

اکتوبر 2012

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع





مستقل سلسلے

خالہ جیلانی	خط آپ کے	رضیہ جمیل	32	کھٹا کسی پہ
خالہ جیلانی	مسکراہٹیں	ساترہ غلام بی	266	موسم کے پیکوان
ادارہ	ایٹنیہ خانے میں	تیسیر نشاط	283	خو بصورت بنے
	بالوں سے خوشنوائے	شگفتہ جاہ	269	
	تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	287	
	سیر و جہاں	امنہ زرین	26	

اکتوبر 2012
جلد 27 نمبر 2
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے لوہن حسن پر شنگ پر پس سے چھپوا کر شائع کیا - مقالم ۱۰۱ پی پی آر سی پریچ ایس سومانجی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ناولٹ

206	فائزہ افتخار	مسٹر ڈیلا
78	فرحانہ ناز ملک	علیسنہ اور میں

افسانے

62	بشری احمد	پھروں ہوا
68	ثریا انجم	ایک ہی زندگی
102	صبا اسلام	بات تو صحیح ہے
158	سردار محمد عمران	بساطِ دل

نظمیں و غزلیں

264	اجمل سرآج	غزل
265	ولی ندما	غزل
264	نوشین اقبال	نظم
265	نازیہ کنول نازی	غزل

زاد سالانہ ایک گیند ریگسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	منیر نیازی	حمد
11	بشیر اعجاز	نعت
12	ادارہ	نئی کی باتیں

انٹرویو

17	شاہین رشید	شہزاد شجہ
22	شاہین رشید	دستک
281	ادارہ	شعاع کے ساتھ
276	کرن مشیر	مشاعری
30	سمیر گل	شادی مبارک ہو

ناول

40	عالیہ بخاری	دیوار شب
----	-------------	----------

مکمل ناول

226	نمرو احمد	جنت کپتے
106	صائمہ اکرم	ابن آدم
164	عائشہ نصیر	میرسا جن

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں

اور ان کے درمیاں جو ہیں میکینوں اور مکانون میں

ہوا چلتی باغوں میں تو اس کی یاد آتی ہے

ستارے چاند سورج ہیں سب ہی اس کے نشانوں میں

اسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خواب ہستی کی

وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرار جہاں کا علم ہے سارا

وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے وہ ہر اک شے پر قادر ہے

وہ سن سکتا ہے لائوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوف باطل سے

بدل دیتا ہے شعلوں کو ہمت گلتانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو

نظیر اس کی طے شاید پرانی داستانوں میں

منیر نیازی

اک مہر بے خودی ہے محمد کے شہر میں

سامان آگہی ہے محمد کے شہر میں

پھولوں میں رقص آفرضا میں ہے نکہت

محل سی اک سہی ہے محمد کے شہر میں

چمکے ہلال بھی یہاں مثل مہ تمام

دریائے چاندنی ہے محمد کے شہر میں

عشق رسول میں ہے ہر اک لمحہ مشکبار

مہکار ہر گھڑی ہے محمد کے شہر میں

روضے کے قرب اور تجلی کے نور سے

ہر گام روشنی ہے محمد کے شہر میں

خوشبود وود کی جو ہوا نذر مصطفیٰ

پھیلی گلی گلی ہے محمد کے شہر میں

کہتے ہیں زائرین مدینہ سدا یہاں

تکلیں آدمی ہے محمد کے شہر میں

بشیر اعجاز

شعاع کا اکتوبر کا شمار پیش خدمت ہے۔
موجودہ دور میں جبکہ ذرائع ابلاغ بے شمار ہیں اور باخبری کوئی مسئلہ نہیں رہی ہے تو ہونا تو یہ چاہیے
تھا کہ عام آدمی بھی حقائق سے باخبر ہوتا، اس میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی اور معاشرے میں مثبت
تبدیلی آتی لیکن یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ میڈیا عوام میں کوئی مثبت سوچ پیدا کرنے میں ناکام
رہا ہے۔

میڈیا کا کام حقائق پیش کرنا ہے۔ عوام کا حق ہے کہ وہ سچائی کو جانیں اور پرکھیں لیکن کچھ نامعلوم وجوہات
یا خوف کی بنا پر لوہا سچ سامنے نہیں لاسکتے تو بہتر ہے کہ ذہنوں کو الجھانے سے گریز کیا جائے۔ وہ جھوٹ سب
سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جس میں کچھ سچ کی آمیزش ہو۔

تہذیب، شائستگی، حسن کلام، اعلاذوقی ہماری تہذیب و روایت کا حصہ ہیں۔ اگرچہ اب بہت سی روایتیں
اور اخلاقی قدیم دم توڑتی جا رہی ہیں لیکن بیشتر گھرانوں میں آج بھی ہمارے مذہبی ارکان کی پوری طرح پابندی
کی جاتی ہے اور تہذیب و شائستگی ہماری زندگیوں کا حصہ ہے۔

میڈیا آزاد ہے لیکن اس آزادی کا مطلب مادہ پرست آزاد ہونا نہیں ہے۔ آج ہم جس عہد میں سانس لے
رہے ہیں اور بین الاقوامی طور پر دنیا تبدیلی کے جس غل سے گزر رہی ہے اس میں ہمیں اپنی شناخت کو برقرار
رکھنا ہے۔ اگر اپنے معاشرے میں حسن، نیکی، خیر اور بھلائی، تہذیب و شائستگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس
سلسلے میں میڈیا کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ صرف مذہبی انتہا پسندی ہی خطرہ نہیں ہے۔ لیبرل انتہا پسندی بھی
انتہائی بڑا خطرہ ہے۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
 - ۲۔ عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول۔ میرا ساجن سب سے روشن،
 - ۳۔ صائمہ اکرم جو دھری کا مکمل ناول۔ ابن آدم،
 - ۴۔ فائزہ افتخار اور فرحانہ ناز ملک کے ناولٹ،
 - ۵۔ ثریا انجم، بشری احمد، صبا اسلام اور سیدہ سحر عمران کے افسانے،
 - ۶۔ عالیہ بخاری کا ناول تکمیل کے مراحل میں،
 - ۷۔ فی وی فیکار شہزاد شیخ سے ملاقات،
 - ۸۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
 - ۹۔ پتھر کر سیر دو جہاں کرنا۔ معروف ادیب اشفاق احمد کی کتاب پر تبصرہ،
 - ۱۰۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
 - ۱۱۔ خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع آپ کو کیا لگا؟ ہم اپنی محنت اور کوشش میں کتنے کامیاب رہے، اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔
آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

ادھار کا بدلہ

حضرت عبداللہ بن ابوربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے غزوہ حنین کے موقع پر تیس ہزار یا چالیس ہزار قرض لیا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (غزوہ سے واپس) تشریف لائے تو انہیں قرض ادا کر دیا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تیرے گھریار میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ ادھار کا بدلہ (قرض کی) ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہے۔“

فوائد و مسائل :

- 1- ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے۔
- 2- اچھے طریقے سے ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ بروقت ادائیگی کی جائے۔
- 3- جیسی چیز لی ہو اس سے بہتر ادا کرنا بھی حسن اخلاق میں شامل ہے، لیکن اگر یہ پہلے سے طے ہو اور قرض خواہ اس کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔
- 4- قرض ادا کرتے وقت قرض خواہ کو دعائیں دینا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اچھے طریقے سے ادائیگی میں شامل ہے۔

قرض خواہ کو (سخت بات کہنے کا) حق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض واپس مانگنے آیا یا کسی اور مالی حق کا مطالبہ کرنے آیا۔ اس نے کچھ (نامناسب) الفاظ

کہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی تادیب کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”رک جاؤ! قرض والے کو اپنے ساتھی (مقروض) پر اختیار ہوتا ہے جب تک وہ ادائیگی نہ کر دے۔“

حق

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ایک بدو (اعرابی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کسی قرض کا تقاضا کرنے آیا جو آپ کے ذمے تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت لہجے میں بات کی، حتیٰ کہ یہاں تک کہ وہ دیا۔ اگر آپ ادا نہیں کریں گے تو میں آپ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کروں گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ ”تجھ پر افسوس! کیا تجھے معلوم نہیں تو کس سے مخاطب ہے؟“ اس نے کہا۔

”میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم نے حق والے کا ساتھ کیوں نہ دیا؟“

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا۔ ”اگر تمہارے پاس کھجوریں ہیں تو ہمیں قرض دے دو، ہماری کھجوریں آئیں گی تو ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔“

انہوں نے کہا۔ ”میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول! میں حکم کی تعمیل کروں گی۔“

انہوں نے آپ کو (کھجوریں) قرض دے دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کا قرض ادا کیا اور اسے کھانا کھلایا۔ اس نے کہا۔

”آپ نے مجھے پورا حق دے دیا، اللہ آپ کو پورا دے۔“

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ایسے لوگ بہترین ہوتے ہیں۔ وہ قوم پاک نہیں ہوتی جس میں کمزور کو پریشان کیے بغیر اس کا حق نہ دیا جائے۔“

فوائد و مسائل :

- 1- قرض خواہ کو سختی کا حق حاصل ہے لیکن افضل یہی ہے کہ تقاضا کرنے میں بھی نرمی کی جائے اور مقروض کو مناسب مہلت دے دی جائے۔
- 2- جاہلوں کے غلط رویے کا جواب سختی سے نہ دیا جائے بلکہ برداشت کیا جائے۔
- 3- حق دار کو اس کا حق اور قرض خواہ کو اس کا قرض بن مانگے ادا کرنا چاہیے۔ یہ انتظار نہ کیا جائے کہ وہ جب مانگے گا تب دے دیں گے۔

ادائیگی کی طاقت رکھنے والا

حضرت عمرو بن شرید رحمۃ اللہ اپنے والد (حضرت شرید ثقفی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ادائیگی کی طاقت رکھنے والا ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہو جاتا ہے۔“ (امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ کے استاد) علی بن محمد طنافسی رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ بے عزتی کرنے سے مراد اس کی شکایت کرنا اور سزا سے مراد قید کرنا ہے۔

فوائد و مسائل :

- 1- قرض بروقت ادا کرنا ضروری ہے۔ معقول عذر کے بغیر تاخیر جائز نہیں۔
- 2- اگر مقروض وقت پر قرض ادا نہ کرے تو اس کے خلاف حکمران یا قاضی سے شکایت کی جاسکتی ہے۔ حاکم اور قاضی کا فرض ہے کہ حق دار کو اس کا حق دلوائیں۔
- 3- اگر مقروض واقعی قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے مزید مہلت دی جائے یا قرض معاف کر دیا جائے یا بیت المال سے اس کی مدد کی جائے۔ بیت

1- قرض خواہ مقروض سے قرض کی واپسی کا تقاضا کر سکتا ہے۔

المال کا نظام موجود نہ ہونے کی صورت میں دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے سے اس کی مدد کریں۔

4- جن جرائم میں حد نہیں ان میں مجرم کو تعزیر کے طور پر قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔

5- حضرت ہرماں بن حبیب رحمۃ اللہ اپنے والد (حضرت حبیب بن ثعلبہ) سے اور وہ ہرماں کے دادا (حضرت ثعلبہ بنی غنبر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا میں اپنے ایک مقروض کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا۔

”(یہ جہاں جائے) اس کے ساتھ رہو۔“ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت میرے پاس سے گزرے تو فرمایا۔

”اے بن تمیم کے بھائی! تمہارے قیدی کا کیا بنا؟“ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے مسجد میں حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے ان کے ذمے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا۔ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ان کی آوازیں سن لیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو آواز دی، انہوں نے کہا۔

”اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اپنے قرض میں سے اتنا معاف کر دو۔“ اور ہاتھ سے نصف کا اشارہ کیا (ادھا قرض چھوڑ دو)۔

انہوں نے کہا۔ ”میں نے معاف کیا۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا۔

”اٹھو اس کا قرض ادا کرو۔“

فوائد و مسائل :

1- قرض خواہ مقروض سے قرض کی واپسی کا تقاضا کر سکتا ہے۔

2- دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو صلح کر دینی چاہیے خاص طور پر وہ شخص جس کو جھگڑنے والوں پر کسی قسم کی فضیلت حاصل ہو اور اس کی بات مانی جاتی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کرائے۔

3- صلح کے لیے صاحب حق اپنا کچھ حق چھوڑ دے تو بہت ثواب کی بات ہے۔

قرض دینا

حضرت قیس بن رومی رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا حضرت سلیمان بن اذنان رحمۃ اللہ نے حضرت علقمہ رحمۃ اللہ کو ان کا وظیفہ (تنخواہ) ملنے تک کی مدت کے لیے ایک ہزار درہم قرض دیا۔ جب انہیں وظیفہ ملا تو انہوں (سلیمان) نے ان سے سختی سے (قرض کی واپسی کا) تقاضا کیا۔

علقمہ رحمۃ اللہ نے ادائیگی کر دی لیکن انہیں ناراضی محسوس ہوئی (کہ اتنی سختی سے تقاضا کیا ہے) چند ماہ ٹھہر کر وہ (پھر) ان کے پاس آئے اور کہا۔ ”مجھے تنخواہ ملنے تک ایک ہزار درہم قرض دے دیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں (میں بڑی خوشی سے آپ کا) احترام کرتے ہوئے (آپ کو قرض دیتا ہوں)۔“ پھر اپنی بیوی سے کہا۔ ”اے ام عتبہ! تمہارے پاس جو مہر بند پھیلی ہے، وہ لے آؤ۔“ وہ لے آئیں تو (علقمہ سے) کہا۔

”قسم ہے اللہ کی! یہ آپ کے وہی درہم ہیں جو آپ نے مجھے ادا کیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی ادھر ادھر نہیں کیا۔“

علقمہ رحمۃ اللہ نے کہا۔ ”کیا خوب! آپ نے مجھ سے جو سلوک کیا اس کی کیا وجہ؟“

انہوں نے کہا۔ ”(اس کی وجہ وہ حدیث تھی) جو میں نے آپ سے سنی۔“

انہوں نے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے کون سی حدیث سنی؟“

سلیمان نے کہا۔ ”میں نے آپ (علقمہ) کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو مسلمان دوسرے مسلمان کو دوبار قرض دیتا ہے، وہ ایک بار اتنا صدقہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔“

علقمہ رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ ”مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے (واقعی) اسی طرح حدیث سنائی تھی۔“

قرض کا ثواب

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”معراج کی رات میں نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ ”صدقے کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔“

میں نے کہا ”اے جبریل! کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”اس لیے کہ سائل (بعض اوقات) سوال کرتا ہے، حالانکہ اس کے پاس (اس کی ضرورت کا مال) موجود ہوتا ہے جبکہ قرض لینے والا ضرورت (اور مجبوری) کی حالت ہی میں قرض لیتا ہے کیونکہ قرض کی واپسی تو ضروری ہے اس لیے مجبوری کے وقت ہی لیا جاتا ہے۔“

مقروض سے تحفہ لینا

حضرت یحییٰ بن ابواسحاق ہنالی رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

”ایک آدمی اپنے بھائی کو مال بطور قرض دیتا ہے پھر وہ (مقروض) اسے کچھ تحفہ دے دیتا ہے (کیا یہ مناسب ہے)۔“

انہوں نے کہا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم میں سے کوئی شخص جب (کسی کو) قرض دے، پھر (مقروض) اسے تحفہ دے یا سواری کے لیے جانور پیش کرے تو (قرض خواہ کو چاہیے کہ)

وہ اس پر سواری نہ کرے اور نہ وہ (تحفہ) قبول کرے“ سوائے اس کے کہ ان دونوں میں پہلے سے تحفہ تحائف کا یہ سلسلہ جاری ہو۔“

فوت شدہ کی طرف سے قرض کی ادائیگی

حضرت سعد بن اطول جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کا بھائی فوت ہو گیا۔ اس نے تین سو درہم (ترکہ) چھوڑا اور بال بچے بھی چھوڑے۔ انہوں نے چاہا کہ یہ مال اس کے بیوی بچوں پر خرچ کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے قید ہے اس لیے اس کا قرض ادا کرو۔“

تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول! میں نے اس کا (سارا) قرض ادا کر دیا ہے، سوائے دو دینار کے۔ ایک عورت ان کا دعوا کرتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت (گواہی وغیرہ) نہیں۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اسے دے دو، وہ سچی ہے۔“

فوائد و مسائل :

1- بیوی بچوں پر خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مال ان کے حوالے کر دیا جائے یا اس سے ان کی ضروریات پوری کی جائیں کیونکہ مرنے والے کے ترکہ میں سے بیوی کا حصہ مقرر ہے، جو باقی بچے وہ بچوں کا ہے۔

2- وراثت میں بعض افراد کا حصہ مقرر ہے۔ انہیں حصہ دینے کے بعد باقی مال قریبی رشتے داروں کو ملتا ہے۔ انہیں ”عصبہ“ کہتے ہیں۔ عصبہ افراد میں بیٹا، بھائی پر مقدم ہے۔

3- ترکہ کی تقسیم قرض کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔

4- عورت کا یہ دعوا تھا کہ مرنے والے کے ذمے اس کے دو دینار تھے۔ حضرت سعد بن اطول رضی اللہ عنہ اپنے اطمینان کے لیے گواہی طلب کرتے تھے۔

عورت کے پاس گواہی نہ تھی۔ اس قسم کی مشکلات سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ قرض کا لین دین تحریر میں لانا چاہیے اور گواہ بھی مقرر کیے جائیں۔

5- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ عورت کا دعوا درست ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دو دینار دلوادے۔

6- قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں فوت ہونے والے کو اللہ کے ہاں قید کیا جاتا ہے لیکن یہ قید صرف جنت میں داخلے سے رکاوٹ ہے، اس کی وجہ سے وہ جہنم کا مستحق نہیں بن جاتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد (حضرت عبد اللہ بن حرام انصاری رضی اللہ عنہ) فوت ہوئے تو ان کے ذمے ایک یہودی کا تیس وسق غلہ قرض تھا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے مہلت مانگی تو اس نے مہلت دینے سے انکار کر دیا، تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ یہودی سے ان کی سفارش کر دیں۔

”چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لے جا کر یہودی سے بات چیت کی (اور یہ پیش کش کی) کہ ان پر جو قرض ہے اس کے بدلے وہ ان کی کھجوروں کا سارا پھل لے لے تو اس (یہودی) نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو مہلت دینے کا کہا تو اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجوروں کے باغ میں تشریف لے گئے اور درختوں کے درمیان چلے، پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

”پھل اتارو اور اسے اس کا حق پورا دے دو۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد انہوں نے پھل اتار کر تیس وسق کھجوریں اس (یہودی) کو دے دیں اور بارہ وسق

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بھجوریں بیچ گئیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس واقعہ کی خبر دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو جابر رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر اطلاع دی کہ انہوں نے اس (یہودی) کو پوری ادائیگی کر دی ہے اور جو مقدار بیچ گئی تھی وہ بھی بتائی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”عمر بن خطاب کو بھی یہ بات بتاؤ۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر انہیں یہ بات بتائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا۔

”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (باغ) میں چل رہے تھے تو مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس پھل میں ضرور برکت عطا فرمائے گا۔“

فوائد و مسائل :

1- حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔

2- حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد پر اور بھی بہت سے لوگوں کا قرض تھا۔ ان کے بارے میں دوسری احادیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ یہودی ان قرض خواہوں میں سے ایک تھا۔

3- اس یہودی کے سوا دوسرے قرض خواہوں کو ادائیگی کرتے وقت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماپ کر ہر ایک کو اس کا قرض ادا کیا تھا۔

4- کھانے پینے کی چیزوں میں یہ برکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے جو متعدد مواقع پر ظاہر

ہوا۔

5- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان اتنا زیادہ تھا کہ انہیں معجزہ ظاہر ہونے سے پہلے ہی یقین ہو گیا کہ یہ واقعہ یوں پیش آئے گا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت اور شان کا اظہار ہوتا ہے۔ ”وسق“ ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے۔ جس کی کل مقدار ہمارے یہاں کے اعتبار سے تقریباً ”چار من“ بنتی ہے۔

تین کاموں کے لیے قرضہ لینے والا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”قیامت کے دن مقروض سے قرض وصول کیا جائے گا جب وہ (مقروض ہو کر) فوت ہو جائے مگر جو شخص تین کاموں کے لیے قرض لیتا ہے (وہ اس سے مستثنیٰ ہے)۔

وہ شخص جس کی اللہ کے راستے میں (جہاد کرنے کی) قوت کم ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل کرنے کے لیے قرض لیتا ہے۔

(دوسرا) وہ شخص جس کے پاس کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے اور اس کے پاس قرض لیے بغیر اس کے کفن و دفن کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اور (تیسرا) وہ شخص جسے اپنے بے نکاح رہنے کی صورت میں (گناہ میں ملوث ہونے کا خطرہ محسوس کر کے) اللہ سے خوف آتا ہے وہ اپنے دین (میں خرابی) کے ڈر سے (قرض لے کر) نکاح کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان (تین قسم کے افراد) کا قرض ادا کر دے گا۔“

جاوید شیخ کے صاحبزادے معروف فنکار

شہزاد شیخ ہے ملاقات

شاہین رشید

جب میں کلچ یونیورسٹی میں تھا تو میں نے سوچا تھا کہ میں پڑھائی سے فارغ ہو کر کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کر لوں گا۔ مگر پھر اچانک ہی ایک دن دل چاہا اداکاری کرنے کا۔ مگر سوچا کہ ایسے۔ نہیں اس کے بارے میں کچھ بڑھ کر اس طرف آؤں گا۔ چنانچہ میں نیویارک امریکہ گیا اور وہاں اداکاری کا کورس کیا۔ کورس کے دوران ہی مجھے اداکاری میں مزا آنے لگا۔ کیونکہ بہت ساری چیزیں سیکھنے کو ملیں تو میں نے سوچا کہ ضرور ثرائی کرنا چاہیے۔ پھر جب میں پاکستان آیا اور سب کو بتا چلا کہ میں اداکاری کے بارے میں پڑھ کر آیا ہوں اور کچھ کرنا بھی چاہتا ہوں تو مجھے جو پہلا سیریل ملا اس کا نام ”ڈریمر“ تھا اور آپ یقین کریں کہ نہ صرف اسے پسند کیا گیا بلکہ میری اداکاری کو بھی بہت پسند کیا گیا اور بس پھر اداکاری کی شروعات ہو گئیں۔“

☆ ”پھر افسوس ہوا ہو گا کہ جلدی آجاتا اس فیلڈ میں؟“

☆ ”نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے اور ابھی بھی میں اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ میں آج بھی جب سیٹ پہ جاتا ہوں اور اپنے سینئرز کو دیکھتا ہوں۔ ان سے ملتا ہوں۔ ان کو کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہوں۔ بہت گنجائش ہے اس فیلڈ میں۔“

☆ ”جانا ایڈورٹائزنگ میں تھا“ آدھر گئے۔ آگے کیا ارادہ ہے چونکہ ادھر مزا آ رہا ہے تو اس کو مستقل رکھنا ہے؟“

☆ ”بات مزے کی نہیں ہے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جو چیزیں مجھے پڑھائی گئیں اور پھر اس فیلڈ

عموماً ”شوہزاد“ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں نئے لوگ کم اور نسل در نسل لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ بات تو ٹھیک ہے کہ آج زیادہ تر فنکار معروف فنکاروں کی اولادیں ہیں۔ لیکن صرف شوہزاد میں ہی ایسا نہیں ہوتا بلکہ تقریباً ہر پرورش میں ہی ہوتا ہے۔

جاوید شیخ فلم کی وی کا ایک جانا پہچانا نام۔ پہلے دن کی طرح آج بھی شوہزاد میں مقبول ترین ہیں۔ اب ان کے فرزند بھی اس فیلڈ میں اپنی پہچان بنانے میں مصروف ہیں۔ شہزاد شیخ کو اس فیلڈ میں آئے ابھی زیادہ ٹائم نہیں ہوا ہے۔ مگر انہوں نے اپنی پرفارمنس سے سب کو بہت متاثر کیا ہے۔

”یعنی کی آئے گی بارات“ می رقصم اور ڈریمر“ ان کے مقبول ترین سیریل ہیں اور شہزاد کی پرفارمنس بھی بہت عمدہ رہی۔

☆ ”کیسے ہیں شہزاد اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“

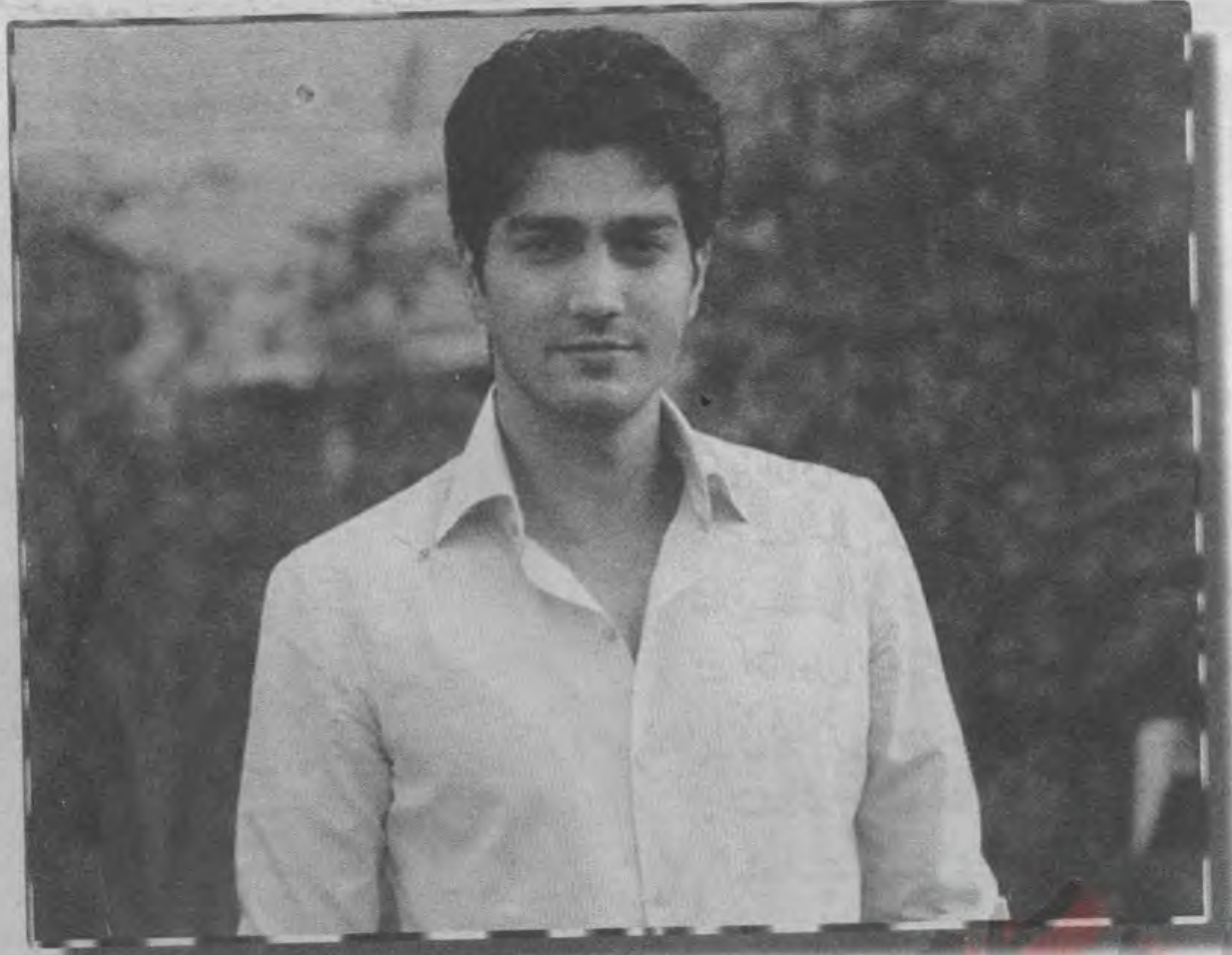
☆ ”مصروفیات تو بہت زیادہ ہیں ماشاء اللہ سے۔“

☆ ”اور انڈر پروڈکشن بھی کام ہے؟“

☆ ”جی ہاں ماشاء اللہ بڑے بڑے پروڈکشن ہاؤسز کے ساتھ کام جاری ہے۔ ایک فلم بھی سائن کی ہے۔“

☆ ”شہزاد۔۔۔ آپ جاوید شیخ صاحب کے بیٹے ہیں۔ اس لحاظ سے تو آپ کو بچپن سے ہی اس فیلڈ میں آ جانا چاہیے تھا؟ کیا پڑھائی کی وجہ سے دیر سے آئے؟“

☆ ”ہاں کچھ پڑھائی کی وجہ تھی اور کچھ میں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے اپنا مائنڈ بھی سیٹ نہیں کیا تھا۔ ابھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اداکاری کی طرف آؤں گا۔“



تھا کیونکہ اس کے بعد ہی مجھے آفرز آنا شروع ہوئیں اور آپ کو بتاؤں یہ 13 قسط پر مبنی تھا جو پہلے ”آگ ٹی وی سے چلا پھر لوگوں کی فرمائش پر اسے جیو سے بھی چلایا گیا۔“

☆ ”اچھا۔۔۔ ویسے اداکاری بور کام نہیں؟ ری ٹیکس۔۔۔ پھر وقت بھی بہت لگتا ہے ایک ڈرامے میں یا سیریل میں۔“

* ”نہیں بالکل بھی بور نہیں ہے۔۔۔ ہاں جب میں اس فیلڈ میں نہیں آیا تھا تب مجھے یہ کام بور لگتا تھا۔ اب ظاہر ہے ایسا نہیں ہے۔“

☆ ”اس فیلڈ کی پہلی کمائی کیا تھی؟“

* ”جیو کے سیریل ڈرامے کے مجھے 75 ہزار روپے ملے تھے اور یہ میری اپنی ذاتی کمائی تھی تو مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا۔ کچھ گھر والوں نے کچھ اپنے اوپر اور کچھ کھانے پینے میں خرچ کر دیے تھے۔“

☆ ”فیوچر پلاننگ کیا ہے۔ اس فیلڈ میں کہاں تک جانا ہے؟“

* ”مجھے اس فیلڈ میں اگلے پانچ سال تک اداکاری ہی کرنی ہے۔ یہ میرا فیوچر پلان ہے۔ پھر اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولوں گا۔ آگے اللہ مالک ہے جو وہ کروانا چاہے۔“

☆ ”ملک سے باہر کافی عرصہ آپ نے گزارا۔۔۔ دل چاہا مستقل قیام کو؟“

* ”میرے پاس گرین کارڈ ہے امریکہ کا۔ لیکن سچ پوچھیں تو میرا بھی دل نہیں چاہا وہاں رہنے کو۔ بے شک ان میں بہت اچھی باتیں ہیں مگر پھر بھی اپنا ملک اپنا ہی ہے۔ ویسے بنیادی طور پر ہم بہت جذباتی قوم ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر ایک ہو جاتے ہیں اور پیچھے ایک دوسرے کی کاٹ کرتے ہیں اور جلدی غصے میں آ جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

☆ ”ہمیں ایک ہونے میں دوسرے ملکوں سے سبق سیکھنا چاہیے؟“

* ”بالکل جی۔۔۔ اسلام کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے پیار محبت سے رہیں۔ ایک دوسرے کا خیال

میں آکر جو کچھ میں نے کیا تو میں یہ کہوں گا کہ اداکاری بھی ایک فل ٹائم جاب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ پارٹ ٹائم ایکٹنگ کر رہے ہیں اور پارٹ ٹائم کچھ اور۔ اگر آپ کوئی کام کر رہے ہیں تو آپ کو اپنی پوری توجہ کے ساتھ وہ کام کرنا ہوتا ہے اور میں اپنی پوری توجہ کے ساتھ یہ کام کر رہا ہوں اور اب جبکہ میں نے اداکاری شروع کر دی اور مجھے اچھا بھی لگ رہا ہے اور سیکھنے کو بھی مل رہا ہے تو میں نے سوچا کہ اب اگلے پانچ سال میں صرف اپنی ایکٹنگ کو دوں گا اور اس کے بعد اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولوں گا اور کمرشلز اور ڈائریکشن پر توجہ دوں گا۔“

☆ ”فلمیں بھی کریں گے۔ پاکستانی یا باہر کی؟ کیونکہ پاکستان کی فلم انڈسٹری تو بالکل بیٹھ گئی ہے؟“

* ”فلموں میں کام ضرور کروں گا۔ اب ہمارے یہاں بھی اچھا فلمیں بننا شروع ہو گئی ہیں اور کچھ فلمیں تو

ایسی ہیں کہ جب وہ ریلیز ہوں گی تو لوگ ان کو بہت پسند کریں گے۔ آپ دیکھیں گی کہ ایک دو سالوں میں سینما ہاؤسز کی رونقیں بحال ہو جائیں گی اور بہت سی اچھی فلمیں دیکھنے کو ملیں گی۔“

☆ ”مثلاً کس طرح رونقیں بحال ہوں گی؟“

* ”بہت سارے ایسے لوگ ہیں۔ جو ہماری فلم انڈسٹری میں انویسٹ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کی یہ بات کہ ہماری فلم انڈسٹری فیل ہو گئی ہے یا بیٹھ گئی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ انڈسٹری فیل یا ناکام نہیں ہوتی بلکہ ہم نے خود سینما ہاؤس جانا چھوڑ دیا ہے اس لیے موویز بننا بند ہو گئی ہیں۔“

(جانا اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ فلمیں متاثر نہیں کر رہیں۔ اب انڈیا کی فلمیں ریلیز ہوتی ہیں تو لوگ جاتے ہیں نا۔)

☆ ”پہلا ڈراما سیریل آپ کا ”ڈرامہ“ تھا۔ کیا رسپانس ملا تھا؟“

* ”جی پہلا ڈراما سیریل ڈرامہ تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس فیلڈ میں مجھے متعارف کرانے والا یہی سیریل

اسی لیے جب ہم اداکاری کر رہے ہوتے ہیں تو لاشعوری طور پر کوئی نہ کوئی کردار ہمارے ذہن میں ایسا آ جاتا ہے جس کو ہم نے دیکھا ہوا ہوتا ہے اور ہم تو کری ایشن بھی کسی کو دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔“

☆ ”ماشاء اللہ! تم اب اچھے خاصے مشہور ہو گئے ہو کیا محسوس کرتے ہو کہ اب عام لوگوں کی طرح لائف گزارنا مشکل ہو گیا ہے؟“

* ”نہیں مجھے بالکل بھی مشکل نہیں ہوتی، کیونکہ میں عام لوگوں کی طرح ہی ہوں اور عام لوگوں میں ہی اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ یہ میرا پروفیشن ہے جس طرح اور لوگوں کے مختلف پروفیشن ہوتے ہیں۔“

☆ ”لوگ آپ کو پہچان کر کیا کہتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں؟ اداکاری کی یا آپ کی؟“

* ”لوگ پہچان کر مجھ سے ہیلو ہائے کرتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں کہ آپ کے ابا کیسے ہیں۔“

☆ ”اچھا۔۔۔ کبھی دل چاہتا ہے کہ آپ کو لوگ آپ کی وجہ سے پہچانیں؟“

* ”شروع میں مجھے یہ بات محسوس ہوتی تھی اور

رکھیں۔ جھوٹ نہ بولیں، کم نہ تو لیں۔ یہ سب باتیں باہر ہیں آپ کسی اسٹور میں چلے جائیں وہ مسکرا کر باتیں کرتے ہیں۔ اچھی طرح ٹریٹ کرتے ہیں قطار میں کھڑے ہو کر ڈسپلن کے ساتھ آپ خریداری کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ زبیرا کراسنگ کا خیال رکھتے ہیں۔ بہت سی اچھی باتیں ہیں ان میں جو ہم میں نہیں ہیں۔“

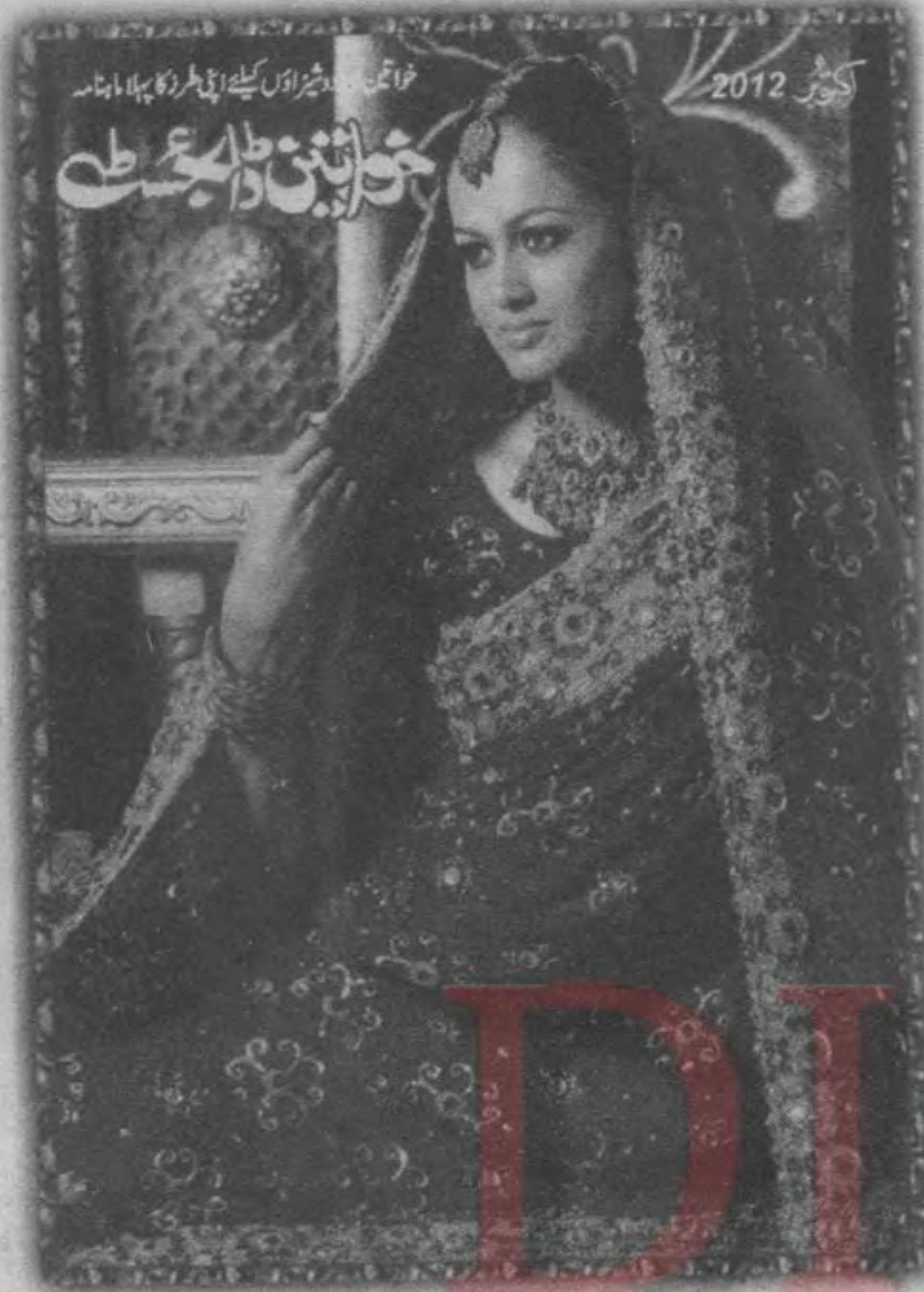
☆ ”ڈراموں میں انسان کی اپنی شخصیت کتنی انوالو ہوتی ہے یا آپ کی شخصیت کا کتنا عکس ہوتا ہے؟“

* ”بخاب۔۔۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو اور بجٹل ہو۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اسکرپٹ اور بجٹل ہے یا یہ اداکاری اور بجٹل ہے۔ ہم انسان ہیں۔ ہم ہمیشہ دوسروں کی چیز کی کاپی کرتے ہیں۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو اسی انداز اور اسی زبان میں باتیں کرتے ہیں جن میں ہمارے والدین اور ہمارے بہن بھائی کرتے ہیں۔ اس طرح اسکول میں جو پڑھایا جاتا ہے اسے اسی طرح ری ایکٹ کرتے ہیں اس لیے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اور بجٹل ہو،

اکتوبر 2012 کے شمارے کی ایک جھلک

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ



اکتوبر 2012
کا شمارہ شائع
ہو گیا ہے

- ✽ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" راشدہ رفعت، عنیقہ محمد بیگ، ملیحہ صدیقی، تہمینہ چودھری
- ✽ فرحت اشتیاق کا ناول تکمیل کے مراحل میں، اور عمرین اعجاز کے افسانے،
- ✽ "زمین کرے آنسو" نگہت سیما کا مکمل ناول، مشہور رائٹر "فصیح باری خان" سے ملاقات،
- ✽ "میرے ہمدم، میرے دوست" اداکارہ "عروۃ الوثقی" سے باتیں،
- ✽ عفت سحر طاہر کا مکمل ناول، کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں
- ✽ سمیرا حمید اور فیضیہ عامر کے ناولٹ، اور دیگر دلچسپیاں،

خواتین ڈائجسٹ اکتوبر 2012 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

☆ "فضول خرچ ہیں؟" *
"جی! بالکل جو کتنا ہوں" خرچ کر دیتا ہوں۔ پیسہ جمع ہوتا ہی نہیں ہے۔ شاید یہ میری بری عادت ہے۔"

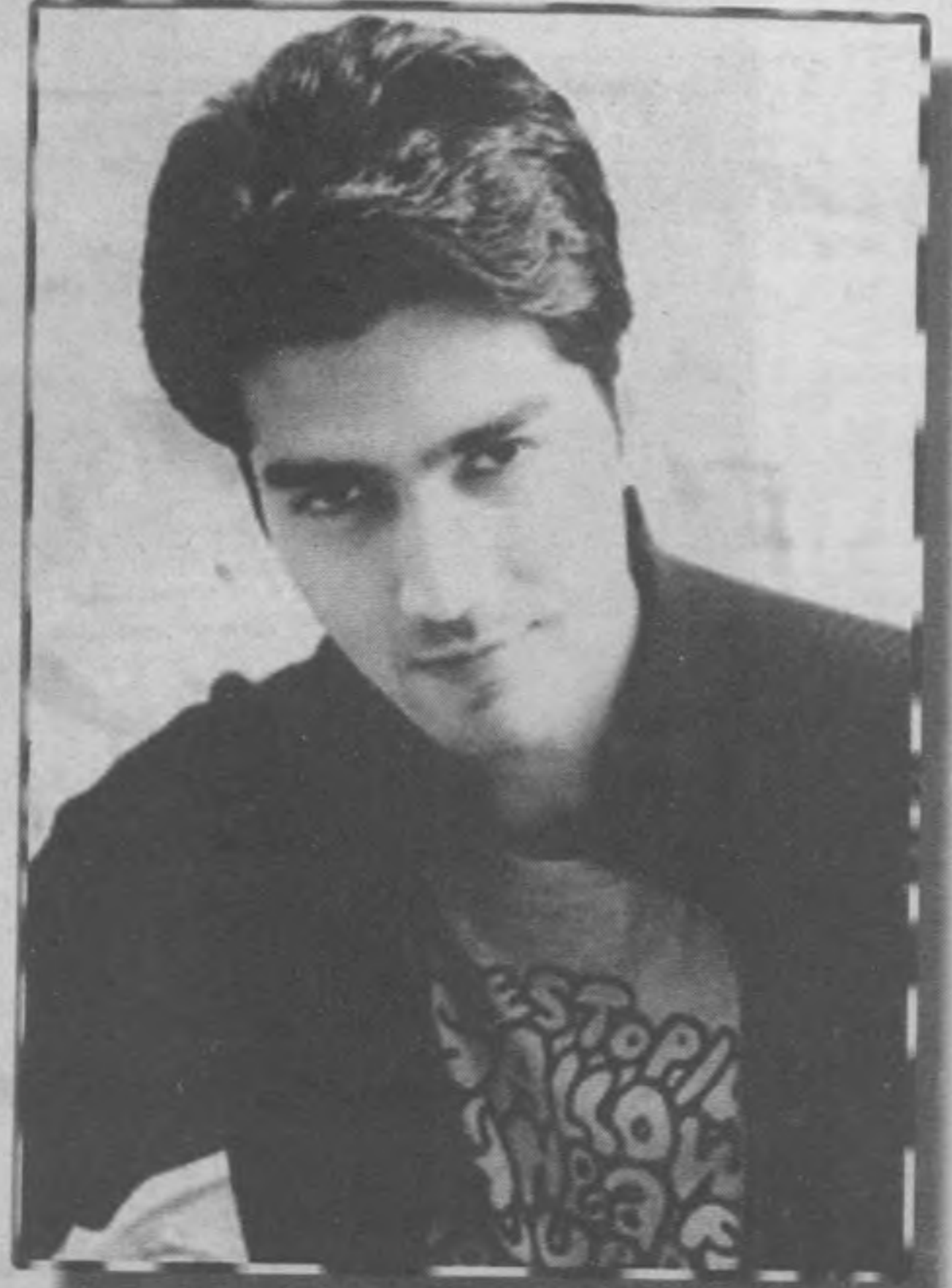
☆ "اپنے والد کی طرح مشہور ہونا چاہتے ہیں یا ان سے بھی زیادہ کی خواہش ہے؟"

* "میرے خیال میں میرے والد عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ شہرت تو شاید ہی حاصل کر سکوں۔" خسر سے کہتا ہوں کہ یہ میرے والد صاحب ہیں۔ بس میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے کہ میرے والد خسر سے کہہ سکیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔" ☆
"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔۔۔ کب کہاں جنم لیا؟"

* "میری فیملی کو تو آپ اور سب ہی جانتے ہیں۔ میں 26 ستمبر 1982ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ ستارہ لبرا ہے اور قد چھ فٹ دو انچ ہے۔ میں نے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کیا ہے اور فلم میکنگ اور ایکٹنگ میں کورسز کیے ہیں۔ میری شادی ان شاء اللہ دسمبر 2012ء میں ہو رہی ہے۔ میری ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"

☆ "شادی پسند سے طے ہوئی ہے؟" *
"جی! میری بھی اور میرے گھر والوں کی پسند سے یعنی لو+ارنج۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شہزاد شیخ سے اجازت چاہی، اس شکریہ کے ساتھ کہ اپنی مصروفیات سے ہمیں وقت دیا۔



خاص طور پر اس وقت جب لوگ مجھے میری والد کی وجہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تو میرا دل چاہتا تھا کہ لوگ مجھے میری حیثیت میں پہچانیں۔۔۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ میں اگر باہر والوں کی نظر سے دیکھوں تو میرے والد ان کے لیے ایک "آئی کون" ایک ہیرو ہوں۔ ہماری پہچان ہیں ہماری شان ہیں تو جب اس چیز کا احساس ہوا تو پھر ان کے حوالے سے پہچان اچھی لگنے لگی۔" ☆
"شوہز کو کیسا پایا۔۔۔ اچھی فیلڈ ہے یا بہت اچھی فیلڈ؟"

* "بچپن سے اس فیلڈ کو دیکھ رہا ہوں۔ اگرچہ کام دیر سے شروع کیا۔ جہاں تک بہت اچھے کی بات ہے تو ہر وہ فیلڈ اچھی ہے جب انسان خود اچھا ہے۔ انسان ہی اس فیلڈ کو بدنام بھی کرتا ہے اور انسان ہی اس فیلڈ کو اچھا ثابت کرتا ہے اور ایسا ہر فیلڈ میں ہوتا ہے۔"

دستک دستک دستک

شاہین رشید



روفلالہ

جاؤں گا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔
☆ ”تو پھر یہ بتائیں کہ آپ کو لالہ کیوں کہتے ہیں جبکہ آپ کا نام تو عبدالرؤف ہے۔“
☆ ”میرا شناختی کارڈ والا نام تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ عبدالرؤف ہے اور لالہ مجھے میرے سب لوگ پیار سے کہتے ہیں۔“
☆ ”اور شناختی کارڈ پر آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟“

☆ ”اس پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا۔ ای کہتی ہیں کہ جس دن تمہاری خالہ کا بیٹا پیدا ہوا تھا اس کے دو سرے دن میں پیدا ہوا تھا۔ اب وہ کب پیدا ہوا تھا مجھے نہیں معلوم۔ اب آپ پوچھیں گی کہ کس شہر میں پیدا ہوا تھا تو اس کا کراچی میں آدھالاڑکانہ میں۔“
☆ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

☆ ”(ہنستے ہوئے) ”مطلب یہ ہے کہ پیدائش کا زمانہ میں ہی ہوا تھا مگر دس دن کے بعد کراچی آ گیا تھا۔ تو دس دن کا بچہ تو بس ایسا ہی ہوتا ہے کہ پیدائش ہو۔“

☆ ”ماشاء اللہ فریہ ہیں پھر بھی لمبے لگتے ہیں۔ تعلیم کہاں تک حاصل کی؟“

☆ ”تو کیا آپ نے میرے کپڑے سلوانے ہیں۔ (ہنستے ہوئے) اور جہاں تک تعلیم کی بات ہے تو میں نے الحمد للہ انٹر تک تعلیم حاصل کی ہے اور وہ بھی پیلے اسکول سے۔“

☆ ”انٹر تک؟۔۔۔ لوگ ڈگریاں لے کر کہتے ہیں الحمد للہ اور آپ انٹر تک پڑھ کر الحمد للہ بول رہے ہیں؟“

☆ ”اس زمانے کا تو انٹر بھی بہت ہے۔ اردو میڈیم میں پڑھائی کی اور جیسا ابھی بتایا کہ پیلے اسکول کا پڑھا ہوا ہوں وہی پیلے اسکول جس کی دیواروں پر دو خاتون کے نام لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔“
☆ ”آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور کیا وہ بھی اس فیلڈ میں ہیں؟“

پانچ بہنیں ہیں۔ اور دو بھائی۔۔۔ ویسے سب شادی شدہ ہیں۔ اپنی زندگی مزے میں گزار رہے ہیں۔“

☆ ”شادی پسند کی کی آپ نے؟“

☆ ”گھر والوں نے ارٹس کی تھی۔ لوشادی کے بعد کیا۔ شادی سے پہلے مجھے ٹائم ہی نہیں ملا کسی سے محبت کرنے کا اور کسی لڑکی کو دیکھنے کا۔ لڑکیوں کے پاس تو بہت ٹائم تھا مجھے دیکھنے کا اور میں یہی سوچتا تھا کہ خوب صورت انسان ہوں تو سب دیکھیں گے ہی اور ویسے بھی لڑکیوں کا کام ہی دیکھنا ہوتا ہے یا بیوی دیکھتی ہیں یا فلمیں دیکھتی ہیں یا پھر لڑکے دیکھتی ہیں۔ بس محبت مجھے شادی کے بعد اپنی بیوی سے ہی ہوتی۔“

☆ ”شوہر کی فیلڈ بڑی خطرناک ہے۔ کبھی دوسری شادی کا خیال آیا؟“

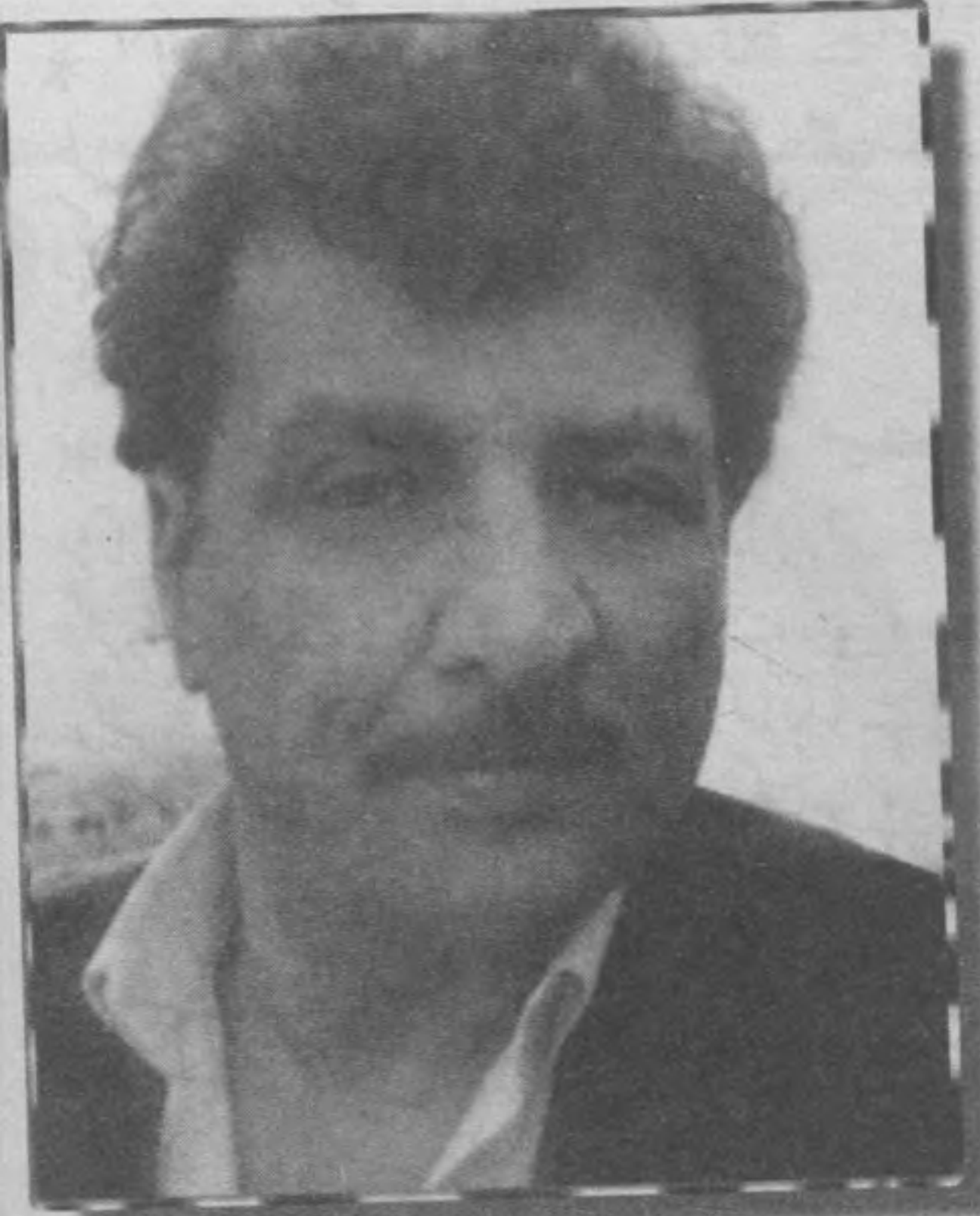
☆ ”دوسری شادی کا خیال آیا تھا اور کرنے ہی لگا تھا کہ بیگم نے منع کر دیا کہ ایسا نہ کریں میں اپنے آپ کو چھین کر لوں گی تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے! تم اپنے آپ کو چھین کر لو تو مجھے کیا ضرورت ہے دوسری شادی کرنے کی۔“

☆ ”شوہر میں کیسے آئے؟“

☆ ”رکشے میں آیا تھا۔“

☆ ”اچھا۔۔۔ رکشے میں کس نے بٹھایا تھا؟“

☆ ”میں خود بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں لاپنج نہیں تھا اور شوہر میں نے 1978ء میں جوائن کیا۔ کسی کی سفارش سے نہیں آیا تھا بلکہ اتفاقاً آیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ ایک اسٹیج پلے کی ریکارڈنگ دیکھ کر گیا تھا۔ وہاں اس موقع پر ایک آرٹسٹ نہیں آیا تھا تو مجھے کسی



نے کہا کہ بیٹا! اس جگہ پر آپ کھڑے ہو جائیں۔ بچپن سے ہی فریہ تھا اور انہیں ضرورت ہی ایک گول مٹول بچے کی تھی تو بس جو پر فارم کرنے کو کہا گیا وہ میں نے پر فارم کر دیا۔ کام پسند آیا اور لوگوں نے بھی تعریف کی تو بس پھر سلسلہ چل پڑا۔۔۔ اور اب پینتیس سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے۔“

☆ ”اور شاید آپ کو پہلے ہی ڈرامے پہ ایوارڈ بھی ملا تھا؟“

☆ ”جی ہاں۔۔۔ پہلے ڈرامے میں سیکنڈ ایوارڈ ملا اور سیکنڈ ڈرامے میں فرسٹ ایوارڈ ملا۔۔۔ اور تیسرے ڈرامے میں تھرڈ ایوارڈ ملا۔ تو بس ایسی حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں نے اس فیلڈ کو اپنا لیا۔۔۔ ورنہ مجھے تو پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ کانڈکٹر کے ہوائی جہاز بنانا کر اڑایا کرتا تھا۔ میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے عزت بھی دی ہے۔ مقبولیت بھی دی ہے اور عزت کی روٹی بھی دی ہے۔“

ذوالقرنین حیدر

☆ ”کیسے ہیں ذوالقرنین حیدر صاحب۔۔۔ اپنے نام کو اپنے لیے کتنا خوش نصیب سمجھتے ہیں؟“

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا

زاویہ

مصنف: اشفاق احمد

تبصرہ: آمنہ زریں

انسانی ذہن کی بلند پرواز جستجو کی فضا میں۔ دریافت کا موتی تلاش کرنے کے لیے جن پروں پر انحصار کر سکتی ہے۔ وہ حیرت کا نام رکھتے ہیں۔ کھلی آنکھ تو ہر ایک کی ہے۔ مگر مشاہدے کے لیے حساس دل اور بیدار دماغ کی ہم نوائی لازم ہے۔

جستجو کا اضطراب اسے بے خطر تجربات سے گزرنے کی جرات عطا کرتا ہے۔ اور نئے نئے تجربات سے گزرنا اس کے خیال کو تازگی، بیان کو سادگی اور لہجے کو دل میں اتر جانے والی تاثیر عطا کرتا ہے۔

اشفاق احمد کی ہمہ جہت ذات اور شخصیت کے کئی تعارف اور کئی مقام ہوں گے، مگر مجھے ان سے محبت زاویہ پڑھ کر ہوئی۔ اوپر بیان کی گئی صفات سے مزین ان کی ذات نے اس کتاب کے ذریعے جو آسانی مجھے اور مجھ جیسے بہت سوں کو عطا کی۔ ایک احسان کا درجہ رکھتی ہے۔

خود فراموشی کی کیفیت سے نکال کر امید، یقین، جستجو کے عمل پر آمادہ کردینے والی اس کتاب کا درجہ میرے لیے خاص بلند ہے۔

”کوشش، جدوجہد، اسٹرائیو، بھاگ دوڑ یہ ساری کی ساری آپ کے اندر انا اور تکبر پیدا کرتی ہیں۔ اسی لیے ہمارے یہاں حکم ہے کہ آپ مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اسلام میں مقابلے کی یہ صورت بالکل منع ہے۔ ایک ہی اجازت ہے اور وہ ہے تقویٰ کے لیے آپ اس میں مسابقت کر سکتے ہیں۔“

”مسابقت اور مقابلے سے آپ کو روکا گیا ہے اور تقویٰ، نیکی، اچھائی کے لیے آپ کو ابھارا گیا ہے کہ ہاں! یہاں پر جتنا مقابلہ ایک دوسرے کا کر سکتے ہو، کرو۔“

”ہم سوچے سمجھے بغیر پہلے تو کچھ بات منہ سے نکال دیتے ہیں اور پھر اپنے تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے اس چیز کو طرہ امتیاز بنا لیتے ہیں جو آپ کے کمال کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بچوں کے نمبر آجانا، آپ کا خوش شکل ہونا، آپ کا چہرہ اچھا ہونا، رنگت گوری ہونا، یہ محض عطاۓ خداوندی ہے۔ اس کو تم اپنی تلوار بنا کر لوگوں کی گردنیں نہ اتارتے رہو۔“

”احترام آدمیت“ سے لیے گئے یہ اقتباس اس تفصیل کا اجمال ہے جو فی زمانہ ”سٹیٹس سیمبل“ کے نام پر اختیار کیے جانے والے رویے، اس پر کیے جانے والے فخر اور ان تمام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس معاشرتی خلا کا باعث بن چکے ہیں جس نے ہماری اقدار، ہمدردی کے احساس اور وضع داری کو شدید ٹھیس پہنچائی ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت اپنے انداز میں اجاگر کرتے ہوئے وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اللہ سے قربت اختیار کرنے کا آسان راستہ اس کی مخلوق کی مدد کرنا ہے اس کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے۔

”بڑا اچھا موسم ہے اور بڑے اچھے دن ہیں، لیکن جو خوشی دلوں کے اندر ناچتی ہے اور چہروں پر رقص کرتی ہے وہ عام لوگوں میں مفقود ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا

وجہ ہے؟ کسی اکاؤنٹسٹ سے دریافت کریں تو وہ اپنی تمام عملیت کے باوجود یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہماری انسانوں کی بھری پڑی دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مغموم، ملول، پریشان اور درد مند رہتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دن بھی کچھ سکھانے کے لیے ہوتے ہیں اور جب آدمی سیکھ جاتا ہے تو بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بڑی باتیں آپ کے سامنے آجاتی ہیں بشرط یہ کہ آپ غور کریں۔“

جمعے کے دن سے محبت ہماری معاشرت کا حصہ ہے اور اس دن میں اللہ کا فضل تلاش کرنے کی نئی جستجو اس کتاب کے ذریعے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اصل شرک وہ ہے جب اللہ کے کیے ہوئے کام میں بندہ نقص نکالے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ یہ تھیک نہیں ہے، فلاں کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہوا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ خرچ کرو۔ روپیہ ایک جگہ پر پڑنا نہ رہے، کیونکہ یہ کھاد کا جو ڈھیر ہوتا ہے۔ ”روڑی“ جسے کہتے ہیں، اگر اسے کھیتوں میں پھیلا دیا جائے تو یہ سونا ہے اور اگر اسے ایک جگہ پر جمع رکھا جائے تو یہ بدلو کا گھر ہے۔ کوئی

گاؤں اس کے قریب بس نہیں سکتا۔ یہی دولت کا حال ہے کہ جب اس کو پکڑ کر رکھ لیا، میرے جیسے لوگوں نے اکاؤنٹ بھی کھول لیا۔ تو پھر جب دولت گھومتی نہیں ہے لوگوں کے ہاتھوں میں تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اللہ کہتا ہے، خرچ کرو!“

”میرے ایک اور دوست لاہور میں جی پی او کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے اور کار میں جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے اور کہتے ”ان کی شکلیں دیکھو، اس کی پکوڑے جیسی ناک ہے اور کتنی اعلا درجے کی کار میں جا رہی ہے۔“ میں نے کہا اب کیا کریں؟ کہنے لگا، ”بس میرے جی میں آتا ہے کہ میں اسے توپ سے اڑا دوں۔“ توپ سے اڑانے والی ذہنیت اپنی اپنی جگہ پر ہم سب میں ہے،

لیکن اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔“

”رضائے الہی“ سے لیے گئے یہ اقتباس اللہ کی طرف سے کی گئی تقسیم اور اس پر راضی رہنے یا ناخوش رہنے والوں کا بیان ہے۔ کتاب کے مختلف ابواب میں اس نکتے پر بحث کی گئی ہے کہ انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ فضل الہی پر تنقید یا تبصرہ کرے۔ اس کا کام اطاعت، شکر گزاری اور تسلیم و رضا ہے اور یہ اس کے سفر کو آسانی عطا کرنے والی صفات ہیں۔

”وہ مومن جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوف زدہ نہ ہو، اس کو ”صاحب حال“ کہتے ہیں، کہ جو حال اس کو عطا کیا گیا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور خوش و خرم، بڑی چاہت کے ساتھ بسر کرے اور جب تک اس کو اس کا تحفہ دیا گیا ہے اس کو ساتھ لے کر چلے۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے پاس اس قسم کا زمانہ آگیا ہے جو خود تو ناسازگار نہیں ہے، اس نے ہماری سوچ کو ہمارے رویے کو بہت ساری ناسازگاری میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور یوں میں یہ سمجھتا ہوں زندگی کے اس حصے میں پہنچ کر جب تک اللہ کا ساتھ نہ ہو اور اللہ کو اس طرح سے نہ مانا جائے، جس طرح سے ماننے کا حق ہے۔ صرف کتابی طور پر نہیں۔ مثلاً ”میری خرابی یہ ہے، میں اس کا ایمان

داری سے اعتراف کرتا ہوں اور مجھے بڑا دکھ بھی ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں، لیکن کتابی طور پر۔ میری ماں کہتی تھی کہ نماز پڑھو، لیکن میں نے بھی یہ ارادہ یا تہیہ نہیں کیا کہ میں اس کے ساتھ ایک ربط یا ہی قائم کروں گا۔ لفظ خدا خدا نہیں ہے، خدا تو اور ہے، نا جو لکھا ہوا ہوتا ہے یا جو ہم گانا گاتے ہیں ٹی وی پر خدا کا نام لیتے ہیں وہ ایک اور چیز ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ہونا، اس کو زندگی کے اندر سے گزارنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔“

رضایہ راضی رہنا۔ سکون قلب کا نسخہ ہے۔ گو کہ اس پر قدم رکھنا آسان نہیں۔ مگر چلتے جانے کے لیے قدم رکھنے کی شرط تو منسلک ہے۔ اور وہی نکتہ کہ اللہ کے نظامہ۔ اللہ کے فضل، اس کی کی گئی

تقسیم پر اعتراض کرنا، کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ جس کی منزل بھی ناخوشی۔ فاصلہ بھی کٹھن۔

”میں یہ سمجھتا ہوں حکومتیں تو بڑی بے معنی اور لا یعنی سی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی بیمار پرسی، ایک دوسرے کی مزاج پرسی انسان ہی کرتے ہیں۔ وہی ایک دوسرے کو سہارا دے سکتے ہیں۔ حکومتیں کبھی نہیں دے سکتیں۔ تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ چیز بتدریج کم ہو رہی ہے اور ہمیں ایسے مراکز کی اور ایسے ڈیروں کی ضرورت ہوتی ہے جہاں چاہے ہمیں تعلیم نہ ملے، جہاں چاہے ہم کو گرامر نہ سکھائی جائے، جہاں چاہے ہم کو درس نہ ملے، لیکن لوگوں کی نگریم ضرور ہو اور یہ نہ کیا جائے کہ یہ صاحب علم نہیں ہے اس لیے ہم عزت نہیں کرتے۔ ہم یہ کہیں گے، چونکہ یہ انسان ہے اور یہ حضرت آدم کی اولاد ہے اس لیے ہم اس کی عزت ضرور کریں۔“

گفتگو سے کام آگے بڑھتا نہیں ہے۔ صرف بحث کرنا، نقص نکالنا کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتا، جب تک کہ عملی طور پر اس کے حل کی کوشش نہ کی جائے۔ محض گفتگو کے جال ڈالنا اور اس کے مضمرات سے بے خبر بھی رہنا۔ اس باب میں ہمیں اس ضمن میں آگاہی اور عمل کی تحریک ملتی ہے۔

”مورلک کہنے لگا۔“ یہ ٹوسٹر کی زندگی جو ہے یہ کامیاب آدمی پیدا کرتی ہے اور سینک لگنے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کے اندر جو رویہ ہے وہ بڑا گڈی گڈی بڑا لے دے رہنے کا انداز ہے۔ ہاتھ ملتے رہتے ہیں، ڈٹ کر بتا نہیں سکتے کہ آپ پاکستانی ہیں اور آپ کا ایک فخر جیسا کیسا بھی فخر ہے۔“ تو میں نے کہا۔ ”بھئی! ہمارا کیا فخر ہے، ہم تو بالکل شرمندہ ہیں۔ مثلاً، ہم میں کیا خوبی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دنیا کی واحد قوم ہے جو بڑی مہمان نواز ہے۔ ٹھیک ہے! ہم غریب ہیں، چھوڑ رہے ہیں اپنی روایات، لیکن آپ سیالکوٹ جائیں، کہیں گے۔ جی! کھانا کھا کے جائیں۔“ ہمارے امریکہ میں نہیں ہے

ہالینڈ میں نہیں ہے، آپ اس پر فخر کر سکتے ہیں۔“ میں اور آپ اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس قسم کی مصیبت میں یا اس قسم کے عارضے میں مبتلا نہ کرنا، اگر ہمارے اوپر کبھی کوئی مشکل وقت آئے تو ہم وہاں سے بھاگ جائیں اور پھر اس کا ذکر نہ کریں کہ آتا ہے وقت اور پھر گزر جاتا ہے۔ بڑا انسان بننے کے لیے انسان کو وہ مثبت پہلو پیش کرنا چاہیے جو اس کی زندگی کے ساتھ چل رہا ہے۔“

”بعض اوقات کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ پشیمانی جو اس کی ہے وہ خود بڑی اچھی دعا بن جاتی ہے۔ کوئی شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کو مٹانے کے لیے وہ اللہ کے حضور میں اپنے تخیل میں جو لمحات میسر آتے ہیں اسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھ سے یہ تو اتنی ہو گئی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن دعا مانگنا مشکل یوں ہے کہ دعا مانگنے والا آدمی سب سے پہلے اپنی ذات کے آگے کھڑا ہو کے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میں نہایت نالائق، کم ظرف، جھوٹا، متکبر، کمینہ، گھٹیا آدمی ہوں، مجھ سے کوئی بات ہوئی ہے اور اب ان کو تاپیوں کو دور کرنے کے لیے ایک سہارا چاہ رہا ہوں اور اللہ کے واسطے مجھے سہارا عطا کیا جائے۔“

دعا۔ دل کا سہارا۔ دعا کریں کہ دعا کا سلیقہ ہمیں آجائے اور ہماری دعاؤں کو کبھی پکٹایا نہ جائے۔

”مگر آپ غور کریں گے تو مصائب اور مشکلات اتنی ہی شدید ہوتی ہیں جتنا کہ آپ نے ان کو بنادیا ہوتا ہے اور وہ آپ کی ساری زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں، ساری زندگی نہیں ہوتیں۔ بندہ یہ سمجھتا ہے کہ ساری کی ساری میری زندگی ہے اور وہ برباد ہو گئی، تباہ ہو گئی۔ تو جب مشکلات اور مصیبتیں آتی ہیں تو اگر آپ ان کو غور سے دیکھیں! کہ ان کا ایک حصہ بالکل ایک جھوٹا سا فریکشن آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن ہم نے وہ دھبا پھیلا کر اتنا وسیع تر کر لیا ہوتا ہے کہ پھر وہ ہمارے اختیار میں نہیں رہتا اور پھر وہ پھیلا ہوا دھبا ہمارا حکمران بن جاتا ہے اور جہاں جہاں چاہتا ہے ہم کو

اٹھائے پھرتا ہے۔“ انسان کا نکتہ نظر ہی اس کا طرز زندگی بن جاتا ہے اور یہ خیال کی بدولت ہے، تو جب کبھی زندگی میں منفی رویے در آنے لگیں تو ان کے پیچھے یہی خیال کی قوت کار فرما ہوتی ہے۔ گویا خیال ایک ایسی معمولی چیز نہیں کہ جسے بے لگام چھوڑنا، خالی از نتیجہ ٹھہرے۔

”اللہ میاں نے انسان کو ایک کیفیت دی جو دوسروں کو، کسی جان دار کو نہیں دی۔ انسان کا ایک وجود جو ہے وہ جسم ہی جسم نہیں ہے۔ اس کے اوپر ایک اور چوہارہ بھی ہے جو Intellect کا چوہارہ ہے۔ وہ چوہارہ جو آپ کو مجبور کرتا ہے کہ آپ سردیوں کی سخت رات کو ٹوٹی ہوئی پائیکل چلائے ہوئے نصرت فتح علی خان کا گانا سننے جائیں، وہ تقاضا ہے نا۔ بھینس کبھی بھی مشاعرہ نہیں سننے جاتی۔ شیر نے آج تک قولی میں شرکت نہیں کی، بندہ کرتا ہے۔ اس کی آرزو ہے جو مرضی کریں۔ یہ جو انٹلیکٹ ہے، ذہن کا چوہارہ، اس کے اوپر ایک اور ہے اور وہ روح کا چوہارہ ہے۔ وہ ہمارا بند پڑا ہے۔ گندی ٹوٹی پھوٹی پھوس اس میں پڑی ہے۔ پرانا ٹوٹا ہوا چرخا ہے۔ شیشے اس کمرے کے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ گندی اس کی مستقل بند ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی اوپر چڑھتا ہے اور وہ آواز دے کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کا ہے چوہارہ۔ تو نیچے سے آواز دیتی ہے کہ اپنا ہے، تو کہتا ہے اس کو کھولیں۔ وہ کہتی ہے نہ پت! دفعہ کر۔ اس میں گند پھوس بھرا ہوا ہے اس کو کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تو یہ ارادہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر چڑھنے والے انسان کا ہوتا ہے کہ آیا میں اس کو ٹھٹھی کو کھولوں یا نہ کھولوں۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔“

زندگی ہی وہ زر بے بدل ہے جس کے ذریعے ہم نظر آنے والی دنیا سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، قطرے سے سمندر ہو سکتے ہیں اور زندگی ہی وہ اصل سکھ ہے جو اگلی زندگی کا ہمیشہ باقی رہنے والا سرمایہ خرید سکتی ہے۔ زندگی کی قدر و قیمت، خالق کائنات سے محبت کی

جسٹو، موجود مسائل سے نبرد آزما ہونے کی قوت، دعا اور عقیدے کی طاقت، نظر کو ایک مختلف سمت اور خیال کو نئی جہت عطا کرنے والی کتاب پڑھنے کا تجربہ کچھ نیا سیکھنے اور جاننے کی سرشاری سے لبریز ہے۔ جو ہمارے ذہنوں کو پیدا کردہ جھوٹ موٹ کے مسائل کی گرہ اس سہولت سے کھول دیتا ہے کہ مدتوں سے سوچ کے بند کواڑ کھول کر یقین، محبت اور عمل کی روشنی ذہن کو منور کر دیتی ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اشفاق صاحب کے اس احسان کے بدلے ان کے ساتھ معاملات میں آسانیاں ہی آسانیاں عطا کرے۔ (آمین)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم
قیمت 250 روپے
مریم عزیز

ٹنگے پاؤں
قیمت 250 روپے
نگہت سیما

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37، اردو بازار، کراچی

سمیرا گل ہمراہ محمد عثمان

آسیہ منیر

تھے۔ آخر جیت محبت کی ہی ہوئی۔ ہمارے عثمان بھائی میں کوئی کمی نہیں۔ خوب صورت، شریف، باکردار، پڑھے لکھے، مہذب، اعلا سوچ کے حامل، غرض تمام خوبیوں سے لیس ہیں۔ بس مسئلہ ذات برادری کا تھا اور سمیرا جیسی روشن خیال لڑکی محض ذات برادری کے چکر میں الجھ کر محبت قربان نہیں کر سکتی تھی۔

”دس منٹ میں آرہے ہیں۔ میرے گھر والے۔“ عثمان بھائی اطلاع دے چکے تھے۔ میں اٹھ کر گھر بھاگی۔ نیا جوڑا استری کیا۔ میک اپ تھوپ کر واپس لوٹی تو مہمان آچکے تھے۔

سمیع باجی کے ساتھ مل کر میں نے کھانا لگوایا۔ غرض ان کی خاطر رات میں لگی رہی۔ سمیرا کھڑکی سے مجھے بار بار اشارہ کر رہی تھی۔ پھر مجھے ترس آگیا اور میں نے جا کر بتایا۔

”مبارک ہو! مورخہ بیس اپریل شام سات بجے آپ کو رخصت کر دیا جائے گا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلما گئے۔ ایک ایک دن ہم تینوں نے گن گن کر گزارا۔ اس دوران شاپنگ اور شادی کی تیاریوں میں بھی بہت مصروف رہے۔

شادی سے تین روز قبل عثمان بھائی کے گھر والوں نے ڈھولک رکھ لی تھی۔ ان کے اور ہمارے گھر میں دو گھر جاملے ہیں۔ میں روز تک سک سے تیار ہو کر ڈھولک بجانے چلی جاتی تھی۔

انیس اپریل کو عثمان بھائی کی مہندی تھی۔ سفید شلوار سوٹ پر پیلا دھڑاگلے میں ڈالے، ہلکا ہلکا بڑھی

پہلے میں آپ کو اپنا تعارف کروا دوں۔ میں ہوں آسیہ منیر، سمیرا گل کی بیسٹ فرینڈ۔ میرے اور سمیرا کے گھر کے بیچ محض ایک دیوار ہے۔ ہماری دوستی تین سال کی ہوئی تو عثمان بھائی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح میں اور سمیرا پندرہ سال کے سا بھی ہیں۔ جب کہ عثمان بھائی اور ہمارا ساتھ بارہ سال پرانا ہے۔ ہمارا بچپن ایک ساتھ کھیلتے اور شرارتیں کرتے ہوئے گزرا ہے۔ ہماری اس تکیوں میں دو لوگوں کی دوستی محبت میں بدل گئی۔

جی! آپ بھیک سمجھے یہ ان کی لومیرج ہے اور میں اس محبت کی روزاول سے اکلوتی گواہ، بلکہ نامہ برجوبھی سمجھ لیں۔

یہ اٹھائیس مارچ کی بات ہے۔ میں دروازے میں کھڑی تھی۔ باجی سمیع نے مجھے آواز دے کر بلایا اور ایسی خبر سنائی کہ مجھے اچھلنے پہ مجبور کر دیا۔

عثمان بھائی کے گھر والے شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آرہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بھنگڑے ڈالوں۔ خوشی ہی اس قدر تھی۔ ان کو دروازے میں چھوڑ کر میں اندر بھاگی۔

محترمہ بچن میں بیٹھی شامی کباب کی ٹکیاں بنا رہی تھیں اور چہرہ خوشی سے لال گلابی ہو رہا تھا۔ ہاتھ الگ کانپ رہے تھے۔ گھنٹہ بھر بیٹھ کر ہم نے کام نبھانے کے ساتھ ساتھ خوب باتیں کیں۔ ماضی کی باتیں، بچپن کے قصے وہ بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

”آسیہ! کیا سچ میں وہ لوگ آرہے ہیں۔“ دونوں ہی اپنے اپنے محاذوں پر خوب ڈٹ کر لڑے

ہوئی شیو میں وہ خاصے بچ رہے تھے۔ سب نے انہیں مہندی لگائی۔ گانے گائے لڑکوں نے ڈانس کیا۔

سمیرا کے گھر ایسا کچھ اہتمام نہ تھا۔ ہم نے رات بجا بجا کر گانے گائے۔ اس کے تیل لگایا۔ پھر شام کو اس کے مہندی لگائی۔ ساتھ ساتھ ہسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی چل رہی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ چھت پر جا کر عثمان بھائی کو دیکھ آئے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔

اگلے روز بارات تھی۔ اس روز سمیرا نے سرخ عروسی لہنگا پہنا تھا۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

پانچ بجے بارات کا نام تھا مگر حسب روایت وہ سات بجے آئی۔ ہم پھولوں کی پلیٹیں لیے استقبال پہ کھڑے تھے۔ دولہا صاحب نے گلی میں قدم رکھا اور لائٹ داغ مفارقت دے گئی۔ سخت غصہ آیا۔ واپڈا والوں کو کوستے ہوئے جزیئر آن کرنے گئے۔ دو جزیئر تھے لیکن عین موقع پہ ایک بھی نہ چل کر دیا۔ سخت کوفت ہوئی۔ ایک تو گرمی اس پہ یہ لوڈ شیڈنگ۔

بارات اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچی۔ سمیرا نے سادگی پہ زور دیا تھا، شو شادی سادگی سے ہو رہی تھی۔ عثمان بھائی بلیک تھری پیس میں سمیرا سے زیادہ پیارے لگ رہے تھے۔ سب نے ہی دولہا کو خوب خوب سراہا۔

اس کے بعد نکاح ہوا۔ اس لمحے ان دونوں کے جو تاثرات تھے وہ میں بیان کرنے سے یوں قاصر ہوں کہ بارہا پوچھنے پر بھی دونوں نے کچھ اگل کر نہ دیا۔ ہمارے عثمان بھائی ڈانیا لاگ بازی میں ماہر ہیں لیکن اس بارے میں انہوں نے بھی منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔

کچھ دیر بعد رخصتی کا شور اٹھ گیا۔ قرآن کے سائے اور بزرگوں کی دعاؤں کے حصار میں وہ رخصت ہوئی۔ ایک گھنٹے بعد میں اور باجی شمع پڑا، میک اپ اور مٹھائی لے کر ان کے پیچھے پہنچ گئے۔ تب تک ان کا فوٹو شوٹ ہو چکا تھا اور مختلف رسموں کے



بعد انہیں جگہ عروسی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ بڑی نزاکت کے ساتھ کچھ سمٹ کر شرماتے ہوئے تازہ پھولوں کے درمیان مسہری پہ بیٹھی تھی۔ اور عثمان بھائی بہنوں کے نرغے میں پھنسے نیگ دے رہے تھے۔

ناشتا لے جانے میں بھی میں پیش پیش تھی۔ جب سب لوگ ناشتا کر رہے تھے تو میں اس کے کان میں گھسی پوچھ رہی تھی کہ عثمان بھائی نے کیسے تعریف کی تھی۔ تھوڑی بہت شاعری تو وہ کرتے ہی ہیں۔ میں نے سوچا ایک آدھ غزل تو کہہ ہی دی ہوگی، لیکن جناب! انہوں نے بس اتنا کہا۔

”اپسرا لگ رہی ہو۔“ خیر قصیدہ گوئی تو اب وہ عمر بھر کرتے ہی رہیں گے۔ دوسرے ہی دن شام کو ولیمہ تھا اور اس روز سمیرا نے ہلکے فیروزی رنگ کا لہنگا پہنا تھا اور کل کی نسبت وہ آج زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی بلکہ دونوں ساتھ ساتھ اتنے حسین اور خوب صورت لگ رہے تھے کہ میرے دل سے بار بار دعا نکل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش و خرم اور آباد رکھے۔ زندگی کا یہ نیا سفر انہیں بہت بہت مبارک ہو آمین۔



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوتی ہے اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ ”دل کو مارے بغیر نور نہیں ملتا“ کیا خوب صورت بات بتائی ہے آپ نے ہمیں نمبر جی! اب بات کروں گی سائرہ رضا کے ناول کی۔ سائرہ رضاتو بہت جلد میری فیورٹ رائٹرز میں شامل ہو گئی ہیں۔ اس قدر زبردست، منفرد سا انداز ہے ان کے لکھنے کا اور اتنے ہی زبردست ان کے اس ناول کے کردار۔ الفت جیسا کردار... میں نے ایک بار نہیں، دو، تین بار اس ناول کو پڑھا اور ہر بار الفت کے بارے میں پڑھ کر یہی سوچا کہ انسان کے بارے میں جو کچھ رب تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے، وہ کس قدر سچ ہے۔ جلد باز، ناشکرا، جھگڑالو، ظالم، بے راہ روی... جسے اللہ کی ہدایت نہ ملے، وہ پھر الفت جیسا ہی ہوتا ہے۔ اور اللہ بھی انہیں ہی ہدایت دیتا ہے جو اس کی ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، جو توبہ کرتے ہیں، اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ اکمل اور اظہر جیسے... جن کے دل پھلتے ہیں... لیکن الفت جیسے جن کے دل و دماغ پر مہر لگ چکی ہو۔ اس کے دل تک وہ روشنی پہنچ ہی نہ پائی... وہ اندھیرے میں بند، خود کو عقل کل سمجھنے والی دنیا کی ٹھوکروں کے باوجود نہ بدلنے والی اور الفت کا دل بھی نہیں مانتا تھا افضل سعید کو کوئی رتبہ، کوئی عزت دینے کو... جس کے لیے دل مانا، اس کے لیے پھر اس نے بھیک بھی مانگ لی۔ میری سمجھ میں تو یہی آیا ہے... دل کی مانتے چلے جاؤ بلا جوں و چرا تو حاصل ”لفت“ کے انجام جیسا ہوتا ہے اور اگر دل کو مار کر جھکا کر اس سے باتیں منوائو تو حاصل ”تمکنت بیک“ جیسا ہوتا ہے۔ موسم کے پکوان بھی اچھے

لگے۔ ایک مشورہ ہے آپ کے لیے۔ اگر کھانوں کی ترکیب کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت ان کی غذائیت اور غذائی اجزاء کے بارے میں بتادیا جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ ج: پیاری یا سمین! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ بہت اچھا تبصرہ کیا آپ نے۔ ہمارے دفتر کے فون خراب ہیں، آپ اپنا فون نمبر بھجوادیں، ہم فون کر کے آپ کے افسانوں کے بارے میں بتادیں گے۔

مدیحہ جاوید نے سرگودھا سے لکھا ہے

اگست کا شمار کمال کا تھا۔ سرورق پہ ماڈل کا انداز بہت اچھا لگا۔ نمبر جی! آپ نے تو قلم اٹھا نے یہ مجبور کر دیا۔ کوئی اتنا اچھا کیسے لکھ سکتا ہے؟ اب آتے ہیں فائزہ جی کی طرف۔ کمال کر دیا آپ نے فائزہ جی بویل ڈن۔ میثا کا کردار اور رومان کے مذاق دل کو بھائے، ویسے یہ کہانی کس شہر کے بارے میں ہے؟ مطلب یہ جگہیں اور نام پاکستان کے نہیں لگتے۔ (کرداروں کے نام) دل، موم کا دیا، کہانی کچھ دل کو نہیں لگی۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔ عازنہ خان کا انٹرویو بھی پسند آیا۔ شاہین جی سے درخواست ہے کہ FM 96 کے ڈی جے مبشر خان کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔ ماہرہ، نواد خان اور حنا دل پذیر کا انٹرویو بھی پبلیز شائع کریں۔

ج: مدیحہ! ہمیں افسوس ہے، دل موم کا دیا آپ کے دل کو نہیں لگی۔ یہ تھوڑی سی مختلف انداز کی کہانی تھی اور ایک کردار پر لکھی گئی تھی۔ آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

تنزل زہرہ نے شہدادپور سے لکھا ہے

سرورق قابل تعریف تھا۔ فہرست میں ام طیفور کا نام

پڑھ کر ذہن میں فوراً ”جھماکا ہوا کہ یہ تو وہی رائٹر ہیں“ جنہوں نے ”نکی جی جنج“ لکھ کر قارئین کو کافی متاثر کیا تھا۔ ”دیدہ مینا“ سیاہ تحریر تھی، لیکن پڑھتے ہوئے مزا آرہا تھا۔ سائرہ ضاکی تحریر ”دل، موم کا دیا“ میں الفت کا کردار منفی سہی، لیکن اس کی بے لگام زبان نے جو وقت بے وقت پھاڑ پھاڑیاں چھوڑیں تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ”ستارہ شام“ اب دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ افسانے بلاشبہ اس بار بہترین تھے۔ ”دو ٹکے کا آدمی“ کنیز نبوی جی کی ایک پراثر تحریر تھی۔ ان کی تحریر ہمیشہ دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اتنے ماہ سے وہ صرف افسانے لکھ رہی ہیں، کوئی ناول کیوں نہیں لکھتیں؟ ”وہ محتسب ہے“ ام مریم کے افسانے کا پلاٹ کچھ پرانا لگا۔ سمیرا حمید کی تحریر ”بھیل ختم“ بھی اپنی طرز کی ایک منفرد تحریر تھی۔ ”ایک نئی سنڈریلا“ میں میثا کا ماز کو سرچڑھانے کے بجائے نظر انداز کرنا اچھا لگا۔

ج: تنزل! کنیز نبوی سے ہر بار فون پر ہم بھی یہی پوچھتے ہیں کہ مکمل ناول کیوں نہیں لکھتیں؟ اور ان کا عذر ہر بار یہی ہوتا ہے کہ فرصت نہیں ملتی۔ شفا ابھی بہت چھوٹی ہے، اس کے کام ہوتے ہیں۔ افسانہ بھی ہم نے شدید اصرار کر کے لکھوایا ہے۔

عالیہ بتول لکھتی ہیں

جولائی کا شمار کافی اچھا تھا۔ لیکن رمضان اور عید کی مصروفیت کی وجہ سے لیٹر نہیں لکھ پائی۔ کہانی لکھی تھی اس کے بارے میں بتادیں۔ نمبر احمد کا ناول بہت پراسرار ہے۔ ان کی کہانی میں مزا آرہا ہے۔ عالیہ بخاری کے کیا کہنے۔ کافی دلچسپ ہو گیا۔ ”دیوار شب“ آپا گل جیسے افراد نہ جانے کب ٹھیک ہوں۔ ”ستارہ شام“ میں مزا نہیں

اعتذار

آمنہ ریاض کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے، ان کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوئی ہے۔ وہ ایک بیٹی کی والدہ محترمہ بن گئی ہیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے ان کو دلی مبارکباد اور ان کی پیاری بیٹی کے لیے دعائیں۔

اسی وجہ سے آمنہ ریاض اس ماہ ”ستارہ شام“ کی قسط نہیں لکھ پائیں، ان شاء اللہ آئندہ ماہ ان کے ناول کی قسط شامل ہوگی۔

آ رہا۔ سارہ رضا کا دل موم کا دیا بہت اچھا تھا۔ لیکن ایسی عورتیں کہاں ہوتی ہیں ہم نے تو آج تک نہ دیکھیں۔ فائزہ افتخار کی سنڈریلا کسی کام کی نہیں، مطلب میٹھا کا کردار اچھا نہیں، البتہ رومان دلچسپ ہے۔ ام طیفور اور ام مریم فرح طاہر کے افسانے اچھے تھے۔

ج: پیاری عالیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے آپ کی کہانی شائع نہیں ہو سکتی آپ محنت کر کے مزید لکھیں۔

شہناز گل، شمیمہ احمدی۔ تحصیل علی پور قادرہ نالہ بستی نرالی والدہ سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

شعاع بہت ہی خوب صورت اور معیاری رسالہ ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ خاص طور پر ماڈل کا لباس اور ایر رنگ بہت اچھے تھے۔ جس تحریر نے

مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے نمرہ احمد کا ”جنت کے پتے“ میرا اندازہ ہے کہ جہان سکندر ہی عبدالرحمن پاشا کا سو کاڈ بھائی ہے۔ اب ہم اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دیتے ہیں۔ ہم ضلع مظفر گڑھ تحصیل علی پور موضع علی والی قادرہ نالہ بستی نرالی والا میں رہتے ہیں۔ میرا نام شمیمہ احمد ہے۔ میں نے اسکول آٹھ تک پڑھا ہے اور شہناز میری کزن ہے۔ اس نے پوری پانچ کلاس پڑھی ہیں۔ میں اپنے گاؤں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ ہمارے گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ آپنی نوک سگر شفاء اللہ خا روکھڑی کا انٹرویو ضرور شائع کیجئے۔

ج: شہناز اور شمیمہ خط لکھنے کا شکریہ، آپ کی لکھائی بہت خوب صورت ہے، بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

صائمہ فیاض لاہ۔ بھانڈال قصور سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

میرے ضلع کا نام قصور ہے، لیکن ہم رہتے بھانڈال کے قریب ہیں۔ وہاں ہماری زمین ہے۔ ہمارے شہر کا نام رادھا کشن ہے۔ ہمارے گھر کے پاس تین نہریں بہتی ہیں۔ میں آٹھ سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ ہم دو بہنیں اور پانچ بھائی ہیں۔

اب بات ہو جائے تبصرے کے رسالے کو جو پڑھ کر میں نے اپنی کزن کے پاس بھیج دیا ہے۔ سب سے پہلے جنت کے پتے پڑھا۔ واہ کیا شان دار اسٹوری ہے۔ فائزہ ہمیشہ ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے میٹھا اور مائر کے کردار بہت پسند ہیں۔ ”ستارہ شام“ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ میری بہن کو دل موم کا دیا اچھی لگی۔ میری بہن نے اسکول میں نہیں پڑھا۔ لیکن رسالے پڑھ کر اس نے اردو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ پہلے میں کہانیاں سناتی تھی۔ اب خود پڑھتی ہے، ہمارے گھر فی وی نہیں ہے۔

ج: پیاری صائمہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی بہن ماشاء اللہ اتنی ذہین ہے کہ اس نے رسالے پڑھ کر اردو پڑھنا سیکھ لیا ہے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنی رہیں گی۔

عثمان پورہ ملتان سے صدف ناز انصاری لکھتی ہیں بے شمار اخبارات، میگزین اور ڈائجسٹ پڑھے، لیکن شعاع کا معیار سب سے اعلا و منفرد پایا۔ آپنی میری عمر 16 سال ہے۔ گزشتہ ساڑھے تین سال سے شعاع زیر مطالعہ ہے۔ علاوہ ازیں کم و بیش اتنے ہی عرصے سے بچوں کے ادب سے منسلک ہوں اور متعدد تحاریر تخلیق کر چکی ہوں۔ مزید برآں اسی شعبے میں سینئر لکھاری کے اعزاز میں ایوارڈز جیت چکی ہوں۔ حال ہی میں ماہ رمضان کے موقع پر مقامی آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقدہ تقریری مقابلہ میں پہلی پوزیشن بھی حاصل کی ہے۔

ج: پیاری صدف! کامیابیوں پر ہماری جانب سے دلی مبارک باد۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کنزہ نقوی نے شہد اوپور سے لکھا ہے

ستمبر کا شمارہ ہاتھ آیا۔ ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی۔ خاص کر اس کے سوٹ کا ڈیزائن بہت زبردست لگا۔ ”جنت کے پتے“ بہترین ناول ہے۔ جہان عبدالرحمن پاشا کا بھائی ہے یہ جان کر کافی حیرت ہوئی۔ آمنہ ریاض کا

”ستارہ شام“ بھی بہترین جا رہا ہے۔ اس بار صفحات بھی زیادہ تھے۔ اس کے بعد بات کرتے ہیں ”اک نئی سنڈریلا“ کی۔ واقعی فائزہ افتخار جی آپ کی سنڈریلا بہت ہی کیوٹ ہے۔ ہم میٹھا کی شرارتیں بہت انجوائے کرتے ہیں اور اس بار پلیز ”ہم سفر“ کی مائرہ خان کا تفصیلی انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج: آپ کا پچھلا خط شائع نہ ہو سکا۔ اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ مائرہ بہت اچھی اداکارہ ہیں۔ اگر انہوں نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

فتح پور ضلع لیرا سے اقراء عروج نے لکھا ہے

زبردست، زبردست، خوب صورت فراک والی ماڈل۔ سنڈریلا فائزہ افتخار تو ہمیں بچپن میں ہی لے گئیں۔ دیدہ بینا ام طیفور نے جس طرح لکھی ہے یہ کہانی بھی بہت زبردست۔ الفت کا کردار بہت عجیب تھا۔ آگ نہ سمجھ میں آنے والی لڑکی، مگر تھی بہت اچھی۔ ایک بات اس کی اچھی لگی کہ دینا ہے دو، نہیں دینا تو نہ دو، کہیں اور سے تول ہی جائے گا۔ کھیل ختم، سمیرا حمید نے اچھا افسانہ لکھا ہے۔ شاعری سچ بولتی ہے واقعی۔

ج: پیاری اقراء! شعاع پسند آیا، بہت شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ الفت کا کردار واقعی عجیب و غریب تھا اور دلچسپ بھی لیکن حقیقی زندگی میں یہ کردار اپنے متعلقین کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایک عورت جو گھر کی بنیاد ہوتی ہے اس کی ذرا سی غلطی پورا گھر تباہ کر دیتی ہے۔

مقدس اور حنا صدف نے لکھن وال گجرات سے شرکت کی، لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل کا اسٹائل متاثر کن تھا۔ نمرہ احمد اور فائزہ افتخار بڑے اچھے طریقے سے ناولٹ خوب صورت کلمات کے ساتھ بڑھا رہی ہیں۔ کنیز نبوی اپنے نصیحت سے بھرپور افسانوں کے ساتھ ہمیشہ شعاع کی جان رہی ہیں۔ ایسا نہیں کہ باقی افسانے اچھے نہیں تھے، بلکہ سب اپنی اپنی جگہ اچھے تھے۔ اب اپنے گاؤں کا احوال۔

لکھن رام، بہل تین ہندو بھائی تھے۔ جن کا اتفاق بے مثال تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے اتفاق کی بنا پر ہمارے گاؤں کا نام لکھن وال اور ساتھ والے دونوں گاؤں کا نام راملے اور بہل پور رکھ دیا گیا۔ باقی دونوں گاؤں

چھوٹے ہیں، مگر لکھن وال بڑا ہے۔ اس کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور لکھن وال کلاں اور خورد کا نام دیا گیا ہے۔ کلاں رہنے کے لحاظ سے اور خورد آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔ ویسے دونوں گاؤں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہاں گورنمنٹ بوائز، گرلز ہائی اسکول ہیں جہاں پر دور دراز کے علاقوں کے لوگ اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ الغرض ضروریات زندگی کی ہر آسائش موجود ہے۔ تازہ ہوا اور تازہ سبزیوں کے ساتھ گاؤں کی شہرت یہاں پر موجود درباروں کی وجہ سے بھی ہے۔ لیکن شعاع جلال پور جٹاں (شہر) سے لانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں اسپتال، گیس اور واٹر سپلائی کی سہولت موجود ہے۔

ج: مقدس! اور حنا! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے گاؤں میں ساری سہولیات مہیا ہیں۔ خصوصاً ”تعلیم کے لیے اسکول اور علاج معالجہ کے لیے اسپتال کی سہولت“ ورنہ ہمارے ہاں بڑے شہروں میں تو قدم قدم پر اسکول اور اسپتال ہیں، لیکن گاؤں کی بہتری کی طرف نہ حکومت توجہ دیتی ہے نہ وہاں کے منتخب نمائندوں کو خیال آتا ہے۔ خصوصاً ”سندھ کا تو بہت برا حال ہے۔“

تحسین فاطمہ نے چک 13 ماڑی کسووال سے لکھا ہے

”جنت کے پتے“ نمرہ احمد کی تو کیا بات کرنی بہت لا جواب تحریریں ہوتی ہیں ان کی خواتین میں مصحف نے بہت متاثر کیا اور اب ”جنت کے پتے“ بھی بہت متاثر کر رہا ہے۔ حیا کی تبدیلی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ کیونکہ ہم لڑکیاں اکثر ہیروئن کی کاپی کرنا پسند کرتی ہیں۔ بہت اصلاح ہوتی ہے اس طرح لڑکیوں کی۔ اس کے بعد فائزہ کے ناولٹ کی طرف گئے تو بے پایاں خوشی ہوئی۔ جب رومان اور میٹھا گفتگو کرتے ہیں تو چہرے سے مسکراہٹ جاتی ہی نہیں۔ سارہ رضا کا مکمل ناول بھی بہت اچھا تھا۔ افسانے میں ”کھیل ختم“ وہ مختصراً ”پسند آئے۔“ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ”دیوار شب“ بھی بہترین ناول ہے۔ ”ستارہ شام“ بھی زبردست ہے۔ ام طیفور کا ناولٹ بھی ٹھیک تھا۔

ج: تحسین شازیہ چودھری کی وفات مئی 2004ء میں ہوئی تھی۔ جس ناول کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔

وہ کتابی شکل میں آچکا ہے۔ مکتبہ عمران ڈائجسٹ سے مل سکتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عفیر اصغر، صبیحہ ارشد گاؤں چھو کر خورد ضلع گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شاعر نے یہ فقرہ یقیناً ”میرے لیے ہی لکھا ہے کہ“ ہمیشہ در کر دیتا ہوں میں، بہت دفعہ دل چاہا کہ خط لکھا جائے اور لکھے بھی بہت، لیکن وہی ازلی سستی آڑے آتی رہی۔

سرورق پر ماڈل کا لباس بہت زبردست تھا۔ اسی طرح کے مکمل لباس دیا کریں، اچھا لگتا ہے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح نمرہ احمد بازی لے گئیں۔ میں ہر دفعہ ان کی تحریر پڑھ کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ سائرہ رضا بہت اچھا اضافہ ثابت ہوئی ہیں۔ سلسلے دار ناول ہمیشہ کی طرح اچھے لگے۔ ہاں فائزہ افتخار کی کہانی میں ان کا مخصوص انداز کہیں گم ہے۔ ان کا وہ بے ساختہ پن کہیں مفقود ہے جو ان کا خاصہ رہا ہے۔ کینز نوی کا افسانہ بالکل سچائی پہ مبنی تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح منفرد لکھا۔

ج عفیر اور صبیحہ! آپ نے اس بار سستی کو بالائے طاق رکھ کر ہمیں خط لکھ ہی دیا۔ بہت اچھا لگا۔ اب اس سستی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں اور ہر ماہ ہمیں خط لکھیں اور شعاع کے دیگر سلسلوں میں بھی شرکت کریں۔

عروج انجم نے ہیڈ فقیروں پر پنجاب سے لکھا ہے

نمرہ احمد کا ناول بہت تجسس لیے ہوئے ہے۔ نعمیہ ناز سے کہیں ناکہ نالی کے محاوروں اور نصیحتوں والے ناول لکھیں۔ نالی کے نت نئے محاورے جو دراصل پرانے مگر متروک ہونے کے باعث نئے لگتے ہیں، ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔

ج پیاری عروج! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا بھیجا ہوا لطیفہ کسی اور نام سے شائع ہو گیا۔ آئندہ خیال رکھیں گے نعمیہ ناز شادی کے بعد گھرواری کے جھمیلوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ ہمیں بھی ان کا وہ پرانا انداز بہت پسند ہے اور شدت سے ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے ہیں۔

صبار شید بھی نے پرور ضلع سیالکوٹ سے شرکت کی

ہے

خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق سات سال پرانا ہے اور ہر گزرتا دن اس تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کر رہا ہے۔ اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر نمرہ کو مبارک باد۔ نمرہ آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ جہان سکندر، عبد الرحمن پاشا کا بھائی ہے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پہلی کا جواب جان کر تو بے ساختہ نمرہ کو داد دینے کو دل چاہا۔ ویری گڈ۔ فائزہ کی باقی تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی زبردست ہے۔ ”ستارہ شام“ اور ”دیوار شب“ بہت اچھے جا رہے ہیں۔ ”دل موم کا دیا“ سائرہ رضا کی ایک اچھی کاوش تھی۔ افسانے تو سب ہی لا جواب تھے، لیکن کینز نوی بازی لے گئیں۔ ایک فرمائش کرنا چاہوں گی کہ 90ء کی دہائی کی یادگار تحاریر کو دوبارہ شائع کیا جائے۔

ج پیاری صبا! 90ء کی دہائی کی خوب صورت اور یادگار تحریروں شائع کرنے کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ ضرور پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سائرہ بخٹوار، تمینہ، تمینہ اینڈ رفعت گاؤں ملتان والی تحصیل و ضلع ملتان سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

اس ماہ کا ناول ہمیں بہت پسند آیا ہے۔ یہ خط لکھنے کی اصل وجہ نمرہ احمد کا مکمل ناول ”جنت کے پتے“ اور فائزہ افتخار کا ناول ”اک نئی سنڈریلا“ ہے۔ یہ دونوں ناول اتنے اچھے ہیں کہ ہمارے پاس ان کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔ افسانوں میں سب سے زیادہ اچھا افسانہ ”دو ٹکے کا آدمی“ اور ”وہ محتسب ہے“ ہے۔ مکمل ناول ”دل موم کا دیا“ سائرہ رضائے اچھا لکھا۔ ناولٹ ”دیدہ بیٹا“ ام طیفور کی اچھی کاوش تھی۔ مستقل سلسلوں میں ہمیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ ”شاعری سچ بولتی ہے“ اور ”تاریخ کے جھروکوں سے“ ہمیں بہت پسند ہے۔ براہ کرم ان کا سلسلہ جاری رکھیں۔ براہ کرم ایف ایم (ملتان) 101 کے R.J آصف نور کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج سائرہ بخٹوار، تمینہ، تمینہ اور رفعت! آپ پچھلے دس سال سے شعاع کی قاری ہیں۔ اتنی طویل خاموشی کیوں؟ یہ تو بہت زیادتی ہے۔ ہمارے ساتھ کہ اتنا طویل عرصہ ہم آپ کی رائے نہ جان سکے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط

لکھتی رہیے گا۔

شائستہ یاسمین اور شگفتہ یاسمین کراچی سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

نبیلہ ابرار راجہ اور نبیلہ عزیز کہاں ہیں بھی اور فائزہ جی کیا کہوں۔ دل تو کر رہا ہے کہ ان کے ہاتھوں کو جوم لوں۔ اور ہاں نمرہ جی آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔ ایک گزارش ہے کہ بھیجی جی اور جہان کو الگ نہیں کیجئے گا۔ ہاں سب سے اہم بات تو بتائی نہیں نائل گرل اتنی پیاری اور اس کے پیچھے کا منظر توفیق۔

ج شائستہ اور شگفتہ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نبیلہ عزیز کی تحریر آپ جلد ہی پڑھ سکیں گی۔ آپ کی چچی 95ء سے باقاعدگی سے شعاع پڑھ رہی ہیں۔ ہماری جانب سے ان کا شکریہ بھی ادا کر دیں۔

حنا سلیم اعوان گاؤں آخون باندی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

ماڈل کے بیک گراؤنڈ میں ڈوبتے سورج کا پانی میں جھللاتا عکس اک پل کو مبہوت سا کر گیا۔ ”جنت کے پتے“ جس قدر منفرد، انوکھے اور چونکا دینے والے نائل نمرہ اپنی کہانیوں کے لیے چنتی ہیں کہانی کے کردار بھی اس سے بڑھ کر خوب صورت ہوتے ہیں۔ چمک دار لمبے بالوں اور نرم و ملائم جلد والی حنا سلیمان سے ہمیں سچے سچ عشق ہو گیا ہے۔ ”دیوار شب“ میں آبا گل اور سلمان کی بے حسی اور خود غرضی پر بہت دکھ ہوا۔ کیا کوئی بہن اپنی سگی بہن کے لیے بھی جانے بوجھے گڑھا کھود سکتی ہے؟ ”ستارہ شام“ انتہائی دلچسپ موڈ پر آن ٹھہرا ہے۔ ”دل موم کا دیا“ سائرہ رضائے بہت عمدہ تحریر کیا ہے۔ باقی سب ہی سلسلے اور تحریروں میں ایک دم پرفیکٹ تھیں۔ عائشہ گل کیا وہی ہیں جنہوں نے فلم ”تیرے پیار میں“ کام کیا تھا؟ آپ کی بندھن سلسلے میں اب ابرار الحق کو بھی بلوا لیجئے۔ آپ سے ریڈیو کے ڈی جے ز کے انٹرویوز کی فرمائش کی تھی۔ جواب بھی تک پوری نہیں ہوئی۔ پلیز 101 کراچی کے عدیل عباسی اور انس کے عباسی کے انٹرویوز لیں جلد از جلد۔ آپ کی نادیہ جہانگیر کی کوئی بہن مریم جہانگیر کالم لکھتی ہیں؟ جہاں پیاری حنا عائشہ گل نے فلم میں کام نہیں کیا۔ نادیہ جہانگیر کی کوئی بہن کالم نہیں لکھتی ہیں۔

حوریہ خان نے کراچی سے لکھا ہے

شعاع حسب معمول 3 تاریخ کو مل گیا۔ نائل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ (میری طرح) نائل کے بعد سب سے پہلے نمرہ احمد کے شاہکار ”جنت کے پتے“ کی طرف دوڑی۔ اللہ کرے بس جہان اور حنا ساتھ رہیں۔ (آمین) اس کے بعد ”اک نئی سنڈریلا“ پڑھا۔ واؤ بہت ہی اچھی کہانی، ہمیشہ کی طرح فائزہ افتخار نے کچھ الگ لکھا ہے۔ خصوصاً ”یشا کی کیوٹ باتیں بہت ہنسی آتی ہے پڑھ کر۔ ”دیوار شب“ میں کہانی کچھ آگے بڑھی ہے۔ اچھی قسط تھی۔ ”ستارہ شام“ ست روی کا شکار ہے۔ پلیز اس کے صفحات تھوڑے بڑھائیں۔ افسانوں میں ”بھیل ختم“ بہت اچھا لگا۔ حقیقت پر مبنی تھا۔ ”وہ محتسب ہے“ بھی اپنے آس پاس کی ہی کہانی لگی حقیقت سے قریب۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول ”دل موم کا دیا“ ناول اچھا تھا۔ مگر کہانی کا پلاٹ تھوڑا پرانا لگا۔ مگر مکالمے الفاظ کا چناؤ وغیرہ نے بے حد متاثر کیا۔ اس کے علاوہ بھی باقی تمام سلسلے بہت ہی اچھے لگے۔

ج پیاری حوریہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کشمالہ گل اور مہرین گل نے کراچی سے لکھا ہے

”دیوار شب“ میں کچھ خاص تغیر نہ ہوا۔ ”ستارہ شام“ بھی یوں ہی رہا، بس اینڈ پر سسپنس تھا۔ ”جنت کے پتے“ رلا بھی گیا اور اچھا بھی گیا۔ جہان تو تبین پھپھو کا بیٹا ہے۔ وہ تو پاشا کا بھائی نہیں ہو سکتا ہے۔ کہیں بھیجتا تو نہیں اور یہ ولید کی گھٹیا حرکات دل چاہا سر توڑ دوں، اس کا رف والے فیصلے اور منگنی کی رسم پر دل کھل اٹھا۔ ”اک نئی سنڈریلا“ فائزہ آپ نے تو بوکھلادیا ہے۔ کبھی دل مار کے حق میں ووٹ دیتا ہے تو کبھی رومان کے فیور میں فائزہ آپ کی جادو کے زور سے رومان کو بھی دولت مند بنا دیں اور پھر میٹھا کا اس کے ساتھ کپل بنادیں۔

فائزہ جی ایک عدد جادوئی منتر مجھے بھی مدیران شعاع کے دل کو تسخیر کرنے کا سکھا دیں

تحریریں شائع ہونے کے لیے جادوئی منتر کی نہیں محنت کی ضرورت ہے

رابعہ انور نے گاؤں آندھالو ضلع بدین سے لکھا ہے

ٹائٹل پہ بھی ماڈل بہت کیوٹ لگی۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں تو ہوتی ہیں پیاری ہیں۔ ”جنت کے پتے“ کہانی اچھی جا رہی ہے۔ نمبر جی نیپکسٹ قسط میں یہ مت لکھے گا جہان اور پاشا دونوں بھائی ہیں دونوں ایک میلے میں گم ہو گئے تھے۔ افسانوں میں کنیز نبوی کا افسانہ بہت بہت ہی اچھا لگا۔ کنیز ادی تو ہاں نہ اکیون ہی گریٹ ناولٹ بھی دونوں اچھے تھے، لیکن فائزہ آپ کی بات ہی الگ ہے۔

نئی رائٹر کوئی بھی متاثر نہیں کر سکی ہے۔ سائرہ رضا کا ناول مجھے اچھا نہیں لگا۔ خط آپ کے میں نورین شفیع کا خط بہت اچھا لگا۔

ج رابعہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے گاؤں کا نام صحیح شائع نہ ہو سکا۔ شعاع پر بھرے کا شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف اور تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

تسلیم سولنگی کلثوم سولنگی ضلع وہاڑی تحصیل میلسی دو کوٹہ سے لکھتی ہیں

جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے نمبر احمد کا ”جنت کے پتے“ اور فائزہ افتخار کا ”ایک نئی سنڈریلا“ بہت اچھا لگا۔ اس ناول میں میٹھا کا کردار بہت اچھا ہے۔ وہ خاموش رہ کے بھی بہت کچھ کر جاتی ہے اور مہر تو زہر لگتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی ناولز اور افسانوں کی کہانیاں زبردست تھیں۔ میں چھٹی یا ساتویں کلاس میں تھی جب سے شعاع پڑھ رہی ہوں اور اب تو بی ایڈ کر چکی ہوں۔ اور پلیز ایک ریکویسٹ ہے لازمی پوری کرنا۔ 103 مست ملتان کے آر جے شفقت عباس کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شامل کرنا۔

ج پیاری تسلیم شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

شمینہ مبارک نے پیرو دھائی موڑا اولینڈی سے لکھا ہے

شعاع، خواتین اور کرن کو پڑھتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا یہ تو مجھے یاد نہیں، لیکن اس کو پڑھنے کی وجہ سے جو گالیاں، کوسنے اور جھڑکیاں پڑتی تھیں وہ کبھی کبھی ضرور یاد آ جاتی ہیں۔ جب ویسی ہی باتیں اپنے میاں جی سے سننے کو ملتی

ہیں۔ بس اماں کی گالیاں بے لاگ اور کھلی ڈلی ہوتی تھیں اور میاں ٹھہرے شریف سے بندے تو وہ ذرا مہذب انداز میں سرزنش کرتے پائے جاتے ہیں، لیکن وہ شہینہ ہی کیا جو ان کی باتوں پر کان دھرے۔ سو وہ اپنا کام (باتیں سنانا) اور میں اپنا کام (یہ تینوں شمارے پڑھنا) کیے جا رہے ہیں۔ کبھی وہ چپ کر جاتے ہیں اور کبھی میں شرم کر لیتی ہوں۔ (صرف دو چار دن) اس کے بعد پھر وہی روئیں۔ اب اس بات سے آپ کو میری محبت کا تو پتا چل ہی گیا ہو گا۔

شمینہ! آپ کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں آپ شعاع اور خواتین کے لیے ہر خط لکھیں۔ ہم ان شاء اللہ ضرور شائع کریں گے۔

اینیلا قیصر گل کا پیرو وال ضلع خانیوال سے شعاع پر بھرے لکھتی ہیں

ہم نے شعاع کا باقاعدہ مطالعہ پیر کامل سے شروع کیا جب پیر کامل ختم ہوا تو فرحت آپ کی ناول کی پہلی قسط شائع ہو گئی۔ فرحت اشتیاق کا ناول شائع ہو اور ہم نہ پڑھیں؟ آگے پوں ہوا کہ فرحت آپ کی ناول ختم ہوا تو ماہا ملک کا شروع ہو گیا اور چونکہ ماہا ملک ایک اچھی لکھاری تھیں لیکن اب وہ خواتین اور شعاع کے لیے ناہید و نایاب ہو چکی ہیں۔ سو ماہا کا ناول پڑھا، اس کے بعد شعاع کے عادی ہوئے اور یوں تب سے اب تک مسلسل شعاع آرہا ہے اور ہم پڑھ رہے ہیں۔ بہت افسوس کے ساتھ کہوں گی کہ شعاع اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ یہ نہیں کہ یہ اب برا ہو گیا ہے۔ بلکہ اب شعاع کا کچھ ماڈرن سا لگنے لگا ہے، پہلے سا سوبر محسوس نہیں ہوتا۔ ویسے اور آل شعاع اچھا ہے۔ آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے بات کروں گی رسالے کی جان اور میرا پسندیدہ ترین ناول ”دیوار شب“ ریکویسٹ ٹو عالیہ بخاری پلیز خیام کو مزید ٹھو کریں مت کھانے دیجئے گا۔ نمبر احمد کا ناول ”جنت کے پتے“ بلاشبہ ایک زبردست اور یاد رہ جانے والا ناول ہے۔ بہت اچھا لگا، ترکی کے بارے میں اتنا کچھ جان کر۔ ام طیفور کی ”دیدہ بینا“ کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ البتہ ”دو نکلے کا آدمی“ اور ”کھیل ختم“ اچھی کاوش ہونے کے ساتھ تلخ حقیقت بھی تھی۔ ”دل موم کا دیا“ سائرہ رضا ویری ویل ڈن، بہت اچھا، بلکہ بہت بہت اچھا لکھا۔ تمکنت کے صبر اور الفت کی نا سمجھی کی بہت اچھی سزا و جزا

ملی، بہت افسوس سے کہوں گی کہ فائزہ افتخار کا سنڈریلا بالکل وہی کہانی محسوس ہوتی ہے جو بچپن سے سنڈریلا کی دیکھتے آرہے ہیں۔ پلیز فائزہ آپ کی اس کو جلدی ختم کر دیجئے گا۔ ”تاریخ کے جھروکوں میں سے“ مجھے بہت پسند ہے۔ پلیز اپنا شعاع یا خواتین کے کسی بھی سلسلے کو بند نہ کیجئے گا۔ اپنا میں نے آج سے قریباً ”پانچ سال پہلے 100

کراچی کے D.J عارف مظفر، منشی علی اور مظفر احمد کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔ اب تو F.M منشی اور مظفر احمد بھی نہیں رہے پر پلیز اب عارف مظفر کا انٹرویو ہی ڈالیے، پیشتر اس کے وہ بھی ریڈیو چھوڑ جائیں۔

ایسا آپ سے ایک ناول کے بارے میں پوچھنا تھا اگر آپ کو معلوم ہو تو پلیز ضرور بتائیے گا۔ ہم نے مارچ 2005ء کے شعاع میں افشاں آفریدی کے ناول ”بساط دل“ بھی عجیب شے ہے کی پہلی اور دوسری قسط پڑھی ہے۔ ایسا اس ناول کی تیسری اور آخری قسط نہیں پڑھ سکے۔ اس کہانی کا اینڈ مختصراً بتا دیں، اگر آپ کو یاد ہو تو کرداروں کے نام، یور علی جاہ، پری چہر، شیراز وغیرہ تھے۔ اگر آپ کے پاس اپریل 2005ء کا شعاع کا شمارہ ہو تو ہمیں دے دیجئے۔

ج پیاری اینیلا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ انٹرویو میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ انٹرویو دینا نہیں چاہتے، اس لیے آپ کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اینیلا آپ اپنی کہانی دوبارہ بھجوا دیں۔ دو ڈھائی سال پرانی کہانی کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ افشاں آفریدی کے ناول کا انجام ہمیں یاد نہیں۔ آپ کا خط شائع کر رہے ہیں کسی قاری بہن نے بھجوا یا تو شائع کر دیں گے۔

صالحہ اور اقصیٰ میرپور آزاد کشمیر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا۔ سب سے پہلے ”دیوار شب“ پڑھا، جو کہ بڑی خوب صورتی سے اختتامی مراحل پر رواں دواں

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی چرچہ کے حقوق طبع و نقل، جس ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

ہے۔ خیام نے زندگی میں بہت محرومیاں دیکھی ہیں، اب اسے ربیعہ سے محروم مت کیجئے گا۔ ”ستارہ شام“ بہت چل رہا ہے۔ نمبر احمد بھی بہت خوب صورتی سے کہانی کو آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔

ج صالحہ اور اقصیٰ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صدف گل نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا یہ پرچہ ہماری بہت رہنمائی کر رہا ہے۔ اگر میں تعریف لکھنے لگوں گی تو بہت سارے صفحات بھی کم پڑ جائیں گے۔

اس خط کو لکھنے کی اہل وجہ نمبر احمد کی کہانی ”جنت کے پتے“ ہے۔ آپ میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیسے اتاروں۔ خصوصاً ”ان لائنوں کو پڑھ کر“ جب حیا مسجد میں بیٹھی ہوتی ہے اور ترک لڑکا آ بیٹھتا ہے اف! اس صفحے کا ایک ایک لفظ میرے دل میں ترازو کر گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی اللہ نے انگوٹھے جتنا نور دیا ہے، جو جلتا بجھتا بجھتا جلتا ہے۔

ج پیاری صدف! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمبر احمد تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

لیلیٰ خالد، مومل خالد اور صنوریہ خالد نے ڈی جی خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کیا ہی ٹائٹل تھا (ویل ڈن) سب سے پہلے ہم پہنچے اپنی مومسٹ فیورٹ رائٹر۔ ہاں جی نمبر احمد کے ناول کی طرف، نمبر آپ کی تعریف کے لیے ہمارے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ پھر اپنا دو سٹریٹوٹ ناول پڑھا عالیہ بخاری کا ”دیوار شب“ اس میں سالار کا کریکٹر بیسٹ ہے۔ اور فائزہ افتخار آپ کا ناول بھی بہت اچھا ہے۔ (ایک نئی سنڈریلا) اور باقی افسانوں میں سب اچھا کھیل ختم سمیرا حمید کا تھا اور آمنہ ریاض اور سائرہ رضوانے بھی اچھا لکھا۔

ج لیلیٰ، مومل اور صنوریہ! آپ تینوں بہنوں کو شعاع پسند آیا بہت شکریہ۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی چرچہ کے حقوق طبع و نقل، جس ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدادہ نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تلمے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دوقیعہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالوشوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شہید چھینکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسہ لوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری عہدے کے ایمان دار میڈیکلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پروردگار کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

قِسْطُ 56



اس کی مکروہ مسکراہٹ، آنکھوں کا گدلا پن اور چہرے کو چھوٹے غلیظ ہاتھ۔

اور سب کچھ اتنا قریب کہ۔۔۔

بے جان ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں کے باوجود اس نے راہ فرار تلاش کرنا چاہی، مگر بے سود۔۔۔

وہ اس طرح کھڑا تھا کہ اگر وہ اٹھ کر کھڑی بھی ہوتی تو لازماً اس سے ٹکرا جاتی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ اسے روک لو۔۔۔ چھوڑ دے اس کیس کا پیچھا، اسی میں سب کا بھلا تھا۔ مگر نہیں سمجھ میں آیا تم لوگوں کے ٹکڑے سے ٹکڑا وکیل۔۔۔ گواہیاں، ثبوت کوئی کسر نہیں رہنے دی سالار نے، میرے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کے لیے۔۔۔“

اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔۔۔ مگر لمحے کی ٹھنڈک میں بڑا دل بٹھاتا سا احساس تھا۔ گیتی نے اپنی ساری ہمت کو جمع کرنا چاہا۔

”سالار نے صرف انصاف چاہا ہے۔ ذاتی دشمنی نہیں ہے ان کی کسی سے۔ ایک خون ناحق کا حساب مانگا ہے اور۔۔۔“

”اس نے صرف خود کو عذاب میں ڈالا ہے۔ سمجھیں۔“ نبیل کے چہرے کی وہ مکروہ مسکراہٹ بھی گم ہوئی اور میری کھلی دشمنی مول لی ہے۔ کچھ نہیں بگاڑ سکا ہے وہ میرا۔ چار دن بعد حج نا کافی ثبوتوں کی بنا پر کیس خارج کر دے گا۔ خرید چکے ہم اسے۔ قصہ ختم۔“

اس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے۔ ”چاہو تو سارے زبانے کو تباہ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔“ اپنی فتح کی خوشی اس کے چہرے پر سرخی بن کر چھا رہی تھی اور چہرے کے نقوش عجیب سے انداز میں پھیل رہے تھے۔ ظلم، فرعونیت، کمینگی کی آخری حدوں کو بھی پار کر جانے والے اس طبقے کے ہر شخص کی شکل ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔

بھیا نک۔۔۔ خوف زدہ کرنے والی۔

وہ اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔

”جھوٹ بول رہے ہو تم۔“ گیتی کی آواز میں نمایاں کپکپاہٹ تھی۔

”یہ بھی پتا چل جائے گا چند دن کی بات ہے، صرف گیتی آرا۔۔۔ اپنی فتح کا جشن میں بہت دھوم دھام سے منانے والا ہوں۔ ایک بڑا سیلبریشن۔ جس میں پرفارمنس دکھانے کے لیے الماس بے قرار ہے۔ تیاریاں شروع کر چکی ہے وہ اور اس کی ماں گل ناز جان۔۔۔ تم چاہو تو نگینہ اور صندل کو بھی بلا لیتے ہیں۔ پیسہ دیکھ کر بھاگی چلی آئیں گی۔“

اس بار وہ ہنستے ہوئے جس طرح اس پر جھکا تھا، گیتی سسم کر بالکل کھڑکی سے جا لگی تھی۔

”راستہ دیں۔“ تازہ اچھالی گئی ذلت نے اس سے فی الوقت نگاہ ملانے کی بھی جرات چھینی تھی۔

نبیل نے دلچسپی سے اس کے آنسوؤں سے بھگے چہرے کو دیکھا۔ ”بھی سے اپنے آنسو ضائع مت کرو گیتی آرا! بہت موقع ملنے والے ہیں تمہیں رونے کے لیے۔ اتنے کہ آنسو کم پڑ جائیں گے تمہارے پاس۔“

لاؤنج کے بڑھول سٹائے میں گھری گیتی آرا نے شدت سے خدا کو یاد کیا۔

”سالار نے جو کرنا تھا کر لیا۔ آج سے میرا اعلان جنگ ہے، سالار سے، تم سے۔ اور اس کمینے راجو سے۔۔۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا، میں تم لوگوں کو۔ گھر شہر کیا۔ دنیا چھوڑنے کی آرزو کرو گی تم اور تمہارا نیک دل، نیک نام شوہر۔۔۔“

کچھ دور کچن میں کوئی شیشے کا برتن چھنا کے ساتھ گرا تھا۔ ایک ساتھ ہی بہت سی جلی آوازیں اور قدموں

کی چاپ۔

نبیل ایک جھٹکے سے مڑا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

لاؤنج پر چھایا دہشت کا آسیب سمٹ کر گیتی آرا کے دل میں براجمان ہوا۔

دونوں بازوؤں کو آپس میں پھنسائے۔ وہ وہیں کاؤچ پر بیٹھی بری طرح کانپ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر ابانے سرکری کی پشت سے ٹکایا۔

”سو ایک بار پھر ثابت ہوتا ہے کہ خود انسان کی زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔“

”جس وقت وہ پہلی بار آیا۔۔۔ اس دن سے آج تک وہ میرے لیے پراسرار تھا۔ لیکن کبھی بھی اتنا نہیں جتنا کہ آج، اپنی حقیقت کھلنے کے بعد۔۔۔“

ان کے سامنے بیٹھا معاذ بہت سنجیدہ تھا اور فکر مند بھی۔

”انسان اپنے ماضی سے مکمل طور پر کٹ کر، محض حال میں کیسے جی سکتا ہے ابا! ایسے جیسے کسی بغیر جڑ کا درخت۔۔۔ اور وہ گب سے اس تکلیف کو جھیل رہا ہے۔ اپنائیت کے ایک چھوٹے سے حوالے کے بھی بغیر۔ وہ درد جس کا کوئی ازالہ نہیں۔ اور جو بنا قصور اس کے حصے میں آیا۔“

معاذ کی آواز دھیمی اور دکھ سے بو جھل تھی۔

”لوگ زندگی کی کتاب سے ان چاہے ورق بے دردی سے پھاڑتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان پر لکھی تحریر ان مٹ ہے۔ مجھے یوسف کمالی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، جو کچھ اس نے خیام اور اس کی مظلوم ماں کے ساتھ کیا۔ وہ ظلم کی بدترین شکل ہے۔ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کے ساتھ دنیا کی بھیڑ میں اکیلی کھڑی رہ جانے والی ماں کے بارے میں ایک بار بھی سوچو گے تو اس سارے سسم پر لعنت بھیجنے کو دل چاہے گا۔ جہاں مجرم کوئی اور ہے اور سزا کوئی اور بھگتا ہے۔“

ابا کے لمحے کا دبا دبا سا غصہ نمایاں ہو رہا تھا۔ معاذ خاموشی سے ان کی طرف دیکھ گیا۔ یوسف کمالی سے مل کر وہ سیدھا واپس ابا کے پاس آیا تھا اور اتنا حیرت زدہ تھا کہ آج کے دن کی دوسری مصروفیات یکسر فراموش ہوئی تھیں۔ ”پیسے کے بل پر عیش و عشرت کو اپنے لیے جائز کرنے والے، عزت کے نام نہاد ٹھیکے دار، ایسے پتا نہیں کتنے بچے اپنے حصے میں آئے جنم کو جھیلے ہوں گے۔ یہ صرف خیام کا ہی رونا کب ہے۔“

”مگر سب لوگ ایک سے بھی تو نہیں ہوتے ہیں ابا۔ سالار نے بھی تو گیتی سے شادی کی پورے عزت و احترام کے ساتھ۔ گیتی بھابھی بھی اسی خاندان کا حصہ ہیں۔ یوسف کمالی نے مجھے بتایا کہ وہ گیتی سے مل چکے ہیں، لیکن اسے کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکے۔“

”جو شخص اپنی اولاد کو اپنانے کی ہمت نہیں کر سکا، اس سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ سالار جیسے صاحب کردار سے کیا مقابلہ ہے بھلا۔“

”اب آپ بتائیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ خیام کو ایک دم یوسف کمالی کے سامنے کھڑا کر دیا تو پتا نہیں وہ اس بات کو کس طرح لے، مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر کہیں اپنی دوزخ چلا جائے، ہم اسے ڈھونڈ بھی نہ سکیں۔“

”کل اسکول کی اوپننگ ہونے دو۔ پھر دیکھتے ہیں۔“ معاذ نے غور سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔

”جو ہو وہ کتنا بھی براسی، لیکن خیام کے لیے اب ایک خوشگوار آغاز بہت ضروری ہے۔ خدا کرے کہ وہ اپنے

باپ کو پورے دل کے ساتھ معاف کر سکے۔

”جی۔۔۔!“ معاذِ ملکہ سے مسکرایا۔

جتنے بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس گھر آیا تھا اس میں اب افاقہ تھا۔

ابا کے ساتھ بات کر کے ہمیشہ اسے ایسا ہی تجربہ ہوتا تھا۔ وہی تھے جو مشکل سے مشکل صورت حال میں بھی اس کی تسلی اور رہنمائی کا ذریعہ بنتے تھے۔

وہ اپنی اس خوش قسمتی پر بہت بہت شکر گزار رہا تھا۔ مگر آج خیام کی محرومی کو لے کر دل بہت بری طرح دکھا۔ ہوش کے پہلے قدم سے لے کر آج تک محرومی کی ایسی بدترین شکل۔

کس کس موقع پر وہ کس تجربہ سے گزرا ہوگا۔

ابا نے اس کے چہرے پر آئی اداسی کو بجا طور پر محسوس کرتے ہوئے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہوتا ہے۔۔۔ اور ہوتا رہے گا۔۔۔ اللہ اسی طرح کی مثالوں سے اپنے بندوں کو آزماتا بھی ہے اور چھانٹتا بھی ہے۔ چلو تمہارے کرنے کے لیے آج بہت کام ہیں۔ سالار سے بات ہوئی؟“

”جی مگر مختصر۔۔۔ آج کیس کی سماعت ختم ہوئی۔۔۔ چار دن بعد فیصلہ ہے۔ سالار خوش اور مطمئن تھے۔“

”خدا کرے کہ انصاف ہو سکے۔“

”آپ کو شک ہے کیا۔“ وہ کمرے سے نکلے نکلے رکا۔

”انتا کچھ دیکھ لینے کے بعد بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ یہاں انصاف آسانی سے مل جاتا ہے تو میری دعا ہے کہ اللہ تمہاری خوش قسمتی کی لاج رکھے۔“

وہ افسردگی سے مسکرائے۔ معاذِ چند لمحے خاموش کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا۔

”لیکن ابا! یہاں انصاف میں کتنی ہی رکاوٹ سہی قدرت کا نظام تو اپنی جگہ ہے۔ وہاں سے تو ہر فیصلہ پوری طاقت اور انصاف کے ساتھ نافذ ہوتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ ایسے چند فیصلوں کا میں کب سے منتظر ہوں پورے یقین کے ساتھ۔۔۔“ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس بار معاذ نے کمرے سے نکلنے میں جلدی کی تھی۔ ابا چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔

ادھ کھلے دروازے سے آتی دھوپ کی لکیر کے اس پار آج بھی گری میالی دھند کا راج تھا۔

جویا نے اندر آتے ہوئے آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا مگر سلمان کے ہنسنے کی آواز پھر بھی اندر تک آرہی تھی۔ کافی عرصے سے وہ عجیب، مسٹرِیکل سے انداز میں ہنسنے لگا تھا۔ چوڑا منہ کھول کر، پیچھڑوں کی پوری طاقت کے ساتھ۔ زویا کہتی تھی کہ وہ اس لیے خود اتنی زور سے ہنسنے لگا ہے تاکہ دنیا اس پر نہ ہنس سکے۔

آج اس طرح کے قمقمے لگانے کا جواز بھی ملا تھا۔ سو وہ حق بجانب تھا۔ نیچے ٹیکسی رکنے کی آواز کے ساتھ ملی جلی سی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی ذرا سا جھکی تو ٹیکسی سے اترتی آگلی اور ان کے شوہر نظر آگئے۔ آج ان کے ساتھ دونوں بچیاں بھی تھیں۔ بہت عرصے بعد ان دونوں کو دیکھا تھا۔ جویا کو وہ خاصی بڑی لگیں۔

جدید تراش کے سوٹ، اونچی ہیل کے جوتے۔

مٹھائی کا ڈبہ۔۔۔ پھولوں کا ہار اور آگلی کا نیا جوڑا ابھی کل ہی سنا تھا کہ وہ ناراض ہو کر گئی تھیں۔ مگر آج انہیں فوراً ہی آنا پڑا۔ وہ بھی خوش خوش۔

کھڑکی بند کر کے وہ چپ چاپ بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ کئی قدموں کی چاب سیڑھیوں اور پھر صحن میں سنائی دینے لگی۔ مبارک سلامت کا ایک ملا جلا سا شور۔

وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھی رہی، جانتی تھی کہ اس کا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔ چند ہی منٹ بعد آگلی کی دونوں بیٹیاں اس کے کمرے میں گئیں۔

”آپ یہاں بیٹھی ہیں ہم سمجھے شاید پڑھانے گئی ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ میں نے چھوڑ دیا ہے۔“ وہ انہیں دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

”اچھا کیا۔۔۔ اب تو آپ کی شادی بھی ہونے والی ہے۔ فرید انکل نوکری تھوڑی کرنے دیں گے آپ کو۔۔۔ امی بتا رہی تھیں کافی پیسے والے ہیں۔“

”تم لوگ آج بہت دن بعد آئیں یہاں؟“

”یہاں آکر مزہ نہیں آتا۔۔۔ آپ کا پرانا والا گھرا چھاتا تھا۔ کتنی چیزیں تھیں وہاں۔۔۔ یہاں تو ہر وقت گرمی رہتی ہے۔ پتا نہیں آپ لوگ کیسے رہتے ہیں۔“

جویا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”آگلی کی بیٹیاں تھیں۔ ان ہی کی طرح منہ پھٹ اور سخت دل۔“

”مگر کم!“ ان میں سے بڑی والی نے اپنے چہرے پر آتے بالوں کو پیچھے کیا۔ تب ہی جویا نے اس کے بے تحاشا بڑھے ناخن نیل پالش اور چہرے پر جمی میک اپ کی تہ کو نوٹ کیا۔

وہ بڑی جلدی کافی بڑی ہو چکی تھیں۔

”پھر آج نانا بھی تو رہا ہو گئے کتنے عرصے بعد۔ امی کہہ رہی تھیں نانا وغیرہ اب ایک بڑے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے والے ہیں اسی لیے اب ہم پھر سے آیا کریں گے اور اب تو آپ بھی نہیں ہوں گی یہاں۔“

جویا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں میرے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

ان دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی مشورہ کیا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔ آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔ نانا سے بھی نہ ملیں گی کیا۔“

”میں مل چکی ہوں جب وہ گھر آئے تھے۔“ وہ اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ آگے مستقبل میں آگلی کی بیٹیوں کو جھیلنا بھی اتنا ہی کٹھن ہونا تھا جتنا کہ آگلی کو۔۔۔ اسے ابھی سے اندازہ ہوا تھا۔ وہ دونوں بھی بور ہو کر سامنے والی دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں جہاں سے نیچے والوں کا صحن اور سامنے گلی نظر آتی تھی۔

زویا کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ وہ اسی کے پاس چلی آئی۔ ”ہٹو میں بنا دیتی ہوں۔“

”نہیں بنالوں کی تم رہنے دو سارا دن سے لگی ہو۔“

”یہ تو روٹین کے کام ہیں زویا! کرنے ہی ہوتے ہیں۔“ وہ وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی۔

زویا چپ چاپ کمرے میں رکھے کپوں میں چینی اور دودھ ملا رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر میں چائے کا پکا ہوا قہوہ دودھ چینی کے اس مکسچر میں مل کر ایک مہکتے مزے دار سے ذائقے میں بدل جانے والا تھا۔۔۔ ساری کڑواہٹ دور۔

”کیا سیدھا سا فارمولا تھا مکاش۔“

”تمہیں کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے جویا! تمہارے لیے سب کچھ روٹین ورک کا ہی حصہ

ہے۔ اپنے حصے کا بوجھ، دوسروں کا بوجھ، دوسروں کی ذمہ داری، یہاں تک کہ اپنی قربانی سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم۔ خود کو بہت عظیم۔ اعلا سب سے الگ۔۔۔ زویا کی آواز دھیمی تھی مگر لہجہ بے حد تلخ۔ جویا نے یوں ہی ان سنا کرنا چاہا۔

وہ آج کل یوں ہی جلتے پھرتے باتیں سنانے لگی تھی۔ شاید اسے غصہ دلانے کے لیے۔ ”مسلمان بھائی! آپا گل شاید سب اتنے بُرے نہ ہوتے، اگر تم ایک بار اپنے حق کے لیے کھڑی ہو جاتیں، تمہاری چپ نے ان کی بہت بڑھادی۔ وہ اپنے زعم میں اتنا بڑھ گئے ہیں کہ۔۔۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ سو خود کو کنٹرول کر کے چائے کے کپوں میں جچھ چلانے لگی۔

”تم نے ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا جویا! پھینک دیتیں ساری ذمہ داریاں اپنے کندھوں سے، مسلمان بھائی چاہے بھیک مانگتے۔۔۔“

”وہ بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے زویا۔“ اس بار اس نے تیزی سے زویا کی بات کاٹی تھی۔ زویا نے حیرت سے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔

”بھیک مانگنا بھی بڑی مشقت ہے، سردی، گرمی کو اپنے سر لینا، بھاگ دوڑ، جھڑکیاں۔۔۔ اور مسلمان بھائی کو عورتوں کی کمائی کھانے میں کوئی شرم پہلے ہی سے نہیں تھی۔۔۔ وہ کیسے مجھے روک دیتے۔“

اس کے کہنے کی ایک لفظ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”مگر پھر بھی۔۔۔ یہ فرید الدین تو حد ہے۔۔۔ بلکہ ظلم ہے۔۔۔ تم آواز کیوں نہیں اٹھا رہی ہو۔۔۔ میں ہوں نا۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ مجھے پتا ہے، میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتی ہوں زویا۔۔۔ پہلے یہ غلطی کر چکی ہوں۔۔۔ سارے گھر کو بھگتنی پڑ رہی ہے آج تک۔“

”گھر والوں نے اپنا کیا بھگتا ہے۔۔۔ ابا کا جیل جانا، ایک ایک شے کا بک جانا، مسلمان بھائی کی طلاق، یہ سب ان کے اپنے قصے ہیں، تم کیوں بہت سی باتوں کو ملارہی ہو چیزوں کو الگ الگ۔۔۔“

”تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔ لے جاؤ ورنہ پھر پانی پڑے گی۔“ جویا نے نرمی سے اس کی توجہ دلائی تو وہ سخت برا مان گئی۔

”تم بھی چلو نا۔۔۔ وہاں بیٹھ کر فرید الدین کی تعریف سنو گی تو بہت اچھا لگے گا تمہیں بھی۔ ابوجب سے آئے ہیں اسی کا قصیدہ پڑھے جارہے ہیں۔“ زویا اتنی ہوئی تیز قدموں سے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جویا اس کے ساتھ ہی پچن سے نکل کر آگئی تھی۔

کمرے کے چوٹ کھلے دروازے سے اظہار صاحب سامنے ہی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ بڑی حد تک کمزور ہو چکے تھے۔ اتنے مہینوں کی سخت زندگی کے بعد ان کی ذہنی حالت بھی یقیناً متاثر تھی۔ وہ ان کے سامنے صرف چند منٹوں کے لیے گئی تھی۔ اسے آج بھی ڈر تھا کہ اسے دیکھ کر وہ اسی نفرت اور غصے کا اظہار کریں گے، لیکن ان کی آمد کے اولین لمحوں میں جو جذباتی سی ہلچل تھی۔ اس میں وہ شاید اس پر دھیان نہ دے سکے تھے۔ مگر یہ محض اس کا خیال تھا۔

”جویا سے پوچھ تو لیا ہے نا تم نے گل۔۔۔ اسے فرید الدین کے رشتے پر اعتراض تو نہیں ہے۔“

زویا جب اندر آئی تو وہ آپا گل سے پوچھ رہے تھے۔ زویا نے ایک نگاہ ان پر اور آپا گل پر ڈالی اور خاموشی سے چائے سرو کرنے لگی۔

آپا گل کو ان کی خراب صحت یا ذہنی حالت کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چند لمحے جوا انہوں نے خاموشی کے لیے تھے وہ محض اپنا بیان ترتیب دینے کے لیے۔

اظہار صاحب ایک بار پھر اپنا سوال دہرا رہے تھے اور شاکرہ امی کی امید بھری نگاہ ان پر جمی تھی۔

”دیکھیں ابو اب! تو اگر جویا کو اعتراض ہوتا بھی ہے تو ہمارے پاس فرید الدین کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کو ہاں بھی آپ سے اجازت کے بعد ہی کی گئی تھی اور دوسرے آپ کی ضمانت بھی اتنی جلدی وہی کروانے والے ہیں۔ انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ آپ کے کیس میں گنجائش نکالی۔ ورنہ دوسرے وکیلوں نے تو صرف پیسہ ہی کھایا ہے۔“ تازہ احسان کا تذکرہ سب سے ضروری تھا۔ ”اور جویا کے انکار، اقرار سے کہیں زیادہ اب سوال گھر کی پکی کچھی عزت کو سنبھالنے اور مالی پریشانیوں کو حل کرنے کا ہے۔ سو وہ سب بہت آسانی سے فرید الدین حل کر رہے ہیں؟“

اظہار صاحب کے اگلے کئی سوالوں کے جواب ایک ساتھ ملے تھے، سو آگے پوچھنے کے لیے کچھ خاص رہا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چائے کا کپ منہ سے لگالیا۔

مسلمان نے بہت غور سے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے تھے۔

”اور ابویہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جو بڑی مشکل سے آپ کی ضمانت ہوئی ہے، کینسل ہو گئی تو۔۔۔ پورے پانچ لاکھ جمع کروائے ہیں فرید الدین نے۔“

”خدا نہ کرے۔“ کپ اظہار صاحب کے ہاتھوں میں کانپا۔ جیل میں گزرا وقت کسی بُرے آسیب کی مانند دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

”میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ فرید الدین بھلا آدمی ہے۔ خوش رکھے گا جویا کو۔“ چائے کا دوسرا گھونٹ انہوں نے پورے اطمینان سے لیا۔

زویا نے آخری کپ مسلمان کے سامنے رکھا۔

”وہ شخص جویا کے جوڑ کا نہیں ہے۔ میں پھر کہتی ہوں کہ اس ظلم سے باز آجاؤ۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تم لوگوں کا۔“ شاکرہ امی کی کانپتی ہوئی آواز پر ساری ہی گردنیں ان کی طرف مڑیں۔

”پانچ لاکھ کا بندوبست کر کے ہم اسے واپس کر دیں گے۔ اتنی بڑی رقم تو نہیں ہے یہ سب جس کے لیے۔“

”اچھا، تو پہلے میرے کل والے پندرہ سو روپے ہی دے دیں۔ جو میں نے مٹھائی بانٹنے میں کرایہ میں خرچ کیے ہیں۔“

آپا گل نے ڈھٹائی سے شاکرہ امی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ تو انہوں نے بنا کچھ کہے گھٹنے کے نیچے دبے ہوئے

میں سے پندرہ سو روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے۔ ”یہ لو۔۔۔ بس!“

”ارے کیا کر رہی ہو، واپس کرو امی کو۔۔۔ یہ کیا حرکت ہے گل!“

آپا گل کے میاں کچھ شرمندہ ہو کر منع کر رہے تھے مگر وہ وصول کر کے اپنے پرس کی زپ بند کر رہی تھیں۔

”آپ مت بولیں، یہ ہمارا آپس کا حساب ہے۔“

اکبر بھائی اپنا کپ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

”چلو ایک قصہ تو ختم ہوا۔ ڈرو اس وقت سے آپا گل! جب امی تمہارے ہاتھ پر پانچ لاکھ روپے بھی رکھنے والی

ہیں۔ پھر تو تمہارے پاس وہی راستے رہ جائیں گے۔“ مسلمان بڑی کینٹکی سے ہنسنے جا رہا تھا۔

آپا گل کے ماتھے پر آیا بل اور بھی گہرا ہوا۔

”کون سے دور استے؟“

”وہی خود کشی کرنے کے۔“ وہ پھر سے ہنس پڑا۔ ”اتنی جلدی بھول گئیں۔ صرف چوبیس گھنٹے میں۔۔۔ پچ چچ۔ عمر کے ساتھ تمہاری یادداشت بھی جواب دینے لگی ہے۔ جب ہی کہتا تھا کہ دماغ پر ہر وقت زور مت ڈالا کرو۔ خرچ

ہو گیا تو پھر کہاں سے لاؤ گی؟

وہ مستقل مذاق اڑانے کے موڈ میں تھا۔ اور اسے بالکل خیال نہیں آیا تھا کہ باہر بیٹھے اکبر بھائی بھی یہ سب سن رہے ہیں۔

آپاگل کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔
اپنی عزت نفس انہیں بے حد عزیز تھی۔

”میں نے غلط نہیں کہا تھا جو یا کی شادی فرید الدین کے ساتھ ہی ہوگی۔ اتنے شریف اور نیک انسان کے ساتھ وعدہ خلافی کر کے خدا کے غضب کو دعوتِ موت و دم لوگ پہلے ہی کیا کم مصیبتیں ہیں۔“ وہ اونچی آواز میں بول رہی تھیں۔

زویا وہیں دروازے کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھی تھی۔

اس تاریک سیاہ منظر نامے میں روشنی کی کسی ایک کرن پھوٹنے کی منتظر تھی۔ مگر یہاں ہر آنے والا پل تیرگی کا احساس برپا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔۔۔ ارے کچھ میرا ہی لحاظ کرلو، کتنے عرصے بعد آیا ہوں تم سب کے بیچ۔۔۔ اظہار صاحب حسبِ عادت اونچی آواز میں بولنا شروع ہوئے تھے۔

”آپ سلمان کو نہیں دیکھ رہے، کتابدہ لحاظ ہو گیا ہے۔ ایک تو ہم نے یہاں اسے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے۔ ورنہ زویا کے گھر سے نکل کر کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس کے پاس بھوکا مرنے والا اگر اس کو ہم سہارا نہ دیتے۔“

”کچھ تو شرم کرلو آپاگل۔“ سلمان ایک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

”میں تمہارا دیا نہیں کھا رہا ہوں۔ گھر جو یا کی کمائی پر چل رہا ہے اور خود تم بھی مینے کے پچیس دن اس گھر کی روٹی کھاتی ہو۔ اس لیے آئندہ مجھے تو یہ طعنہ دینا نہیں چاہیے۔“

اکبر بھائی دروازے کی چوکھٹ میں آکھڑے ہوئے تھے۔

”اور کتنی بے عزتی کروانی ہے۔۔۔ اب چلتی ہو یہاں سے یا میں اکیلا ہی چلا جاؤں۔“

وہ واقعی چلے جاتے، لیکن سلمان نے برہہ کرا نہیں منا ہی لیا۔

”میرا اور آپاگل کا معاملہ ہے سلمان بھائی! آپ کی تو میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ لیکن آپ خود ایمان داری سے کہیں کہ میں غلط ہوں یا آپاگل۔“

اکبر بھائی نے جواباً ”ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکایا تھا۔

”چھا بس اپنا دل صاف کرلو۔ ورنہ کچھ بھی تسلی سے نہیں ہو سکے گا۔ اب کیا پروگرام ہے تم بتاؤ گل! میں اب حالات کی بہتری چاہتا ہوں۔ وہ بھی فوری طور پر اور بس۔“

آہستہ آہستہ وہی ٹھوک بجالانے والی کیفیت اظہار صاحب کے لہجے میں ابھر رہی تھی۔ جو صرف آپاگل کے حق میں جاتی تھی۔

آپاگل آنسو صاف کرتے ہوئے ہلکے سے مسکرائیں۔

”فرید الدین فلیٹ کی چابی لے کر آنے والے ہیں۔ تاکہ سب چل کر دیکھ لیں۔ میں اور اکبر تو کل رات دیکھ آئے ہیں۔۔۔ کشادہ اور ہوادار فلیٹ ہے اور اگلے سے اگلے جمعہ وہیں سے جو یا کا نکاح اور رخصتی عمل میں آجائے گی۔ سادگی سے کیے گئے کام میں برکت بھی ہوتی ہے۔“

”بے شک، بے شک۔“ اظہار صاحب کا لہجہ عقیدت سے بوجھل ہوا۔ زویا نے گردن موڑ کر باہر صحن میں دیکھا۔

دیکھا۔

وہ ابھی بھی وہیں کرسی پر بیٹھی تھی جہاں آدھی دھوپ اور آدھا سایہ تھا۔ اس کے پیر دھوپ میں جل کر سرخ ہو رہے تھے اور وہ کم از کم اپنی کرسی کھسکا کر پیچھے توک رہی سکتی ہے۔ مگر وہ یہ بھی نہیں کر رہی۔

زویا نے بے چینی سے پہلو بدلا اور کمرے کا دروازہ برابر کیا۔ اب کم از کم وہ نظر تو نہیں آ رہی تھی۔

”بس ہو گیا فیصلہ، اب اس پروگرام میں کوئی رد و بدل نہیں، اس کے بعد آخر زندگی کے کچھ اور بھی کام کرنے ہیں۔ میں کسی سے کوئی اعتراض نہیں سنوں۔“ انہوں نے باری باری سلمان اور شاہ امی کی طرف دیکھا تھا۔

”ارے کیسے نہ بولوں ماں ہوں میں، اچھا لڑکا ہوتا تو میں کبھی منع نہ کرتی، جو یا کے ساتھ اتنا برا مت کرو، سارا بوجھ ساری ذمہ داریاں اٹھا کر چلی ہے میری بچی۔ کوئی حرف شکایت نہیں۔“

آپاگل نے بے ساختہ ماتھے کو چھوا۔ ”اپنی گولیاں بھی تو نہیں کھاتیں کہ سوتی رہیں، بس یوں ہی چیخ چیخ۔“

نیچے کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ چچپاتی آنکھوں والا فرید الدین پورے حق کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا ہوا ٹھیک جو یا کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”دھوپ میں کیوں بیٹھی ہو میری جان۔۔۔ سارا رنگ روپ جلا جا رہا ہے تمہارا۔“ اس کے پاس رومانٹک ہونے کا حق کچھ کچھ آئی چکا تھا۔ سو وہ بنا گھبرائے بیٹھی آواز میں کہہ رہا تھا۔

جو یا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ کچھ بول کھلا کر پیچھے ہوا۔

”بیمار ہو کیا؟ اتنی گم زور ہو رہی ہو۔“ اس بار وہ بھی چونکا تھا اور اس تشویش میں اپنائیت نہیں کچھ اور ہی احساس تھا۔

جو یا نے بنا کچھ کہہ وہاں سے گزرتا چاہا، مگر وہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

”دیکھنے تو دو خود کو۔۔۔ کتنے دن بعد دیکھا ہے اپنے سامنے۔۔۔ حالانکہ خوابوں میں تو روزانہ ہی ساتھ ہوتی ہو۔ دل بھر کر۔“

جو یا کا ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ فرید الدین کے ہاتھ سے اس کا دوسرا ہاتھ خود بخود چھوٹا تھا۔ پہلے آپاگل کی دیوار پر لٹکتی بیٹیوں نے مڑ کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے سامنے کے بند دروازے کو کھول کر آپاگل اور سلمان باہر آئے تھے۔

”کیا ہوا خیریت۔ کچھ گرا کیا؟“ بڑے زور کی آواز تھی۔ ”آپاگل نے ہڑبڑا کر ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

جو یا کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے اندر چلی گئی، مگر ان چند سیکنڈوں میں ہی آپاگل نے اس کا موڈ بھانپ لیا تھا۔

”بیزا غرق پتا نہیں اب کیا کرو اگر چھوڑے گی۔“ ایک ساتھ ہی بہت سارے دل بٹھاتے وہموں نے انہیں گھیرا تھا۔

”کچھ نہیں ایسے ہی بات کر رہا تھا، شرما گئیں۔“ فرید الدین نے خود کو بروقت سنبھالا تھا، لیکن اس وقت اگر وہ جلتے توے کو ہاتھ لگا کر بھی کہتا کہ کچھ نہیں تھا۔ تو آپاگل کو ایک فیصد بھی یقین نہیں آتا تھا۔

انہوں نے ایک نگاہ اپنی دونوں بیٹیوں پر ڈالی جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے منہ پر ہاتھ رکھے اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش میں عجیب مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھیں۔

”آپ یہاں دھوپ میں کیوں کھڑے ہو گئے فرید بھائی۔ اندر چلیں۔ یہاں تو سب آپ کا انتظار کر رہے تھے کب سے۔“

”ہاں وہ میں گاڑی بھی لے کر آیا ہوں، تاکہ سب چل کر فلیٹ دیکھ لیں۔“

وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا کمرے تک آیا۔ یہاں سب ہی دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے اور اپنے اپنے طور

پر مطلب معنی اخذ کرنے میں مصروف۔
 ”تو بس چلتے ہیں۔ دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ آپاگل کابس نہیں چل رہا تھا کہ وقت کے بالکل مختصر سے وقفے میں وہ سارا منظر بالکل بدل کر رکھ دیں۔
 ”کون کون چلے گا بھئی؟“ خود کو بے نشان ظاہر کرنے کی وہ مسلسل کوشش کر رہی تھیں۔
 اظہار صاحب، سلمان اور وہ خود اور دو ان کی بیٹیاں مل کر ایک گاڑی کی سواری سے زیادہ تھے۔ اکبر بھائی دیکھ چکے تھے، سو معذرت کر لی، زویا خاموشی سے نکل کر بچن میں جا چکی تھی۔
 خاموش ساکت بیٹھی شاہرہ امی سے پوچھنا کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔
 اس چھوٹے سے قافلے کے ساتھ جاتے فرید الدین نے ایک بار پھر پلٹ کر جویا کے کمرے کی طرف دیکھا۔
 اس کے چہرے پر الجھن تھی یا فکر۔
 آپاگل کی گھبراہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

نبیل گلاس ایک بار پھر بھرنے لگا تھا۔ زرتاج نے ایک تنبیہ کرتی نگاہ نبیل پر ڈالی۔
 ”تم بہت پینے لگے ہو نبیل اور وہ بھی گھر میں۔۔۔ سالار نے دیکھ لیا تو پتا نہیں وہ کیا حشر کرے گا یاد ہے نا ایک بار اس نے تمہارے دوستوں کے سامنے کیا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ نہ صرف کرا کر بلکہ کمرے کا قیمتی فرنیچر اور کارپٹ پروے تک باہر ڈالوا دیے تھے۔“
 زرتاج کے لہجے میں گھبراہٹ تھی، اندر سے لاک ہوئے کمرے کو بھی انہوں نے ایک بار سے زائد چیک کیا تھا۔

نبیل نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور ہاتھ میں تھا ہوا گلاس ایک سانس میں پیتا چلا گیا۔
 ”تم بہت وہمی ہوئی جا رہی ہو زرتاج اور بڑوں بھی۔۔۔ کچھ سال پہلے والا رعب بدبویہ کھو سا گیا ہے۔“
 ایک ٹھنڈی سانس زرتاج نے دل کی گہرائیوں ہی میں دبا لی۔
 ”کیا ہوا؟“ وہ ان کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوری کینگی کے ساتھ مسکرایا۔
 ”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ اس کے قریب آ بیٹھی تھیں۔

سامنے رکھی میز پر دونوں پاؤں پھیلائے وہ پورے مالکانہ استحقاق کے ساتھ اس عالی شان بیڈ روم میں بیٹھا تھا۔ زرتاج کو آج کل وہ زمانہ شدت سے یاد آنے لگا تھا جب انہوں نے نبیل سے نئی نئی شادی کی تھی۔
 اس وقت وہ یکسر مختلف تھا۔

ہاتھ باندھا غلام، جوان کے تلوے کیا جوتے چاٹنے کو بھی تیار رہتا تھا۔ ایک آنکھ کے اشارے سے بندھا تھا۔ اور اب۔۔۔ نالی کی اینٹ کو چوبارے لگانے والا محاورہ اب ٹھیک سے سمجھ میں آیا تھا۔
 ”لگتا ہے تمہیں مجھ پر سخت غصہ آ رہا ہے۔“ مسکراتے ہوئے وہ سو فیصد درست اندازہ لگا رہا تھا۔
 ”نہیں تو۔۔۔ آج تو میرے لیے بہت خوشی کا دن ہے۔“ خود پر بمشکل قابو پاتے ہوئے وہ مسکرائیں۔ ”آخر کار اس منحوس کیس سے اب تمہاری جان ہمیشہ کے لیے چھٹ رہی ہے جس نے ہماری نیندیں اڑا رکھی تھیں۔“
 ”میری نہیں صرف تمہاری۔۔۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے ایسی چیزوں سے نمٹنا اچھی طرح آتا ہے۔“ شراب اور اختیار دونوں کا خمیازہ اس کے لہجے اور لفظوں میں اتر رہا تھا۔
 ”یہ بات مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے نبیل۔“ اس بار ان کی سرد مہری ظاہر ہو ہی گئی۔

نبیل نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً ”ناراض“ تھیں اور انہیں مزید ناراض رکھنا بالکل بھی عقل مندی نہیں تھی۔

”سواری۔۔۔ مجھے ایسا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بہت ضروری تھا زرتاج۔ سالار بری طرح میرے پیچھے پڑا ہے اور اس بار تو اس نے میری گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ اگر تم ساتھ نہ دیتیں تو بات بہت بڑبڑ جاتی۔“ وہ سرک کر ان کے قریب آیا۔

”میں تمہارا ساتھ ویسے بھی دیتی۔ اگر تم اتنے گھٹیا طریقے سے بلیک میل نہ کرتے۔ آخر اتنے سالوں سے بھی تو میں نے بھی کسی مسئلے میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا ہے۔ تو اس بار کیسے چھوڑتی۔ مگر تم نے تو اپنا پھندا میرے بیٹے کے گلے میں فٹ کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ اور نہ ہی میں یہ بھی بھولوں گی۔“

ان کی نگاہ نبیل کے چہرے پر جمی تھی۔

”اور وہ یقیناً بالکل گدھا ہے۔ جو اس پہلی کامیابی پر اس سانپ جیسی آنکھوں والی عورت کی دشمنی مول لینے چلا ہے۔“ گلاس بوتل سب ایک سائیڈ پر رکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھا۔

”میں نے مانی کے لیے برا نہیں چاہا تھا زرتاج۔ لیکن میں سالار کے ہاتھوں شکست بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ یہ کیس پورا میرے خلاف جارہا تھا۔ حالانکہ تم نے اسے دبانے میں لاکھوں روپیہ خرچ کر ڈالا تھا۔ پھر بھی یہ اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ تو مانو گی نا۔“ وہ ان کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

زرتاج نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تو اس نے اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔ ”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں زرتاج۔ اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

”میں کیسے یقین کر لوں اس بات کا نبیل! جو شخص اپنی مصیبت کو ٹالنے کے لیے مجھے میرے ہی بیٹے پر قتل کا مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایک دس سال پرانے معاملے پر پریس کانفرنس بلانے کے لیے تیار ہے۔ وہ کیسے آگے کی زندگی میں مجھ سے وفادار رہے گا۔“

”آگے ایسے کوئی مسائل نہیں آئیں گے ہماری زندگی میں۔۔۔ مانی وہاں خوش باش رہتا رہے گا۔ اور ہم دونوں یہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ آئی سوئیر۔ بہت پیار کرتا ہوں میں تم سے زرتاج۔“

بہت عرصے بعد نبیل اس والہانہ محبت کا اظہار کر رہا تھا۔
 زرتاج نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
 نبیل۔۔۔ مانی۔

ان کی زندگی کے یہ دونوں اہم کردار کتنی گہری مماثلت رکھتے تھے۔ دونوں کی بد کرداری ثابت تھی۔ اور دونوں ہی کو بچانے کے لیے وہ جان مال پر کھیلی تھیں۔

”میرے اعصاب بہت تھک گئے ہیں نبیل! یہ سب آسان نہیں تھا۔ کروڑوں خرچ ہوئے ہیں اور ذہنی اذیت الگ۔ بڑس بھی بالکل ٹھنڈا جا رہا ہے۔ اوپر سے یہ سالار اور لیتی آرا۔ میری زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے شاید۔“

انہوں نے تھک کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اور آنکھیں بند کیں۔ ان کے گلابی چہرے پر اب جھائیاں نمایاں ہو رہی تھیں اور چہرے اور آنکھوں کے گرد گہری ہوتی لکیریں۔ اب کسی میک اپ کے نیچے چھپی رہنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

وہ اتنی ڈل اور بیمار لگ رہی تھیں کہ نبیل کا ان کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ مگر اگلے چند سال اور

انہیں برداشت کرنا تھا۔ اس نے بروقت خود کو یاد دلایا۔

”خود کو سب فکروں سے آزاد کر لو ہنی اب میں سب سے نمٹ لوں گا۔ رہا یہ سالار تو اب کی بار اس طرح رسوا ہو کر یہاں سے جائے گا کہ ساری عمر اس شہر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔ یقین کرو میرا۔ بس کچھ دن اور۔ تم یہ شکلیں بھی نہیں دیکھو گی اپنے آس پاس۔“ مدھم آواز میں بڑی ہی مضبوط یقین دہانی تھی۔

زرتاج کی آنکھیں ایک دم کھلی تھیں۔

”سچ کہہ رہے ہو!“

”تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔ ان کی رسوائی کا تماشا!“

”کیا کرنے والے ہو؟“ زرتاج کی آنکھوں اور چہرے پر خوشی کی چمک اُتری۔ ”کیا کرنے والے ہو تم ان کے ساتھ؟“

”وہ ابھی رہنے دو۔ ریلیکس کرو۔ جو تم چاہتی ہو اس سے بڑھ کر ہو گا۔ مجھ پر یقین ہے نا!“

زرتاج کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”ہاں! اگر ایسا ہو جاتا ہے نیل! تو مجھے نہیں پتا کہ میں تمہارے لیے کیا کچھ کر جاؤں گی۔ سات خون معاف ہوں گے تمہیں میری طرف سے۔“ یہ دو نام دو شکلیں گم ہو جائیں میری زندگی سے بس۔ میں پھر سے جی اٹھوں گی۔

”تو بس سمجھ لو کہ اب یہ شکلیں گم ہیں ہمیشہ کے لیے۔“ ایک بھرپور یقین دہانی اس سخت اعصاب شکن دور کے خاتمے کا سبب بنی تھی۔

”وہ یقیناً“ ایسا کر گزرے گا جب ان جیسی عورت کو سرنڈر کر چکا ہے۔“

پہلی بار انہیں نیل کی اس کمینگی پر بھی پیار آیا جس سے ذرا دیر پہلے تک وہ سخت نفرت میں مبتلا تھیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے نیل کی طرف دیکھا۔ ”آج رات ہم ایک شاندار سامیبلویشن رکھیں گے صرف ہم دونوں کے لیے اس گھر سے دور۔“

”میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔“ نیل کے چہرے پر بڑی بھرپور مسکراہٹ تھی۔

”پتا نہیں کون احمق ہوتے ہیں جو زندگی کو پریشانیوں اور مسائل کے دھارے پر چھوڑے رکھتے ہیں۔“ اور اس مضبوط نامون ماحول میں پورے غور کے ساتھ اب وہ زمانے پر ہنس سکتا تھا دل کھول کر۔ وہ ہنستا چلا گیا۔

زرتاج تیار ہونے چلی گئی تھیں۔

باہر لاؤنج میں سے آئی ہوئی قدموں کی آہٹ پر اس نے یوں ہی پردہ سر کا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سالار کے نیلی ڈاکٹر اندر آرہے تھے سالار ان کے ساتھ تھا اور اس کی فکر مندی چہرے سے عیاں تھی۔

”کیا ہوا یہ ڈاکٹر کیوں آیا ہے؟“ زرتاج اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔

نیل نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ ”میتھی آریا بیمار پڑ گئی ہیں سچ چچ۔“ مذاق اڑاتا سا انداز۔

زرتاج ہلکے سے ہنس پڑیں۔ ”ضرور تم نے ہی کچھ کہا ہے۔“

نیل نے گہری سانس لی۔ زرتاج کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ ابھی کھڑکی میں ہی کھڑی تھیں۔

”میرا فون دینا نیل۔“ آج بہت اچھا دن ہے ضرور کوئی اور بہت اچھی خبر ابھی میری منتظر ہے۔“

بنالٹ کر دیکھے انہوں نے کہا تھا۔

پر یقین مغرور کھنکھاتا ہوا الجہ۔

نیل نے ڈرنگ ٹیبل پر بچتا ہوا فون بڑی لاپرواہی سے زرتاج کو تھمایا تھا۔ مگر اس بار ان کا اندازہ بالکل غلط نکلنے والا تھا۔



محرابوں والے آرائشی برآمدے کے نیچے گلی میں بھرپور جگمگاہٹ تھی۔

پھولوں کی تیز دل فریب مہک، کچھ فاصلے پر سیخوں پر سنکتے کباب تنکوں کی مزیدار سی خوشبو، تندور میں پکتی روٹیوں کی گرمی، سب ہی کچھ مل کر ہوا کے جھونکوں کو بو جھل کیے دے رہے تھے۔

نگینہ نے نیچے جھانکتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ گلناز، الماس کے دو پرانے ملازم دو بڑے بڑے شاعر اٹھائے برابر کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور نیچے سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی گاڑیوں کی لائسنس مہمانوں کے اسٹیشن کی گواہی دے رہی تھیں۔

وہی ایک سامنظر۔

”ہا آ!“ ایک دبی دبی سی سانس نگینہ کے لبوں سے آزاد ہوئی اور اس نے دانستہ رخ موڑا۔

کوئی دن تھے جب گلناز کے چوبارے تلے کھڑی گاڑیاں اسے سر سے پیر تک جلا کر رکھتی تھیں۔ گلناز کی اونچی آمدنی اور عیش و عشرت بھرا طرز زندگی کا اپنی مشقت بھری پھٹکار زدہ زندگی سے موازنہ برسوں خون کے آنسو رلاتا رہا۔ مگر اب نہیں۔

فرق اس کا اور کل ناز کا نہیں تھا۔ نانی ستارہ اور نانی ولد دار کا تھا۔

تصویر کے دو انتہائی مختلف رخ۔

فن کی میراث کو زندگی کا سرمایہ سمجھنے والی نانی ستارہ کا فلسفہ زندگی اب کہیں جا کر اس کے سمجھ میں تھوڑا تھوڑا آنے لگا تھا۔

پانی پر تیرتے اس پتے کی طرح جس کا ایک رخ تراور دو سرا خشک۔ اس ماحول کا لازمی حصہ بن کر بھی وہ بالکل الگ تھلک تھیں۔

معاشی بد حالی کے بدترین دور میں بھی انہیں اس کا ایک سٹرا میں ڈانس کرنا قبول تھا۔ مگر اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ ان کا سارا سرمایہ اقتدار، آج بھی ان کا کلاسیکل بیک گراؤنڈ تھا۔ رقص، موسیقی، اعلیٰ پائے کے اساتذہ کا کلام۔ آج بھی اگر وہ فیروزہ کے صدمے سے نہیں نکلی تھیں تو وہ صرف ایک بیٹی کی جدائی کا رونا نہیں تھا۔ ایک اعلیٰ پائے کی فنکارہ کامٹی میں مل جانا بھی تھا۔

گلی کے سارے گھروں کی بالکونیاں، درتچے، رنگ بھری روشنیوں سے جھلملائے جا رہے تھے۔

نیم تاریک برآمدے میں کھڑی نگینہ نے خالی خالی نگاہوں سے اطراف کو دیکھا۔

وہ سب جو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچی تھیں۔

اور وہ بھی جو خاموشی سے گمنامی کے اندھیروں میں اتر گئیں۔ سب کی زندگیوں کے اپنے جواز، اپنی مجبوریاں اپنے دلائل۔

اور کون ہے اس بھری دنیا میں جو پہلا پتھر مارنے کی جرات کر سکے۔

وہ خلی سے مسکرا دی۔

محلہ رانج الوقت آٹم نمبروں سے گونج رہا تھا۔

وہ نمبر جن کا بچا اس گھر میں آج بھی ممنوع تھا اور جنہیں سن کر نانی ستارہ کانوں کو ہاتھ لگاتی تھیں مگر یہی سب

یہاں کی خوشحالی کی گارنٹی بھی دیتے تھے۔

اس نے ان سب کو بھی دل سے برا نہیں سمجھا تھا۔ یہ وہ طریقہ زندگی تھا جو معاشرے کی بھرپور سرپرستی میں رائج تھا۔ رواں دواں تھا۔ پوری ہمت اور جرات کے ساتھ۔ اپنی اچھائی اور برائی دونوں کو اپناتے ہوئے زمانے کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ان کے گھرانے کی طرح پیچ پیچ کی جینے والی زندگی سے شاید کہیں بہتر۔

”کہیں اماں ساری زندگی ایک منافقانہ طرز عمل پر تو کاربند نہیں رہیں۔ کیا ان کا کبھی دل نہیں چاہتا ہو گا کہ وہ بھی پیسے کی اس ریل پیل کو دیکھیں جو ہر آمد کے دو سرے سرے پر ان کی بہن دیکھتی ہیں۔“

یہ ایسی ہی بدگمانی تھی جیسے نانی ستارہ کا فیروزہ سے بے حد محبت کرنا۔

گیتی اور صندل پر خیام کو ترجیح دینا وغیرہ وغیرہ۔

ابنی ہوا میں اڑتی بالوں کی لٹوں کو اس نے کان کے پیچھے کرتے ہوئے خود کو شرم دلایا۔

”پیسے کا تو اماں نے وہ عروج دیکھا ہے کہ آج بھی وہ کسی کو نصیب نہیں ہے۔ بڑی بات ان کے اصول۔ ان کا صبر روایت سے جڑے رہنے کی مضبوطی ہے۔ اور جو بھی ہے ان ہی کی جوتیوں کا صدقہ۔“ اس کا دل ایک دم ہی بھر آیا۔

ہیلی سے رگڑ کر آنکھیں خشک کیں اور واپس اندر مڑ گئی۔ صندل، استاد فراغت بیگ کے کمرے میں بیٹھی نظر آرہی تھی۔ آج وہ بڑی دیر سے ان کے پاس بیٹھی نہ جانے کون سے مسائل حل کر رہی تھی۔

گنینہ کو دیکھ کر اچھا لگا۔ وہ کم از کم اپنی خود ساختہ تنہائی سے تو باہر آرہی تھی۔

نانی ستارہ نے کھلے ہوئے دروازے سے گنینہ کو اندر آتا دیکھ کر اپنی حساب کتاب کی کاپی تکیہ کے نیچے سرکائی۔

”بہت دیر بعد دیکھا تمہیں کہاں تھیں شام سے؟“

”آج بہت دن بعد گھر سے نکلی تھی نا اماں۔ آتے آتے تھک گئی۔ ذرا دیر کے لیے لیٹی تو پھر آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھی ہوں۔“

سادہ سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ ان کی پائنٹی کی طرف بیٹھی۔

نانی ستارہ نے ذرا غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی تھکن کے آثار تھے۔ آج وہ اسٹوڈیو گئی تھی۔ کام کے سلسلے میں۔ اپنے پرانے تعلقات کو چیک کرنے کے لیے۔

”پتا نہیں کیا بنا؟“ نانی ستارہ نے اس کے چہرے سے اندازہ لگانا چاہا۔

”لوگ اب صندل کی ماں کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں اماں! کہتے ہیں کہ صندل نے کچھ عرصے میں خاصا پیسہ بنالیا ہے بظاہر عزت دے کر ملے۔ مگر کام کے لیے منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔“

”تم خود سے خواہش کا اظہار کر دیتیں اس میں کوئی برائی نہیں۔ آرٹسٹ تو ساری عمر آرٹسٹ رہتا ہے اور جن کے نیچے فیلڈ میں کام کر رہے ہیں۔ کیا وہ ماں باپ گھر بیٹھ گئے ہیں۔“

نانی ستارہ کو اس کا کار کا سا انداز اچھا نہیں لگا۔ گنینہ کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک اتری۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ اگر انڈسٹری والے نہیں پوچھ رہے تو بہتر ہے کہ ٹی وی کا رخ کیا جائے۔ آج کل وہاں کام بھی زیادہ ہو رہا ہے اور معاوضہ بھی اچھا مل رہا ہے۔ فلمیں بن کون سی ایسی زیادہ رہی ہیں۔“

نانی ستارہ نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

”یہ بھی اچھا ہے۔ سالار سے بات کرنی ہوں اس کے ریڈیو ٹی وی پر تعلقات بھی بہت ہیں۔“

”نہیں اماں۔“ وہ ان کے خاموش ہوتے ہی تیزی سے بولی۔ ”سالار سے نہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ پتا نہیں گیتی کو شرمندگی ہو میرے کام پر۔ سالار بھی تو آخر بڑا آدمی ہے کوئی اسے حوالہ دے۔ میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔“

ہوں۔“

اس کے چہرے اور انداز میں اضطراب تھا۔ نانی نے ہمدردی سے اس کو دیکھا۔ وقت کے ساتھ وہ بھی تبدیل تھی۔

مصلحتوں، جوازوں کو ٹھوکر پر ساری زندگی رکھنے کے بعد گیتی کی شادی ایک خاموش سے بدلاؤ کا سبب بنی تھی۔

”گیتی سے بات ہوئی تمہاری!“

”نہیں۔۔۔ دو تین دن پہلے ہوئی تھی۔ میں خود زیادہ نہیں کرتی۔ بے خیالی میں کوئی اچھی بری بات منہ سے نہ نکل جائے اور وہ وہاں اتنی دور ہماری وجہ سے پریشان ہوتی رہے۔“

”وہ تو ہے!“ نانی نے دھیرے سے کہا۔ ”مگر پھر بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اگر سالار ہمارا کوئی مستقل بندوبست کروا دے تو۔۔۔ مگر ہمت جواب دیتی ہے کچھ کہتے ہوئے۔“

”میں تو دعا کرتی ہوں کہ اللہ صندل کو عقل دے کہ۔۔۔“ صندل کو آتا دیکھ کر انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں!“ وہ قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ آج بہت دنوں بعد اس نے خود سے گھر والوں میں کوئی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ پہلے استاد جی اور اب۔۔۔

گنینہ ہلکے سے مسکرا دی۔

”ایسے ہی ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے!“

مگر وہ اس سے نہیں نانی ستارہ سے مخاطب تھی۔

”آپ نے کیا میرے لیے بالی سے کوئی بات کی تھی؟“

”نہیں تو حالانکہ میرا ارادہ تھا مگر گنینہ نے منع کر دیا۔“ نانی ستارہ نے فی الفور گنینہ کو بچانا چاہا۔

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھائی۔

گنینہ کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ شاید اسے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

مگر وہ فی الفور اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔

”مجھے آپ سے بات کرنا ہے امی!“ اس کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی بے تاثر تھے۔

گنینہ کو اس پر ٹوٹ کر ہار آیا ”ماں صدقے کیا بات کرنا ہے۔“

”آپ بالی کے پاس گئی تھیں۔ میری طرف سے معافی مانگنے درخواست کرنے کہ کوٹھی کی فروخت کے پیسے میں سے کچھ پیسہ وہ مجھے معاف کر دے۔ اگلی فلم میں مجھے چانس دے۔“ اس کی نگاہ گنینہ کے چہرے پر جمی تھی۔

”کون بد ذات کہتا ہے کہ میں وہاں گئی تھی۔ یوں ہی جھوٹا الزام لگایا ہے۔ ہے کون؟ نام تو بتاؤ؟“

اس کا چھوٹی موٹی ایکٹرس ہونا کام آیا تھا۔ مگر وہ ثبوت لیے ہوئے تھی۔

”مجھے خود بالی نے فون کر کے بتایا ہے۔“

گنینہ کے لب نیم وا ہوئے اور نگاہ نے صندل کے چہرے پر سے نانی ستارہ کی طرف سفر کیا۔

وہی تھیں جو اسے صندل کے پھٹ پڑنے والے غصہ سے بچا سکتی تھیں۔

”اور آج آپ نے پھر اسٹوڈیو کا رخ کیا تھا۔ کام مانگنے کے واسطے۔“

صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

”ملنے گئی تھی پرانے لوگوں سے گھر میں پڑے پڑے دل گھبرا رہا تھا مجھے کیا ضرورت تھی کام مانگنے کی۔ ساری عمر کام ہی کیا ہے۔ اب تو دل بھر گیا ہے میرا۔“

صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

”ملنے گئی تھی پرانے لوگوں سے گھر میں پڑے پڑے دل گھبرا رہا تھا مجھے کیا ضرورت تھی کام مانگنے کی۔ ساری عمر کام ہی کیا ہے۔ اب تو دل بھر گیا ہے میرا۔“

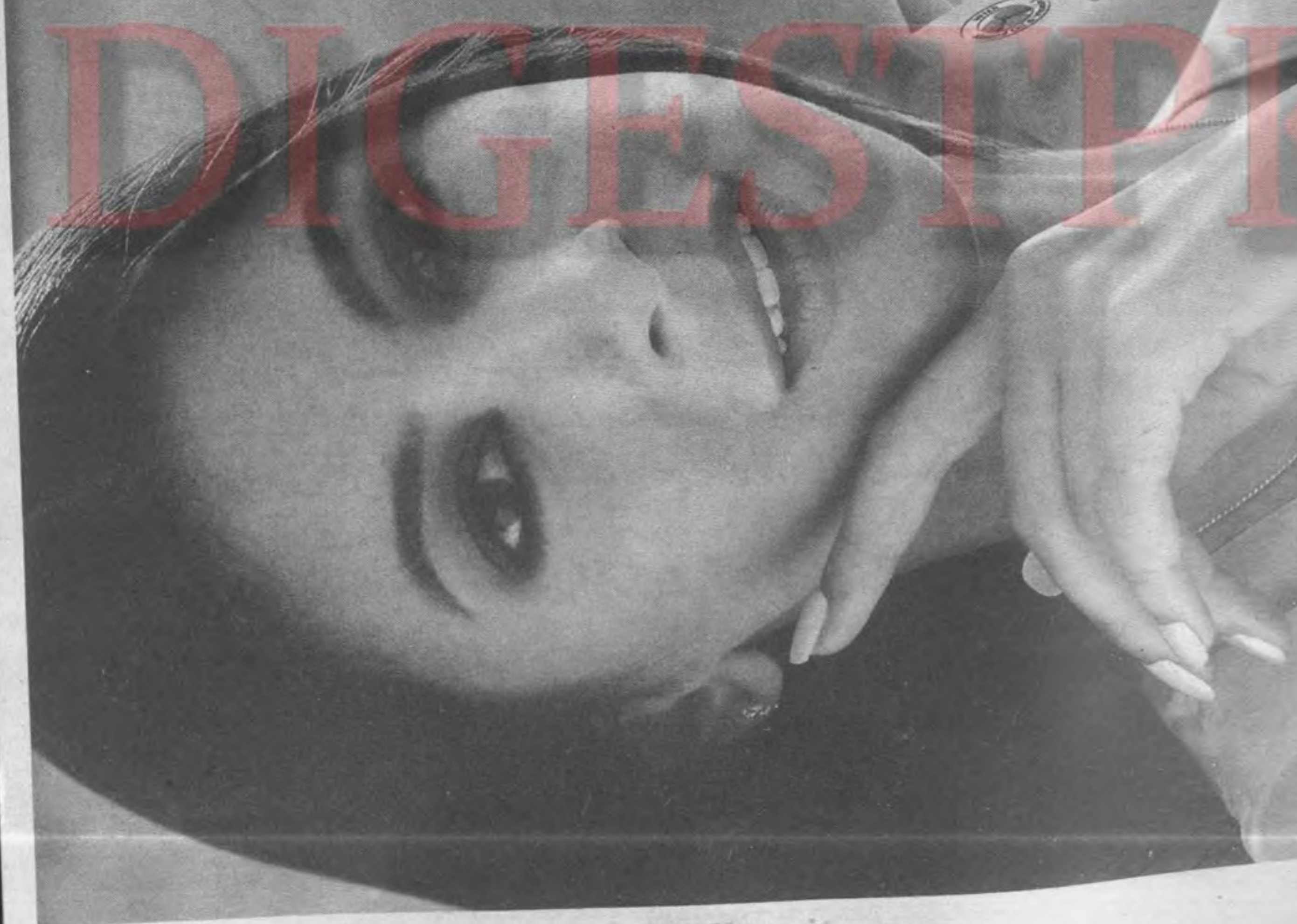
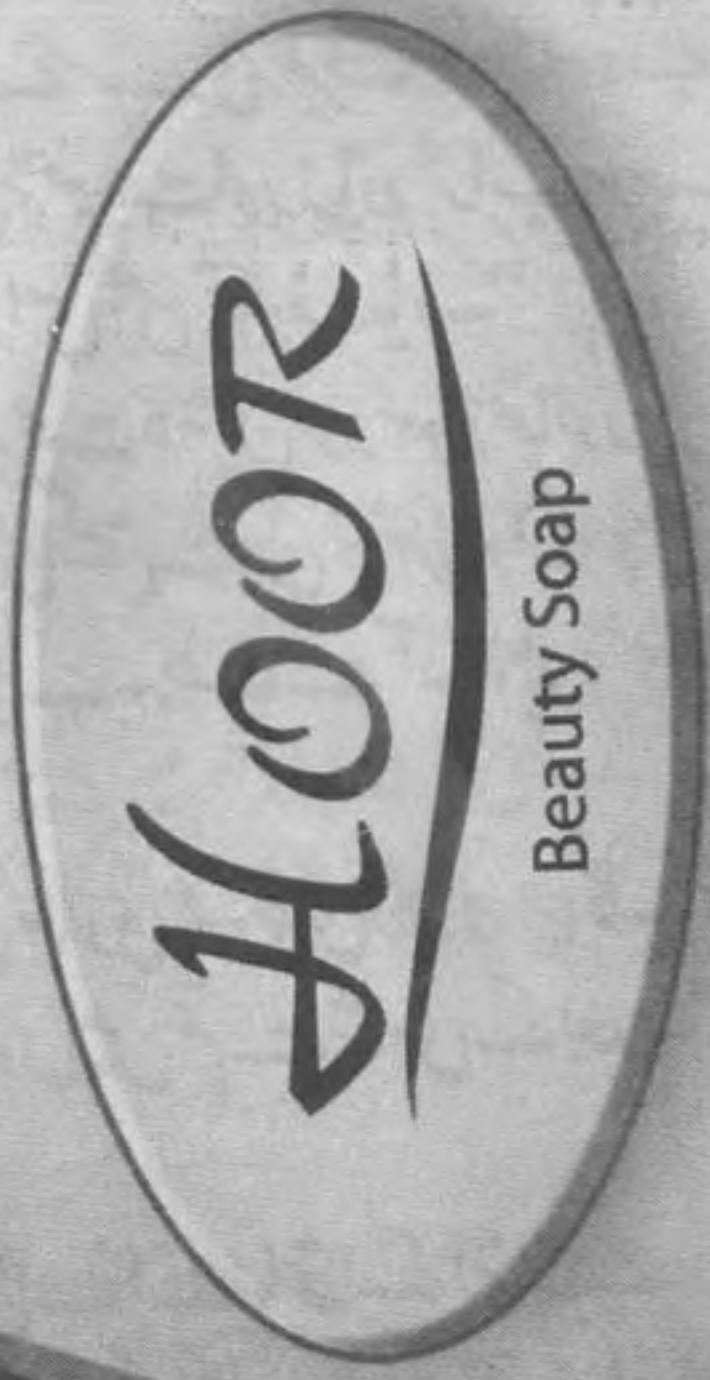
صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

خوڑو جیسا حسن...



نگینہ نے خود پر قابو لیا تھا۔ سوا سوا الزام کی سنگینی کو کم کرنا آسان ہوا تھا۔
 ”اس کا مطلب ہے کہ آپ گئی تھیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس کے چہرے سے ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ناراض ہے۔ نانی ستارہ ہلکے سے کھنکھاریں۔
 ”چلو اگر گئی بھی تھی تو کیا جرم کر دیا اور کام بھی اگر کرے گی تو اس میں کیا برائی ہے۔ آخر کرتی آئی ہے پہلے بھی۔
 ٹی وی پر دیکھو تو ساری پرانی اداکارائیں نظر آتی ہیں آج کل وہ جو اپنے وقت کی نامور ہیروئین تھیں۔ آج ٹی وی پر کریکٹر رول کر رہی ہیں۔ تو نگینہ بھی کرے گی تو کون سا فرق پڑنے والا ہے۔“
 ”فرق تو بڑا ہے نانی۔ اور یہ آپ بھی جانتی ہیں اور امی بھی۔ ناموروں کی اپنی دنیا ہوتی ہے وہ جہاں جاتے ہیں اپنی دنیا ساتھ لے جاتے ہیں۔ کوئی سوال کوئی انگلی نہیں اٹھتی۔ لیکن امی بے چاری۔“
 نگینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ خود کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اترتی ہی نگینہ سے چھپی نہ رہ سکی۔
 ”مجھے پتا ہے کہ اب آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی۔“ اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر آنکھیں خشک کرنی چاہیں۔

”کسی اور کا نہ سہی، گیتی کا خیال کر لیں۔ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ وہاں شہر میں عزت نام کما کر بیٹھا ہے اس کا شوہر۔ کیا کہیں گے لوگ یہ ہے سالار کی ساس یہ۔“ نگینہ کا سر خود بخود جھکا تھا۔
 ”مجھے پتا ہے کہ آپ قصور وار نہیں ہیں، میں ہی ناشکری ہوں مگر گیتی بہت کم ہمت ہے امی! وہ خود پر اٹھائے گئے سوال نہیں برداشت کر سکے گی۔ رو رو کر جان گھلاتی رہے گی یا پھر۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو اپنی زندگی جی لینے کا حق ملنا ہی چاہیے نا امی!“
 صندل کہیں دور گم تھی اور چہرے پر پانی کے چمکتے چند قطرے۔

سالار نے گیتی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔
 بخار ابھی بھی تیز تھا۔
 تھوڑی دیر پہلے دی جانے والی دوا کا اثر ابھی پوری طرح نہیں ہوا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے برف ملے پانی میں سے اس نے دوسری پٹی نکال کر اس کے ماتھے پر رکھی۔ گیتی کی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔
 سالار محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا۔
 گیتی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرے ہوئے تھے۔
 ”اب ایک آنسو نہیں۔ آج رو رو کر کتنا تیز بخار چڑھا چکی ہو پہلے ہی۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر خود کو پرسکون نہیں رکھو گی تو بخار آسانی سے اترنے والا نہیں ہے۔“ اس پر جھکتے ہوئے وہ جو کچھ نرمی سے سمجھا رہا تھا بالکل ہی رائیگاں جا رہا تھا۔
 گیتی کی آنکھوں سے ایک نہ ختم ہونے والی برسات جاری تھی۔ سالار نے بہت تشویش سے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ آج جب وہ کورٹ سے واپس آیا تھا تو وہ اسے تیز بخار میں جلتی ہوئی ملی تھی اور اسے دیکھتے ہی وہ جس طرح اس کے کندھے سے لگ کر روئی تھی۔ سالار اب تک اس کے لیے کوئی وجہ نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔
 اور وہ خود سے کچھ بتانے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔
 ”خود کو سنبھالو گیتی۔ تھوڑا سا کچھ کھا لو۔ آج سارا دن گزر گیا ہے۔ ہمیں کھائے پیے بغیر۔“

فی الحال آنسوؤں کا سبب پوچھنے کے بجائے وہ اس کی طبیعت کی حال کی فکر میں لگا ہوا تھا۔
گیتی نے چہرہ خشک کرتے ہوئے سالار کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد فکر مندی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”ایسے ہی ہمت ہارتی رہو گی تو طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اپنا نہ سہی میرا ہی خیال کرو پلینز۔ میں کہاں
برداشت کر سکتا ہوں تمہاری ذرا سی بھی تکلیف یار۔“

اس کی آنکھوں اور لہجے میں محبت کا یقین اور شہر آؤ تھا اور اس کی موجودگی کا احساس سکون آمیز!
اس سخت اعصابی ستاؤ میں بھی گیتی نے دل کو شہر ہوا محسوس کیا۔

”آپ نے بھی تو نہیں کھایا ہے۔ جب سے آئے ہیں میری پریشانی میں لگے ہوئے ہیں۔“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

”تمہاری پریشانی میں تو میں ساری عمر خوشی لگا رہوں گا۔ بس تم میرے پاس ہو۔ میرے لیے کافی ہے۔ بہت
شکر گزار قسم کا انسان بن چکا ہوں میں تم سے شادی کے بعد۔“ گیتی کے ماتھے سے خشک ہوتی پٹی کو مٹاتے ہوئے وہ
مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بس اب اور نہیں!“ گیتی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ ”آپ کھانا
کھالیں پہلے پلینز اور اس طرح مت کیا کریں کہ اگر میں ذرا سہا پڑ جاؤں تو اپنا خیال بھی نہیں۔“
”میرا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس لیے بیمار پڑنے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ میرا کیا حال بن سکتا ہے
تمہارے بغیر!“

اس کے پیچھے تکیے رکھتے ہوئے اس نے تیزی سے گیتی کی بات کاٹی تھی۔

”ایسا تو نہ کہیں نا!“ گیتی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بیمار تو آدمی کبھی بھی پڑ سکتا ہے۔ تو اس کا یہ
مطلب تو نہیں ہے کہ آپ بھی۔“

وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا انٹرکام پر کچن میں کچھ کھانے کی ہدایت دے رہا تھا۔

گیتی چپ چاپ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔
”کتنا بھلا اور پیارا شخص تقدیر نے اس کی قسمت میں لکھا تھا اور جواباً وہ اس کے لیے کیا تھی۔
تمت بدنامی۔ ذلت! بد نصیبی۔“

نچلے ہونٹ کو دانت تلے سختی سے دباتے ہوئے اس نے ان گھٹی گھٹی سسکیوں کو اندر ہی کہیں اتارا۔ وہ پھر سے
اس کے پاس آکر بیٹھ چکا تھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو!“ محبت سے گیتی کے چہرے کو چھوتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

گیتی نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔ سالار نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ آج ہمیشہ سے زیادہ پریشان اور دکھی تھی۔ مگر وہ پوری کوشش سے مستقل
نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اسی طرح فکر مند اور آنکھوں میں آنسو لیے کئی بار نظر آئی تھی۔ مگر کچھ بتانے کے لیے
تیار بھی تو نہیں۔

مگر آج تو کچھ زیادہ ہی۔

”اب میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا گیتی! اس وجہ کو میں خود ڈھونڈ نکالوں گا۔ جو تمہارے لیے دکھ کا سبب
بنی۔ یہ میری محبت کا تقاضا بھی ہے اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض بھی کہ اس نے تمہاری نگہبانی مجھے سونپی
ہے۔“ مگر خاموشی کے ساتھ اس نے خود کو یاد دلایا گیتی نے خود پر جی اس کی نگاہ سے کنفیوز ہو کر ذرا سا رخ

موڑا تھا۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی ملازم کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔

سالار نے گرانڈر مڑنے لگا تھا کہ وہ ہلکے سے بولا۔

”آپ سے کچھ بات کرنی تھی سر!“

”ہاں کہو!“ سالار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ ہوا ہے سر۔ میرا مطلب ہے کہ زرتاج میڈم اور نیل صاحب گھبرائے ہوئے ہیں۔ پریشانی پھیلی ہوئی
ہے نیچے بہت زیادہ۔ میں یہی بات آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔“

یہ ایک خاموش طبیعت اور وفادار ملازم تھا۔ جس نے کچھ بھی مالک کے علم میں لانا ضروری سمجھا تھا۔

”شکریہ تمہارا عبدل! میں دیکھ لوں گا کیا ہوا ہے۔ اگر کوئی نیچے آتا جاتا ہے تو مجھے آکر بتا دینا۔“ اس نے نرمی
سے ملازم کو ہدایت دی اور دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں“ آج عدالت میں دلائل ختم ہو گئے ہیں۔ چار دن بعد فیصلہ آ رہا ہے۔ شاید اس لیے مخالف کیمپ
میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ عبدل یہی بتا رہا تھا کہ زرتاج میڈم اور نیل بڑے پریشان ہیں آج۔ چھوڑو
تم کھانا کھاؤ۔ یہ ہمارا درد سر نہیں ہے۔ جس نے جو ظلم کمایا ہے۔ وہ اس کے انجام سے کیسے بچ پائے گا۔“ وہ سو
فیصد یقین تھا۔

گیتی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

”آپ کو لگتا ہے کہ اسے ضرور سزا ملے گی!“

”ہاں“ ایک سو دس فیصد! سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں روزی، نیل کی زندگی کا شکار ہوئی یہ بات ثبوت
کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے اور اس کا پچھلا ریکارڈ بھی اس کی بد کرداری اور غنڈہ گردی کے واقعات سے بھرا ہوا
ہے وہ انتہائی نچلے درجے کا شخص ہے، تم نے سنا نہیں کہ اس نے زری کو اپنی سگی بہن کو کئی بار فروخت کرنے کی
ٹھانی تھی۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ۔“

”نیل کی کمینگی کے اور کتنے ثبوت درکار تھے آخر؟ اور اس جیسے کتنے بھیانک لوگ معاشرے میں دندناتے
پھرتے ہیں، کھلے عام انسانیت کی وہ تذلیل کرتے ہیں کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔“

گیتی کا اس سارے سسٹم پر چین مار کر رونے کا دل چاہا، جہاں قانون کی سرپرستی میں ہر ظلم روا ہے۔
سالار اس کی پلیٹ میں کھانا نکال رہا تھا۔

”ظالم ہمیشہ ضرورت سے زیادہ بے خوف ہوتا ہے اور اسے کبھی نہیں لگتا کہ کوئی اس سے بھی پوچھنے والا ہے۔
یہ خدا سے منکر لوگوں کا شیوہ ہے گیتی۔ ظلم کے لیے بڑھنے والے ہاتھوں سے کہیں پہلے ان کے دلوں سے خدا کا
خوف یکسر مٹتا ہے، ورنہ اتنے بڑے پھاڑ کیسے ڈھائے جاسکتے ہیں۔“ کچھ جذبات سا ہو کر وہ خاموش ہو کر روزی کی
معصوم ہنسی، بھولا بھالا چہرہ اور لاوارثی شاید وہ زندگی بھر بھی بھولنے والا نہیں تھا۔

”مبارک ہیں وہ لوگ جن کے دل میں رائی برابر بھی خوف خدا ہے۔“ سالار کی آواز دھیمی پڑی تھی۔
”اور وہ اس بے حد پیارے شخص کو اس دکھ سے کیسے بچا سکتی ہے۔ جو وہ چار دن بعد نیل کو ہنا کسی سزا کے
عدالت سے باہر آتا دیکھ کر جھیلے گا۔“ حلق میں اٹکتے نوالے کو پانی کے ساتھ گیتی نے بمشکل اتارا تھا۔

”محض چند دن اور، جتنی بھی بھاگ دوڑ کریں یہ لوگ، نیل اب بچنے والا نہیں ہے کسی بھی صورت!“
وہ بچ چکا ہے!“ گیتی نے خود کو کہنے سے روکا تھا۔

”فصلے کے بعد راجو زری کو لے کر اپنے گاؤں جائے گا۔ اور میں تمہیں لے کر اپنی سسرال۔ بہت دن ہو گئے ہیں نانی تو سوچتی ہوں گی کہ میں تمہیں لے کر فرار ہو چکا ہوں۔ کہیں دور۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا اور اس کا دل رکھنے کے لیے کیتی بھی۔

”بس اتنا ذرا سا۔“ وہ اسے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے دیکھ کر اس کی پلیٹ میں مزید کچھ ڈالنے لگا تھا مگر کیتی نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”بس واقعی اب اور نہیں پھر کھالوں گی۔“

”ٹھیک ہے پھر چائے پیتے ہیں!“ اسے کھانے کے بعد چائے کی عادت تھی۔

وہ کیتی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہا تھا، لیکن بار بار اپنے ذاتی کاموں کے لیے ملازموں کو نیچے اوپر کی دوڑ لگوانا بھی اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔

سیڑھیوں پر اسے لے کر آتا دیکھ کر عبدل تیزی سے اس کے قریب آیا۔ ”آپ نے کیوں تکلیف کی سر۔۔۔ میں اوپر آکر لے جاتا۔“

”کوئی بات نہیں عبدل۔ بہت شکریہ تمہارا۔ اب ذرا چائے لے آؤ پلیز!“ وہ کہتا ہوا مڑنے لگا تھا کہ کسی عجیب سے احساس نے اسے رکنے پر مجبور کیا۔

کون تھا جو گھٹے گھٹے سے انداز میں رو رہا تھا۔ بہت بے قراری کے ساتھ؟

”میڈم زرتاج کے بیٹے کا بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے لندن میں۔ مجھے نیل صاحب کے ملازم نے بتایا ہے ابھی ابھی۔۔۔ بتانے ہی آ رہا تھا میں آپ کو۔“

”کیا؟“ سالار نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ملازم کا سر ہلکے سے اثبات میں ہلاتا تھا۔

”او خدا!“ وہ چند لمحے عجیب متضاد سی کیفیت میں گھرا وہیں کھڑا رہا۔

”مانی!“

جسے اس نے آخری بار تب دیکھا تھا جب وہ ایک نو عمر سالر کا تھا۔ بے حد لاڈلا، خود سر۔ اپنی ماں کی شہ پر دل بھر کر اس کی بے عزتی کرنے والا۔

وہ دن جب زرتاج اس سے مانی کے جوتے پالش کروانے اور کپڑے استری کرنے سے لے کر اس کی جھوٹی پلیٹ کی بخشش کیا کرتی تھیں اور وہ تیز تیز دھڑکتے دل کے ساتھ خوف میں گھرا ہر وہ کام کیے جاتا تھا جس کا حکم ملتا تھا۔ پھر بھی بری طرح پٹتا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد اچانک ہی زندگی کے اس تاریک ترین دور نے لاؤنج کی سیڑھیوں پر اسے گھیرا۔ وہ سارا وقت جو وہ بھولے سے بھی یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رونے کی وہ آواز اب بلند ہو رہی تھی۔

سالار نے ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کیا اور نیچے اتر آیا۔ لاؤنج کے بڑے صوفے پر بیٹھی ہوئی زرتاج کی ردی ہوئی حالت اسے کچھ فاصلے سے ہی نظر آگئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی آنکھیں سوچ چکی تھیں اور چہرے کی کڑھکی میک اپ بہہ جانے کے بعد اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ نیل ان کے قریب کھڑا موبائل پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔

”اتنی دیر ہو گئی۔ تم سے ایک سیٹ کنفرم نہیں کروائی جا رہی ہے۔ وہاں پتا نہیں کیا قیامت گزری ہے۔“

سالار نے انہیں چلاتے ہوئے سنا تھا۔

”اتنی دیر ہو گئی۔ تم سے ایک سیٹ کنفرم نہیں کروائی جا رہی ہے۔ وہاں پتا نہیں کیا قیامت گزری ہے۔“

سالار نے انہیں چلاتے ہوئے سنا تھا۔

وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آکر ٹہرا۔

”آپ چاہیں تو میں آپ کی ابھی پہلی فلائٹ سے سیٹ کنفرم کروا دیتا ہوں۔“

زرتاج نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”وہ یقیناً“ کروا سکتا تھا!“ اس وقت وہ اتنی پریشان تھیں کہ پہلا خیال انہیں یہی آیا تھا۔

”اپنا پاسپورٹ دے دیجئے۔ میں آپ کے جانے کا انتظام کر دیتا ہوں جلد سے جلد۔۔۔“ نیل کو قطعی نظر انداز کر کے وہ صرف زرتاج سے مخاطب تھا۔

وہ اس کے باپ کی بیوی رہ چکی تھیں اور مانی اس کے باپ کی ہی اولاد تھا۔

صرف یہی ایک سوچ سالار کو مدد کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

زرتاج نے اپنا چہرہ خشک کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے سوچنا چاہا۔

تب ہی نیل بڑھ کر ان دونوں کے بیچ آکر کھڑا ہوا تھا۔

”ہمارے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا سمجھتے ہو جھوٹی ہمدردی جتا کر احسان کرو گے۔۔۔ دفع ہو جاؤ!“ سالار کی اٹھی ہوئی انگلی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

”مت بھولو کہ کسی کو بھی دفع ہونے کا کہنے کا حق صرف میرا ہے اس لیے کہ یہ میرا گھر ہے۔۔۔“

زرتاج ہسٹرکل ہو رہی تھیں۔ ”یہ گھر میرا ہے۔ میرے مانی کا ہے اور کسی کا نہیں۔۔۔ وہ آئے گا تو تمہیں دھکے دے کر باہر نکال دے گا۔۔۔ سب کچھ پھین لے گا، کچھ نہیں چھوڑے گا تمہارا پاس وہ۔ اب بس اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں گی۔ تم نے سمجھا کیا ہے خود کو سالار، نفرت ہے مجھے تم سے تمہاری بیوی سے بڑا دھوکے تم لوگ۔۔۔“

ان کی چیخوں سے گھر گونج رہا تھا۔ سالار خاموشی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

”خود کو سنبھالو زرتاج۔۔۔ دیکھو، تمہیں ابھی سفر بھی کرنا ہے اس طرح کیسے۔“ خود نیل کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

”انہیں نکالو یہاں سے نیل، میں ان کی شکلیں نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”کل کے بعد یہ خود اپنی شکلیں نہیں دیکھنا چاہیں گے، کاش آج تمہیں نہ جانا پڑتا تو تم دیکھتیں کہ اس اسکول اوپننگ میں کیسے منہ چھپانا پڑے گا سالار کو۔“

اس نے اپنی ہی بات سے بھرپور مزہ لیا تھا۔

زرتاج نے کچھ سنا تھا اور کچھ نہیں سمجھا۔

”مجھے فون دو، میں خود بات کرتی ہوں۔ مجھے جانا ہے آج ہی۔“ انہوں نے جھپٹنے کے سے انداز میں نیل سے فون چھینا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بیشری احمد

”توبہ! تم لڑکیوں کو دوستیاں گانٹھنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ تمہاری سیلیوں کا حلقہ تو دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔“

ابھی ابھی غالب بھائی اسے اس کی ایک سیلی کی برتھ ڈے پارٹی سے لے کر لوٹے تھے اور گھر آکر اپنی حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ وہاں تقریباً ”درجن بھر لڑکیوں سے تحریم نے یہ کہہ کر تعارف کروایا تھا کہ یہ اس کی بہت اچھی سہیلیاں ہیں۔“

اس کی بچپن کی سیلیوں سے تو غالب بھائی بخوبی آگاہ تھے۔ اس کی پیسٹ فرینڈ ارشین تو گویا اب ان کے گھر کا ایک فرد ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا گھر بھی قریب تھا اور وہ دونوں کلاس فیلو بھی تھیں۔ تحریم کا آدھا دن اس کے گھر گزرتا تو ارشین کا باقی آدھا یہاں مگر جب سے تحریم کالج گئی تھی اس کی بہت سی نئی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اگرچہ پیسٹ فرینڈ کا رتبہ ابھی بھی ارشین کو ہی حاصل تھا لیکن ارشین نے گھر کے قریب ترین کالج میں داخلہ لیا تھا جبکہ وہ اپنے اچھے نمبروں کی بنیاد پر شہر کے بہترین کالج میں داخلے کی اہل تھیں۔ جو گھر سے نسبتاً ”فاصلے پر واقع تھا۔“ یک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری غالب بھائی کے کندھوں پر آن پڑی۔

چھوٹی اور اکلوتی لاڈلی بہن کی اچھی تعلیم کے پیش نظر وہ یہ ڈیوٹی بخوشی نبھا رہے تھے لیکن مسئلہ تب پیدا ہوتا جب تحریم اپنی نئی نئی سیلیوں کے ہاں جانے کی ضد کرتی۔ جانے کیوں لڑکیوں کو اپنی سالگرہ منانے کا اتنا خط ہوتا ہے۔ ہر ہفتے تحریم اپنی کسی سیلی کی برتھ

ڈے پارٹی میں مدعو ہوتی۔ اماں، اپا کی طرف سے انجانی لڑکیوں کے گھر جانے کی اسے قطعی اجازت نہ ملتی ہاں اگر غالب بھائی ساتھ جانے پر تیار ہو جاتے تو اماں، ابا سے اجازت دلوا ہی دیتیں۔ غالب بھائی بھی چھوٹی بہن کی خوشی کے پیش نظر اسے ساتھ لیے لیے پھرتے البتہ گھر آکر کانوں کو ہاتھ ضرور لگاتے تھے۔

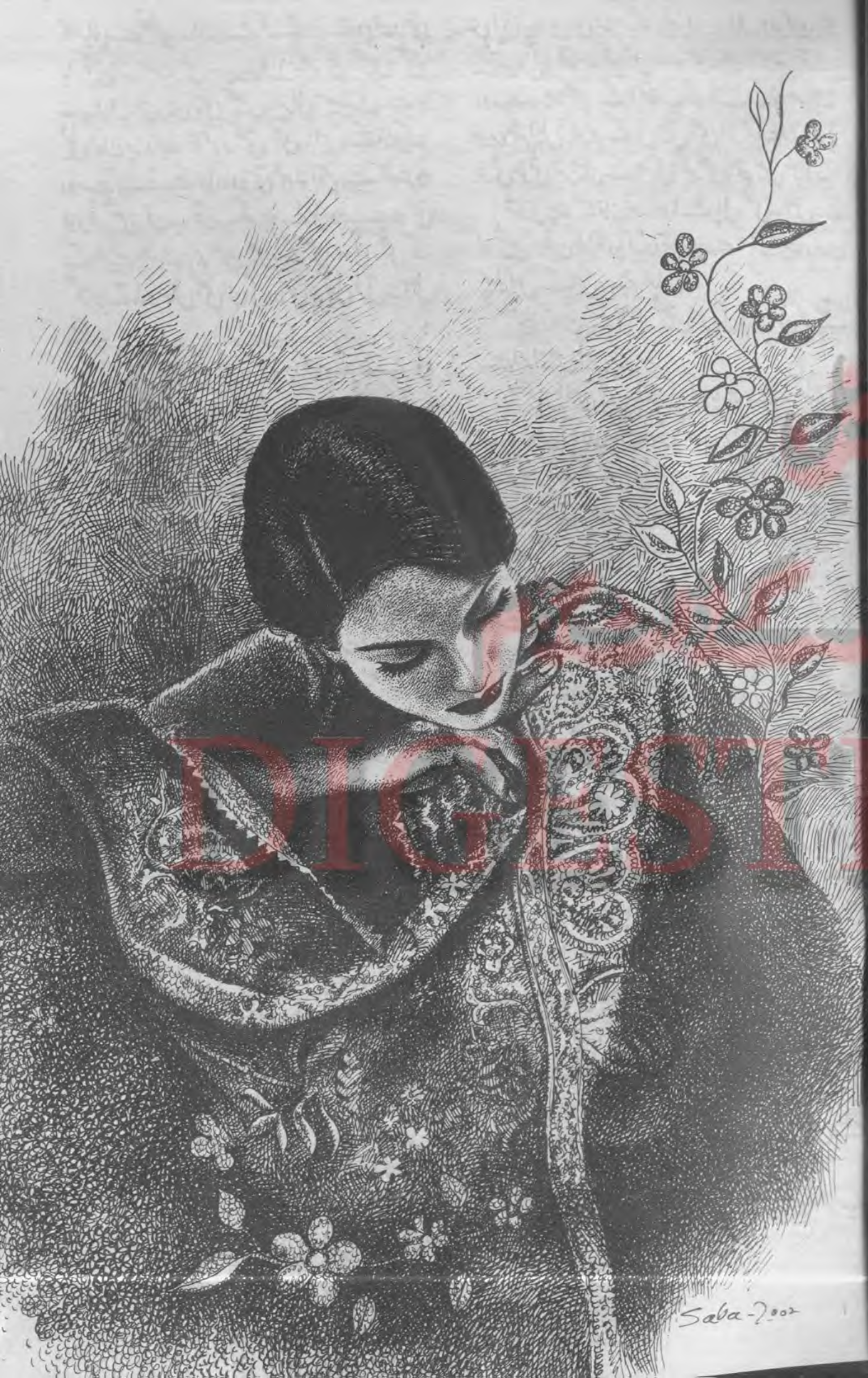
”مجھے تو لگتا ہے، شہر کی آدمی لڑکیوں سے تو تم دوستی گانٹھ ہی چکی ہو گی۔“

”ہاں آدمی لڑکیوں سے میں اور باقی آدمی لڑکیوں سے ارشین۔“

تحریم کھلکھلائی تھی۔ ارشین اس سے ملنے آئی ہوئی تھی اس نے بھی ہنستے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔

”ہاں میری طرح ان کے گھر میں بھی ایک کاٹھ کا الو بٹا ہے نا۔“ غالب بھائی ہنس پڑے تھے۔ ان کا اشارہ ارشین کے بھائی احمد کی طرف تھا۔ وہ بے چارہ بھی بکنا جھکتا ارشین کو موٹر سائیکل پر بٹھائے ادھر ادھر گھمانے پر مجبور تھا۔ کبھی کسی تھیلی سے نوٹس چاہیے ہوتے، کبھی کسی کی والدہ کی عیادت تو کبھی کسی کی بہن کی منگنی میں شرکت۔۔۔ دونوں سیلیوں کی سوشل ایکٹیویز کی کوئی حد نہ تھی۔

ارشین کا بھائی احمد اس سے ڈیڑھ برس چھوٹا تھا۔ وہ تو کبھی کبھار رنج ہو کر انکار بھی کر دیتا لیکن تحریم شکر کرتی کہ غالب بھائی بادل خواستہ ہی سہی مگر اسے اس کی سیلیوں کے ہاں لے جاتے ہیں۔ وہ بہت مخلص لڑکی تھی۔ اپنی تمام سہیلیاں اسے بہت عزیز تھیں۔



کامیابی سے تعلیمی درج طے کرتے ہوئے وہ یونیورسٹی جا پہنچی۔ بہت سی سہیلیاں بچھڑ گئی تھیں مٹی سہیلیاں مزید بن چکی تھیں۔ پرانی سہیلیوں سے وہ ٹیلی فون پر رابطہ قائم رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک دوست بنانے سے زیادہ دوستی نبھانا اہم ہے۔ البتہ وہ اور ارشین قریب قریب گھر ہونے کی وجہ سے دوستی کے ایسے انٹ بندھن میں بندھی ہوئی تھی کہ گزرتے ماہ و سال بھی ان کی دوستی پر کوئی فرق نہ ڈال سکے۔

ارشین پڑھائی میں بس درمیانے درجے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس نے بی اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہا اور گھر بیٹھ کر امور خانہ داری میں مہارت حاصل کرنے لگی۔ اسے خود تو شادی کا شوق تھا ہی گھر والے اسے پیادیں سدھارنے کے لیے اس سے زیادہ بے تاب تھے۔

دانیال اشرف، ارشین کا دور پرے کا کزن تھا۔ وہ ہی اس کا نصیب ٹھہرا۔ تحریم نے ارشین کی شادی میں دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اپنی مشکل ترین پڑھائی کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے چند دن صرف اور صرف ارشین کے نام کر دیے۔ کبھی اس کے ساتھ بازاروں کی خاک چھان رہی ہوتی۔ کبھی اسے لیے بیوی پارلر کے چکر کاٹی۔ اس کے جینز کے کپڑوں کی پیکنگ 'ماریوں' ہندی کے لیے ارشین کے گھر کے ہال کرے کی منفرد سی سجاوٹ سے غرض ارشین کی شادی کا ہر کام تحریم کی بدولت پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس کی رخصتی پر تحریم نے اتنے نیر بہائے کہ دلہن بنی ارشین کو خود اسے چپ کروانا پڑا۔ بہر کیف ارشین رخصت ہو کر لاہور سے میلوں دور شجاع آباد جیسے چھوٹے شہر میں جا بسی۔

مہینوں بعد وہ میکے آئی تو ماں، باپ، بہن بھائیوں سے مل کر جھٹ تحریم کے گھر کا رخ کرتی۔ تحریم کا ماسٹرز مکمل ہو گیا تھا اور آج کل وہ گھر داری سیکھنے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھی۔

غالب بھائی کی چند سال بستر شادی ہو چکی تھی۔ ان کی بیگم رومیہ بھابی بہت اچھی تھیں۔ انہوں نے

ہی اپنی پیاری سی نند کے لیے اپنے خالہ زاد کزن کا انتخاب کیا تھا۔ شرجیل۔ میکینیکل انجینئر تھا۔ رومیہ بھابی کے انتخاب کو سب نے سراہا۔ خوبو شرجیل، تحریم کے دل میں بھی اتر گیا۔ اس نے خوشی خوشی شرجیل کے نام کی انگوٹھی ہاتھ میں سجائی۔ شادی چند مہینوں بعد ہونا طے پائی تھی۔ اس نے ارشین کو فون کھڑکا دیا کہ وہ شادی سے کم از کم پندرہ دن پہلے اس کے پاس رہنے آجائے۔

”پندرہ دن پہلے؟“ ارشین اس کی بات سن کر پھیکے سے انداز میں ہنس پڑی۔

”کیوں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری بیسٹ فرینڈ ہوں۔ تمہاری شادی پر میں نے بازاروں کے چکر کاٹ کاٹ کر اپنی جوتیاں گھسادی تھیں۔ اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں ہر صورت آنا ہے۔“ اس نے مان بھرے لہجے میں دھونس جمائی۔

”تمہارا احسان تسلیم کر لیا مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت جو تمہاری حیثیت تھی اس میں اور میری موجودہ حقیقت میں بہت فرق ہے۔ اگر تمہاری شادی مجھ سے پہلے ہوتی تو یقیناً میں اسی جوش و خروش سے شرکت کرتی جس طرح تم نے میری شادی میں کی لیکن اب میں ایک ذمہ دار اور میچور شادی شدہ عورت ہوں۔ اگر میں نے تمہاری شادی میں شرکت کے لیے ہفتہ بھر بھی پہلے جانے کی اجازت مانگی تو میرے سسرال والوں کے علاوہ میرے سرباج محترم بھی مجھے ایسی حیرت سے تنگیں گے کہ جیسے میں نے کوئی بہت انوکھی بات کر دی ہو۔ بہر حال میں کوشش کروں گی کہ شادی سے ایک دو دن پہلے پہنچ جاؤں۔“ ارشین کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہونا ارشین! دانیال بھائی تمہارے ساتھ آتے ہیں نا، تمہارا خیال تو رکھتے ہیں۔“ اسے اپنی فکر چھوڑ کر ارشین کی فکر دامن گیر ہوئی۔

”ہاں ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دانیال بھی آجے ہیں۔“

آخر کار اس کی شادی کا وقت بھی آن پہنچا۔ اس کی آنکھیں منتظر رہ گئیں مگر اس کی بچپن کی بھجولی، جو اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی شادی میں شرکت کے لیے نہ پہنچی البتہ اس کی یونیورسٹی فیلوز نے خوب رونق لگائی مگر ان میں سے کوئی ارشین کی کمی تو پوری نہ کر سکتا تھا۔

اسے ارشین سے کوئی شکایت نہ تھی، وہ اس کی مجبوری سمجھ چکی تھی۔ اس کے شوہر کو بیوی کے احساسات سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس نے محض ایک سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے بیوی کو اتنی دور بھیجنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ ارشین نے اپنی امی کے ہاتھ اسے شادی کا تحفہ بھجوا دیا تھا اور اس کے سیل فون پر معذرت کا ایک میسج بھی۔

”شادی شدہ عورت کے لیے دوستی نبھانا بہت مشکل ہے تحریم! میری مجبوری سمجھ کر معاف کر دینا۔“

اور اس نے ارشین کو تو معاف کر دیا تھا مگر دانیال پر خوب ہی تاؤ چڑھا۔ ایسی حاکمانہ فطرت کے مرد زہر لگتے تھے اسے۔ شکر ہے شرجیل ایسا نہ تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی اسے اس کی نرم طبیعت کا اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ دونوں میں ایک بات مشترک تھی دونوں کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا بلکہ اس بات کی طرف غالب بھائی نے ہی توجہ دلائی تھی۔ آدمی سے زیادہ بات شرجیل کے دوستوں پر مشتمل تھی اور شادی کے بعد دعوتوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاندان والے تو پھر بھی جلد نمٹ گئے تھے شرجیل کے دوستوں کی طرف سے دعوتوں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہا تھا۔ آخر کار اس نے تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔

”پلیز شرجیل! فی الحال باقی دوستوں سے معذرت کر لیجئے۔ میرا معدہ دعوتی کھانے کھا کھا کر اب سیٹ ہو گیا ہے۔ اب گھر کا پکا ہوا پکا پھلکا کھانے کو دل کرتا ہے۔“ شرجیل اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔

”خبردار لڑکی! ایسی کسی بات کی میرے دوستوں کو

بھٹک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ دعوتیں تو ہمیں ہر صورت اینڈز کرنی ہیں۔ میرے دوستوں نے مجھے وارننگ دے رکھی ہے کہ میں شادی کے بعد بدل گیا تو وہ میرا شرنشر کر دیں گے۔“

شرجیل کے انداز پر وہ بھی ہنس دی تھی۔ وہ واقعی دوستیاں نبھانے والا شخص تھا۔ اس کے دوست وقت بے وقت آتے رہتے اور وہ ان کی بھرپور خاطر مدارت کا سامان کرتا۔

تحریم کی چھوٹی نند سامعہ نے تو اس کی شادی کے بعد باقاعدہ شکر منایا تھا کہ اب بھائی کے دوستوں کی خاطر تواضع کے لیے بھابی آگئی ہیں، ورنہ اس کے بقول پہلے اسے پکن سے نکلنا ہی نصیب نہ ہوتا تھا۔ تحریم کو خیر شرجیل کے دوستوں کی خاطر مدارت سے کوئی الجھن نہ ہوتی تھی۔ شرجیل کے اکثر دوست چائے پر آتے اور کھانا کھا کر جاتے۔ تحریم نے بخوش پکن کی ذمہ داری سنبھال لی تھی بلکہ اس نے تو شرجیل کے اکثر دوستوں کی بیگمات سے خود بھی دوستی گانٹھ لی تھی۔ اس بات نے شرجیل کو بہت خوش کیا۔

تحریم کو خود اپنے ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج رکھنے والے میاں سے عشق سا ہو گیا تھا۔ زندگی اسے بہت خوب صورت لگنے لگی تھی اور چند مہینوں بعد ننھے مہمان کی خوش خبری کیامی شرجیل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ وہ تحریم کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

ننھے شافع کے آنے کے بعد تو گویا زندگی بالکل مکمل ہو گئی تھی۔ شافع دو مہینے کا تھا کہ شرجیل کے چچا زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے اسے ملتان جانا پڑا۔ اس کی ساس جوڑوں کے درد کی وجہ سے لمبا سفر نہ کر سکتی تھیں۔ چھوٹی نند کے پیپر نہ تھے۔ وہ خود بھی گرم موسم اور چھوٹے بچے کی وجہ سے سفر سے ہچکچا رہی تھی لیکن اولیں شرجیل کا نہ صرف کزن تھا بلکہ بہت اچھا دوست بھی۔

شرجیل کو دوستی کا مان تو رکھنا تھا۔ وہ تحریم اور شافع کو لے کر شادی سے تین دن پہلے ملتان پہنچ گیا تھا۔

شادی والا گھر مہمانوں سے کھینچ بھرا ہوا تھا۔ شافع کورش کی عادت یہ تھی۔ وہ نہ صرف خود بے آرام ہو رہا تھا بلکہ رورو کر تحریم کو بھی پریشان کر رہا تھا۔ اوپر سے بلا کی گرمی اور لوڈ شیڈنگ کا عذاب بچا کے گھر جنریٹر کا انتظام تو تھا مگر جنریٹر پر ایر کنڈیشنر نہیں چلتا تھا۔ جس اور گرمی نے مہمانوں کو عاجز کر دیا تھا۔

چچا کے گھر والے خود تہیہ کر رہے تھے کہ آئندہ کسی بچے کی شادی کے لیے ان مہینوں کا انتخاب نہیں کریں گے۔ بہر طور شادی تو کسی طرح نمٹ ہی گئی اور جس دن ولیمہ تھا اتفاق سے اس روز اس کے موبائل پر ارشین کی کال آگئی۔

مدتوں بعد اس کی سہیلی نے اسے یاد کیا تھا۔ شافع سے پہلے تحریم خود مہینے میں ایک آدھ بار اس کو فون کر کے اس کی خیر حیرت لے لیتی تھی لیکن سچی بات یہ تھی کہ شافع کے بعد وہ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اتنی مصروف رہتی کہ گھر والوں کو فون کرنے کا نام نہ ملتا ارشین کا نمبر تو بعد میں آتا تھا۔ آج غیر متوقع طور پر ارشین کی آواز سنی تو بے ساختہ خوشی کا احساس ہوا۔

”شافع کے بعد تو تم نے بھلا ہی دیا ورنہ مجھے اطمینان تھا کہ چلو تمہاری بدولت ہماری دوستی یک طرفہ طور پر سہی پر قائم تو ہے۔ ہم تو سرالی بھتیختوں میں ایسے پھنسے ہیں کہ اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔“

ارشین لمبے چوڑے سرال کو بھگتاتے بھگتاتے عاجز آچکی تھی اور برملا اعتراف کرتی تھی کہ ان دونوں کی دوستی کا سلسلہ صرف تحریم کی وجہ سے قائم ہے۔

”شافع نے ہی تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہم ملتان آئے ہوئے ہیں شادی میں اور یہاں کی گرمی میرے بیٹے سے برداشت نہیں ہو رہی۔“ اس نے ارشین سے اپنی پریشانی شیئر کی۔

”تم ملتان آئی ہوئی ہو۔“ ارشین تو سنتے ہی گویا اچھل پڑی۔

”چار دن ہو گئے ہیں آئے ہوئے اور ابھی دو تین

دن مزید رہنا ہے۔“ اس نے کوفت زدہ ہو کر جواب دیا۔ ملتان میں دو در پرے کے کافی رشتہ دار بستے تھے اور اس کی ساس کا آرڈر تھا کہ سب سے مل کر آنا ہے۔

”تم میرے اتنے قریب آ کر مجھ سے ملے بغیر جاؤ گی۔ شجاع آباد آخر ملتان سے دور ہی کتنا ہے۔“

ارشین اس کے ملتان میں موجود ہونے پر پر جوش ہو گئی تھی۔ دونوں کو ملے ہوئے اتنا عرصہ بھی تو ہو گیا تھا۔ وہ ارشین کی بات پر ایک لمحے کو چپ ہو گئی سچ تو یہ تھا کہ اس کے اپنے ذہن میں بہت باریہ بات آئی تھی کہ وہ ارشین سے بھی ملنے جائے لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے ارشین سے رابطہ نہیں کیا کہ کہیں اس کے سرال والے اس سے اور شرجیل سے بے رخی سے پیش نہ آئیں اور ارشین بے چاری کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ ارشین نے اپنے سرالیوں کا کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ رکھا تھا سو اس نے دل کی خواہش دل میں دبالی تھی مگر اتفاق سے آج ارشین کا خود ہی فون آگیا تھا۔ وہ اسے پر زور طریقے سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہی تھی۔

”لیکن دانیال بھائی اور تمہارے سرال والے کہیں وہ۔۔۔“ اس نے متذبذب ہو کر کچھ کہنا چاہا۔

”خدا کا نام لو تحریم! دانیال اب اتنے بھی برے نہیں۔ میرے کہیں آنے جانے کے خلاف ضرور ہیں لیکن گھر آئے مہمانوں سے بہت عزت و احترام سے پیش آتے ہیں اور تو اور میرے سرال والے بھی مہمانوں کو فل پروٹوکول دیتے ہیں۔ یہ دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں یا ر! مہمانوں کو تو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں۔ تم کسی خدشے کو ذہن میں جگہ مت دو۔ میں ابھی سے تمہاری کل کی دعوت کی تیاری شروع کر رہی ہوں۔ کل دوپہر کا کھانا تم نے یہاں کھانا ہے بلکہ صرف دوپہر کا نہیں تم نے رات بھی یہیں رکنا ہے۔ تمہیں گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے نا، میں تمہیں ساتھ والے گاؤں کی بھی سیر کرواؤں گی جہاں ہم لوگوں کی زرعی زمینیں ہیں۔“ ارشین نے جھٹ پورا پروگرام ترتیب دے ڈالا۔

”رات رات رات تو خیر مشکل ہو جائے گا۔ بس ہم دوپہر کا کھانا تمہارے ہاں کھائیں گے اور شام کو واپس آجائیں گے۔“ تحریم نے پروگرام میں رد و بدل کر کے اسے آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بابا! تم آؤ تو سہی۔ شرجیل بھائی کو میں خود منالوں گی۔ وہ تمہیں رات رکھنے دیں گے۔“

ارشین بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ تحریم ہنس پڑی۔

”شرجیل کی اجازت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تو ایک رات چھوڑ مجھے دو راتیں تمہارے ساتھ گزارنے کی اجازت دے دیں گے لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔ یہاں ملتان میں شرجیل کے بہت سے ننھیالی عزیز بھی رہتے ہیں۔ ان سب سے مل کر جانا ہے۔“ اس نے رسائیت سے آگاہ کیا۔

”اوکے چلو۔ ٹھیک ہے لیکن کل کا پروگرام تو پکا ہے نا۔“ ارشین نے اس کی مجبوری سمجھ لی تھی۔

”ہاں ان شاء اللہ۔“

اس نے اسے یقین دہانی کروا کر فون بند کر دیا کہ اسٹیج پر تصویر کھنچوانے کے لیے اس کے نام کی پکار پڑ رہی تھی۔ ولیمہ کے فنکشن سے فراغت کے بعد اس نے شرجیل کو کل کے پروگرام سے آگاہ کیا تھا۔

”تم نے مجھ سے پوچھے بغیر پروگرام فائل کر دیا۔“

شرجیل نے اپنے منہ سے پوچھا۔

”تو آپ نے کوئی منع تھوڑی کرنا ہے۔“ وہ مان بھرے لہجے میں بولی۔

”منع کرنے والی بات ہوگی تو ضرور منع کروں گا۔ میں اتنی دور اور اتنی گرمی میں جمل خوار ہو کر کسی ایرے غیرے سے ملنے نہیں جاسکتا۔“

شرجیل کے سپاٹ سے انداز پر اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ شاید موسم کی گرمی اس کے دماغ پر بھی چڑھ گئی تھی ورنہ وہ تو بہت دھیمے لہجے میں بات کرنے والا شخص تھا۔

”ارشین میری بیسٹ فرینڈ ہے شرجیل! بچپن لڑکپن اور پھر جوانی سے ہماری عمر کا بڑا حصہ ایک

دوسرے کے ساتھ گزرا ہے۔ وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے اور پھر اتنے خلوص سے اس نے مجھے انوائٹ کیا ہے میں کیسے اسے انکار کرتی۔“ اس نے شرجیل کو رسائیت سے سمجھانا چاہا تھا۔

”دیکھو تحریم! بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم اب ایک میچور شادی شدہ عورت ہو۔ اپنے بچپن لڑکپن وغیرہ کی دوستیوں کو بھلا کر تمہیں ذمہ داریوں اور ماں ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔ دوستیاں نبھانا لڑکیوں کے لیے شادی سے پہلے کے چونچلے ہو سکتے ہیں شادی کے بعد ایسی دوستیوں کی قطعی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے ہاں ہی کیوں بھری۔ تم ابھی اپنی سہیلی سے فون کر کے معذرت کر لو۔ میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ کل شکور انکل وغیرہ کے ہاں جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی لیکن امی کی تاکید تھی ان کے تو جانا پڑے گا تم لٹائے نئے پروگرام سیٹ کر رہی ہو۔“

شرجیل کوفت اور بیزار سی سے مخاطب ہوا تھا۔ تحریم چند لمحوں تک اسے بے یقینی سے تکتی رہی یکایک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ شرجیل کی اس پر نگاہ پڑی تو اسے اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا۔

”سوری یار! میں تم سے کچھ سخت پول گیا لیکن کیا کروں تم نے بات ہی اتنی بے تکی کی تھی کہ میرا میٹر گھوم گیا۔ شاید تھکن اور گرمی کی وجہ سے میں نمپر لوڈ کر بیٹھاؤںس آگین سوری اور اپنی سہیلی سے میری طرف سے بھی معذرت کر لینا کہہ دینا ہمارے پاس وقت کم ہے ورنہ ضرور آتے۔“

شرجیل اب اسے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ تحریم کے لبوں پر پھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور ارشین کو معذرتی میسج ٹائپ کرنے لگی۔

دوستیاں کرنا اور پھر انہیں نبھانا یہ یقیناً ”مردوں کا ہی وصف ہے۔ بہت بعد میں سہی مگر یہ حقیقت تحریم کو سمجھ آگئی تھی۔

لکھی زندگی

ہماری اماں خاصی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اتنی کہ ایک مشہور و معروف کالج میں پڑھاتی ہیں۔ مگر ہمارے ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے باتوں باتوں میں مختلف طریقوں سے ہمیں وہ ہی پچھلی صدی کی ماؤں والا سبق اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ شادی کے بعد ہمیں جس گھر میں قدم رکھنا ہے وہاں سے پھر اپنے قدموں پر نہیں بلکہ چار لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر ہی نکلنا ہے اور یہ کہ جس اعلا و ارفع شخصیت سے ہمارے دو بول پڑھا دیے جائیں اس کے ہر قسم کے بول ہمیں اپنے ہونٹوں پر چپ کا فضل لگا کر انتہائی خندہ پیشانی سے سننے ہوں گے اور جب وہ کوئی فرمان جاری کر رہے ہوں تو ٹک ٹک ویدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر ان کی ہر بات پر آمنہ و قانع ہونا ہمارے فرائض میں شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ نئے زمانے کا یہ خناس بالکل بھی ہمارے دماغ میں نہ سمانے پائے کہ عورتوں کے حقوق و درجات مردوں کے برابر ہونے چاہئیں، کیونکہ مردوں کی برابری کی خواہش رکھنے والی عورت نہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔ گھر اور گھاٹ والی مثال سن کر ہمیں اپنا آپ بہت ہی حقیر سا لگنے لگتا۔ مگر ہم یہ سوچ کر صبر کر لیتے کہ گل و گلزار ہونے کے لیے دانے کو خاک میں ملنا ہی پڑتا ہے۔

”جب اللہ نے مرد کا درجہ بلند رکھا ہے تو بیوی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ایک اسٹیپ نیچے رہے تاکہ وہ سر اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھے۔ مرد کی عزت کر کے

ہی عورت اپنا مقام بنا سکتی ہے۔“

اماں کا یہ عجیب و غریب فارمولا سن کر ہم پریشان ہو جاتے کہ اپنا کوئی مقام بنانے کے لیے ہمیں ہمیشہ ایک سیڑھی اپنے ساتھ رکھنی ہوگی۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے فرمودات وہ گاہے بگاہے ہماری سماعتوں میں اندھلتی رہتی تھیں۔

ابا تو ہمارے بچپن میں ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گئے تھے تو اماں نے ہمیں تن تنہا ہی پروان چڑھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پروان تو ہم جیسے تیسے چڑھ ہی گئے۔ مگر ہمارے سارے پر کٹے ہوئے تھے اور شخصیت کے معاملے میں ہم بالکل دبو اور ڈر پوک سے تھے۔ حالانکہ ہماری اماں خود تو بڑی دنگ قسم کی خاتون تھیں۔ جب کسی کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتیں تو وہ بے چارہ وہیں قسم کر رہ جاتا۔ کم بولتی تھیں مگر جب کچھ کہتی تھیں تو ان کا لہجہ ایسا ہوتا تھا جیسے کسی سخت گیر پولیس آفیسر کا ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں کہ ہمیشہ سے ہی ان کا انداز ایسا تھا یا اسکول کالج میں پڑھا پڑھا کر ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ایک بار کہہ دیتیں سننے والے کے پاس اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا تھا تو ہم بے چارے تو کسی شمار میں ہی نہیں تھے۔

انہوں نے ہمیں انسان بنانے کے لیے بڑے جتن کیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے انسان ہونے کے معیار تک پہنچنا کم از کم کسی انسان کے بس کا روگ نہیں تھا اور پھر ہمیں انسان بنانے کے مشن میں وہ کس

حد تک کامیاب ہوئی تھیں۔ اس کا فیصلہ بھی وہ ہی کر سکتی تھیں۔ مگر ہمیں دیکھنے والے کبھی صاف لفظوں میں اور کبھی اشاروں اشاروں میں یہ ہی کہتے تھے کہ ہماری اماں نے ہمیں اکیسویں صدی میں گزشتہ صدی کا شاہکار اور کچھ لوگوں کے بقول ”نمونہ“ بنا دیا تھا۔ مگر قیص کار و اج ہو تو اننگی قیص اور جب سب شارٹ شرٹ پہنے ہوتے تو ہماری قدموں میں لوٹتی ہوئی قیص ہماری خاص پہچان ہوتی۔ ہمارے نرم و ملائم ریشمی بال ہمیشہ کسی ہوئی چوٹی میں بندھے ہوتے۔ ناخن اس قدر گہرائی میں کٹے ہوئے ہوتے کہ اکثر لوگ بڑی کراہیت سے ہماری طرف دیکھتے کہ شاید ہم دانستوں سے ناخن کترنے کی عادت بد میں مبتلا ہیں۔ یہ تو

شکر ہے کہ صابن سے منہ دھونے کی اجازت تھی، ورنہ منہ دھونے کے بعد ہمارا چہرہ جس طرح سے جگمگا اٹھتا، ہمیں ہر دم یہ ہی خوف رہتا کہ کہیں کسی روز صابن کے استعمال پر بھی پابندی نہ لگ جائے۔ یہ نہیں کہ یہ ساری پابندیاں صرف ہمارے لیے تھیں، وہ خود بھی بہت سادہ رہتی تھیں، کیونکہ جوانی میں ہی ہمارے ابا ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے تو اسی وقت سے انہوں نے لوگوں کی بے لگام زبانوں کے خوف سے بالکل سادہ رہنے کی عادت ڈال لی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس سادگی میں بھی وہ اس قدر خوب صورت لگتی تھیں کہ جو بھی ان کی طرف دیکھتا، چند لمحوں کے لیے اس کی نظر ان پر ٹھہری جاتی۔ ان کا دیلا پتلا سراپا



اڑے اڑے سے رنگوں والے کپڑوں میں بھی ایک خاص جاذبیت کا حامل تھا۔ ہر قسم کے احساسات سے عاری آنکھوں اور لہجے کے روکھے پن کے باوجود ان کے چہرے پر نرمی کا جو تاثر تھا وہ ان کے نہ چاہنے کے باوجود لوگوں کو ان کی طرف مائل کرتا تھا۔ مگر وہ چند گنے چنے لوگوں کے علاوہ نہ خود کسی سے ملتی تھیں اور نہ ہمیں اس کی اجازت تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے بے کار کی دوستیاں پالنے کی۔ لوگ جیسے نظر آتے ہیں اندر سے ویسے ہوتے ہیں۔ لہذا ان سے دور رہنے میں ہی عافیت ہے۔“

اب ہم ان سے کیسے کہتے کہ یہ جو ہماری عمر کی آزاد پرندوں جیسی بے فکر اور پھولوں جیسی کھلی کھلی لڑکیاں ہیں ان کا شمار ان لوگوں میں نہ کریں مگر ہم ان سے نہ تو یہ کہہ سکتے تھے اور نہ ہی ان کی ہدایت کے خلاف جا کر اپنے ساتھ بڑھنے والی ہستی مسکراتی بات بے بات قہقہے لگاتی کسی لڑکی کے اس حد تک قریب جاسکتے تھے کہ کبھی اسے اپنے گھر بلا لیں یا کبھی خود اس کے گھر چلے جائیں۔ اگر کبھی ڈرتے ڈرتے کہیں جانے کی اجازت مانگتے تو جواب میں وہ ہی پرانا جملہ سننے کو ملتا۔

”یہ ملنا ملنا گھومنا پھرنا شادی کے بعد ہی اچھا لگتا ہے۔“

وہ تو بڑے آرام سے اتنا کہہ کر اگلے دن کے لیکچر کی تیاری میں مشغول ہو جاتیں اور ہم بھی ہمیشہ کی طرح حزن و یاس کی تصویر بنے ان تمام کاموں کا شمار اپنی انگلیوں کی ناکانی پوروں پر کرنے کی ناکام کوشش میں لگ جاتے جو ہمیں شادی کے بعد سرانجام دینے تھے۔ اسی لمبی ہوتی فرست کی وجہ سے ہم اس خاص لمحے کا انتظار تھوڑی بے صبری اور زیادہ بے شری سے کیے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی اس خوف سے ہماری نیند اڑ جاتی تھی کہ اس انتظار میں وقت ہمارے ہاتھوں سے یوں نکلا جا رہا تھا جیسے بند مٹھی سے ریت مگر اس سے پہلے کہ ہماری مٹھی خالی ہو جاتی اماں کی کولیگ کو ہم ان کے لائق فائق بیٹے کے لیے پسند آگئے۔ اب

کیوں پسند آئے یہ بھی ایک غور طلب معاملہ تھا۔ کیونکہ ہماری اماں اور مسز ہمدانی میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی۔ مسز ہمدانی انتہائی خوش مزاج اور خوش پوش خاتون تھیں۔ زندگی جیسے خود ان سے جینے کا ڈھنگ سیکھتی تھی۔

دو چار دفعہ اماں ہمیں اپنے ساتھ کلج لے کر گئیں تو ہم مسز ہمدانی سے ملے تھے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے تھے۔ وہ کوئی خاص خوش شکل تو نہیں تھیں۔ مگر انہیں خوب صورت نظر آنے کا فن آتا تھا۔ ان کے کپڑوں کا اسٹائل اور رنگوں کا خوب صورت انتخاب ان کی قدرے سادگی رنگت کو جیسے نکھار سادیتا اور پھر سلیقے سے کیا گیا ہلکا ہلکا میک اپ ان کے چہرے کو کچھ اور روشن کر دیتا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنہیں اپنی خامیاں چھپانے اور خوبیاں اجاگر کرنے کا ڈھنگ آتا ہے اور پھر ان کے بے ساختہ قہقہے جنہیں سن کر ایسا لگتا جیسے ان کے اندر سے حقیقی خوشی کے جھرنے پھوٹ رہے ہوں۔ ہم جب کبھی اماں کے ساتھ ان سے ملے ہمیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوتی کہ ہماری ہر دم خاموش اور سنجیدہ رہنے والی اماں نہ صرف ان سے خاصی بے تکلف تھیں بلکہ ان کا انداز ٹھیک ٹھاک دوستانہ ہوتا تھا۔ ہماری اماں اس قدر لیے دیے رہنے والی کہ بلا ضرورت کسی سے بات بھی نہ کریں اور مسز ہمدانی ایسی بے تکلف اور ملنسار کہ بل بھر میں کسی کو بھی اپنا گرویدہ کر لیں۔ حیران تو ہمیں ہونا ہی تھا اور جب ہم نے اماں کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو کچھ لمحوں کے لیے وہ کسی خیال میں کھو گئیں اور پھر آہستہ سے بولیں۔

”کبھی کبھی اپنے اندر کی تنہائی اور خاموشی سے ڈر کر کچھ لوگ اپنے آس پاس بھیڑ لگاتے ہیں۔“

ان کا یہ فلسفیانہ بیان ہمارے سر پر سے گزر گیا۔ مگر مزید کچھ پوچھنا بے کار تھا کیونکہ وہ حاضر ہوتے ہوئے بھی غمیر حاضر ہو جانے والی کیفیت میں جا چکی تھیں۔

جہاں سے ان کی واپسی ذرا مشکل ہی سے ہوتی تھی۔

اس روز صبح ہی سے آسمان پر گہرے سرمئی بادلوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہوا میں نمی کا تناسب زیادہ ہونے کا اندازہ لی وی پر موسم کا حال جانے بغیر بھی کیا جاسکتا تھا اور چونکہ ہم نے اپنی اب تک کی زندگی اماں کی سنگت میں انتہائی بے رنگی اور بے کیفی میں بسر کی تھی تو ہمیں یہ موسم سخت بے ہودہ لگ رہا تھا۔ بس دل یہی چاہ رہا تھا کہ منہ تک چادر تان کر لیٹ جائیں تاکہ نہ ہاتھوں کی طرح ایک دوسرے کا تعاقب کرتے بادل نظر آئیں اور نہ ہی ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹ پریشان کرے۔ یوں بھی ہم اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد گہری یاسیت میں مبتلا تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد زندگی کا جو واحد مقصد تھا وہیہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور اب ہماری اماں ہم سے اپنی انگلی چھڑا کر ہمیں جس راہ پر ڈالنے والی تھیں اس پر فی الحال ہمیں نہ ہرے بھرے درختوں کی گھنی چھاؤں نظر آرہی تھی نہ ہی پرگنیں پھولوں کی خوشبو بل بھر رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ نہ منزل کے نشان واضح ہوئے تھے کہ جسے پالینے کی خواہش سے ہمارے خوابوں اور خیالوں کی محفلیں بجتیں۔

اماں تو کلج گئی ہوئی تھیں اور ہم گھر کا تھوڑا بہت کام پنہا کر اب اس انتظار میں تھے کہ وہ واپس آجائیں تو ہم روٹیاں پکائیں۔ دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی ہلکی سی آواز آئی تو ہم جو صوفے پر نیم دراز انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے سیدھے ہو بیٹھے۔ دروازہ آہستگی سے کھلا اور اماں بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ ہماری پہلی نظر ان کے چہرے پر پڑی جو خلاف معمول کچھ روشن روشن سا لگا۔ دوسری نظر مسز ہمدانی کے مسکراہٹ بکھیرتے چہرے پر پڑنے کے بعد ساکت رہ گئی۔ کیونکہ ان دونوں کے عقب میں جو شخصیت تھی اس کا طویل سایہ ہماری اماں اور

مسز ہمدانی پر سے ہوتا ہوا ہمارے چمکتے دکتے فرش پر پڑ رہا تھا جو ہم نے اماں کی خوشنودی کے لیے صبح جی جان سے صاف کیا تھا۔

دراز قامت مردوں کو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر وہ صاحب اس حد تک لمبے چوڑے تھے کہ ہم سمجھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اور ہمارے اس طرح پیچھے ہٹنے پر وہ بھی ہلک کر وہیں رک گئے۔

”آجاؤ بیٹا! رک کیوں گئے؟“

اماں نے اس قدر بیٹھے لہجے میں کہا کہ اس مرتبہ ہم جھٹکا کھا کر ان کی طرف مڑے۔ وہ اپنے لہجے سے بھی زیادہ میٹھی نظروں سے اس ”جن“ کی طرف دیکھ رہی تھیں جو دروازے کے فریم میں کسی تصویر کی طرح ایستادہ تھا۔ سانولی رنگت، جتنا ہی سراپا۔ یہ بھی پہلی جھلک ہمارے ہونے والے مجازی خدا کی جو ہماری نظروں کے رستے ہمارے حواسوں پر بجلی بن کر گری۔

اس پہلی نظر نے جو قیامت ڈھائی اس سے تو ہماری جان ناتواں کسی طور سنبھل ہی گئی۔ مگر جب اگلے روز ہماری اماں نے لڑکیوں کے اساتذہ چیک کرتے کرتے اچانک ہماری طرف رخ کرتے ہوئے جو انکشاف فرمایا اس نے ہماری ذہنی اور جسمانی بنیادیں کچھ اس طرح ہلا ڈالیں کہ اگر ہم پر ماں کی دعاؤں کا سایہ نہ ہوتا تو ہم اسی بل اس جہان فانی سے کوچ کر جاتے مگر اتنا ضرور ہوا کہ ہم پتھر کے بے جان بت کی طرح بنا پلکیں جھپکائے، سانس روکے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے اور وہ اپنی بات کر کے بڑی بے نیازی سے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

”میں نے تمہارا رشتہ آفاق کے ساتھ طے کر دیا ہے۔“

ہم نے یہ جملہ سنا اور اس کے بعد گھنٹوں ہمارے کان سائیں سائیں کرتے رہے۔ دیدہ بینا تقریباً ”ناپیدنا“ ہو گئی کیونکہ ایک طویل و طویل سایہ ان کے سامنے

آکر ٹھہر گیا۔ آفاق احمد صاحب کا جناتی وجود ہمارے مستقبل کے تمام خوابوں اور ارادوں کے درمیان اس طرح سے حائل ہوا کہ آنے والی زندگی کا تصور کرنا بھی محال لگنے لگا۔

”آفاق دو سال کا تھا جب اخلاق احمد ہمدانی نے ایک مقابلہ ”زیادہ خوب صورت عورت کے چکر میں پڑ کر عذرا کو طلاق دے دی۔ حالانکہ اس بے چاری نے تو بہت منت سماجت کی کہ وہ بے شک دوسری شادی کر لے، مگر عذرا سے اپنا رشتہ ختم نہ کرے، لیکن اس دوسری عورت کا یہ ہی مطالبہ تھا کہ وہ اسی شرط پر شادی کرے گی کہ پہلے اخلاق احمد عذرا کو طلاق دیں۔“

ہماری اماں چلتے پھرتے وقتاً فوقتاً ہمیں ہماری ہونے والی سسرال سے متعارف کر رہی تھیں جیسے ڈائجسٹوں میں چھپنے والی قسط وار کہانیاں یا پھر ٹی وی پر چلنے والے ہفتہ وار ڈرامے۔ ہم ٹکڑوں ٹکڑوں میں ملنے والی معلومات کی مدد سے اپنی آنے والی زندگی کے تانے بانے بن رہے تھے اور خود الجھتے جا رہے تھے۔

”عذرا نے اپنی ساری زندگی آفاق کے لیے وقف کر دی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی، زندگی کی ہر ضرورت بہترین انداز میں مہیا کی، تاکہ اسے بھی باپ کی کمی محسوس نہ ہو اور اس کے جواب میں اس نے بھی ہمیشہ ایک سعادت مند اولاد کی طرح عذرا کی ہر خواہش کا احترام کیا۔“

اماں ہمیں مسز ہمدانی کی قربانیوں کے بارے میں اس طرح بتا رہی تھیں جیسے ہمیں پتا ہی نہ ہو کہ ساری زندگی اولاد کے لیے وقف کرنا کسے کہتے ہیں اور اکیلے رہ کر اولاد کی تعلیم اور اس کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کیسے دن اور رات کا فرق بھولنا پڑتا ہے۔ انہوں نے خود ساری زندگی یہ ہی کچھ کیا تھا۔ مگر اب مسز ہمدانی کی جیو جہد کو اس قدر جذب اور عقیدت سے بیان کر رہی تھیں جیسے انہوں نے یہ کڑا وقت نہ گزارا ہو۔

مسز ہمدانی کے بارے میں تو ہم جان گئے تھے مگر ہم خود ان کے صاحبزادے جیسے سعادت مند ہیں یا نہیں اس کا پتا چلنا ابھی باقی تھا۔ اتنی فرمایا برداری تو ہم نے بھی دکھائی تھی کہ اس پہاڑ جیسی شخصیت کے ساتھ ساری زندگی بتانے کے لیے بغیر کسی چوں چراکے راضی ہو گئے تھے۔

”آفاق بہت سلجھے ہوئے مزاج کا مالک ہے۔ میں اس سے بہت بار مل چکی ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں کسی بات پر اعتراض ہو یا آفاق کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو بتا دو۔“

اماں نے تمام تر باتیں طے کر لینے کے بعد جب ہم سے یہ سوال کیا تو ہمیں ان کے بھول پن پر بے ساختہ پیار آگیا۔ مگر نہ ہم اس پیار کا اظہار کر سکے نہ ان سے جدائی کے خیال سے ان کے گلے لگ کر روایتی انداز میں چھم چھم نہر بہا سکے، کیونکہ ہماری اماں کو جذبات کا اظہار بچکانہ اور اوچھا لگتا تھا۔

جس طور سے ہماری پرورش ہوئی تھی اس کے نتیجے میں شادی کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہی ہونا چاہیے تھا کہ ہمیں اپنی مرضی کے کپڑے پہنے اور ہر جگہ آنے جانے کی آزادی مل جائے گی، مگر آفاق احمد صاحب سے رشتہ طے ہو جانے کے بعد ہمارے یہ معصوم خواب بھی خوف اور دہشت کے گھنے جنگلوں میں گم ہو گئے۔

ہماری اب تک کی زندگی میں کسی مرد کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ اپنے ابا کو ہم ان کی بڑی سی فریم شدہ تصویر کی حد تک جانتے تھے جو اماں نے اپنے کمرے میں ایسے زاویے سے لگا رکھی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی پہلی نظر اس پر پڑنی لازمی تھی۔ ابا کے خدو خال کے علاوہ ان کی شخصیت سے تھوڑا بہت تعارف اماں کی اس گفتگو سے ہوا تھا جو بہت خاص موقعوں پر بیچی نظریوں اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کیا کرتی تھیں اور جس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہمارے ابا بہت ہنس مکھ اور سادہ مزاج تھے۔

وہ جیسے بھی تھے ہماری زندگی میں بس ایک یاد بن کر ہی شامل رہے۔ اس کے علاوہ اماں کے دونوں بھائی یعنی ہمارے ماموں تھے جو بہت پہلے دوسرے ملکوں میں جا بے تھے اور کئی کئی سال کے بعد اگر کسی خاص ضرورت کے تحت اپنے ملک کا چکر لگانے پر مجبور ہو جاتے تو بس تھوڑی سی دیر کو ہمارے گھر آتے اور ہم دونوں ماں، بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر ہمارا احوال دریافت کرتے اور ڈھیروں تحائف دے کر واپس چلے جاتے۔ کالج اور یونیورسٹی میں ہم صنف مخالف کے سائے سے بھی دور رہے، کیونکہ ہمیں اپنی اماں کی آنکھوں میں چھپا خوف، بخوبی نظر آتا تھا جو ہمارے ہوش سنبھالتے ہی ان کے لاشعور میں بس گیا تھا اور جس کا اظہار وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر پیشانی باتوں میں کر ہی جاتی تھیں۔ اور اب اچانک بغیر کسی پیشگی وارننگ کے اماں نے ہماری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ نتھی کر دی تھی جس کا ظاہری سراپا ہمارے ذہن میں صرف خوف جگاتا تھا۔

شادی کے دن جس رفتار سے قریب آتے جا رہے تھے اسی رفتار سے ہمیں اپنا آپ کسی گہری کھائی میں گرنا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایسے سفر کا آغاز ہونے کو تھا جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہر چند کہ اماں اپنی عادت کے برعکس آج کل ہر وقت ہم سے مخاطب رہنے لگی تھیں۔ مگر ان کی باتوں کا محور چونکہ وہ ہی ذات ہوتی تھی جس کے خیال ہی سے ہمارے چہرے کی رنگت اڑتی جا رہی تھی۔ لہذا ان کی طرف سے ملنے والی غیر معمولی توجہ اور محبت ہمیں کوئی خوشی نہیں دے رہی تھی بلکہ ہم تو کچھ ایسی لالچنی الجھنوں میں الجھ کر رہ گئے تھے کہ ہمیں اپنی اماں کا گھر چھوڑنے کا صدمہ بھی بھول گیا تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ بہت جلد ہماری زندگی میں ایک ایسا بدلاؤ آنے والا ہے جس کے بارے میں سوچ سوچ کر ہمارا دماغ ہر سوچ سے عاری ہو چکا تھا۔

مگر اماں کے چہرے پر نظر آنے والا اطمینان روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رہنے

لگی تھی اور پیشانی پر رہنے والی فکر و تردد کی لکیریں غائب ہو گئی تھیں اور یہ ہی بات ہماری ڈھارس بندھائے ہوئے تھی۔ آنے والے دنوں میں انہوں نے اس تیزی سے ہمارے جینز کا سامان اکٹھا کیا کہ ہم ان کی شاہ خرچی بلکہ نفیس ترین انتخاب اور دن رات کی ان تھک بھاگ دوڑ پر نہ صرف انگلیاں اپنے دانتوں میں دبائے حیرت کا جیتا جاگتا مرقع بن گئے، بلکہ ایک نئی فکر میں بھی مبتلا ہو گئے کہ اگر حیران ہونے کا سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہا تو کچھ عجب نہیں کہ اس جناتی شخصیت کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے ہم اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے ہی محروم نہ ہو جائیں۔ مگر حیران ہونے کا یہ باب ہمیں بند نہ ہو سکا۔ ابھی حیرت کے اور بھی بہت سے درواہ ہونے تھے۔ یہ ہمیں اپنی شادی خانہ آبادی کے بعد بتا چلا۔



ہمارے دل کے دھڑکنے کی رفتار اس گاڑی جیسی تھی جو کسی مشہور سیاسی شخصیت کی رہائش سے متصل شاہراہ پر تھوڑے تھوڑے سے فاصلے سے بنے ہوئے اسپید بریکر پر جھٹکے لے لے کر آگے بڑھ رہی ہو۔

پھولوں اور خوشبوؤں سے آراستہ کمرے میں ہم سانس روکے اس چنگھاڑ کے منتظر تھے جو آفاق احمد ہمدانی کی کمرے میں آمد کے بعد گونجنے والی تھی۔ مدہم روشنی رومان پرور ماحول کے بجائے ڈراؤنی فلم کے منظر کی طرح لگ رہی تھی جس میں کسی بھی لمحے کوئی خوفناک وجود کسی اندھیرے کونے سے نکل کر حملہ آور ہونے والا ہو۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا۔ دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ ہم نے اپنی آنکھیں پوری قوت سے سیج کر کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔



سنہرے خستہ پراٹھے، اشتہا انگیز خوشبو اڑاتا

گی۔“ وہ کسی قدر فکر مند نظروں سے آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور اس لمحے بالکل عام سی ماں لگ رہی تھیں جسے اپنی اولاد سے وابستہ ذرا سی تکلیف کا بھی بغیر کچھ کے اندازہ ہو جاتا ہے۔

”مگر می! ہمارے جانے سے آپ بالکل اکیلی ہو جائیں گی۔“ آفاق نے انتہائی محبت سے ان کی طرف دیکھا۔

”تم میرے اکیلے ہونے کی فکر نہ کرو۔ تمام مردوں کی طرح اگر تم بھی یہ ہی سمجھتے ہو کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی تو یہ خام خیالی اپنے دل سے نکال دو۔ مجھے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں چاہیے وہ بھائی ہو یا بیٹا یا پھر۔“ وہ ہل بھر کور کیں۔

”میں نے اکیلے رہ کر تمہیں اس قابل بنادیا تو آئندہ بھی اپنے بل بوتے پر زندہ رہ سکتی ہوں۔“ معمولی سی بات نے اچانک کیا رخ اختیار کر لیا۔ آفاق ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے اور می ایک جھٹکے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

اور ہم بے چارے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔

ٹھنڈی ہوائیں اونچے اونچے سرسبز راستے شفاف پانی کا پتھروں سے ٹکرانے سے پیدا ہونے والا شور جو کسی خوب صورت موسیقی سے کم نہ تھا اور پھر آفاق جیسے نرم و مزاج اور خیال کرنے والے شوہر کا ساتھ۔ ہمارا ہنی مون حقیقتاً شہد کی طرح میٹھا اور چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کی طرح روح کو سرشار کر دینے کی حد تک خوب صورت تھا۔

سارا دن قدرت کے حسین نظاروں سے آنکھوں کو سیراب کرنا اور رات کو دیر تک جاگ کر دنیا جہان کی باتیں کرنا۔ وقت کیسے گزر رہا تھا کچھ پتا ہی نہیں چلا اور واپسی کا دن قریب آ گیا۔

اس رات ہم نے آفاق کی پسند پر ہلکے نیلے رنگ کا نازک سی کڑھائی والا سوٹ پہنا اور ان کے ہی کمنے پر

بال جن کی لمبائی اور خوب صورتی کا احساس خود ہم کو شادی کے بعد ہوا تھا کھلے چھوڑ دیے تھے۔ سارا دن اونچے نیچے رستوں پر گھومنے کی وجہ سے کچھ تھکن کا احساس تھا اور اگلے دن واپسی کے خیال سے تھوڑی اداسی اور تھوڑی خوشی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد ہمیں اپنی عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز کرنا تھا اور یہ خیال ہمیں ایک بے نام سی گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ می کے لمحہ لمحہ بدلتے موڈ کی وجہ سے ہم اس وقت بھی حیران ہوئے تھے اور اب جب ہمیں واپس جا کر ان کے ساتھ رہنا تھا تو ہم یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ جب وہ آفاق سے اس قدر تلخ لہجے میں بات کرتی تھیں تو پھر ہمارے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہوگا۔

آفاق بھی شام سے کچھ خاموش تھے۔

”آپ میرے ساتھ خوش تو ہیں نا؟“ آفاق کی بھاری آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی تو ہم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بھلا ان کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

ان کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں اور وہ اضطراری انداز میں اپنی منھیاں بھیج رہے تھے۔

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ ہم کتنے خوش ہیں۔“ ہم نے بغور ان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں ہمارا جواب سن کر ایک پھلکی سی مسکراہٹ آکر معدوم ہو گئی تھی۔

”ابھی تو ہماری زندگی کا آغاز ہوا ہے آگے جا کر پتا نہیں آپ کی یہ خوشی قائم رہ سکے یا نہیں۔“ انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟“

اس بار ہم نے بھی کسی قدر سنجیدگی سے سوال کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر ہمارے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”آپ کو می کے موڈ کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہو گیا ہوگا، مگر آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا یہ رویہ

صرف میرے ساتھ ہے۔“ باقی ساری دنیا کے ساتھ تو اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہی اس قدر پسند کی جاتی ہیں۔

ان کی آواز میں گہری اداسی گھل گئی تھی اور چہرے پر ایک کرب انگیز کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ہم نے حیرت اور دکھ سے اس لمحے چوڑے مرد کو دیکھا۔ وہ اس لمحے کسی معصوم بچے کی طرح لگ رہے تھے جسے کسی ناکرد جرم کی سزا ملی ہو۔

”می ایسا کیوں کرتی ہیں؟“ ہم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تو انہوں نے ایک جھٹکے سے ہمارے ہاتھوں پر سے اپنی گرفت ہٹالی۔

”کیونکہ میں اخلاق احمد ہمدانی کا بیٹا ہوں۔“ انہوں نے ایسے کہا جیسے کسی بہت بڑے جرم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

”جس وقت ڈیڈی ہمیں چھوڑ کر گئے، میں بہت چھوٹا تھا، مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ می ہر وقت مجھے اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھیں شاید انہیں خوف تھا کہ ڈیڈی کہیں مجھے بھی ان سے چھین نہ لیں۔ وہ ہر وقت روتی رہتیں اور راتوں کو جاگ جاگ کر نلکی کیا کرتیں کہ میں ان کے پاس موجود ہوں۔ مگر جب ڈیڈی نے پلٹ کر میری خبر نہ لی تو رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ مگر ان کا رویہ میرے ساتھ اس قدر جارحانہ ہو گیا جیسے میں ان کی بھی نہیں صرف اخلاق احمد ہمدانی کی اولاد ہوں۔ وہ اپنے رد کے جانے کا انتقام دنیا بھر کے مردوں سے لینا چاہتی ہیں۔ کسی اور مرد پر ان کا کوئی اختیار نہیں تو صرف میری ہی ذات ان کی نفرت کا نشانہ بنتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے میری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو میرے کے بنا پورا کیا ہے۔ میں اگر ذرا سا بھی بیمار ہو جاؤں تو وہ رات رات بھر جاگ کر دعائیں کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی انہیں ہر لمحے یہ احساس رہتا ہے کہ میں اسی باپ کا بیٹا ہوں جس نے انہیں محض اس لیے چھوڑ دیا کیونکہ اسے ان سے خوب صورت عورت مل گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ

ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے بہترین ہیں اور وہ واقعی بہترین ہیں اگر وہ ڈیڈی کو بھول کر اپنی زندگی جینا شروع کر دیں۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور ہمارا دل ان دونوں ماں بیٹے کے لیے دکھ سے بھر گیا۔

”اور آپ کو پتا ہے کہ می نے میرے لیے آپ کا انتخاب کیوں کیا؟“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے نسبتاً بشاش لہجے میں سوال کیا تو ہم نے ان کے بازو پر سے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کیونکہ آپ بہت خوب صورت ہیں اور می کو یقین ہے کہ ایسی حسین بیوی سے نظر ہٹا کر میں کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور ہمیں اپنے اور قریب کر لیا۔

ہر شخص کو جینے کے لیے ایک ہی زندگی ملتی ہے مگر وہ لوگ جن کو اپنی عملی زندگی کے آغاز میں کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑے وہ کبھی بے تحاشا محبت اور کبھی شدید نفرت کی وجہ سے دوسروں اور خصوصاً اپنی اولاد کی زندگی بھی خود جینا چاہتے ہی اور اس کوشش میں وہ کبھی کبھی اپنی اولاد کے ساتھ بہت زیادتی بھی کر جاتے ہیں۔

ہماری یعنی ماضی کی ارم فاطمہ اور حال کی مسز ارم آفاق کی زندگی کی دو اہم ترین خواتین ایک ہماری ماں اور دوسری ہماری ساس جو اپنے اپنے خیالات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اس قدر مماثلت رکھتی ہیں کہ ایک نے اپنی ساری زندگی کو دنیا کے خوف اور دوسری نے مردوں سے نفرت کی نذر کر دیا اور اپنے اس خوف اور نفرت کا سارا بوجھ اپنی اولاد پر ڈال دیا۔ مگر ہم یہاں سے واپس جانے کے بعد جب اپنی عملی زندگی کا آغاز کریں گے تو ہماری کوشش ہوگی کہ ہم چاروں کی زندگی ہر خوف اور نفرت کے جذبے سے آزاد ہو کر خوشیوں اور ایک دوسرے کے احترام سے عبارت ہو۔

عکس اور حسیہ

”آہ...“ حلق سے برآمد ہوتی یہ چیخ اتنی دلدوز اور دہشت ناک تھی کہ آسیہ کچن کا دروازہ کھولتے کھولتے پلٹ آئیں۔
 ”الہی خیر! اس کا کمرادیں قدم کے فاصلے پہ تھا۔ آسیہ نے تیز گام کی طرح چانچ قدموں میں پاٹا۔
 ”کیا ہوا...؟“
 ”اپنے بیڈ پر وہ سکتے کی کیفیت میں تھی۔ آسیہ نے حواس سنبھال کر پوچھا۔ ساتھ ہی چار اطراف نظریں

صادقین کی روح کو تسکین پہنچاتی — جاری تھی۔
 ”یہ میں نے شہریار کو دی تھی کمپلیٹ کرنے کے لیے۔ اس نے یہ بنا دیا۔“
 آخری جملہ بعد میں ادا ہوا، آنسو پہلے نکل آئے۔ آسیہ نے مسکراہٹ دیانی۔
 ”اچھا بس... میں بات کروں گی شہریار سے۔ تم بھی اب سمیٹو بہت رات ہو گئی ہے۔“
 ”آپ دیکھیں تو... یہ کوئی بات ہے۔ خود مجھے کہا

تکڑی لٹ

گھمائیں۔ سب کچھ ٹھیک تھا، تم از کم حواس باختہ کر دینے والا کچھ نہیں تھا۔
 ”میں پوچھ رہی ہوں، چیخیں کیوں؟ کوئی چھپکلی دیکھ لی تھی کیا۔“ اس کا سکتہ ٹوٹنے میں نہ آیا تو انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے باقاعدہ اسے جھنجھوڑ دیا۔
 ”یہ...“ کہتے ہوئے اس نے اپنے سامنے رکھی فارما کی پریکٹیکل نوٹ بک اٹھا کر ان کے سامنے کر دی۔
 شکل رو دینے والی ہو رہی تھی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے آسیہ نے نوٹ بک کے کھلے ورق پر خاصے اشتعال سے نظر دوڑائی۔ جس پر مشہور زمانہ کاٹون ڈونلڈ ڈک بے حد مہارت سے بنایا گیا تھا۔
 ”یہ تم بنارہی تھیں؟“ نہیں فی الفور غصہ آگیا۔ یعنی میڈیکل کی سخت پڑھائی کا بہانہ اندر

بنادوں گا اور ایسی گھٹیا...“
 ”میں نے کہا ناں! میں صبح بات کروں گی اس سے۔ تم اب اپنا خون مت جلاؤ۔ سو جاؤ شاباش۔“
 آسیہ نے خود ہی اس کے بیڈ پر پھیلی کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ وہ خود بھی تھک چکی تھی مگر احتیاطاً فارما کی پریکٹیکل نوٹ بک چیک کرنے کا خیال آیا تو اندر ڈی ڈی مسکرا تامل۔
 ”آپ اس سے بات نہیں کریں گی... کان کھینچیں گی اور دیکھیں گے، میں بھی اس کا وہ حشر کروں گی کہ سات پشتوں کو میرے نام سے ڈرائے گا۔“
 آسیہ جب تک اس کا مال و متاع سمیٹ کر ماتھے پر بوسہ دے کر کمرے سے باہر نکلیں وہ اندر کی کھولن نکالتی رہی۔

کوئی مذاق تھا اس کی پریکٹیکل کی نوٹ بک تیار کر دی تھی۔ اگر وہ چیک کیے بغیر مس عائشہ کو تھما آئی تو۔۔۔ آگے کا حشر سوچنے سے پہلے وہ شہریار کی خیالی درگت بنانے لگی۔

آج اسد کا برتھ ڈے تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ لاؤنج میں صوفے پر اداس بیٹھی اسد کی جدائی کے دنوں کا اعداد و شمار کرنے میں مصروف تھیں۔ جب جمیل صاحب ہاتھ میں موبائل تھامے تیزی سے داخل ہوئے۔

”بیچے۔۔۔ بات کیجئے اپنے لاڈلے سے ہم سے تو بھی غیروں کی طرح ہوں ہاں کے علاوہ کچھ اور کہنا نشان کے خلاف سمجھتا ہے۔“ شائستہ کا چہرہ آن کی آن میں کھل گیا۔

”صاحبزادے کے لیے تو ماما بھی آپ ہیں اور ڈیڈی بھی آپ۔۔۔“ ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے جمیل صاحب صوفے کے کنارے پر جا بیٹھے۔ شائستہ کے لیے اس طنز کی کیا اہمیت و حیثیت جب اسد بات کر رہا ہو۔

”اسد میری جان!“ ضبط کرتے کرتے بھی لہجہ رو نکھا ہو گیا۔

”السلام علیکم ماما! کیسی ہیں؟“ اسد کی بھرپور مردانہ آواز ممتا کی نشانی برہا گئی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا وہ بات کر کے خوش و مطمئن ہونے کے بجائے اور بے چین و مضطرب ہو جاتی تھیں۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ جیتے رہو خوش رہو۔۔۔ اب یاد

آئی ہوں؟“ ہلکا سا شکوہ اسد کے قہقہے میں دب گیا۔

”اصولاً“ آپ کو یاد کرنا چاہیے تھا۔ آفٹر آل آج کا دن میرا ہے۔“

”کیا کروں۔۔۔ کتنی بار تو کوشش کی مگر سن ہی نہیں

مل رہی تھی۔“ وہ حسب عادت پشیمان ہوئیں۔

”اس اوکے۔۔۔ آپ کریں میں کروں ایک ہی

بات ہے۔“ شائستہ کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ اسد کے

چھوٹے چھوٹے جملے انہیں توانا کر دیتے تھے۔ جمیل صاحب بیوی کے چہرے سے جذبات پڑھتے ہوئے محفوظ ہونے لگے۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“ اچانک ہی اسد کی

طبیعت یاد آگئی۔ اسد کو دو دن پہلے بخار ہوا تھا۔

”اب تو بالکل ٹھیک ہوں ماما! ڈونٹ وری۔“

”کیسے نہ فکر کروں ذرا خیال نہیں رکھتے ہو اپنا۔“

خفگی سے کہتے ہوئے جمیل صاحب کو بھنویں سکوڑ کر

دیکھا۔ ”بالکل اپنے باپ جیسے ہو لا پروا اور سست۔“

جمیل صاحب نے ضرورت سے زیادہ آنکھیں پھاڑ

لیں۔ وہ مسکین خواجواہ گفتگو کے بیچ آگئے تھے۔

”پتا نہیں کب واپس آؤ گے۔ آج کل آج کل

سنتے سنتے اتنے سال ہو گئے ہیں۔“

”کوشش تو کر رہا ہوں ماما۔ آپ بس دعا کریں۔“

”ساری دعائیں تمہارے لیے ہیں۔“ شائستہ کا

لہجہ محبت و شفقت سے مغلوب ہو گیا۔

”تھوڑی سی شہریار کے لیے بھی بچا رکھیں۔“

جمیل صاحب کی سنجیدہ برہنہاٹ اتنی تیز تو ضرور تھی

کہ شائستہ تک پہنچ جائے۔

”اپنا خیال رکھنا ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“ موبائل

آف کر کے جمیل صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے

شائستہ نے حسب عادت انہیں گھورا۔

”آپ کا بھی جواب نہیں بیگم صاحبہ!“ شائستہ نے

آنکھیں سکوڑ کر ناگواری سے دیکھا۔

”شہریار جھوٹ نہیں کہتا۔ غلطی ایک کی ہو۔

آپ سارے گھر کو سمیٹ لیتی ہیں۔“

شائستہ کی برہمی میں اضافہ ہو گیا۔ جمیل صاحب

جانے بوجھتے شرارت پہ آمادہ رہے۔

”جیسے اب۔۔۔ طبیعت کا خیال آپ کا بیٹا نہیں رکھتا

اور ملا رہی تھیں اسے باپ سے۔“

”توبہ ہے۔“ تنگ آکر وہ کھڑی ہو گئیں۔

”ذرا سی بات پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پورے کے پورے

عورتوں پر گئے ہیں۔“ ناگواری بھری برہنہاٹ جمیل

صاحب کو سٹپٹانے پر مجبور کر گئی۔

”بیٹا مجھ پر۔۔۔ میں عورتوں پر۔۔۔ لاجول ولا“ وہ بلند

آواز میں برہنہاٹے۔

شہریار کی خیالی درگت زیادہ دنوں تک نہیں بنانی

پڑی۔ دو دن بعد وہ سامنے تھا۔ علیحدہ نے ضرورت

سے زیادہ باچھیں پھیلا کر استقبال کیا تو اس کا ماتھا پیس

پہ ٹھنک گیا۔

”چائے۔۔۔“ خالی مسکراہٹ نہیں اگلے پل وہ لہرا

لہرا کر زبردستی کی مہمان نوازی پہ اتر آئی تو شہریار کے

دماغ میں ہنگامی سائرین گونجنے لگی۔

”آئیے نہیں۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہنے

ہی نہیں دیا گیا۔

”کیوں نہیں۔۔۔ میں ابھی بنا کر لائی۔“ وہ جھپاک

سے کچن میں جا گئی۔

”گڑبڑ ہے شہریار بیٹے!“ پہلے وہ کچن کے کھلے

دروازے کو مشکوک نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر جب

آنکھوں کے سامنے چائے میں زہری پڑیا ملائی علیحدہ

لہرائی تو وہل کر علیحدہ کے سر پہ جا پہنچا۔ وہاں چوہے

دودھ پتی چینی ایک ساتھ کیٹلی میں ابل رہی تھی اور

علیحدہ اسے کپ میں ڈالنے کے لیے ساز و سامان سے

لیس کھڑی تھی۔

”یہاں کیوں آگئے؟ میں بس لا ہی رہی تھی۔“

لہجے میں شیرینی ہی شیرینی تھی۔ خالصتاً ان بیویوں

جیسی مجنہیں فرمائش پوری کروانے کے لیے ان

ہتھیاروں کا استعمال کرنا بخوبی آتا ہو۔ شہریار کو اس

پاس ہی نہیں بیٹ میں بھی گڑبڑ محسوس ہونے لگی۔

”اچھا میں باہر بیٹھا رہتا اور یہاں تم چائے میں ڈی

ڈی لی یا چوہے مار دو اگھول لیتیں؟ میں یوں بے خبری

میں اپنی جان دینے والا نہیں شکل سے ضرور شریف

اور معصوم لگتا ہوں مگر۔۔۔“

”چائے۔۔۔“ اس کی نان اسٹاپ خدشات اور جلتا

تقریر علیحدہ کی غراہٹ تلے دب گئی۔ وہ چائے کا بالاب

کپ عین اس کی آنکھوں میں سامنے لے آئی اس

کے رونگٹے۔ کھڑے ہو گئے یہ گرم گرم چائے چھلک

جاتی تو منہ فٹے منہ ہو جاتا۔

”تنی کم طرفی سے صرف تم ہی سوچ سکتے ہو۔ میں

یہاں نیک بیتی سے چائے بنانے آئی تھی۔ تمہاری

طرح تخریب کاری کرنے کا نہ شوق ہے نہ عادت۔۔۔

اب پکڑو چائے۔“

کپ ابھی تک خطرناک پوزیشن میں تھا۔ شہریار

نے آنکھوں کے ڈیلے گھما کر عین سامنے کسی بندوق

کی طرح تنے کپ کو دیکھا اور پھر انہی ڈیلوں میں الجھن

سمو کر دل کی سردار کو۔۔۔ دل کر رہا تھا کپ پکڑ لینے میں

کوئی قباحت نہیں۔۔۔ مگر دماغ کے سائرین ہنوز بج رہے

تھے۔

”تمہیں پتا ہے مجھے چائے کے نام پر یہ ملغوبہ پینا

بالکل پسند نہیں۔ میں سپیوٹ چائے بننے کا عادی

ہوں۔“ اس نے بیچ کی راہ نکالنے کی لولی لنگڑی کوشش

کی۔

”تمہیں بھی پتا ہے مجھے چائے کے نام پر مذاق پینا

پسند نہیں۔“ اس کا بے مروت اشارہ اس کی پسندیدہ

چائے کی طرف تھا۔

”میں دودھ پتی پیتی ہوں اور ملغوبہ بنا کر پیتی ہوں اور

مت بھولو ہمیشہ تمہیں بھی یہی پلاتی ہوں۔“

کہنے کے ساتھ ہی نہایت سفاکی سے اس نے پرچ

کو ایسے تین جھٹکے دیے کہ اس پر رکھا کپ تو چھلکا ہی

شہریار کا دل بھی حلق میں آگیا۔ عذاب کی موت مرنے

سے بہتر تھا چائے کا کپ لے لیا جائے۔ اگلے پل

نہایت شرافت سے کپ تھاما۔ علیحدہ نے باقاعدہ ہاتھ

جھاڑ کر اس کے جلے جی کو مزید آج دکھائی۔ کینہ توڑ

نظروں سے اسے گھورنے کے بعد چائے کا بڑا سا

گھونٹ بھرا اور اگلے ہی پل فوارے کی طرح باہر نکال

دیا۔ علیحدہ ہونٹ سکوڑنے آنکھوں میں فحش کانشہ لیے

سنجیدگی سے گھورتی رہی۔

”یہ چائے ہے یا زہر؟“ کپ سلیب پر پٹخ دیا۔
 غنیمت رہی، ٹوٹا نہیں۔
 ”نہ چائے نہ زہر۔ یہ سزا ہے۔“ علیہ کے
 اطمینان میں سر مو فرق نہ آیا۔
 ”مجھے کیوں دی؟“ نمک ملی چائے داغ کے سائرن
 کبھی نہ بجنے کے لیے بند کر گئی تھی۔
 ”کیونکہ تم اس کے حق دار ہو۔“
 ”ابھی بتانا ہوں پھپھو کو۔“ صدے کی جگہ
 تلملاہٹ نے لے لی۔
 ”میں نے بھی اپنی پریکٹیکل بک دکھا دی تھی امی کو۔“
 ”اوسے آئی سی؟“ شہریار کی تلملاہٹ فوراً رنو چکر
 ہوئی۔ ہونٹ مسکرا اٹھے۔
 ”اس پر تو تمہیں مجھے داد دینی چاہیے تھی۔ میں
 نے اتنا کمال کا بورڈ رٹ بنایا تھا تمہارا۔“
 اب کے تلملاہٹ علیہ پہ حملہ آور ہوئی۔
 ”داد تو تمہیں ماموں اور مامی دیں گے، جب میں ان
 کو بھی دکھاؤں گی۔ نہیں دل کر رہا تھا تو نہ بناتے، ایسا
 گھٹیا مذاق تو نہ کرتے۔ مس عائشہ میری بے عزتی کر
 ڈالتیں۔“
 آخری جملہ ہونٹ لٹکا کر ادا کیا۔ شہریار نے جی بھر
 کر دیکھنے کے بعد نرمی سے سوری کہہ دیا تو جیسے اس کا
 غم و غصہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ شہریار نے فرج سے
 پانی کی بوتل نکال کر گلاس بھرتے ہوئے اسے پھر سے
 شاکی انداز میں دیکھا۔
 ”ویسے ہو بہت بری تم۔“
 ”کیا بہت کڑوی تھی۔“ نرمی سے پوچھا گیا۔
 ”پی کر دیکھ لو۔“ وہ چڑ گیا۔
 ”سوری۔“ ہونٹ لٹک گئے۔
 گلاس رکھنے کے بعد وہ قریب آکر اس کی آنکھوں
 میں سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ اس کا یوں بھرپور انداز سے
 دیکھنا علیہ کا کام تمام کر دیتا تھا۔ ابھی بھی وہ گھبراہٹ کا
 شکار ہونے لگی۔
 ”چھا چھوڑو۔ میں نے کدو کا حلوہ بنایا ہے، وہ

چکھاتی ہوں تمہیں۔“ گھبراہٹ کو مصنوعی جوش سے
 چھپانا چاہا۔
 ”کدو کا حلوہ۔“ شہریار نے منہ کے زاویے
 بگاڑے۔
 علیہ فرج سے ڈش نکال لائی۔ شہریار نے اس
 کے ہاتھ سے ڈش لے کر سلیب پر رکھی اور نہایت
 اطمینان و فرصت سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔
 ”تم سے کس نے کہہ دیا میرے دل کا راستہ
 معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔“ مخمور، دھیمالوجہ علیہ
 کی گھبراہٹ عود کر آئی۔
 ”تمہیں ان پیچیدہ راستوں سے گزرنے کی
 ضرورت نہیں۔ تم ڈائریکٹ دل پر لینڈ کر چکی ہو
 ڈارلنگ۔“ کبھی کبھی اس پر رومانس کا دورہ پڑ جاتا تھا۔
 علیہ پھر بری طرح گھبرا گئی۔
 ”وہ۔ مجھے لگتا ہے امی بلا رہی ہیں۔“
 شہریار نے ہنستے ہوئے ہاتھوں پر گرفت مضبوط
 کر لی۔
 ”کیا مصیبت ہے، انسان ہو یا جنگلی۔“ چھڑانے کی
 کوشش رائیگاں گئی تو وہ جھنجھلا گئی۔ شہریار نے اب
 کے شرافت سے ہاتھ چھوڑ دیے۔
 ”بد تمیز۔“ پکچن چھوڑنے سے پہلے اس نے کہا۔
 ”اب آئی ہونا پڑی ہے۔“ شہریار تادیر مسحور و
 مسرور کیفیت میں تھا۔

☆ ☆ ☆

”تو گویا۔“ فرائی مچھلی رغبت سے کھاتے ہوئے
 جمیل صاحب نے شائستہ سے چھیڑ خانی بھی برقرار
 رکھی ہوئی تھی۔
 ”آپ کے صاحبزادے کو ماں باپ پر رحم آ ہی
 گیا۔“
 ”میرے صاحبزادے آپ کے کیا ہوئے؟“ شائستہ
 قدرے خفا ہو گئیں۔ اسد سے ان کی بے پایاں محبت
 باقیوں کے لیے مذاق بن گئی تھی۔ ایسا صرف انہیں لگتا

تھا۔
 ”ڈیڈی! آپ میری می کو خوا مخواہ مت تنگ کیا
 کریں۔“ شائستہ کا پھولا ہوا چہرہ دیکھا کر شہریار نے گویا
 وار تنگ دی۔
 ”پھر کیا کروں!“ جمیل صاحب باز آنے والوں میں
 سے نہیں تھے۔
 ”میں آجاؤں؟“ قبل اس کے کہ شائستہ کوئی
 جواب دیتیں۔ علیہ کی چمکتی آواز نے سب کو متوجہ
 کر لیا۔
 ”آپ اندر آپکی ہیں۔“ شہریار کی نگاہیں
 مسکرانے لگی تھیں مگر بظاہر سنجیدگی سے کہا۔
 ”السلام علیکم۔“ زوردار سلام جھاڑتے ہوئے بے
 تکلفی سے ان کا حصہ بن بیٹھی۔
 ”وعلیکم السلام۔“ آج ہماری بیٹی کیا لائی ہے؟“
 جمیل صاحب اس کی لائی ہوئی ڈش کا بے صبری سے
 معائنہ کرنے لگے۔
 ”تمہارا اپنا کوئی گھر ہے؟ جب دیکھو ہمارے گھر میں
 تھسی رہتی ہو۔“ شہریار نے بلا ارادہ چھیڑا۔
 ”میرے ماموں، مامی کا گھر ہے، تمہیں کیوں
 تکلیف ہو رہی ہے؟“ اس نے لاڈ سے شائستہ کے
 گلے میں بائیں ڈال دیں۔
 ”تمہارا یہ الم علم کھا کر میرے ڈیڈ کو جو بد ہضمی
 ہوگی وہ۔“ شہریار کا اشارہ اس کی بریانی کی طرف تھا۔
 ”نہیں یا۔۔۔! بہت مزے کی ہے کھا کر دیکھو!“
 جمیل صاحب یوں شوق سے کھا رہے تھے۔ جیسے پہلے
 کبھی بریانی کھائی ہی نہ ہو۔
 علیہ کا موڈ آف ہو گیا۔ جواب دینے کے بجائے
 ہونٹ سی لیے۔ یعنی شدید ناراضی کا اظہار۔
 ”تمہاری یہ کوکنگ کلاسز میرے می ڈیڈی کے
 معدے تباہ کر دیں گی۔“
 ”مائی۔۔۔ سمجھائیے نا اپنے بیٹے کو۔“ چیخ کر شائستہ
 سے مدد چاہی تو شہریار نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس
 لیں۔

”شہری! احب کرو کیا اول فول بولے جا رہے ہو۔“
 شائستہ نے اٹھتی غصہ دکھا ڈالا۔ شہریار نے سنجیدگی
 سے علیہ کو دیکھا، پھر مکمل طور پر کھانے کی طرف
 متوجہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر کھڑا ہوا۔ اور اسے نظر انداز
 کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ علیہ کا دل جیسے
 سکڑنے لگا۔
 ”علیہ۔۔۔ وہ آنسو پٹکانے ہی لگی تھی کہ شہریار
 کی آواز پر فوراً سر اٹھایا۔
 ”جانے سے پہلے میری دھن سنتی جانا، نئی بنائی
 ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

شہریار کا کرا معمول کی طرح نفاست و قرینے کا
 آئینے دار بنا ہوا تھا۔ اسے وہاں آکر ایک عجیب و
 خوشگوار سا اپنا پن محسوس ہوتا۔
 ”شہری۔۔۔ اسد بھائی خاصے دہشت ناک لگتے
 ہیں۔“ دیوار پر شہریار اور اسد دونوں کی بڑی سی تصویر
 آویزاں تھی۔
 ”خبردار۔“ اپنے گٹار کی تاروں کو چھیڑتا شہریار
 مصنوعی دھاڑا۔ ”میرے بھائی کی شان میں گستاخی
 نہیں کرنا۔“
 ”یہ وہی بھائی ہیں، جنہوں نے بچپن میں دوبار
 تمہارا سر پھاڑا تھا اور دونوں مرتبہ بے قصور ثابت
 ہوئے تھے۔“
 وہ جتا رہی تھی۔ اسد کا پھنے خان روپ اسے کبھی
 نہیں اچھا لگتا تھا۔ کزنز کے پیچ پوں رہتا جیسے کہیں کا
 راجہ اندر ہو۔ کزنز تو کیا شہریار کو بھی کسی گنتی میں
 نہیں رکھتا تھا۔ ”میں۔۔۔ اور صرف میں“ کے گرد اس
 کی دنیا تھی۔
 ”اب نہ وہ بچپن رہا، نہ وہ حالات۔“ شہریار کے
 لہجے میں لا پرواہی تھی۔
 ”اور ابھی تم اس گھر میں آئی نہیں ہو، ہم بھائیوں
 میں پھوٹ پہلے ڈالنے لگیں۔“

”بھائی چچہ گیری چھوڑو اور اپنی دھن سناؤ مجھے گھر بھی جانا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو گئی۔“ علیہ نے ثبوت کے طور پر دو چار جمائیاں بھی لے ڈالیں۔ ابھی وہ گلا کھنکار کے دھیسے سے گٹار کے سرچھیڑنے ہی لگا تھا کہ وہ چلائی۔

”مگریزی کا جو متروک ہو چکا ہے میوزک۔ پھر سے ویسی دھن تو نہیں بنائی؟“

شہریار کو گٹار بجانا بھول گیا۔ ہمیشہ ہی رنگ میں بھنگ ڈالنے والی زبان بولتی تھی وہ۔ وہ پوری طرح سے ناراض ہو گیا۔

”قسم سے سن کر ایسے لگتا ہے جیسے میرے ارد گرد بدروہیں ناچ رہی ہوں۔“

پھولے ہوئے منہ کے ساتھ شہریار نے گٹار واپس رکھ دیا۔ علیہ کی ہنسی بھی زہر لگ رہی تھی۔

”سوری سوری سوری۔“ ہنسی ضبط کرتے ہوئے اپنے کان پکڑ کر ایک ہی لفظ کی گردان کرتی وہ اس کے قریب پہنچی۔

”ہرگز نہیں۔ جاؤ اب۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔

”کہانا سوری مذاق کر رہی تھی۔“

”اپنے پاس رکھو اپنا سوری مجھے نہیں چاہیے، جہاں میں اپنے دل کی بات کہنے لگوں، تمہیں مذاق سوجھ جاتا ہے۔“

”آئندہ نہیں سوچھے گا۔ سچی۔ دیکھو! گٹار اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیا اور مزید لجاجت دکھائی۔

”اب مان بھی جاؤ نہیں تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔“ گٹار تھام کر شہریار نے اس کی پریشان صورت دیکھی اور اس کی چھوٹی سی ناک چھینچ کر گویا بدلہ چکایا۔

”میرا یہ سوگ تمہارے نام ہے۔“

دھن چھیڑنے سے پہلے اس نے جاذبیت سے کہا۔

علیہ کی جان میں جان آئی۔

☆☆☆

کب ان دونوں کے دل کی زمین پر پروان چڑھا اور کیسے اس کی آبیاری ہوئی، انہیں نہ تو خبر ہوئی اور نہ ہی جاننے کی خواہش تھی۔ بس یہی کافی تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بھی اس معصوم محبت سے آگاہ ہو گئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کتنے ضروری تھے یہ بہت بچپن میں ہی سب کو سمجھا گئے تھے۔

جب اسد اور شہریار اپنے کزنز یا دوستوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتے تو علیہ بھی پہنچ جاتی۔ گھر میں وہ ایک ہی بچی تھی۔ اس پاس بھی اس کی ہم عمر کوئی لڑکی نہیں تھی۔ ایسے میں شہریار اور اسد سے قریبی رشتہ ہونے کی بنا پر وہ جب ان میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کرتی اسد کا ٹوٹ بن جاتا۔

”لڑکوں میں کیوں آتی ہو؟ تمہیں یہاں کوئی لڑکی نظر آرہی ہے؟ ہم نے نہیں کھلانا تمہیں۔“ بنا لحاظ مروت کے وہ اپنی عادت سے مجبور غصیلے لہجے میں کہتا تو علیہ کی سٹی وہیں گم ہو جاتی۔ اسد سے مرعوبیت کی وجہ سے باقی بچے بھی اسے کھلانے سے انکاری ہو جاتے۔ وہ ایک طرف آنکھوں میں آنسو بھرے بڑی آس سے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔ تب شہریار اس کی اتری صورت اور گیلی آنکھیں دیکھ کر نرم پڑ جاتا اور اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے دوستوں کو چھوڑ دیتا۔ اسد اور باقی بچوں کے ہاتھ مذاق آ جاتا۔

”یہ بڑا ہو کر لڑکی بنے گا۔“ شہریار ذرا بھی نہ چڑتا پھر اسد خود چڑ جاتا۔ کبھی علیہ کی شامت اس کے ہاتھوں ہو رہی ہوتی تو کبھی شہریار کی خواہ مخواہ درگت بنا تی ہوتی۔

شروع سے ہی وہ بہت گھمنڈی اور خود پرست بچہ تھا۔ ماں باپ کی محبت پر صرف اپنا حق جتانے والا۔ شائستہ اگر شہریار کو اس کے سامنے ”میرا چاند“ میری جان“ کہہ کر اکاٹیں تو وہ شائستہ سے باقاعدہ ناراض ہو جاتا کہ آ۔۔۔ شہریار کو میری جان کیوں کہا مجھے کیوں نہیں؟ پہلے ہمیشہ ان دونوں کے لیے ایک جیسے کپڑے اور کھلونے لاتی تھیں۔ اسد اس پر بھی اعتراض کرنا پھرو۔ تلف لانے لگیں تو اسد کو شہریار کی

چیزیں پسند آ جاتیں مگر تب بھی اپنی چیز پر تو قابض ہوتا ہی۔ اس کی بھی ہتھیالیتا۔ اس کی ضد ماننے میں شائستہ نے کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا تھا۔ ایسا کرنے میں وہ شہریار کے ساتھ کتنی زیادتی کر جاتیں یہ احساس جمیل صاحب کے بار بار دلانے پر بھی انہیں نہ ہوا۔ نتیجتاً اسد خود سر اور ضدی ہوتا گیا تھا۔ شہریار کی چیزوں، کھلونوں پر ملکیت قائم کرنے کے بعد انہیں اپنے پاس بھی نہ رکھتا۔ توڑ پھوڑ دیتا یا کسی اور کو دے دیتا۔ مگر شہریار کے پاس نہ رہنے دیتا۔

کئی بار اپنے قصور شہریار کے سر تھوپ کر اسے باقاعدہ سزا دلوانی۔ شہریار بھی بچہ تھا۔ پہلے بہت مغموم ہوتا، روتا، کتنی دیر تک دل گیر رہتا، پھر شائستہ اور جمیل صاحب اسے کسی نہ کسی طرح سے راضی کر لیا کرتے۔

بہت نامحسوس طریقے سے علیہ شہریار کے چھوٹے موٹے دکھ اپنے دل پر لینے لگی تھی۔ اسد جو کھلونا شہریار سے چھینتا۔ علیہ وہی کھلونا شہریار کی برتھ ڈے پر اس کو گفٹ کر رہی ہوتی۔ اسد شہریار کو مارنے کے لیے لپکتا علیہ دھال بن جاتی۔ وہ علیہ کو دھکیلتا تو شہریار اسے سنبھالنے کو آگے بڑھتا۔ یوں اسد کے لیے علیہ بھی وہ چیز ہو گئی جو شہریار کے نہیں، اس کے پاس ہونی چاہیے تھی۔

اب وہ ضد کرنا علیہ میری پارٹنر بنے گی۔ علیہ بدک جاتی۔ پر زور انکار کرتی اسد شہریار کو دھمکاتا۔

”یہ میری نہیں بنے گی تو میں ماروں گا اسے۔“ محض اس خوف سے کہ اسد علیہ کو مارے نہیں، شہریار خود علیہ کی منت کرتا۔

”تم بھائی کی پارٹنر بن جاؤ۔ میں اور نونو فل پارٹنر بن جاتے ہیں۔“

اور صرف شہریار کی خاطر وہ اسد کی پارٹنر بن جاتی۔ یہ الگ بات تھی ان کے پارٹنر واقف ہوتے کہ ایسا کرنے سے وہ دونوں بے تو جی سے کھیلتے تھے۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ بچپن دور ہوتا گیا۔ اسد کی ضد شہریار کا صبر اور علیہ کی جھنجھلاہٹ برقرار رہی۔

یہاں تک کہ اسد اعلا تعلیم کے لیے لندن گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شہریار اور علیہ کے دلوں میں نمودائے محبت کے خود رو پورے کو جڑیں پھیلانے کے لیے فضا موقوف مل گئی۔

☆☆☆

اسد کی آمد کے دن بھی آگئے۔ وہ شائستہ کو سربراہ بننا چاہتا تھا مگر شہریار نے سختی سے منع کر دیا۔

”مام اتنی خوشی سنبھال نہیں پائیں گی۔“ شائستہ کی ممتا کا ہر رنگ اسد نے دیکھا تھا اور ان کے مزاج سے آشنا تھا شہریار۔

اسد حیرت انگیز طور پر مان گیا۔ اسے ایرپورٹ سے جمیل صاحب اور شہریار لینے گئے تھے اور اب وہ تینوں آگے پیچھے لاؤنچ میں داخل ہو رہے تھے۔ جہاں شائستہ ابھی بھی چار اطراف ناقدانہ جائزہ لینے میں مگن تھیں۔ گھر کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ اس کی پسند ہر شے پر غالب تھی۔ شائستہ نے خود بھی اس کے پسندیدہ رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔

”مام! آپ یہاں ہیں، میں سمجھ رہا تھا بھائی کے استقبال کے لیے گیٹ پر آجائیں گی۔“

شائستہ نے شہریار کا مذاق سنا کہاں۔ وہ تو یک ٹک اس کو دیکھے جا رہی تھیں۔ قابل رشک قد و قامت، دلکش خدو خال، قیمتی لباس۔ شائستہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔

”ارے ماما! ایسا روتا بسور تاو یکم؟“ اسد نے ہنستے ہوئے انہیں خود سے لگا لیا، وہ کھل کر رونے لگیں۔

اسد ان کے سر کو نرمی سے سہلانے لگا۔

”میرا بیٹا آگیا؟“ وہ اسد کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر جیسے خود کو یقین دلانے لگیں۔

”بالکل پورا کا پورا۔ اور ماما اندر تو آنے دیں۔ آپ نے تو دروازے پر ہی روک لیا۔“ وہ لوگ ابھی لاؤنچ کے دروازے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اسد کے احساس دلانے پر شائستہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔

”میری ماما۔۔۔“ اسد نے اچانک شائستہ کے گرد بائیں جمائل کر کے گویا اپنے کہنے کی تصدیق چاہی۔
”ہے نا؟“

”ہاں۔۔۔ صرف تمہاری ماما۔“ شائستہ روتے روتے ہنس دیں۔ جمیل صاحب نے فوراً ”شہریار کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ماں بیٹے کے پیار سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ محبت کے علاوہ کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

”یاسے صاحبزادے کی ضد وہی ہے۔“ جمیل صاحب نے تھوڑا آگے ہو کر شہریار کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ زور سے ہنس دیا۔ ”آپ ادھر ادھر کی سوچنے کے بجائے یہ دیکھیے کہ بھائی کتنے ہینڈسم ہو کر آئے ہیں پہچانے بھی نہیں جا رہے۔“
”ہاں یہ تو ہے۔“ اس بار جمیل صاحب نے فخریہ گردن مائی۔

اسد سے ملنے کے لیے آسیہ اور فاروق تو اسی دن چلے گئے۔ علیہ تب گئی جب اسد کے اعزاز میں دوست احباب کو پارٹی دی گئی۔ اسد محفل کی جان بنا ہوا تھا۔ خاندان کی لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اس سے چسکی ہوئی تھیں۔

”لگ رہے ہیں ناہالی ووڈ کے ہیرو؟“ وہ ایک طرف منہ بنائے بیٹھی تھی۔ جب شہریار نے قریب آکر اپنا فخر جھاڑا۔

”مجھے تو نہیں ان کو ضرور لگ رہے ہیں جو ان کے گرد منڈلا رہی ہیں۔“

”تم ہمیشہ جلتی رہنا۔“

”میں کیوں جلوں گی وہ بھی اس بندے کی وجہ سے جس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں۔ ہاں اگر تمہارے گرد یہ منڈلائیں تو پھر دیکھنا حشر کروں گی اور تمہیں تو میں گنجا کروں گی۔“

”اوہو۔“ شہریار اکٹا گیا۔ ”میں بھائی کی پر سنالٹی کی بات کر رہا ہوں۔“

”ہوں۔“ علیہ نے ذرا بھی دلچسپی نہ دکھائی۔
”ان کو دیکھ کر تو مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب میری دو یونیاں ہوئی تھیں اور ان کے گینڈے جیسے ہاتھ جب تمہاری ہڈیاں ہوئی تھیں اور ان کے جیکلی جن والے ایکشن۔“

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ شہریار جیسے آیا تھا ویسے چلا بھی گیا۔

”بڑا آیا بھائی کا چچہ۔“ وہ خود سے برہنہ رہی۔ پارٹی خیر و عافیت سے انجام پذیر ہوئی۔ رشتے دار دوست سب چلے گئے ایک ماسوائے آسیہ، فاروق لوگوں کے۔ فنکشن کے مٹے مٹے آثار باقی تھے۔ تھکاوٹ کسی کے بھی چہرے کی مہمان نہیں بنی تھی۔ سب ابھی بھی تروتازہ نظر آ رہے تھے۔ خوب صورت لباس اور بالکل نیچل میک اپ کیے علیہ نے اسد کی توجہ اب کھینچی تھی۔ اس سے پہلے رنگ برنگی قتلیاں اسے چھوڑیں تو وہ کہیں اور دیکھ پاتا۔
”پھپھو! یہ اتنی بڑی ہو گئی؟“ علیہ اس کی ستائشی نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔

”بھائی! دراصل آپ بہت سارے سال لندن کو دے آئے ہیں۔“ شہریار نے جیسے اطلاع دینی چاہی۔

”پتا ہے یاسے پتا ہے تو بھی بڑا ہو گیا۔“ اسد کے کسی بھی انداز سے بچپن والے اسد کا شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

”پھپھو! یہ گوئی ہو گئی کیا؟ بچپن میں تو بالکل جنگلی بلی ہوتی تھی۔“ وہ پھر بولا۔

”یہ اب بھی ویسی ہے۔“ شائستہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں اور تمہیں یاد ہے، مارتے تم شہریار کو تھے، روتی یہ تھی۔“ جمیل صاحب کے لہجے میں بھانجی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”جی ہاں۔۔۔ اور اکثر شہریار کو مارنے کا بدلہ بھی لے لیا کرتی تھی۔“ اسد نے مزید معلومات پہنچائیں۔ جس پر علیہ نے بھنویں سکڑیں۔ ایسا کوئی واقعہ اس کی یادداشت میں نہیں تھا۔ وہ دونوں تو ہمیشہ مار کھاتے

تھے۔

وہ اس وقت نشر مکرر ڈرامے دیکھنے بیٹھی ہی تھی کہ آسیہ سبزی کی ٹوکری لے کر وہاں آ گئیں۔

”دو سرا چینل لگاؤ۔ کوئی پرانا گیت ملا آ رہا ہو گا۔“ علیہ کو پہلے سے پتا تھا اس فرمائش کا۔ ناچار چینل بھگائے مزے کی بات ساٹھ کی دہائی کا کوئی گیت ملا لگا بھی ہوا تھا۔ اب سبزی اچھی کتنی تھی۔ وہ صوفہ پر لمبی ہو گئی۔

”امی۔۔۔ شائستہ مامی کا نام تو گنیز بک میں آنا چاہیے۔“

”کیوں؟“ آسیہ پوری طرح سے ٹی وی میں مگن تھیں۔ بے خیالی سے بوچھا۔

”ایسی سوتیلی ماں دیکھی نہ کبھی سی۔“
”کیا مطلب؟“ آسیہ کے ابرو تن گئے۔ وہ پوری طرح علیہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ گیت مالا بھول گیا۔

”آپ کو نہیں لگتا وہ شہریار کی حق تلفی کرتی ہیں؟“ کسی ٹی وی اینکر کی طرح اس نے یہ سوال کیا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ آسیہ سبزی ٹی وی بھول کر جلال میں آئی جا رہی ہیں۔

”سوتیلے بیٹے سے اتنا پیار اور سکے بیٹے کو ہمیشہ پھٹکار۔“

”علیہ!“ آسیہ کی آواز گھن گرج سے مشابہ تھی۔ علیہ کو باقی الفاظ بھول گئے۔

”آج تو میں یہ سن رہی ہوں۔۔۔ آئندہ نہ سنوں۔“ ان کی وارننگ دل دہلا گئی۔

”خاندان میں کسی کو بھی یہ بات یاد نہیں ہو گی کہ اسد شائستہ کا سگایا نہیں ہے اور تم گڑے مردے اکھیرنے لگیں۔“

”امی۔۔۔ میں تو۔۔۔“

”چپ کرو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔“ آسیہ کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ علیہ پیاؤں پیچ کر جانے لگی۔

”ایسا کیا کفر بول دیا میں نے۔ اتنا غصے ہو رہی ہیں۔ سچ ہی تو کہا ہے۔“ دروازے سے نکلنے سے پہلے وہ جوار شاد کر گئی اسے سن کر آسیہ مزید سنجاپا ہو گئیں۔

گھر میں جب بھی وہ اکیلے ہوتی، اطلاعی گھنٹی بجانے والوں کی آزمائش ضرور ہوتی۔ عموماً ”آنے والا زچ ہو کر گھنٹی پر ہاتھ جما دیتا۔ تب وہ دروازہ کھولتی۔ آج بھی ایک بار دوبار، تیسری بار۔۔۔ بہت اکتا کر، بدردار کر، آنے والے کو کوس کر جب وہ دروازے تک گئی تو سامنے اسد کھڑا نظر آیا۔ گھبراہٹ کے مارے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

”اسلام علیکم۔ کیا حال ہیں پیاری لڑکی؟“ اتنی دیر انتظار کروانے پر کوئی ناراضی، کوئی غصہ نہیں۔ بلکہ ایک پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ مہذب طریقہ گفتگو۔ علیہ کی بوکھلاہٹ دوچند ہو گئی۔

”وہ۔۔۔“ اس نے عادتاً ”وہ کو لمبا کیا۔“ اسد بھائی! امی تو گھر پہ نہیں ہیں۔“

”اوہ۔۔۔“ اس کے چہرے پر مصنوعی مایوسی پھیل گئی۔ علیہ بھگائے کے موڈ میں نظر آئی۔

”ابو بھی ابھی آفس سے نہیں آئے۔“ جلدی جلدی خالص نو دو گیارہ کتا انداز۔

”یعنی مجھے چلتا کر رہی ہو؟“

”نن نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔“ امید نہیں تھی اسد صاف کہہ بھی دے گا۔ ”آپ آئیے پلیز۔“ وہ گڑبڑا گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اسد لاؤنج تک آیا اور وہیں صوفے پر بیٹھنے لگا۔

”چائے پیس گے؟“ اسد کی نظروں سے بچنے کا واحد حل یہی نظر آیا کہ آداب میزبانی نبھائی جائے۔

”نہیں میں چائے نہیں پیتا۔“ اسد جیسے اس کے اندر کی کیفیت جان کر محظوظ ہو رہا تھا۔

”شہری تو بہت پیتا ہے۔“ وہ بالکل غیر اراداً ”بول گئی۔

”ہاں۔۔۔ شہری واقعی بہت پیتا ہے۔“ اسد نے ہنستے

ہوئے تائید کی۔ اس کے بعد جیسے باتیں ختم ہو گئیں۔ اسد ابھی بھی اس کے لیے ایک ہوا تھا۔ نہ ہوتا تو شاید وہ اس سے بے تکلف ہو جاتی اور اسد کے لیے شاید زیادہ دلچسپ کام تھا علیہا کو دیکھے جانا۔ جو وہ مسکراتی نگاہوں سے بڑے اطمینان سے کر رہا تھا۔

”پچھو کب آئیں گی؟“ علیہا کے چہرے پر گھبراہٹ اور پھر ناگواری بڑھنے لگی تو اسد کو نارمل ہونا پڑا۔

”دیر سے آئیں گی۔“ ایک بار پھر برثر خانا انداز سے اسد نے ہنسی دبانے کی ذرا کوشش نہیں کی۔

”تم مجھے نکال کر رہو گی۔“ علیہا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

”بھئی بشری آیا کا بچہ پیدا ہو گا تو آئیں گی نا۔“ شرمندگی مٹانے کے لیے تھا خفا سے انداز میں جو وضاحت دی اسے سن کر اسد کو زبردستی خاصی محنت سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹنا پڑا۔ جبکہ وہ دانتوں تلے زبان داب چکی تھی۔

”ممانے بتایا تھا تم ایم بی بی ایس کر رہی ہو؟“ اس کی شرمندگی دور کرنے کی خاطر اسد یوں ہی پوچھنے لگا۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”حیرت ہے۔ میں تو تمہیں میٹرک کی اسٹوڈنٹ سمجھا تھا۔“ وہ چپ رہی۔ اسد کی پر شوق نگاہیں کچھ دیر تک اس کے سرخ پڑتے چہرے پر جمی رہیں پھر وہ گہری سانس کھینچتا کھڑا ہو گیا۔

”پچھو واقعی دیر لگا رہی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔“ علیہا کی سانس میں سانس آگئی جان خلاصی ہونے پر۔

”آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں اسد بھائی!“ اب جب وہ جا رہا تھا تو اخلاق دکھانے میں کیا حرج تھا۔

”آپ نے کچھ دیا ہی نہیں۔“ بالکل علیہا کے اشاری میں اس نے شوخی سے کہا۔ علیہا پھر سے شرمندہ ہو گئی۔

”مجھے جو چاہیے ہو گا پچھو سے لے لوں گا۔“ پھر اس کے عین سامنے آکر ایسے ڈرامائی انداز سے کہا کہ علیہا پوری کی پوری سن سی ہو گئی۔

”اوکے بائے۔“ وہ ہاتھ ہلاتا چلا بھی گیا تھا۔ علیہا دروازہ بند کرنے بھی نہ گئی۔

آئینے کے سامنے کھڑی علیہا کی نظریں اپنی صراحی دار گردن میں موجود سونے کی بے حد نفیس زنجیر اور اس میں بڑے دل کی شکل کے نگینوں والے لاکٹ پر تھیں۔ شہریار کی طرف سے اسے یہ گفٹ آج ہی موصول ہوا تھا۔ آج اس کی برتھ ڈے تھی مگر وہ کسی میٹنگ کی وجہ سے نہ آسکا تھا اور اب وہ اپنی دلتی گردن پر نازاں چین لاکٹ پر ہاتھ پھیرتی تھک نہیں رہی تھی۔ اسی وقت اس کا موبائل فون اس مصروفیت میں حائل ہو گیا۔

خصوص رنگ ٹون سے ظاہر تھا کہ کال شہریار کی ہے۔

”تم آئے کیوں نہیں؟“ خوں خوار لہجے و انداز میں پوچھا گیا۔

”ساگر مبارک۔“ دوسری طرف سے شہریار کی مخمور سی آواز ابھری۔ اس کی آنکھوں میں جگنو دکنے لگے۔ بعض اوقات ساری دنیا بھی آپ کے آگے پیچھے گھومے۔ مگر وہ نہیں ہو جس کا دم دل بھرتا ہو تو دنیا بھی پیچ لگنے لگتی ہے۔ بالکل آج کے دن کی طرح، سب اس کے آس پاس تھے۔ ایک سوائے اس کے، سب نے اس کو مبارک باد دی تھانف مرضی و پسند کے دیے پھر بھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب تک چین لاکٹ گردن میں سج نہیں گیا اور اب شہریار کی کال نے تو جیسے بجی گئی ناراضی بھی ختم کر دی تھی۔

”تم آئے کیوں نہیں آج؟“ اتنی جلدی شہریار کو غیر حاضری پر معافی نہیں ملتی تھی۔ تب ہی تو سوال دوہرایا۔

”گفٹ تو بھیج دیا ناں۔“ نرمی و محبت سے بات کرتا

انداز سے علیہا کھٹکنے لگی تھی۔

”خود دینے کیوں نہیں آئے؟“ اس کی جرح ایسے کیسے ختم ہو سکتی تھی۔

”مصرف تھا یا۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ معاف کرو۔“

”کر دیا۔“ وہ مسکراتی تھی۔

”اچھا بتاؤ گفٹ کیسا لگا؟“ شہریار نے بات بدل کر اشتیاق سے پوچھا۔ علیہا نے بے ساختہ آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

”بہت آؤٹ ڈیٹڈ ہے میری پسند کا نہیں ہے۔“ لہجے میں واضح اتراہٹ اور خمرہ تھا کہ یہ خمرے تو محبت میں جائز ہوتے ہیں۔

”میری پسند کا ہے۔“ شہریار نے زور دے کر گویا جتلیا۔

”یہ دل اوپن بھی ہوتا ہے۔ اس میں اپنی اور میری تصویر لگانا۔“

”ہاں اور امی سے جوتے بھی کھانا۔“ شہریار کے ہی انداز میں اس نے فٹنٹ جواب دیا۔

”اسد بھائی آئے تھے۔ تم نے ٹھیک طرح سے تو استقبال کیا ناں ان کا؟“ عام سے انداز میں کہا۔ مگر وہ جو اپنی اور صرف اس کی باتوں سے محفوظ و مسرور ہو رہی تھی۔ ساری جان سے جل کر رہ گئی۔

”بس گھر میں جھنڈیاں نہیں لگائی تھیں اور نہ ہی سلامی دینے کے لیے توپیں رکھی تھیں۔“ شہریار کو اس جلے کٹے جواب نے خوب لطف دیا۔ دیر تک اور خوب اونچا قہقہہ لگا کر علیہا کو مزید سلگایا۔

”بہت بد مزیز ہو تم بھائی ہیں وہ میرے۔“ شہریار ابھی بھی ہنستا رہا۔

”اچھا بس امی آرہی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں کتاب کے بجائے موبائل دیکھ کر جوتے اٹھالیں گی۔“ گفتگو کے بیچ اسد کیا آیا سارا رومانس تباہ کر دیا۔ اور پھر آئیہ واقعی دروازہ بجارہی تھیں۔ اس نے فوراً کال کٹ دی۔

بیٹھی تھیں۔ چہرے پر گہری سنجیدگی اور سوچ کے رنگ سجائے جمیل صاحب یہاں سے وہاں ٹہل رہے تھے۔ شائستہ گاہے بہ گاہے چور نظروں سے ان کی طرف دیکھتیں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتیں اور پھر ہونٹ بھینچ لیتیں ہمیشہ ہر دم بذلہ سخی۔ اور ہنسوڑ سے رہنے والے جمیل صاحب کے ہر انداز سے سنجیدگی ہی نہیں ناراضی بھی ظاہر تھی۔ شائستہ کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی انہیں اپنے نقطہ نظر سے قائل کرنے کی۔ یوں بھی تین دن سے وہ یہی تو کر رہی تھیں۔ وہ بھی پہلی بار اپنی کسی بات کو لے کر ضدی ہوئے تھے۔ ان کی کسی بھی دلیل سے جذباتی نہیں ہو رہے تھے۔ صرف اس کمرے کی ہی نہیں۔ اسد کو چھوڑ کر سارے گھر کی فضا خاموش اور سوگوار تھی۔ شہریار کے کمرے سے اس کے گٹار کی دھنیں بجنا بند ہو گئی تھیں۔ وہ جیسے گٹار کی تاروں کو چھیڑنا ہی بھول گیا تھا۔ صرف گٹار کیا اس کی تو مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں تک کا راستہ بھول گئی تھی۔ وہ جس کے دم سے گھر بولتا تھا۔ جب گھر آتا لگتا دیواریں بھی کھل اٹھی ہیں۔ اب تب ہنستا بولتا جب اسد قریب ہوتا گویا اسے دکھانا مقصود ہوتا کہ وہ کتنا خوش ہے۔ بلاوجہ بات بہ بات اونچے قہقہے لگا کر اسد کو ہی نہیں خود کو بھی دھوکا دینے کی ناکام سعی کرتا۔ ایسے میں جمیل صاحب آنکھوں میں سے جیسے تیر نکال نکال کر شائستہ کو دیکھتے۔ جو خود شہریار کے اس مصنوعی پن سے مجروح بیٹھی ہو تیں۔ اسد آس پاس نہ ہوتا تو شہریار ماں باپ سے ضرورتاً بھی بات نہ کرتا۔ شائستہ کے ضمیر و دل میں جیسے جرم کا احساس تھا۔ سو وہ تو کیا۔ جمیل صاحب بھی شہریار کو حوصلہ دینے کی ہمت نہیں کیا رہے تھے کہ رد عمل کے طور پر وہ نہ جانے کتنے پرانے درد کھول کر بیٹھ جاتا۔ صرف ہفتہ بھر پہلے ہی رات کے کھانے کے بعد جب لاؤنج میں سبز چائے کا دور چل رہا تھا۔ شائستہ اور پھر شہریار اسد کی پسند کی لڑکی جاننے پر مصر ہو گئے۔

”کوئی بھی نہیں ہے یا۔ اس نظر سے کوئی اچھی

کمرے کی فضا سوگوار تھی۔ شائستہ مغموم سی بیڈ پر

نہیں لگی۔

”ماشاء اللہ قربان جانیے۔“ شہریار نے جمیل صاحب اور شائستہ کی طرف دیکھ کر گویا اپنی کی گئی توصیف کی تائید چاہی۔ ”لیکن اب آپ کو یوں چھوڑا بھی نہیں جاسکتا جبکہ سر کے بال بھی سفید ہونے لگے ہوں۔“

”نہیں نہیں یار! اسد نے بے ساختہ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”تمہاری کوئی پسند نہیں تو یہ چارج اپنی ماما کے ہینڈ اوور کرو۔ وہ ڈھونڈ لیں گی تمہارے مزاج کی۔“

”ماما کو نہیں۔“ شہریار نے جمیل صاحب کے مشورے کو فوری مسترد کر دیا۔ ”اپنی علیینہ ہے ناں۔ سنی بنائی رشتہ کرانے والی۔ ایک چھوڑ دس دس لڑکیاں دکھا دے آپ کو۔“

شہریار نے محسوس نہیں کیا اسد کے ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرانے لگی تھیں۔ ”اس مقصد کے لیے ہر ٹاپ کی لڑکی دوست بنا رکھی ہے اس نے۔ آپ کے نام لینے کی دیر ہے اور علیینہ کی دوستوں کی پٹاری میں سے۔“

”دوستوں کی پٹاری میں سے کیوں؟“ شہریار کو امید نہیں تھی اسد یوں بات کاٹ دے گا۔ وہ کچھ جھل سا ہو گیا تھا۔

”علینہ خود کیوں نہیں؟“ پھر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اسد نے گہری پر تجسس نظروں سے سب کے تاثرات جانچے۔

”کیا...؟“ کافی دیر بعد بالکل پھکی آس بھری مسکراہٹ کے ساتھ شہریار نے یوں کہا جیسے یقین ہو وہ سننے میں غلطی کر بیٹھا ہے اور اب پوچھنے پر اسد یقیناً ”نہیں کرے گا۔“ میں تو مذاق کر رہا تھا۔

”سمپل یا۔“ علیینہ کی فرینڈز میں سے کوئی کیوں۔ علیینہ خود کیوں نہیں؟“ مگر اسد نے جیسے اس کی سماعتیں دھواں دھواں کر دیں۔ وہ خالی نظروں سے بس اسد کو تنکے گیا۔ سمجھ بوجھ کے سارے فارمولے اس ایک پل میں ذہن سے نکل گئے۔

”کیا ہوا! علیینہ اتنی بری ہے کیا؟ اس کا نام سنتے ہی آپ سب فریز کیوں ہو گئے؟“

”بہت بری۔ ایک دم جنگلی۔“ اندر کہیں بہت ناقابل برداشت تکلیف ہونے لگی تھی۔ اسی تکلیف کو چھپانے کی خاطر مسکرانے کی کوشش میں اس کا چہرہ کیسے راز محبت افشا کر گیا۔ اگر اسد چہرہ شناس ہوتا تو ضرور جان جاتا۔

”رینی؟“ اسد مصنوعی مایوس سا ہونے لگا اور دو بیٹوں کے بیچ پنڈولم کی مانند جھونکتیں شائستہ کی وہی ممتا عود کر آئی جس کے دور رنگ تھے اسد کے لیے الگ۔ شہریار کے لیے الگ۔

”نہیں نہیں بالکل بھی نہیں۔“ وہ بولیں تو شہریار نے انتہائی کرب سے انہیں دیکھا۔ جمیل صاحب غائب دماغی سے تینوں کو دیکھ رہے تھے۔

”علینہ تو بہت پیاری بہت ہونما رہی ہے۔ سب کی چیتی۔“ شہریار سے دانستہ نظریں چرا کر دم آواز میں شائستہ نے کہا۔

”تو آپ اس بہت پیاری بہت ہونما اور سب کی چیتی پچی کے لیے پھپھو سے بات کر س ناں۔“ اسد نے پورا لائحہ عمل ترتیب دے دیا۔ شہریار کی رنگت زرد ہوتی چلی گئی۔ جمیل یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

”اچھا ہے ناں۔ آپ کو دوڑ دھوپ کرنے سے بچالیا۔“ اسد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ شائستہ جبرا ”مسکرا دیں۔ اور شہریار تو جیسے دماغی طور پر بالکل ہی غیر حاضر ہو گیا۔

”لیکن۔“ گلا کھنکارنے کے بعد جمیل صاحب نے بے حد سنجیدگی سے کچھ کہنا چاہا تو شائستہ بری طرح سے ہراساں ہو گئیں اور شہریار کوئی کال سننے کے بہانے باہر نکل گیا۔

شائستہ اور جمیل صاحب بخوبی جانتے تھے وہ منظر سے غائب ہونا چاہتا تھا۔ وہ بھی ناؤ کھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس بات کو ہفتہ گزرنے کے بعد بھی سب کے

مزاج برداشتہ تکلف کی چپ برقرار تھی۔

”جمیل! میں۔“ شائستہ کی بھرائی آواز پر جمیل نے رک کر انہیں دیکھا۔ شائستہ کی محبت کی ترجیحات اسد کے لیے اور بھی شہریار کے لیے۔ اور اسی بات پر جمیل صاحب کو اعتراض تھا۔

”تم ایک بیٹے کو خوش کرنے کی خاطر دوسرے کی خوشی نہیں چھین سکتیں۔“ ان کی آواز بلند اور درشت تھی۔

”جمیل۔“

”جانتے بوجھتے تم شہریار کو دکھ نہیں دے سکتیں۔ شائستہ“ جمیل لفظ چبا کر بولے۔ شائستہ رو پڑیں۔

”اسد نے اتنے عرصے بعد مجھ سے کچھ مانگا ہے۔“

”اسد نے ہمیشہ کی طرح صرف وہی مانگا ہے جو شہریار کا ہے۔“ جمیل صاحب طنز بولے۔

”میں اسے کیسے انکار کروں۔“ وہ سمجھے گا۔“ وہ روتے روتے بولیں۔ جمیل صاحب مزید اشتعال میں آگئے۔

”وہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ وہ آٹھ نو سال کا بچہ نہیں رہا۔ ایک میچور مرد ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے تم نے اس پر اپنا سب کچھ بچھا کر کیا محبت، شفقت، ممتا سب کچھ۔ اور آج تک کر رہی ہو۔“ جمیل صاحب ان کے سامنے بیڈ پر آ بیٹھے۔

”خدا کے واسطے۔“ وہ شائستہ کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہنے لگے۔ ”اسد کو اپنی ممتا اور محبت کے پروف دینا چھوڑ دو۔ ایسا کر کے تم شہریار کی حق تلفی کرتی ہو۔ اس پر ظلم کرتی ہو۔ کبھی تم نے سوچا اسد کے دل میں جگہ بنانے کی کوششوں میں تم شہریار کے دل سے نکلتی جا رہی ہو۔“

”شائستہ تھک کر کھڑکی کے آگے جا کھڑی ہوئیں۔ آخری تاریخوں کا چاند اندھیرے کا باسی بنا ہوا تھا۔

”ایسا کر کے تم مجھے بھی شرمندہ کرتی ہو شائستہ! میں نے ایسا کب کہا تھا کہ تم اسد سے محبت کی انتہا کرو اور اپنے سگے بیٹے کی خوشیوں کی قاتل بن جاؤ۔ تم نے

مجھے خوش کرنے کے لیے۔“ جمیل صاحب سے بات پوری نہیں کی جاسکی۔

”رحم کرو شائستہ! شہریار پر کیونکہ اب معاملہ کھلونوں کا نہیں، اس کی زندگی کا ہے۔ جو اسد چھین لے اور وہ اف بھی نہ کرے۔“

شائستہ نے آزدگی سے سریشے پر ٹکا دیا۔ دیر تک بے آواز روتی رہیں۔ جمیل صاحب نے چپ نہیں کرایا کہ اس بوچھاڑ کے بعد شاید شفاف راہ شائستہ کو نظر آجائے۔

”لیکن اب میں نے اگر اسد کو انکار کیا تو میری ساری محبت، خلوص، ممتا ختم ہو جائے گی۔“ شائستہ کی لرزتی آواز پر جمیل صاحب نے ہونٹ بھیچ لیے۔

”صرف اور صرف سوئیلی ماں رہ جائے گی۔“

☆☆☆

ابھی ابھی وہ جو سن آئی تھی اس کے بعد حواس کا قابو میں رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ درحقیقت اس کی پوری جان لرز کر رہ گئی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ شہریار کا نمبر ملاتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں جیسے سکت ہی ختم ہو گئی ہو۔ یوں کپکپا رہے تھے کہ موبائل فون بھی سنبھالنا دشوار لگ رہا تھا۔ شہریار کے نمبر پہ نیل جا رہی تھی۔ وہ دم سادھے اس کے ہیلو کہنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر نیل جاتے جاتے خود تھک کر بند ہو گئی۔ شہریار نے فون نہیں اٹھایا۔

”ایک بار دوبار، تین بار۔ اور پھر شاید اسے خود بھی گنتی یاد نہ رہی۔ شہریار نہ جانے کن مصروفیات میں پھنسا تھا کہ کال اینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔

”شہریار! پلیز میری کال سنو۔ بات کرو مجھ سے۔ ابھی اسی وقت نہیں تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“ نمبر ملاتے ہوئے وہ ایک بار پھر بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑلاتی تھی مگر کال دو گھنٹاں جانے کے بعد دوسری طرف سے دانستہ کال دی گئی تو جیسے اس کی آنکھوں

کے آگے اندھیرا چھا گیا۔
”شہریار...“ اس کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

شہریار کی یہ حرکت سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آسیہ بیگم کے کمرے کی طرف یہ بتانے کے لیے گئی کہ وہ ماموں کی طرف جارہی ہے تو اندر سے اپنا نام سن کر لحظہ بھر کورک سی گئی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ آسیہ کا لہجہ رعب لیے ہوئے تھا۔ علیحدہ نے کان باقاعدہ دروازے سے چپکا لیے۔

”کچھ نہیں... سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ قاروق صاحب کی آواز بھی اٹل تھی۔

”میں سوچ رہی ہوں اسد ضدی طبیعت کا تو ضرور ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس میں متانت آگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے علیحدہ اور اس کا جوڑ برا نہیں۔“ جملے واضح تھے علیحدہ کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

”عجیب نا سمجھی ہے۔“ قاروق خفا ہو گئے۔ ”اولاد کی خوشی سے زیادہ ہمیں جوڑ ملانے کی پڑ رہی ہے۔“ علیحدہ نے دروازے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ”اور جوڑ تو شہریار کے ساتھ بھی خوب بنتا ہے۔“

جواب میں آسیہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئیں۔ علیحدہ کے دل میں سب الٹ پلٹ ہونے لگا۔ ایسی عجیب و غریب بات کانوں میں پڑ گئی کہ لگنے لگا جو کچھ بھی اندر ہے منہ سے باہر آجائے گا۔ ٹانگیں الگ ریشہ زدہ ہو گئیں۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ آسیہ کی مدھم آواز میں گوگو سی کیفیت تھی۔

”ہم سے پہلے شائستہ اور جمیل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔“ قاروق صاحب کی آواز بلند تھی۔ ”حیرت ہے انہوں نے کیا سوچ کر یہ بات کی؟“

جواب میں آسیہ پر پھر چپ کے بادل سایہ فگن

ہو گئے۔ یہ سوچ کر کہ آسیہ کے دل میں کہیں نہ کہیں ضرور اسد کے لیے نرم گوشہ موجود ہے، علیحدہ کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔

”آپ...“ آسیہ کی — جھجکتی ہوئی آواز آئی۔ ”آپ سوچیں تو... اسد بہترین لڑکا ہے۔“

”کوئی شک نہیں کہ اسد بہترین لڑکا ہے۔“ قاروق صاحب نے فوراً کہا۔ ”لیکن بہر حال... وہ شہریار نہیں ہے۔“

”اور تمہیں یا مجھے علیحدہ کی خواہش یا خوشی کے آگے کچھ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”ہاں جیسے وہ ہم سے بھی زیادہ سمجھ دار ہے؟“ آسیہ کی ناگواریت بھری بلند بڑبڑاہٹ باور کرائی کہ وہ اسد کو کن نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور کیا مقام دینا چاہتی ہیں۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر کسی سسکاری کا گلا گھونٹتی علیحدہ اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ شہریار کو فوراً ”فون کیا صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ ماموں ماما نے اسد کے لیے بات کی... اور آسیہ کیا سوچے بیٹھی ہیں؟“

وہ دونوں ہی کل تک بہت سکون سے اپنے رشتے کے خوشگوار انجام کے متمنی تھے۔ آج منظر دھندلا گیا۔ مگر شہریار اول تو کال انیڈ ہی نہیں کر رہا تھا اور آخری تین کالز خود کاٹ رہا تھا۔ بہت بھنا کر آخری بار ملایا تو شہری نے موبائل ہی آف کر دیا تھا۔ وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

”شہری... کیوں کر رہے ہو ایسا... مت کرو“ موبائل ایک طرف پھینک کر وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔

کھانے کی ٹیبل پر اشتہا انگیز خوشبو میں کھانے والوں کو مسحور کر رہی تھیں۔ مگر کھانے والے جیسے کھانے سے ہی نہیں ایک دوسرے سے بھی بے زار بیٹھے تھے۔ جامد خاموشی سب پر پہرہ دے رہی تھی۔ رغبت سے کھاتے اسد کا دل بھی اچاٹ

ہو گیا۔ بڑی گہری نظروں سے اس نے سب کا جائزہ لیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے۔ میرے اس رشتے سے کوئی بھی خوش نہیں ہے۔“ شائستہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اسد گہری سنجیدگی سے متوجہ تھا، جمیل اور شہریار بھی اسے دیکھنے لگے۔

”جب سے میں نے بات کی ہے۔ سب کو چپ لگ گئی ہے۔“ تینوں کو اندازہ نہیں تھا وہ یوں صاف گوئی سے پوچھے گا۔ شائستہ تو زرد پڑی ہی تھیں، شہریار بھی بوگھلا گیا جبکہ جمیل صاحب معنی خیزی سے کھنکار کر پلیٹ پر جھک گئے۔

”نہیں... بالکل نہیں۔ ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟“ مصنوعی مسکراہٹ شائستہ کو قدرے ہونق سا بنا گئی۔

”ہم سب بہت خوش ہیں۔“ شائستہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

”شہریار نہیں ہے۔“ اسد نے براہ راست اسے دیکھ کر گویا وثوق سے کہا تو وہ خود پہ قابو پا تا بڑی بہادری سے مسکرا دیا۔

”آپ غلط سوچ رہے ہیں بھائی! ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔“ اس نے اسد سے زیادہ خود کو یقین دلایا۔

”ریلی؟“ اس کے پوچھنے میں ابھی بھی شک تھا۔

”آف کورس۔“ ایک بار پھر جبراً ”مسکرا اپنا۔ اس مسکراہٹ کا ساتھ اسد نے بھی مسکرا کر دیا۔

”چلو پھر ڈن ہوا... میری شادی کی شاپنگ بھی تم کرو گے۔“ وہ انجانے میں اس کے زخم تازہ کر رہا تھا۔

”شیو... میں ہی کروں گا۔“ بہت تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ کمال کی بہادری دکھا رہا تھا۔

”انیڈ آئی ایم سر پر انڈ... پھپھو لوگ سوچنے میں اتنا ٹائم کیوں لے رہے ہیں؟“ گھر والوں سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے نیا مسئلہ اٹھایا۔ شہریار نے اپنی پلیٹ میں موجود چاول گننے شروع کر دیے۔

”تم پریشان مت ہو۔“ قاروق بھائی انکار نہیں کریں گے۔ میرے بیٹے کو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اسد

مہم سا مسکرا دیا۔ شہریار کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

شائستہ مسکراتے ہوئے علیحدہ سے گلے لگیں۔

”اتنے دنوں بعد آئیں؟“ اس سے الگ ہو کر شائستہ نے ہلکا پھلکا شکوہ کیا۔ ”بیٹھو۔“

”جی بس۔“ وہ بیٹھ گئی۔ ”طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

شائستہ نے اب غور کیا۔ ان پندرہ بیس دنوں میں اس کا بہت وزن کم ہو گیا تھا، چہرے پر الگ زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ شائستہ کو لگا وہ شہریار پر تو ظلم کر رہی رہی ہیں، علیحدہ کو بھی دوہری اذیت دینے کا باعث بن رہی ہیں۔

”مامی...“ انگلیاں مروڑتی وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اپنے کمرے سے باہر نکلتا شہریار لاؤنج میں علیحدہ کو شائستہ کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر واپس کمرے میں چلا گیا۔

ماتھا مستلہ وہ تھکا ہوا سا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سامنا کرنے کی ہمت ممکن ہی نہیں تھی۔ علیحدہ جس اجڑے بکھرے حلیے میں بیٹھی تھی۔ کیا پتا وہ کمزور پڑنے لگتا۔

کچھ سوچ کر جب سے موبائل نکالا اور پکچن میں شام کی چائے بناتے شکور کو میسج بھیجا۔

”شکور! علیحدہ آئی ہوئی ہے۔ باہر اس کے پاس جاؤ“ وہ میرا پوچھے تو کہنا میں گھر پہ نہیں ہوں۔“

سارا دن اوٹ پٹانگ میسج پڑھنے اور بھیجنے کا شوقین شکور میسج ٹون سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتا تھا۔ اس نے فوراً ”شہریار کا میسج پڑھا اور قدرے حیران ہوا۔ اسے معلوم تھا شہریار اوپر بیڈ روم میں ہے۔ پکچن سے جھانک کر دیکھا، شائستہ علیحدہ سے مصروف گفتگو تھیں، وہ چائے لے کر فوراً ”وہاں پہنچا۔“

”لو چائے بھی آگئی۔“

”نہیں میں چائے نہیں پیوں گی ماما...“ اس کے انداز میں ہمیشہ والا اپنا پن غائب تھا۔ شائستہ نے

شدت سے محسوس کیا۔

”کیوں علیہ... میں ابھی سب کو۔“

”مامی! شہیار ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی تھی؟“ شائستہ کی زبان فوراً ”اٹک گئی۔ وہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔

”وہ تو جی باہر گئے ہیں کافی دیر ہو گئی ہے۔“ شائستہ نے حیرت سے فر فر جھوٹ بولتے شکور کو دیکھا۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر نظروں سے کچھ سمجھانا چلا رہا تھا اور شائستہ سمجھ بھی گئیں۔

”کب آئے گا؟“ علیہ کے چہرے پر چھائی مردنی شائستہ کا دل پسین رہی تھی۔

”رات ہو جائے گی کہہ رہے تھے۔“ شکور کہہ کر واپس کچن میں چلا گیا۔

”چھال...“ علیہ کی جیسے رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ وہ لبالب آنکھیں لیے کھڑی ہو گئی۔

”علیہ! بیٹھو تو بیٹا میں۔“

”نہیں بس۔“ شائستہ کی بات کاٹ کر وہ بمشکل کہہ پائی۔ آنسو باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔ وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ اپنی کھڑکی سے جھانکتا شہیار نڈھال ہو کر رہ گیا۔

مگر علیہ کے پاس ایک اور۔ اور شاید آخری راستہ موجود تھا۔

اس شام اس کی سیکریٹری نے اسے انٹر کامپ علیہ کے آنے کی اطلاع دی تو جیسے اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔

”آپ ٹال دیں انہیں۔ کہہ دیں میں مینٹنگ میں بڑی ہوں۔“ آخری الفاظ منہ میں ہی تھے جب آندھی طوفان بنی وہ اندر داخل ہوئی۔ ہانپتی ہوئی سیکریٹری بھی پیچھے تھی۔

”سرایہ...“ سیکریٹری بے بسی سے کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے آپ جا میں۔“ شہیار نے بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ پلٹ گئی۔ علیہ آنکھوں میں

غصہ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”تم مجھ سے چھپ رہے ہو؟“ وہ دانت پیس کر پوچھنے لگی۔

”بیٹھ کر میری بات سنو۔“ شہیار اس کی جانب قدم بڑھا کر رمان سے بولا۔

”میں کال کروں تم سیل آف کر دیتے ہو۔ میں گھر آؤں تم جھوٹ بول دیتے ہو اور اب۔۔۔؟ اب تم مینٹنگ میں بڑی ہو؟“ شہیار اس زرد روکنزور علیہ میں اپنی فریش سی علیہ کو کھوپکا تھا۔ وہ اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

”علیہ! ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنا چاہا۔“ علیہ ہاتھ جھٹک دیا۔ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ آنسو بنا اجازت بنے لگے۔

”شہیار... کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟“ پھر خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا کہ شہیار خود بھی کرچی کرچی ہو گیا۔ بس نہیں چلا علیہ کو ساتھ لگا کر کہہ دے۔۔۔ سب جھوٹ ہے مذاق ہے، ہم تو آج بھی ساتھ ہیں۔ مگر زبان گوئی ہو گئی تھی۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ گیا بس۔

”شہیار! ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں ناں؟“ اس کے پوچھنے میں یقین تھا۔ مگر شہیار چپ رہا۔

”پھر یہ اسید بھائی بیچ میں کہاں سے آگئے؟“ وہ روئے جاری تھی اور مقام حیرت کہ آج اس کے رونے کی وجہ وہ خود تھا۔ جو آج سے پہلے خود اس کے آنسو صاف کرتا تھا۔ شہیار کی چپ برقرار رہی تو علیہ کو طیش آگیا۔

”مجھ سے کسی بھی قیمت پر دستبردار نہ ہونے کا دعوا کرتے تھے ناں تم۔ اب اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے چھوڑنے پر کیسے راضی ہو گئے تم۔“ روتے روتے وہ چلا اٹھی شہیار کے چہرے پر کرب پھیلتا چلا گیا۔

”اسد بھائی بچپن میں تمہارے کھلونے چھین لیا کرتے تھے لیکن وہ بے جان چیزیں تھیں۔ میں جیتی جاگتی انسان ہوں شہیار! شہیار نے نظریں جھکا لیں۔

علیہ کا یوں شدت سے رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ”مجھے بے جان چیزوں کی طرح قربان مت کرو۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ شہیار نے بہت نرمی سے اس کے گال پر پھسلتے آنسو صاف کیے اور رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

”علیہ...“ اس کی آواز علیہ کو دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”اسد بھائی بہت اچھے ہیں۔“ علیہ ایک دم سے رونا بھول گئی۔ وہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ وہ یہ کہے گا۔

”شہری! اس نے بے یقینی سے پکارا۔ شہیار پیٹھ کے کھڑا تھا۔ علیہ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر منتظر رہی۔ پھر خود اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ شہیار نے اسے یوں دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔

”تم نے پھر مجھے اسد بھائی کا بنا دیا۔؟“ علیہ کی آواز بھرا گئی۔

”مگر اب تو ہم بچے نہیں ہیں نہ ہم کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ ہماری زندگی ہے۔ پوری زندگی ایک ساتھ گزارنے کا سوال ہے۔ صرف دو گھڑیوں کے لیے مجھے اسد بھائی کا نہیں بننا۔“ شہیار دانت پہ دانت جھاکر چپ کھڑا رہا۔

”سن رہے ہوں ناں۔ یہ میری پوری زندگی کا سوال ہے۔“ علیہ اس کا بازو دبوچ کر چیخی تھی۔ وہ پھر بھی چپ رہا۔ اندر کی اذیت اندر چھپائے سیاٹ اور بے تاثر۔ علیہ تا دیر بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بری طرح اپنا چہرہ رگڑ کر یوں ہنسی جیسے اپنا مذاق اڑا رہی ہو۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ بولی تو لہجہ عجیب ہو رہا تھا۔ ”ایسا ہے تو ایسا ہی سہی“ وہ خود اذیتی کی حد تک پہنچ گئی۔

”مامی نے ابھی مجھ سے نہیں پوچھا۔“ یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ حواسوں میں نہ ہو۔

”لیکن اب میں ان سے خود جا کر کہہ دوں گی کہ مجھے اسد بھائی کا رشتہ منظور ہے۔“ اس نے لفظ چبا ڈالے تھے۔

”دیکھتی ہوں کتنے بڑے سورا ہو تم۔“ تمہارے گھر میں تمہارے سامنے تمہاری بھابھی بن کر رہوں گی۔ پھر کھانا تم اپنے یہ تیور۔“ وہ پلٹ کر جانے لگی۔ ”رکو۔۔۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔“ علیہ دروازے پہ رک کر پلٹی۔

”تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے شہیار! اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور باہر نکل گئی۔ شہیار کرسی پر گر گیا۔

اس سے اگلی رات کو جب وہ خود سے بے گانہ ٹوٹا بکھرا سا اپنے بند روم میں بیٹھا تھا کہ شائستہ اندر داخل ہوئیں۔ وہ دعا کی طور پر اس قدر غیر حاضر تھا کہ شائستہ نے جب تک اس کے کندھے پہ نہیں رکھا، وہ ان کی آمد سے بے خبر رہا۔

”مما آپ۔۔۔“ وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ شائستہ دنیا جہاں کا پیار نظروں میں بسا کر اسے ہنکتی رہیں۔ ”مصروف ہو؟“ انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ شہیار کو دیکھتے ہی احساس جرم تو اٹا ہوا گیا تھا۔

”نہیں بالکل نہیں۔“ شہیار نے سامنے رکھی فائل بند کر دی اور چپ چاپ شائستہ کی اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔ جنہیں ندامت کچھ بولنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بوکھلا کر کبھی شہیار کو دیکھتیں، کبھی اس کی ٹیبل پر رکھی چیزوں کی ترتیب بدلنے لگتیں۔

”نہیں پتا ہے شہری! یونہی مصروف نظر آنے کی کوشش میں وہ پولیں۔“ تمہاری پھپھو مان گئی ہیں؟“ شہیار خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔ کہتا بھی کیا، نہ مبارک دینے کو دل آمادہ ہوا اور شکوہ کرنے کی تو عادت ہی نہیں تھی۔ بس تکلیف تھی کہ حد سے سوا ہو گئی تھی۔ تو علیہ نے وہی کیا جو وہ کہہ گئی تھی۔ اندازہ تھا پھر بھی دل رونے لگا۔ شائستہ نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹا!“ وہ رونے لگیں۔ شہیار کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح بیٹھا رہا۔ جس سے

جینے کی امید چھین لی گئی ہو۔

”میں سمجھ رہی تھی۔۔۔ علیہ خود انکار کر دے گی لیکن۔۔۔ شائستہ کی اس بات پر اس کا دل چاہا، زور زور سے ہنسنے۔ شائستہ نے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ وہ بہت بے چین ہو کر رو رہی تھیں۔

”پلیز چپ ہو جائیں ماما! وہ نرمی سے ان کا سر سہلاتا رہا۔” سب کچھ بھول کر بھائی کی خوشی سیلبوٹ کریں۔ شائستہ نے سر اٹھا کر متورم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ خود ٹوٹ چکا تھا۔ انہیں سمیٹ رہا تھا۔

”میں بھی کوشش کروں گا شائستہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ پھر بولا تو آواز بھیگی ہوئی تھی۔

”سب کچھ بھولنے کی۔“

☆ ☆ ☆

زرد لباس میں وہ خود بھی سرسوں کا پھول بنی ہوئی تھی۔ ضرورت سے زیادہ پکی اور بالکل اداس۔ پہلی نظر میں تو اس کو خدشہ ہوا کہ اس میں وہ بیمار تو نہیں اور وہ پوچھنے بھی لگا تھا، لیکن اس کے آہستگی سے ”چلیں“ کہنے پر اس کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں بھی دونوں کے بیچ خاموشی حائل رہی۔ وہ بھی سمجھی سی شے کے پار دیکھتی رہی اور اس کا الجھا الجھا سا کبھی اسے تو بھی سامنے دیکھتا رہا۔

”تم آنا کیوں نہیں چاہ رہی تھیں؟“

کچھ تو بولنا تھا۔ جب کہ وہ اسے لایا بھی اسی مقصد کے لیے تھا کہ وہ بولے گی اور وہ سنے گا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ ناچار علیہ نے جواب دیا۔

”یار! میں اب اتنا بھی خوفناک نہیں ہوں۔“ اس نے فضا کی گھبراہٹ دور کرنے کی خاطر شوخی دکھانی چاہی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ علیہ کو بولنے سے چڑھ رہی تھی۔

”اوکے۔۔۔ تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔“ اس نے زیادہ دیر بحث مناسب نہیں سمجھی۔ یوں بھی علیہ کے چہرے پر بڑا بڑا ”ٹوٹ“ لکھا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا مگر کب تک۔

”تم کوئی ڈھنگ کا ٹکر پہن لیتیں۔“ اس کا اشارہ اس کے زرد رنگ کے سوٹ کی طرف تھا۔ علیہ استغما میہ اسے دیکھنے لگی۔

”اس میں تمہارا چہرہ بھی نہیں نظر آ رہا۔ کپڑوں کا رنگ تم جیسا لگ رہا ہے۔“ علیہ نے بے تکی بات کا کیا جواب دینا تھا خاموش رہی۔

”ویسے تو تم اپنی مرضی سے بھی شاپنگ کر سکتی تھیں مگر میں چاہ رہا تھا ہم دونوں ایک ساتھ کریں۔“ علیہ نے دانت بہ دانت جمالیے۔

بعض اوقات ان چاہے شخص کی سنگت اس کی باتیں، کتنی ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ یہ اسے اب اندازہ ہوا تھا۔ اس کو بھی اس کی بے زاری محسوس ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی نہ بولا۔

”علیہ۔۔۔“ کافی دیر بعد پکارا تو وہ چونک گئی۔

”پہلے کہاں چلیں۔۔۔ جیولری یا پھر ڈریس آرڈر کرنے؟“ وہ بہت نرمی سے پوچھ رہا تھا لیکن علیہ کا دم گھٹنے لگا۔ بس نہیں چل رہا تھا چلتی گاڑی سے کود جائے۔

”اسد بھائی۔۔۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کبھی پلیز۔“ وہ بہت عاجزی سے بولی۔ حیرت و پریشانی کا شکار اسد فوراً اس کی کلائی چیک کرنے لگا۔

”واقعی۔۔۔ تمہیں تو نمپر پتھر ہو رہا ہے۔“ بہت نا محسوس انداز میں علیہ نے اپنی کلائی چھڑائی۔

”ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“

”نہیں پلیز نہیں۔“ وہ بری طرح روہانسی ہوئی۔

”مجھے کیس نہیں جانا۔“

”لیکن علیہ۔۔۔“

”اسد بھائی پلیز! کہیں نہیں جانا اور اگر آپ زبردستی لے گئے تو میں آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔“ انداز دو ٹوک تھا۔ اسد ہونٹ بھیچتا ہوا گاڑی

موڑنے لگا۔

☆ ☆ ☆

”کہیں جا رہی ہیں؟“ اپنے کمرے سے پریشان صورت لیے لاؤنج میں بے جلت داخل ہوتی شائستہ کو دیکھ کر جمیل صاحب نے پوچھا تو اسد اور شہریار دونوں متوجہ ہو گئے۔

”آسیہ کا فون آیا ہے ابھی۔“ شائستہ بے حد فکر مند نظر آ رہی تھیں۔ ”وہ کہہ رہی تھیں علیہ کا نمپر پتھر بہت تیز ہو گیا ہے۔ وہ بالکل بے ہوش ہے۔“

اسد اور شہریار ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔

”اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ شہری! تم مجھے چھوڑ آؤ۔“ عادتاً ان کے منہ سے شہریار کا نام نکلتا تھا۔

”میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔“ شہریار کے جواب دینے سے پہلے اسد آگے بڑھ گیا۔ علیہ کے اجنبی اور سرد رویے کا لالہ، فکر میں ڈھل گیا تھا۔ وہ ہر بات بھلائے شائستہ سے پہلے باہر نکلا۔

”میں بھی چلتا ہوں“ جمیل صاحب بھی ان دونوں کے پیچھے چلے گئے۔

شہریار وہیں بے جان بت کے جیسا کھڑا رہا۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں بیٹھا وہ بے آواز آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

علیہ کو اس حالت تک پہنچانے کا ذمہ دار وہ تھا۔ محبت کے دعوے دونوں طرف سے ہوئے تھے مگر ان پہ کھری علیہ اتر رہی تھی۔ اس کے وعدے، اس کی قسمیں بودی ثابت ہوئی تھیں۔

”مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھے معاف کر دو علیہ!“ وہ با آواز بلند دہراتا رہا۔

”مما۔۔۔ آپ کب تک اسد بھائی کو سوتیلی ماں ہونے کا ہر جانہ میری خوشیوں کی صورت میں بھرتی رہیں گی۔“ کب تک۔۔۔ وہ خود ترسی میں مبتلا ہو کر خود پہ روتا رہا۔ علیہ گھل رہی تھی۔ اس سے گویا زندگی روٹھ گئی تھی۔

محض اس کی ضد میں اگر علیہ نے اسد کا ساتھ منظور کیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی کا بدلہ وہ خود کو بھینٹ چڑھا کر لے رہی تھی اور وہ اتنا بے بس اور مجبور کہ خاموش تماشائی بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ”ایسا ہے تو کاش! میں بھی آپ کا سوتیلا بیٹا ہوتا۔“ اس کے صبر برداشت کے ثبوت میں یہ جملہ آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزار دی۔

☆ ☆ ☆

صبح آئینے کے سامنے اپنی لال سرخ ہوئی آنکھوں کا جواز سوچ رہا تھا کہ دروازہ ہلکا سا بجایا۔

”یس! اسے ناچار کہنا پڑا ورنہ اس وقت کسی کا سامنا کرنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ اسد مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

”بڑی ہو؟“ اسے بغور دیکھتے ہوئے اسد نے استفسار کیا۔ وہ نظریں چرا کر رہ گیا۔

”ابھی تو بالکل نہیں۔“ اسد اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ شہریار کو اپنا آپ چھپانا مشکل ہو گیا۔

”کوئی کام تھا آپ کو؟“ اسد کی چہرہ بڑھتی نظروں سے خائف سا ہو کر وہ خود پوچھنے لگا۔

”تم روئے ہو؟“ اسد نے سنجیدگی سے سوال کیا تو اسے گھبراہٹ نے آلیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں روؤں گا کیوں؟“ اسے مصنوعی خوش گواریت کا سہارا لینا پڑا۔

”تو آنکھیں کیوں اتنی سرخ اور سوجی ہوئی ہیں؟“

”نیند نہیں آئی۔ سرد کر رہا تھا۔“

”کیا بات ہے۔“ جوں جوں منگنی کا دن قریب آ رہا ہے میرے قریب کے لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ ادھر علیہ ٹھیک ہونے کا نام لے رہی ادھر تم۔“

”بھائی! نیند نہیں آئی تو سر بھاری ہو گیا بس ورنہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یار یہ علیہ۔۔۔“ شہریار کی وضاحت پر کان نہ دھرتے ہوئے اسد نے ابھی بھی مرغی کی ایک ٹانگ

پکڑے رکھی۔ لیکن اس بار اس کا لہجہ شکستہ تھا۔
”مجھے کیوں لگتا ہے علیہ اس رشتے سے خوش
نہیں۔“ ماتھا مستاد وہ بھی تھکا تھکا سا لگا۔ شہریار نے
بے اختیار ٹھنڈی سانس پھینچی۔ گویا مطمئن اسد بھی
نہیں تھا۔

”آپ کا وہم ہے بھائی! بہت دھیمی سی آواز میں
شہریار نے کہا۔

”اچھا یہ دیکھو۔“ شہریار نے بے ساختہ سراٹھایا۔
”میں نے علیہ کے لیے انگوٹھی لے لی۔ دیکھو
کیسی ہے۔“ ایک بیش قیمت انگوٹھی اس نے شہریار کو
دکھائی۔

”یہ تو بہت بڑی ہے۔“ بے ساختہ شہریار کے منہ
سے نکلا۔

”میرا مطلب۔۔۔ علیہ تو بہت پتلی سی ہے تو۔۔۔“
اس کی وضاحت یہ اسد تھوڑا سا مسکرا دیا۔
”اچھا ایسا کرو۔ تم مجھے یہ چھوٹی کروادو۔“
”میں؟“ شہریار بدکا۔

”یار! دن کم ہیں۔ مجھے سائز بھی نہیں معلوم۔ پھر
وہ بیمار بھی پڑی ہوئی ہے۔“ اسد نے بالکل عام سے
انداز میں کہا۔

”اوکے میں کروادوں گا۔“
”تھینکس۔“ اسد کے چہرہ پر بڑی روشنی سی
مسکراہٹ پھیل گئی اس نے بھی مسکرائے کی کوشش
کی مگر اس کوشش میں آنکھیں نم ہو گئیں۔

”لو۔“ اسد بے اختیار اس کے گلے لگ کر بڑے
جذب سے بولا اور پھر الگ ہو کر اس کے ماتھے کا بوسہ
لیتا باہر چلا گیا۔ شہریار تیز وہ سا کھڑا رہا۔

☆☆☆

آج آسیہ اور فاروق کے گھر بہار کا سماں تھا۔ چار
اطراف رنگ ہی رنگ خوشبو میں اور قمقمے گھر کی
سجاوٹ کے علاوہ تقریب کے مہمان خصوصی یعنی
علیہ اور اسد بھی نئے رنگ ڈھنگ میں تھے۔

علیہ جدید طرز کے انارکلی فراک اور چوڑی دار

پاجامے کے ساتھ نفیس سے میک اپ، جیولری میں
پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ چہرے کی زردی یہ میک اپ
کی تہہ آجانے سے خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا۔ شہریار اور
اسد دونوں ایک ہی جیسے تھری پیس سوٹ میں تھے۔
شہریار کی بے چین نظریں علیہ پر پڑتیں تو ہنسنے سے
انکاری ہو جاتیں۔ علیہ نے ایک بار بھی اس کی
جانب نہیں دیکھا تھا۔ آسیہ اور شائستہ کے درمیان
بیٹھی وہ اپنے گود میں رکھے ہاتھوں کو تگے جا رہی تھی۔
چہرے پر چھائی سنجیدگی شہریار کا دل کاٹنے کا باعث بن
رہی تھی۔

”دفعتا“ جمیل صاحب گلا کھنکار کر حاضرین محفل
سے مخاطب ہوئے۔ ”رات بہت ہو رہی ہے رسم
شروع کر دیں۔“

”اسد آؤ بیٹا! شائستہ نے آواز دی۔
”جی ماما! اسد تابعداری سے قریب آکھڑا ہوا۔
”انگوٹھی پہناؤ۔“ وہ پیار سے کہنے لگیں۔ شہریار
علیہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی بھی ہاتھوں کو دیکھے جا رہی
تھی۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے اس سب سے بے خبر۔
شہریار کو تو یوں گمان ہوا جیسے اس میں سانس ہی نہ
ہو۔

”انگوٹھی؟“ اس نے بھول پن سے یہاں وہاں
دیکھا۔
”شہریار۔“ یکدم اس نے پکارا۔ شہریار جھٹکا کھا کر
چونکا۔

”انگوٹھی نکال یار!“

”اوہاں۔“ اس نے جیبیں ٹٹولیں۔ ”میرے پاس
رہ گئی۔“ انگوٹھی واقعی اس کی جیب سے نکلی۔
”لیجئے۔“ جمیل صاحب اس کی جانب بڑھائی۔ اسد نے
لی ہی نہیں۔ اچانک ہی اس کے گلے آگیا۔

اسد شہریار کا ماتھا چوم کر الگ ہوا۔ اور اپنی جیب
میں سے دل کی شکل والا لاکٹ اور چین برآمد کر کے
شہریار کی مٹھی میں دے دیا۔

”سنبھالو اپنی امانت۔“ شہریار نے آنکھیں پھاڑ کر
پہلے لاکٹ چین کو دیکھا پھر علیہ کو۔ یہ وہی گفت تھا

جو اس نے علیہ کو سالگرہ پر دیا تھا۔ علیہ ابھی بھی
متوجہ نہیں تھی۔ سب حیران کھڑے حق دق ان دونوں
کو دیکھ رہے تھے۔

”دیکھا سمجھتے ہو بہت بڑے ہو گئے ہو۔“ مجھ سے بھی
زیادہ عقل سمجھ والے ہو۔ یا پھر رشتے صرف تم ہی
نبھاسکتے ہو؟“ اسد اس کے کندھے پر زوردار مکار سید
کر کے زور زور سے بول رہا تھا۔ آس پاس سارے بت
بنے کھڑے تھے۔ اب کے علیہ بھی سراٹھا کر دونوں
بھائیوں کو دیکھنے لگی۔

”مجھے بھائی نہیں سمجھتے ہوناں! اسد کی آواز بھرا
گئی۔ جمیل صاحب اور شائستہ دونوں تڑپ اٹھے۔
”بھائی سمجھتے تو یہ حرکت نہ کرتے۔“ اسد کا لہجہ دکھ
سے لبریز تھا۔ شہریار کی بھی آنکھیں جھلملانے لگیں۔
”تمہارے نزدیک میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سوتیلا
رہا۔“

”بھائی بالکل نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ خدا گواہ
ہے۔“ شہریار تڑپ کر اس کے گلے آگیا۔ آسیہ اور
شائستہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔

”اچھا چلو اب۔“ سناؤ انگوٹھی۔ اسے الگ کر کے
اسد نے گیلی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے حکم دیا۔
”بھائی میں۔۔۔؟“ شہریار بدکا گیا۔

”ہاں تم۔“ اسد نے اسی کے انداز میں کہا۔
”یار تو تو ہیرو ہے۔“ جمیل صاحب نے اسد کو بھیج
کر کہا۔

”آپ تو ہٹلر سمجھ رہے تھے۔ مجھے آپ سے بھی
شکوہ ہے۔“ اسد نے مصنوعی خفگی دکھائی وہ ہنس
دیے۔

”معاف کر دے یار!“ انہوں نے اس کا کندھا دیا
تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگا پھر شائستہ کو دیکھ کر نظروں میں
کچھ کہا تو اسد بھی مسکرائے لگا۔

شائستہ شہریار کو علیہ کے پاس لے گئیں۔ جس کا
سکتہ ٹوٹ چکا تھا۔ کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر وہ خوں خوار
نظروں سے شہریار کو دیکھ رہی تھی۔ علیہ کے پہلو میں
بیٹھ کر انگوٹھی پہنانے کے لیے علیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد مبارک سلامت کا شور گونج
اٹھا۔ وہی ماحول تھا وہی لوگ تھے ایک صرف غلط فہمی
کا پردہ ہٹ جانے سے منظر بدل گیا تھا۔ شائستہ آسیہ کی
مبارکباد وصول کر کے اسد کے قریب جا کھڑی
ہوئیں۔ خوشی اور تشکر بھرے آنسوؤں کے ساتھ اسد
کو دیکھ گئیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہی سنجیدہ ہو گیا۔
”اسد۔۔۔“

”اصولاً“ تو مجھے صرف آپ سے ناراض ہونا
چاہیے۔ شائستہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنا چاہا کہ
اس کے یہ الفاظ انہیں چپ کرا گئے۔

”آپ نے مجھے ہمیشہ سوتیلا سمجھا ماما! جب ہی مجھ پر
اعتبار نہیں کیا۔ آپ کی محبت پر حرف نہ آئے۔ یہ
سوچ کر آپ شہریار کے ساتھ نا انصافی کرتی چلی
گئیں۔ مگر اچھا تو میرے ساتھ بھی نہیں کیا۔
درحقیقت مجھ پر اعتبار نہیں تھا آپ کو۔“ اسد کے
لفظوں میں دکھ اور رنجیدگی تھی۔

”اسد! تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ شائستہ کی تڑپ
شرمندگی میں ڈھلنے لگی۔

”اپنا سمجھتیں تو شہریار کی محبت قربان نہ کرتیں۔۔۔
شہریار یہ آپ کو مان تھا مجھ پر نہیں؟“ وہ شکوے پر شکوہ
کرنا چلا گیا۔ شائستہ اس کے ساتھ روتی رہیں۔

”ماما میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اس خوف سے
نکل آئیں کہ میں آپ کو کبھی سوتیلا سمجھوں گایا کوئی
آپ کو طعنہ دے گا۔ پلیز مجھے شہریار نہ سہی شہریار
جیسا سمجھ لیں۔“

اس کے لہجے میں التجا تھی۔

”میں نے تمہیں ہمیشہ شہریار سے بڑھ کر سمجھا۔“
انہوں نے اسد کے بھیگے گل اپنے ہاتھوں سے صاف
کیے۔

”نہیں ماما! اب نہیں۔ اب شہریار سے زیادہ
نہیں شہریار کی طرح۔۔۔ بے شک اس سے کم سمجھیں
مگر اپنا سمجھیں اور مجھ پر اعتماد کریں پلیز۔“

”فلم کا اینڈ ہو گیا ہو تو کھانے کی کچھ کریں؟“
اچانک جمیل صاحب کی شوخ آواز ابھری تو اسد اور

خالص لونگوں سے بنا

PROFESSIONAL TOOTHPASTE

NEXERA

نئے جیسے دانت
صرف ایک ٹیوب کی دُوری پہ



Anfords
Values Life

f www.facebook.com/WeValueLife

”اچھا نہ کرنا۔ مگر ابھی تو ان پیارے لمحات کو محسوس کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔“ شہیار کا انداز مصالحتیہ تھا۔ علیہ چپ ہو گئی تھی۔ مگر سوسوں جاری تھی۔ شہیار نے اس پل کو غنیمت جان کر اس سجا سجا یا روپ دل میں اتارا۔

”قسم سے بالکل اسٹرابری لگ رہی ہو۔ دل کر رہا ہے۔“

”نیکو اس نہیں کرو۔“ اس کے یوں کہنے پر وہ بے اختیار سرخ پڑ گئی۔ شہیار نے جیب سے چین لاکٹ نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ وہ حیران سی ہو گئی۔

”اچھی حفاظت کرتی ہو میرے خفے کی۔ اسد بھائی کی کار میں گرا آئی تھیں۔ تھینک گاڈ! کہ اس میں تم نے اپنی اور میری تصویر لگائی تھی۔ ورنہ آج کا ڈراپ سین کچھ اور ہوتا۔“

اس نے کس کر مٹھی بند کر لی۔ شہیار نے اس کی وہی بند مٹھی پکڑ لی۔

”شہری! تم دوبارہ تو مجھے ایسے بچ منجھدار میں نہیں چھوڑو گے ناں؟“

اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ بے یقینی، خوف، آس۔ شہیار شرمندہ ہو گیا۔

”کبھی بھی نہیں۔“ اس نے کان پکڑ لیے۔

”اور اگر ایسا کیا ناں تو یاد رکھنا! اس وقت ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔ گولی مار دوں گی۔“

علیہ نے چھوٹی دو انگلیاں موڑ کر ہاتھ کو پستول بنا کے شہیار کی طرف اٹھایا۔ شہیار نے ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی والی انگلی کھول کر ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ رومانٹک ہونے لگا تھا۔ سنجیدہ چہرے پہ لودیتی آنکھیں یہ علیہ نے ہاتھ چھڑا کر ہانپا مگر اب کہاں بچ سکتی تھی وہ۔

شائستہ مسکراتے چہرے لیے کھانے کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

شہیار کی متلاشی نظریں علیہ کی تلاش میں چاروں اطراف گئیں۔ مگر وہ شاید یہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

کہاں؟ یہ وہ جانتا تھا۔

ٹیرس پہ ریبلنگ تھامے وہ خشوع و خضوع سے روئے جا رہی تھی۔ جب شہیار کے کھنکارنے کی آواز گونجی۔ شہیار اس کی جانب آرہا تھا۔ سرشار و شاداں۔

”خبردار! آگے مت بڑھنا۔“ وہ پھنکاری مگر شہیار ان سنی کیے آگے بڑھتا آیا۔

”میں کہہ رہی ہوں آگے نہیں بڑھو گے۔“ انگلی اٹھا کر اس نے وارن کیا تھا۔

کیوں تم گولی مار دو گی؟“ اتنے دنوں بعد اسے دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ شہیار کی شوخی بھی زندہ ہو گئی۔

”عزت پیاری سے تو وہیں رک جاؤ۔“ علیہ اتنی زور سے غرائی کہ گلے میں خراش پڑ گئی۔ تب تک شہیار قریب پہنچ گیا۔

”میری عزت، میری محبت، میرا سب کچھ تمہارا بلکہ میں پورا کا پورا تمہارا۔“

”مجھے یہ دو نمبر مال نہیں چاہیے، سمجھے۔ تم میرے خالص جذباتوں کے قابل نہیں۔“ وہ زور، زور سے رو رہی تھی۔ آواز نیچے تو کیا سات گھروں تک جا سکتی تھی۔ اس خوف سے شہیار نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”گن گن کر بدلے لینا۔ میں واقعی تمہارا قصور وار ہوں مگر ابھی۔“

”معاف نہیں کروں گی تمہیں ساری زندگی نہیں کروں گی۔“ وہ چیخی۔





”اماں! میں نے آپ سے کہہ دیا ہے۔ مجھے اب اس گھر میں واپس نہیں جانا۔ چاہے جو مرضی ہو جائے۔ میں اب اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ طیبہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ کیا کوڑھ پڑ گیا ہے اس کی شکل میں اب؟“ آپا سیکینہ نے ہاتھ نہاتے ہوئے کہا۔

”جو آپ کو نظر نہیں آ رہا اور مجھے بتائیں کہ کسی کی بد صورتی صرف کوڑھ کی مرہون منت ہے؟ اندر کا کوڑھ بھی ہوتا ہے جو باہر آ جاتا ہے۔“ طیبہ نے نفرت سے کہا۔

”دو سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ اگر دو سال تجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی تو اب کیا مصیبت آگئی ہے کہ تو گھر چھوڑ چھاڑ کر آکر بیٹھ گئی ہے۔“ اماں نے بے زاری سے کہا۔

”دو سال میں نے ہی سہا ہے سب کچھ اور وہ بھی بڑی خاموشی سے، صرف اس آس پر کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ دکھ کے بعد سکھ بھی دے گا۔ مگر اماں! بنجر زمینیں بھی کچھ دیتی ہیں؟ ان لوگوں کے پاس دینے کے لیے عزت ہے ہی نہیں۔ خالی لوگ ہیں وہ نہ عزت نہ محبت۔ صحیح کہتے ہیں لوگ جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی دیتا ہے اور ان لوگوں کے پاس صرف نفرت ہے اور وہ وہی دے سکتے ہیں۔ آپ نے صحیح کہا۔ دو سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ میں نے ان دو سالوں میں پرکھ لیا ہے ان لوگوں کو وہ نہیں بدلنے والے۔“ طیبہ نے زہر خند نظروں سے ان کی طرف

دیکھا۔ اماں نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

”اگر یہ گنوں والی ہوتی تو گھر چھوڑ کرنے بیٹھی ہوتی۔ ارے تجھ سے ایک شوہر نہ سنبھالا گیا۔“ آپا سیکینہ جو طیبہ کی بڑی بہن تھیں، نے ایک اور نشتر چھوڑ دیا۔

”آپ سے آپ کا شوہر کون سا سنبھالا گیا ہے، روز تو مار کھاتی ہیں۔“ طیبہ نے بھی جوابی وار کر دی۔

”ہم تو تمہارا معاملہ پنپانے آئے تھے۔ تم تو ہمارے ہی سر پر سوار ہو گئیں۔ ارے اگر مار کھاتی ہوں تو کیا ہوا۔ اپنے گھر میں تو بیٹھی ہوں، کسی کو کیا پتا کہ میں مار کھاتی ہوں۔ تیری طرح تو نہیں کہ گھر چھوڑ کر آگئی۔ تجھ جیسی بے وقوف عورت میں نے ساری زندگی نہ دیکھی۔“ آپا سیکینہ سانس لینے کو رکیں۔

”اماں! میں بتاؤں آپ کو۔ اسی کی ساری غلطی ہے۔ اس نے ہی اپنا گھر اجاڑا ہے اور سن لیں اگر یہ نہ گئی تو نواز مجھے طعنے دے دے کر مار دے گا۔ اپنا تو گھر اس نے اجاڑنا ہی ہے، مجھے بھی بسنے نہ دے گی۔“ آپا سیکینہ اب باقاعدہ زور زور سے رونے لگیں۔

اماں مسلسل سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جیسے ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

طیبہ آج صبح ہی اپنے سسرال سے اماں کے گھر آگئی تھی اور اس نے آتے ہی بتا دیا تھا کہ اب وہ واپس نہیں جائے گی۔ اگر اس کے شوہر یا سسر نے اسے طلاق نہ دی تو وہ خلع لے لے گی، مگر واپس نہیں جائے گی۔

ابادو سرے شہر گئے ہوئے تھے۔ اماں کو پریشانی میں اور کچھ نہ سوچھا تو سیکینہ آپا کو بلالیا، جو دو گلیاں چھوڑ کر رہی رہتی تھیں۔ یہ ایک لوڑ کلاس فیملی تھی اور اس خاندان کی سب سے زیادہ بڑھی لکھی لڑکی طیبہ تھی۔ جس نے میٹرک پاس کر رکھا تھا۔ آپا سیکینہ نے تو چھٹی جماعت میں ہی پڑھائی سے توبہ کر لی تھی۔

طیبہ کو پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر میٹرک کے بعد ابانے اس کا بیاہ ایک بڑی فیملی میں کر دیا۔ یہ فیملی اسٹینس کے لحاظ سے نہیں بلکہ افراد خانہ کی تعداد کے لحاظ سے بڑی تھی۔ چار نندیں، پانچ دیور، ساس، سسر، کوئی مذاق کی بات نہ تھی۔ بد مزاج اور دو سروں کے بہکاوے میں آجائے والا شوہر سونے پر سہاگہ تھا۔

”اس نے خود ہی گھر بسانے کی کوشش نہیں کی۔“ آپا سیکینہ نے آنسو پونچھ کر نہایت نفرت اور حقارت کے ساتھ کہا تو طیبہ بلبلا اٹھی۔

”میں نے گھر بسانے کی کوشش نہیں کی، میں نے؟“ اس نے بے یقینی سے آپا کی طرف دیکھا۔

”ہاں تو نے، پڑھائی کا رعب جماتی ہوگی کہ وہ چار جماعتیں پاس اور تو دس جماعتیں پاس۔“ آپا سیکینہ نے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو طیبہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

”میں نے گھر بسانے کی کوشش نہیں کی، آپ صحیح کہتی ہیں۔“ طیبہ نے غیر مرمی لفظ پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

”ہاں، صحیح کہتی ہیں آپ۔ شادی کے دوسرے ہی ہفتے میکے اور سسرال کا سارا زیور انہوں نے بیچ دیا۔

میری ناک میں ایک لونگ تک نہ رہنے دی۔ اماں! آپ کو تو یاد ہے ناک وہ سات گلوں والی لونگ میں نے کیسے بنائی تھی۔ مجھے سونا پہننے کا شوق تھا۔ میں نے تین دن میں آٹھ سوٹ سی کر بارہ سو روپے جمع کیے اور دو سو روپے آپ سے لے کر وہ لونگ خریدی تھی۔ وہی لونگ اماں! جس کے گرد چھ سفید رنگ تھے اور درمیان میں سرخ رنگ ایسے جڑا تھا جیسے برقی قمقموں کے بیچ

کوئی دلہن بیٹھی ہو۔ میں نے بڑا زور لگایا کہ اس کو نہ بیچو، مگر کسی نے میری نہ سنی۔ میں چپ رہی، کیونکہ اماں نے کہا کہ شوہر ہی سر کا تاج ہوتا ہے۔ میں نے گھر

بسانے کی کوشش کی ہوتی تو چپ کیوں رہتی؟“
ایک ماہ گزرا تھا شادی کو کہ یا سرنے بات بات پر مجھے گالیاں اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اکثر ہی ہاتھ بھی اٹھانے لگا۔ میری غلطی تھی یہ جو سب کچھ نہ گئی۔“ طیبہ نے آنکھیں جھپکیں تو آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ایک لمبی قطار کی صورت میں اس کے گالوں پر بکھر گئے۔

”اللہ نے اولاد کی خوشی دینا چاہی تو وہ بھی برداشت نہ ہوا۔ میری بڑی نند نے مجھے سیڑھیوں سے دھکا دے دیا۔ صرف اس لیے کہ وہ خود شادی کے چھ سال بعد بھی بے اولاد تھی۔ بمشکل میری جان بچی، مگر سب سرالوں نے بد نصیب اور منحوس کہہ کہہ کر میرا جینا حرام کر دیا۔ یا سرنے میری ہر ضرورت سے منہ موڑ لیا۔ گھر کے خرچ کے لیے مجھے بار بار ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ اماں سے گلہ کیا تو انہوں نے کہا کہ تجھے ہنر کس لیے دیا ہے، گھر میں سلانی کا کام شروع کر دے۔ گھر کا سارا بار مجھ پر آگیا۔ تھکے ہارے جسم کو دو گھڑی آرام کے نصیب نہ ہوتے اور میں گھر کا سارا کام پنپا کر لوگوں کے کپڑے سلانی کرتی، تاکہ میرے پینے کے لیے بھی کپڑے میسر آسکیں۔ سرال والوں کو سلانی کے لیے آنے والی عورتیں بھی برداشت نہ ہوتیں۔ طعنے اور کوسنے میری جان نہ چھوڑتے۔

جب سلانی کا کام زیادہ ہونے لگا تو وہی ساس جو مجھے بد نصیب کہتی تھی اب مجھ سے پیسے مانگنے لگی۔ یا سرنے کا روبرو چھوڑ دیا اور گھر بیٹھ گیا۔ وہ بھی مجھ سے پیسے مانگ مانگ کر اپنا گزارا کرنے لگا۔ اگر پیسے نہ دیتی تو مارتا۔ انہی دنوں یا سرنے کے ابا کا ایکسایڈنٹ ہو گیا۔ سارے محلے سے قرض لے کر پیسے اکٹھے کیے اور ابا کا علاج کروا کر گھر لائے۔ وہ پیسے میں نے کیسے ادا کیے، میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔ اس پر بھی مار پیٹ، گالی گلوچ میں نے سہی۔ ایک مند بیاہی تھی چلو کبھی کبھار آتی تھی، مگر تین نندوں، پانچ دیوروں، ایک شوہر اور ساس، سر کو پالا ہے میں نے دو سال۔ ایک سے بڑھ

کر ایک ہڈ حرام۔ دیور اگر کچھ کماتے تو خود ہی اڑا لیتے ہیں۔ بے اولادی اور بانجھ پن کے طعنے میں نے سہی ہیں۔ اپنے بدن پر مار کا درد میں نے سہا ہے۔ اپنے وجود کو کولوہ گئے نیل کی طرح جوتا ہے میں نے۔ اس شخص کے ساتھ دو سال گزارے ہیں، جس نے دو پل سکھ کے نہیں دیے۔ ان شریکوں کو اپنی کمائی میں شریک کیا ہے، جنہوں نے دکھ کو میرا سا بھی بنادیا ہے۔“
طیبہ کے آنسوؤں کی رفتار اب مزید تیز ہو گئی تھی۔

”ہاں، بس ایک کام میں نے نہیں کیا۔ گھر بسانے کی کوشش نہیں کی میں نے۔ اپنی دس جماعتوں کے زعم میں رہی۔“

طیبہ نے طنز بھرے لہجے میں کہا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

”مجھے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ میری تو اولاد بھی نہیں ہے۔ جس کے لیے سب سہوں۔ اماں! میں وہاں بھی خود کماتی تھی۔ یہاں بھی کمالوں گی، آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ بس اس چھت کا آسرا چاہیے۔“

طیبہ نے اماں کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنے پکڑ کر لجاجت سے کہا مگر اماں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنی بیٹی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔

”ہمیں لوگوں کی باتیں نہیں سننی کہ لڑکی کی کمائی کھاتے ہیں۔ ہم نے نہیں بیاہ دیا ہے۔ ہمارے گھر تم سودھے رہنے کے لیے آؤ، مگر پھر اپنے گھر چلی جاؤ۔ اسی میں ہماری اور تمہاری عزت ہے۔ تمہیں گھر میں بٹھا لیں تو سیکینہ کو بھی نواز طعنے دے گا۔ کل کو وہ بھی آجائے گی۔ اس کے تو چار بچے بھی ہیں۔ ہم کس کس کو سنبھالیں گے۔ اب گھر جاؤ۔ یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے نئے مسئلے کھڑے نہ کرو۔“

اماں نے بے رحمی سے کہا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ نہ جانے دور آسمانوں میں کیا تھا جسے وہ تکتے جا رہی تھیں۔

”شوہر کے سکھ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔“
اس خوفناک خاموشی کو آپا سیکینہ کی آواز نے توڑا۔
”مجھے نفرت ہو گئی ہے اس کی شکل سے۔ جب وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو میرے دل سے صرف ایک دعا نکلتی ہے کہ اس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔“ طیبہ نے نفرت بھرے لہجے میں روتے ہوئے کہا۔
توبہ استغفار! اللہ معاف کرے۔ تو تو اس کی سلامتی کی دعائیں مانگا کر۔“ آپا سیکینہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

”کیوں مانگوں میں اس کی سلامتی کی دعائیں؟ مجھے اب اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ مجھے نفع لینی ہے۔“
طیبہ نے چیختے ہوئے کہا۔

”اچھا! خلع لینی ہے، کیا وجہ بیان کرے گی خلع لینے کی؟“ آپا سیکینہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

”وجہ؟ ابھی بھی آپ کو وجہ چاہیے۔ یہ جو وجوہات میں نے بیان کی ہیں یہ کم ہیں کیا؟ ویسے بھی اسلام میں خلع لینے کے لیے یہی وجہ کافی ہے کہ عورت، مرد کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ بیوی کو اپنے شوہر کی شکل سے ہی نفرت ہے۔ یہی وجہ کافی ہے کہ مرد، عورت کو مارتا ہے۔“ طیبہ نے کہا۔

”لو کر لو گل، تو بڑی حسین ہے؟“ آپا سیکینہ نے طیبہ کا ٹھٹھا لگاتے ہوئے کہا۔ ”لو جی، مجھے شکل پسند نہیں ہے۔ نفرت ہے مجھے۔ مرد، عورت کو مارتا ہے۔“ آپا سیکینہ، طیبہ کی نقل اتارتے ہوئے زور زور سے ہنسنے لگیں۔

”ارے تو اس کے بغیر ہے کیا۔ عورت کا حسن مرد کے ساتھ ہے تو تجھی ہے کیا اس کے بغیر؟ شکل سے نفرت ہے تو بڑی سوہنی ہے۔“ آپا سیکینہ ایک بار پھر طیبہ کے الفاظ دہرا کر ہنسنے لگی۔ جیسے کوئی بہت ہی مزاحیہ لطیفہ سن لیا ہو۔

”بہت ہی کم عورتیں ہوں گی جنہوں نے کبھی اپنے شوہر سے مار نہ کھائی ہو۔ فرق بس اتنا ہے کہ کوئی تیری طرح کا بے وقوف سارے جہان کو بتا دیتا ہے اور کوئی

خاموش رہتا ہے۔ ارے جو مرد مارے نہ وہ کمزور ہوتا ہے۔ جھلی نہ ہوتو۔“ آپا سیکینہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔
”میں جا رہی ہوں اماں! بچے اسکول سے آنے والے ہوں گے۔ نواز کو روٹی دیر سے ملے تو میری ہڈیوں کو ہی نمک لگا دیتا ہے۔ میں سمجھی پتا نہیں کیا خاص بات ہو گئی ہے۔ ایویس ٹینشن نہ لیا کرو۔“
آپا سیکینہ نے چادر لیتے ہوئے کہا اور گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ اماں خاموشی سے دروازہ بند کرنے لگی اور زمین پر حق دق بیٹھی طیبہ کی نگاہیں ابھی تک چارپائی پر اسی جگہ لگی ہوئی تھیں، جہاں سے آپا سیکینہ اٹھ کر گئی تھیں۔

حضرت ثابت بن قیسؒ کی بیوی نے ان سے خلع لی تھی اور اس خلع کی وجہ جو احادیث کی کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی بیوی کو ان کی شکل ناپسند تھی

طیبہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے چلے گئے۔ جاہلیت کے اس دور میں جب روشنی کا منبع اور مرکز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تب بھی عورت کے حقوق کا خیال رکھا گیا۔ اللہ نے اپنے کلام میں عورت کو خلع کا حق دیا، مگر اکیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں عورتوں کے حقوق کے لیے بل پاس کیے جا رہے ہیں۔ حقیقتاً ”عورت آج بھی نہی داماں ہے۔ کیونکہ ایمان کی وہ کرنیں اب صرف مسجد میں کیے جانے والے سجدوں میں رہ گئی ہیں۔ آج بے شمار وجوہات کے باوجود وہ گھر کی چار دیواری میں مرنے کے لیے موجود ہے کیونکہ شوہر کے گھر میں گزارا جانے والی زندگی چاہے ذلت سے بھری ہو، مگر پھر بھی باعزت کہلاتی ہے۔

طیبہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ شام کے وقت جب دھوپ ڈھل جائے گی تو وہ دارالامان چلی جائے گی۔

طیبہ نے آخری فیصلہ کر لیا، کیونکہ ظلم کو خاموشی سے سہنے والا بھی اتنا ہی ظالم ہے جتنا ظلم کرنے والا۔



”وہ اپنے فلیٹ کے ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفہ کم بیڈ پر انتہائی بے ترتیب چلے میں لیٹا ہوا تھا، اس نے گھٹنوں سے تھوڑا نیچے آتی سیاہ شارٹس پہن رکھی تھی۔ اس کی بنیان اور لی شرٹ سامنے کارپٹ پر لا پرواہی سے پھینکی گئی تھیں۔ سامنے میز پر صبح کے ناشتے کے برتن پڑے تھے۔ وہ انتہائی انہماک سے ارفع عزیز کی پاکستان کے کم عمر محنت کش بچوں پر بنائی جانے والی ڈاکو منبری فلم دیکھ رہا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ ارفع اس ڈاکو منبری کے حوالے سے اس سے بہت جلد بات کرے گی اور اگر اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو روٹھنے اور منانے کا سیشن خاصا طویل چلے گا، کیونکہ آج کل وہ ویسے ہی آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔

اس کے پس منظر میں ارفع کی خوب صورت آواز تھی۔ ڈاکو منبری کا اسکرپٹ، لوکیشنز اور ریسرچ ورک تمام چیزیں ہی لا جواب تھیں۔ وہ اپنا کام انتہائی محنت، لگن اور ایمانداری سے کرنے کی قائل تھی۔ اس نے ڈاکو منبری اسکرپٹ رائٹنگ کا باقاعدہ کورس آسٹریلیا کی گریفٹھ یونیورسٹی سے کیا تھا۔ اس لیے وہ چھوٹی سے

مکمل تافل



چھوٹی باریکیوں کا بھی بے حد خیال رکھتی تھی۔ وہ اپنے کام کے بارے میں پاگل پن کی حد تک جنونی تھی۔ اس کا کیمرا میں اس سے حد درجہ تنگ تھا۔ وہ اسے زچ کر کے رکھ دیتی تھی، کیونکہ ارفع نے ڈاکو منزلی کے حوالے سے کیمرے کی تکنیکس کا بھی ایک کورس کر رکھا تھا۔ وہ اپنی سب سے بڑی نقاد خود تھی۔ اس لیے اکثر لوگ اس کے ساتھ کام کرنے سے کتراتے تھے۔ خضر نے بڑی دلجمعی سے اس کی ڈاکو منزلی فلم دیکھی اور پھر پی وی بند کر کے ریموٹ کنٹرول ایک دفعہ پھر نیلے کارپٹ پر پھینک دیا۔ اسی وقت اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ اس نے کابلی سے گھڑی میں وقت دیکھا، دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

چپل پاؤں میں ڈال کر وہ بے زاری سے پاؤں گھسیٹتے ہوئے دروازہ کھولنے گیا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم ابھی پوستیوں کی طرح پڑے ہو گے۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر فوراً اندر داخل ہوئی۔

”تم بھی برے وقت کی طرح ہو جو کبھی بھی آسکتا ہے۔“ اس نے سر کھجاتے ہوئے اسے بتایا۔

”بکومت۔۔۔ اور ہزار دفعہ کہا ہے کہ یہ گھر میں عمران ہاشمی بن کر مت پھرا کرو۔“ جب دیکھو وہ ہی بنے پھر رہے ہوتے ہو۔ ”ارفع نے کارپٹ سے شرٹ اٹھا کر اس کی طرف اچھالی۔ وہ سخت صدمے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بس! بس! زیادہ اور ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں، مجھ سے تو تمہارا ایک پروگرام برداشت نہیں ہوتا اور تم نے گھر میں بھی ڈرامے بازی شروع کر دی ہے۔“ وہ کارپٹ پر پھیلی چیزوں کو اٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ایک دنیا مرتی ہے میرے اس ٹاک شو پر، جس میں تم سو سو کیڑے نکالتی ہو۔“ وہ اس کے سامنے آکر مصنوعی غصے سے بولا۔

”ظاہر ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کو ہی یہ چیز پسند آ سکتی ہے ورنہ زندہ اور عقل والوں کو ایک منٹ میں پتا چل جاتا ہے کہ یہ جو دانشور بن کر سیاستدانوں کو لڑا رہا ہے، یہ نری ڈرامے بازی کر رہا ہے، ویسے تم لوگوں کو قوم کے جذبات سے کھیلے ہوئے شرم نہیں آتی؟“ وہ گیلیا تولیہ باہر ٹیرس پر پھیلا کر معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے آج بھی اپنی بلیو مخصوص جینز کے ساتھ سفید کرتا پہن رکھا تھا۔ بالوں کو حسب معمول گول مول کر کے جوڑا سا بنایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی راج ہنس جیسی گردن خاصی نمایاں لگ رہی تھی۔

”اور جو تم ڈاکو منزلی کے ذریعے دنیا میں مایوسی پھیلاتی ہو، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ شرٹ کے بٹن کابلی سے بند کرتا ہوا بولا۔ یہ کام کر کے وہ ایک دفعہ پھر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”ہم لوگ گفتار کے غازی نہیں۔ دنیا کو حقیقت سے باخبر کرتے ہیں۔ ڈرامے بازیاں نہیں کرتے۔

تحقیق کر کے کام کرتے ہیں۔“ وہ اب سی ڈیز کے ڈھیر کو ان کے ٹھکانے پر ترتیب سے رکھتے ہوئے انتہائی اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ یہ سارے کام وہ اکثر آتے جاتے یا پھر خصوصاً ”اتوار کو آکر لازمی کرتی تھی۔

”ہم بھی سیاست دانوں کے کچے چھے کھولنے کے لیے سخت محنت کرتے ہیں۔ ایسے ہی نہیں ایک گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔“ خضر نے بمشکل جمائی کو روکا تھا۔

”آدھا ٹائم تم لوگوں کو آپس میں لڑانے میں اور آدھا ”بریک“ لینے میں گزار دیتے ہو۔ آخر میں نکلتا کچھ بھی نہیں۔“ وہ ساری چیزیں ٹھکانے پر رکھ کر اب کمرے کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے کا حلیہ اب کافی بہتر ہو گیا تھا۔

”وہ تمہاری روشن اماں صاحبہ۔۔۔ آج بھی صفائی کے لیے تشریف نہیں لائیں گی کیا؟“ ارفع نے کھڑے کھڑے کچن میں بھی جھانکا، جہاں ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔

”ان کی بہو صاحبہ نے ایک دفعہ پھر محکمہ بہبود آبادی کو ڈنٹ ڈالا ہے۔ خیر سے آٹھویں بجے کی اماں بن گئی ہیں۔ اماں روشن جمال آرا آج کل بہو کی خد متیں فرما رہی ہیں۔“ اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔ ”ماشاء اللہ۔۔۔! اللہ ہی رحم کرے ان لوگوں کے حال پر۔ ایک کمرے کا گھر اور گیارہ بندے۔“ وہ اپنے اسٹیپ کٹنگ بالوں کو جو کھل گئے تھے، اب گول مول جوڑے کی شکل میں ایک دفعہ پھر باندھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

”ویسے! وہ ایک مشورہ دے رہی تھیں، تمہارے لیے۔۔۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چل رہی تھی۔ ارفع نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ کہہ رہی تھیں کہ ارفع بی بی سے کہنا کہ اب یہ فلمیں شلمیں بنانا چھوڑے اور آکر اپنا گھر سنبھالے۔ انہوں نے کوئی ساری زندگی کاٹھیکا تو نہیں لے رکھا مجھ معصوم کا۔“ اس کی اداکاری عروج پر تھی۔

”انہوں نے کون سا ”مفتے“ کاٹھیکا لے رکھا ہے۔ مینے میں دس تو چھٹیاں کر لیتی ہیں۔ چار پانچ تم دے دیتے ہو، ان کا تو مفت کا وظیفہ لگا ہوا ہے۔“ وہ اب کچن میں آگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سارے برتن اکٹھے کر کے دھوئی، وہ پی وی لاؤنج سے اونچی آواز میں بولا۔

”رہنے دو! روشن اماں آرہی ہیں۔ ان کا فون آیا تھا کہ ڈیڑھ بجے آئیں گی۔“

”تو یہ بکواس تم پہلے نہیں کر سکتے تھے، خوا مخواہ سارا کمر ابھی صاف کروادیا۔“ وہ باہر نکل کر کمر پر سخت لڑاکا انداز میں گویا ہوئی۔

”پہلے کہہ دیتا تو تمہارا یہ گھریلو ساروپ کیسے دیکھنے کو ملتا، قسم سے اس طرح۔ کام کرتی بہت ظالم لگتی ہو۔“ وہ شرارت سے ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ارفع کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

”سخت لو فر لگ رہے ہو۔“

”جیسا بھی ہوں، اب تو تمہارے پلے پڑ گیا ہوں۔“ اس نے پھر ایک لمبی جمائی لی۔ ”دوبارہ یہ ہاتھی جیسا منہ کھولا تو جبراً توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی، جب سے آئی ہوں نحوست پھیلا رکھی ہے۔“ وہ دوبارہ کچن میں جا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر آئی تو وہ اب بالکل فریش بیٹھا ہوا تھا۔ ”یہ جس کو تم سو سو باتیں سناتی ہو، اس کی اسرار ٹیس اور ڈیشننگ پر سنائی پر ایک دنیا آہیں بھرتی ہے۔ یاد نہیں تمہاری بہن نے کتنی منتیں کی تھیں کہ میں اس کے فیشن شو میں حصہ لوں؟ وہ تو مجھے ایسی نمائی پریڈ پسند نہیں تھی ورنہ اب تک تو میں ماڈلنگ میں تہلکہ مچا چکا ہوتا۔“ ارفع کو معلوم تھا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے آج تک اس نے زبان سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ”تم شو بزنس کی دنیا میں تہلکہ مچانے سے پہلے ایک دفعہ واش روم میں جا کر اچھی طرح منہ دھو کر آؤ، ورنہ جیسے منہ پھاڑ کر تم جمائیاں لے رہے ہو، حلق کا کو اتک نظر آ رہا ہے۔ ایک دم جاہل لگ رہے ہو۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ جب کہ آنکھوں میں شوخی نمایاں تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
فائرہ افتخار کے 4 خوبصورت ناول

آئینوں کا شہر	قیمت - 500/- روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت - 500/- روپے
یہ گلیاں یہ چو بارے	قیمت - 300/- روپے
پھلاں دے رنگ ہزار	قیمت - 250/- روپے

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

”ایک بات تو بتاؤ ارفع عزیز!“ وہ حد درجہ سنجیدگی سے ایک دفعہ پھر اٹھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے انتہائی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ ”جب تم آسٹریلیا ڈاکو منزی اسکرپٹ رائٹنگ کا کورس کرنے گئی تھیں اسی دوران تم نے ”طنزبات“ میں بھی پی ایچ ڈی کر لی تھی کیا؟“ ارفع نے اس کی بات پر اپنے ہونٹوں پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا بہت صفائی سے گھونٹا اور بچن میں جاتے ہوئے بولی۔

”جی جناب! میں نے ”طنزبات“ میں پی ایچ ڈی اسی وقت کی تھی جب تم انگلینڈ سے ”سستی اور کابلی“ کے ڈپلومے لے رہے تھے اور تم نے ان ڈپلوموں میں پوری یونیورسٹی میں ٹاپ بھی کیا تھا۔“ وہ کون سا اس سے کم تھی۔

”کاش! تم میری تایا زاد کرن نہ ہوتیں کاش! تم میری ہونے والی منکوحہ اور میری آخری محبت نہ ہوتیں۔“ وہ اب دہائی دے رہا تھا۔ ”ہائے ناں! ہائے باپ! کن ظالم رشتے داروں میں اپنے اکلوتے بیٹے کو چھوڑ گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ دنیا کتنی ظالم ہے۔“

”یہ چائے کا کپ پکڑو اور ایکٹنگ بند کرو۔“ وہ اپنا مک تھام کر سامنے بڑے فلور کشن پر بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک پلیٹ میں کیک رس رکھے ہوئے تھے جن کو وہ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔ خضر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی نانی خالفتا ”ایرانی حسن کا ایک لاجواب نمونہ تھیں وہی چیز وراثت میں اس کی ماما یعنی خضر کی نانی اور ان کی بیٹیوں کو وافر مقدار میں ملی تھی۔ بے تحاشا سرخ و سفید رنگت جیسے کسی نے دودھ میں ہلکا سالال شربت گھول دیا ہو۔ بے داغ جلد، سنتواں ناک، کٹاؤ دار ہونٹ، بادامی رنگ کی کٹور اسی آنکھیں، لمبا قد اور انتہائی متناسب سراپا، وہ جس قدر خوب صورت تھی اس سے زیادہ اپنے حسن سے لا پرواہ۔

”تم نے رات نیوز میں دیکھا، شرمین عبید چنائے نے آسکر ایوارڈ کی تاریخ میں تھلکہ محاذ دیا ہے۔ اس کی ڈاکو منزی فلم ”سیونگ دی فیس“ کیا کمال کی چیز ہے۔

مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ آسکر کی جو اسی سالہ تاریخ میں پاکستان کا نام بھی درج ہو گیا۔ کمال کر دیا شرمین نے۔۔۔“ وہ کھلے دل سے اسے سراہ رہی تھی۔

”اس میں کمال کی کیا بات ہے؟“ سیونگ دی فیس“ لندن میں مقیم پاکستانی نژاد برطانوی ڈاکٹر جواد کے پاکستان واپس آنے اور ملک میں تیزاب کے حملوں کا شکار خواتین کے حوالے سے کام پر ایک دستاویزی فلم ہے۔ عام سی کہانی ہے۔ کیا خاص ہے اس میں؟“ وہ چائے پیتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”خضر حیات! اس قدر اہم کام کو تم عام سی کہانی کہہ رہے ہو؟ اس کے کام کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔ دنیائے فلم کا سب سے بڑا اعزاز ”آسکر ایوارڈ“ کیا معمولی بات ہے؟“ وہ چائے میں کیک رس بھگونا بھول کر حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم ایک بات بتاؤ ارفع عزیز! کیا عرفان صدیقی نے اپنے کالم میں ٹھیک نہیں لکھا کہ ”آسکر ہویا کوئی اور علمی اعزاز“ صرف اس صورت میں کسی پاکستانی شخصیت، ادارے، تنظیم یا اس ابن جی او کا ہی مقدر کیوں بنتا ہے جس میں پاکستانی معاشرے کی گھناؤنی متعفن اور نفرت انگیز تصویر پیش کی گئی ہو۔ ہمارے سینے پر ایک تمنہ سجا کر پاکستان کو بظاہر شاباش دی جاتی ہے، لیکن درحقیقت پاکستان کا تیزاب زدہ مسخ چہرہ ساری دنیا کو دکھا کر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پاکستان درندوں کی کمین گاہ ہے۔“

”تو کیا ایسا نہیں ہے؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان میں ایسا ہو رہا ہے۔ یہ کوئی غلط بات تو نہیں۔“ ارفع کی رنگت کی سرخی میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

”یہ صرف پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا۔ انڈیا، بنگلہ دیش، نیپال اور حتیٰ کہ یورپی ممالک میں بھی ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں، پھر صرف پاکستان کو ہی ہر جگہ پر کیوں نمایاں کیا جاتا ہے؟“ خضر کی آنکھوں سے بھی ناراضی جھلکی۔

”اس لیے کہ تھامس رائٹز فاؤنڈیشن نے عورتوں کے حوالے سے ایک سروے میں پاکستان کو عورتوں

کے لیے تیسرا بڑا خطرناک ملک قرار دیا ہے۔ پہلے نمبر پر افغانستان اور دوسرے پر ڈیموکریٹک ری پبلک آف کانگو ہے۔“ بحث میں ہار ماننا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”ہونہ۔۔۔!“ خضر نے ناک سے فرضی مکھی اڑائی۔ ”کون سی احمقوں کی جنت میں رہتی ہیں آپ ارفع عزیز صاحبہ! یہ سروے کرنے والے کون لوگ ہیں۔۔۔؟ اور اپنا پیٹ ننگا کر کے کون دکھاتا ہے۔ مغرب میں عورتوں کو جیسے پھولوں کی طرح رکھا جاتا ہے ناں! آئے دن ان کے اخبارات بھی ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں۔ آپ پتا نہیں کون سی دنیا کی بات کرتی ہیں۔“ وہ بھی لی وی کا ایک کامیاب اینکوپرسن تھا جس کے پروگرام کی ریٹنگ خاصی زیادہ تھی۔

”وہاں اگر ظلم ہوتا ہے تو انصاف بھی ہوتا ہے۔ ہماری طرح ساری زندگی عدالتوں کے دھکے کھاتے نہیں گزر جاتی۔۔۔“ وہ پھٹ پڑی۔

”چلو! تم نے یہ تو مانا کہ وہاں بھی ظلم ہوتا ہے ہمیشہ یاد رکھنا کہ ظلم تو ظلم ہی ہوتا ہے، چاہے وہ مرد پر ہو یا عورت پر، لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ظلم کو بھی ہمیشہ صنفی تعصب کے خانے میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں۔“ خضر نے بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا لیکن ان کی گفتگو ہمیشہ کی طرح اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جس کا اختتام ایک زوردار قسم کی لڑائی پر ہی ہوتا تھا۔

”تم سے تو بحث کرنا ہی فضول ہے، کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو۔ اصل میں تمہیں تکلیف شرمین کے ایوارڈ لینے پر ہو رہی ہے کہ یہ آسکر اگر پاکستان کو ملا بھی تو ایک عورت کے ہاتھوں۔“ وہ اس کے اس ”شاندار“ انکشاف پر ہکا بکارہ گیا۔

”استغفر اللہ! کاش کہ جس موضوع پر کام کر کے اور پوری دنیا کے سامنے پاکستان کا منہ کالا کر کے اس عظیم خاتون کو ایوارڈ ملا ہے یہ اعزاز شکر ہے کہ کسی پاکستانی مرد کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ اندر اٹھتے گھرے اشتعال کو چھپا کر وہ بڑے تحمل سے بولا تھا ورنہ ارفع کی یہ عادت اسے

خاصی ناپسند تھی کہ وہ خاصے غلط قسم کے اندازے لگاتی تھی۔

”ویسے ایک بات تو بتاؤ! میں تمہیں کیا واقعی اتنا تنگ نظریا دقیا نوس لگتا ہوں کہ میں صنفی تعصب کا بات بے بات مظاہرہ کروں؟“ وہ تھوڑا سا جھک کر اس کا سو جا ہوا منہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صنفی تعصب کا تو پتا نہیں، لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ میری ہر بات کی مخالفت تم اپنا پیدائشی قانونی اور معاشرتی حق سمجھتے ہو۔“ تب کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح ایک ”اور“ غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنے گھر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔

”مجھے دوپہر کا کھانا کون بنا کر دے گا؟ ایمان سے سخت بھوک لگی ہے۔۔۔“ اسے جاتے دیکھ کر وہ بلند آواز میں بولا۔ لہجے میں سارے جہان کی معصومیت سموئی ہوئی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ پیچھے مڑ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ شوخ نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”میں نے ٹھیک نہیں لے رکھا۔۔۔“ اپنی بات کہہ کر اس نے ٹھاٹھ کر کے دروازہ بند کیا تھا۔ خضر اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

اس کے فلیٹ سے نکلنے کے ٹھیک دو منٹ بعد اس کے سیل فون کی بپ بجی۔ اس کو ایک سوا ایک فیصد یقین تھا کہ یہ ارفع عزیز کا ہی میسج ہو گا اور وہ ہی ہوا تھا۔

”بچن میں سرخ لہج باکس میں کریلے گوشت کا سالن ہے، ٹھونس لینا۔“ اس کا میسج پڑھ کر ایک بے ساختہ قہقہہ اس کے حلق سے نمودار ہوا تھا۔

ٹھیک دو منٹ بعد ارفع کو اس کا میسج ملا تھا۔ ”گاڑی کی ابھی بینک کی قسطیں باقی ہیں اس لیے آنکھیں کھول کر اور دماغ ٹھنڈا کر کے چلانا۔ تمہاری تو خیر ہے گاڑی البتہ نئی ہے۔“

☆☆☆

”ہائے ڈارلنگ! تمہیں معلوم ہے کہ سائنس

وانوں کو ایٹم بم بنانے کا خیال کیسے آیا؟
خضر حیات کا یہ ایس ایم ایس ارفع عزیز کو اس وقت موصول ہوا جب وہ اسلام آباد کی ایک کچی آبادی پر ڈاکو منٹری بنانے میں مگن تھی۔ وہ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے سر پر چھاتا تانے کھڑی تھی۔ اس نے اس ایس ایم ایس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ خضر کو جب تک اس کا جواب نہیں ملے گا وہ ڈھٹائی کی تمام حدوں کو توڑتے ہوئے اسے ایک ہی پیغام ہر دو منٹ بعد بھیجتا رہے گا۔
وہ ہی ہوا۔

ٹھیک دو منٹ بعد اس کے سیل فون کی میسج ٹون دوبارہ بجی تھی۔
ارفع نے جھنجھلا کر اسکرین کو دیکھا۔
”ارے میری مصروف ترین لڑا کا دوست! کیا تمہیں پتا ہے کہ سائنسدانوں کو ایٹم بم بنانے کا خیال کیسے آیا؟“

”نہیں۔۔۔!“ اس نے مختصراً جواب لکھا۔
دوسری طرف سے جھٹ اطلاع آئی۔
”ان کو ایٹم بم بنانے کا خیال عورتوں کی زبان دیکھ کر آیا تھا۔۔۔“ سخت مصروفیت کے عالم میں بھی اس دفعہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی گئی۔

”اپنی فضول باتیں بند کرو اور اپنے پروگرام کا ہوم ورک ڈھنگ سے کرو۔ رات ایک تو تمہارے پروگرام کا موضوع انتہائی گھٹیا تھا، اوپر سے تم نے انتہائی واہیات ثانی لگا رکھی تھی۔ زہر لگ رہے تھے“ دل کر رہا تھا کہ گردن سے پکڑ کر نیوی سے باہر نکال لوں۔۔۔ اس نے بان کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بڑی تیزی سے یہ میسج ٹائپ کیا تھا۔ اس کا اسٹنٹ ایک دفعہ پھر وہاں موجود لوگوں کو ہدایات دینے میں مگن تھا۔ گرمی اور دھوپ کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”وہ خوب صورت ثانی مجھے میری ایک بہت ہی کیوٹ سی ”فین“ نے دی تھی۔ اگر میں اس کو نہ لگا کر جاتا تو اس کا دل ٹوٹ جاتا۔“ اس کا معصومانہ انداز ارفع کو زہر لگا۔

”تم نے دوبارہ وہ ثانی لگائی تو اس کا پھندا بنا کر تمہیں اس دنیا سے رخصت کر دوں گی۔۔۔“ اس کے جوابی حملے پر خضر نے بے اختیار ہی اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر اس کو سہلایا تھا۔ شکر تھا کہ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھی ورنہ اس سے کوئی بعد نہیں تھی۔
”شام کو ڈنر کروانے کے لیے شرافت سے ”منال ریسٹورنٹ“ لے جانا اپنے بے تکرے پروگرام کے لیے ریسرچ پہلے ہی کر لینا، کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔۔۔“ اس کا دھونس بھرا میسج پڑھ کر خضر کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے مار گلہ کی خونی پہاڑیوں سے خوف آتا ہے، تمہیں زمین پر کوئی جگہ نہیں ملتی کھانا کھانے کو؟ اس پہاڑی گھمن گھریوں پر چڑھ کر اپنا آدھا خون خشک کر کے کھانا کھانے کی کیا تکبلی ہے بھلا۔۔۔؟“ خضر نے بڑی سرعت سے جواب لکھا۔

”ہمیشہ ڈریوک ہی رہنا۔ تمہیں کیا پتا کہ بلندیوں کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ انسان جب آسمان کو چھونے کی دھن میں اوپر سے اوپر بھاگتا ہے تو اس کے وجود میں کتنی سرشاری کی لہریں پھیلتی ہیں۔ اس کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔۔۔“ ارفع کا انداز اب کے ذرا فلسفیانہ تھا۔
”مالی ڈیر! آسمانوں کی بلندیوں کا نشہ اپنی جگہ، لیکن زمین کی قدر کرو۔ ہر پستی میں گرنے والا اسی کی گود میں آکر گر جاتا ہے۔“ خضر حیات سے بحث میں جیتنا کون سا آسان تھا۔

”تم اپنا لیکچر شام کو وہیں آکر دینا اور ہاں اس دفعہ مجھ پر سواہدہ“ تک جانا ہے۔۔۔“ ارفع نے اسے خبردار کیا۔

”میرا خیال ہے محترمہ! میں اپنی وصیت بھی تعویذ کی صورت میں گلے میں لٹکا کر ساتھ آجاتا ہوں، کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میری موت ان ہی پہاڑوں پر آئے گی۔“ خضر نے اسے جذباتی کیا۔

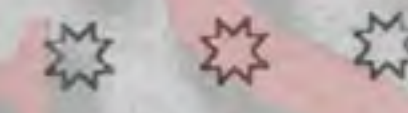
”بندے کی اگر شکل اچھی ہو تو اسے بات اس سے بھی زیادہ اچھی کرنی چاہیے۔ خیر! ارفع کرو، ہم میریٹ میں ہی ڈنر کر لیتے ہیں۔“ وہ خلاف توقع جلدی ہار مان

گئی تھی۔
”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، تمہاری خاطر تو میں پہلی کاپڑ پر ماؤنٹ ایورسٹ تک جا سکتا ہوں۔ بس خدا رات شام میں لڑکیوں والے حلے میں آنا بہت عرصہ ہوا تمہیں انسانوں والے روپ میں دیکھے ہوئے۔“ وہ اس کے جینز اور لونگ شرٹ والے حلے سے سخت چڑتا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ شام میں سارہ کی وارڈروب پر ڈاکا مارنا پڑے گا۔۔۔“ وہ اس بات سے بھی متفق ہو گئی تھی۔ خضر اس کا میسج پڑھ کر حیران ہو گیا۔ وہ اپنے لباس، کام اور اسٹائل پر کسی کا کوئی بھی مشورہ اتنی آسانی سے نہیں مانتی تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ خضر نے مسکراہٹ کی علامتی شکل کے ساتھ اسے حیرت بھرا میسج بھیجا۔

”نہیں یار! سخت گرمی لگ رہی ہے، اس لیے ہنسی بہتی باتیں کر رہی ہوں۔ تم ٹینشن نہ لو، شام تک میں اپنی اصلی حالت میں واپس آجاؤں گی۔۔۔“ وہ اس کی نبض شناس تھی۔ اس کا میسج پڑھ کر خضر کے منہ سے ایک بے ساختہ تہقہ نمودار ہوا تھا۔



”شکر ہے! میں نے اپنے بچے کی شکل دیکھی۔ کہاں گم تھے تم۔۔۔؟“ صوفیہ بیگم نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے انتہائی محبت سے کہا۔ وہ ابھی ابھی ”صوفیہ ولا“ میں ارفع کو پک کرنے آیا تھا۔ اس وقت سب شام کی چائے برلان میں اکٹھے تھے۔

”خیر تو ہے یہ اٹالین ٹوپس، ثانی، لٹش ہنٹ کرتے جوتے اور پرفیوم کا بے دریغ استعمال کس خوشی میں کیا ہے؟ کہاں بمباری کرنے جارہے ہو؟“ صوفیہ بیگم کے بالکل سامنے بوگن ویلیا کی نیل کے پاس لان چیمبر پر نیم دراز سارہ نے توصیفی نظروں سے اپنے ہینڈ سم کزن کو دیکھا۔ اس کا لہجہ شرارت میں ڈوبا ہوا تھا۔

”بھئی! تمہاری بہن کے ساتھ کہاں“ کسی اور پر

بم گرانے کا موقع ملتا ہے۔ حشر نہ کروے میرا۔۔۔ اور باز آیا میں ایسی حرکتوں سے۔“ اس نے بڑی بے تکلفی سے سارہ کا چائے کا کپ پکڑ کر منہ سے لگا لیا۔
”شرم کر لو، اپنی حرکتوں سے تو تم مرکز بھی باز نہیں آسکتے۔۔۔“ وہ جل کر بولی۔ جب کہ صوفیہ بیگم اس کی شرارت پر بے ساختہ ہنس رہی تھیں۔

”آپ ہی نے اسے شہرہ دے دے کر سر پر چڑھا رکھا ہے۔“ سارہ نے شکایتی نظروں سے صوفیہ بیگم کی طرف دیکھا، جو اس کے لیے بڑی محنت کے ساتھ چائے کا ایک اور کپ بنا رہی تھیں۔ وہ حقیقت میں ان کا لاڈلا تھا۔ جن دنوں اس کے ماں باپ اکٹھے پی ایچ ڈی کرنے انگلینڈ گئے تھے اس وقت وہ صرف تین سال کا تھا اور اس نے اپنے بچپن کے پانچ انتہائی قیمتی سال صوفیہ بیگم کی گود میں ہی گزارے تھے۔ اس لیے وہ اپنی ممی کے ساتھ ساتھ صوفیہ بیگم کو ان کی بیٹیوں کی طرح ماما ہی کہتا آیا تھا۔ صوفیہ بیگم اس کی تائی لگتی تھیں ان کی صرف چار بیٹیاں ہی تھیں۔ اس لیے بھی وہ ان کا خالص لاڈلا تھا۔

”میں نے سنا ہے اس سیزن میں تمہارے لان کے پر تنس نے بڑے بڑے ڈیر انڈوز کے چھکے چھڑا دیے ہیں؟ فیشن انڈسٹری میں بڑے چرچے ہیں جناب کے،“ اس نے ارفع کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سارہ کو چھیڑا۔ وہ اس کی ہم عمر تھی اور دونوں میں بلا کی بے تکلفی تھی۔

”بس جی! اپنی تو بات ہی اور ہے۔“ سارہ نے اپنے فرضی کالر اوپر کیے۔

اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ صوفیہ بیگم کی چاروں ہی بیٹیوں نے اپنے اپنے میدان میں بے مثال کامیابی کے جھنڈے گاڑے تھے۔ حالانکہ جب صوفیہ بیگم کے شوہر کا اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا تھا اس وقت ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ارفع صرف دس سال کی تھی۔ ان کی سب سے بڑی دو بیٹیاں جڑواں تھیں، جن میں عقیقہ ایک بہت اچھی ڈراما ٹولو جسٹ ڈاکٹر تھیں۔ کچھ عرصہ سے اٹلی میں مقیم

تھیں۔ ان کے میاں بھی پلاسٹک سرجن تھے۔ ان کی چڑواں ماہرہ کی شادی ایک پروڈیوسر کے ساتھ ہوئی تھی اور ان کا اپنا بھی رجحان شو بیز کی طرف تھا۔ آج کل دونوں میاں بیوی کے پروڈکشن ہاؤس کے زیر اہتمام بننے والے ڈرامے خاصے مشہور ہو رہے تھے۔ ان دونوں سے چھوٹی سارہ عزیز نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں باہر سے کافی کورسز کرنے کے بعد نہ صرف اپنی ٹیکسٹائل مل کو کامیابی کے ساتھ سنبھالا ہوا تھا بلکہ وہ فیشن انڈسٹری میں بہت تیزی سے ابھرتی ہوئی ڈیزائنر کے طور پر بھی مانی جا رہی تھی۔ اس کی بوتیکس اور فیشن شوز کا خوب چرچا تھا۔ اس سے چھوٹی ارفع کا رجحان بھی شو بیز کی طرف تھا، لیکن وہ اپنی تمام تر توانائیاں بس ڈاکومنٹری فلمز کی طرف مرکوز کیے ہوئے تھیں۔ صوفیہ بیگم خود بھی ایک کامیاب بزنس وومن تھیں۔ وہ اپنی گارمنٹس فیکٹری کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ سارہ کا بھی خوب ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ رفاہی کاموں کے سلسلے میں بھی وہ خاصی متحرک تھیں اور خواتین کے حوالے سے ایک تنظیم بھی چلا رہی تھیں۔

”تم آج کل کچھ زیادہ بولڈ ہو کر کام نہیں کر رہے ہو؟ ایسے ایسے خطرناک قسم کے جملے بولتے ہو کہ ماما کا بی بی کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ سارہ کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔

”بیٹا! ذرا سنبھل کر اور محتاط انداز میں کام کرتے ہیں، جن لوگوں کے خلاف روز بولتے ہو، وہ کوئی نقصان ہی نہ پہنچادیں۔ میرا تودل ہی دہلتا رہتا ہے۔“ صوفیہ بیگم کے لہجے اور انداز میں اس کے لیے محبت اور شفقت کی فراوانی تھی۔

”ان میں سے بہت سے لوگ جو آن ایر پروگرام میں ایک دوسرے کے جانی دشمن دکھائی دیتے ہیں، پروگرام کے اینڈ میں چائے پی کر خوب بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے گپ شپ لگا رہے ہوتے ہیں۔ پاگل بناتے ہیں بس عوام کو۔“ اس کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

”مجھے معلوم ہے بیٹا! لیکن تم پھر بھی ذرا احتیاط کیا کرو۔“ اسے ان کی محبت پر کبھی بھی شک نہیں رہا تھا اس لیے مسکرا کر بولا۔

”دفع کریں ماما! آپ ماہرہ آپ کی پروڈکشن ہاؤس کے رومانٹک سے اور ساس بہو کے جھگڑوں والے ڈرامے دیکھا کریں۔ یقین کریں ڈراموں میں اتنا رومانس دکھا رہی ہیں کہ میرے جیسے بندے کے کانوں سے دھومیں نکلنے لگتے ہیں، تو باقی لوگوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ میں نے کل انہیں فون کر کے کہا تھا کہ کچھ خدا کا خوف کریں۔ کیوں نہیں! بجز کاملاً آپ لوگ خراب کر رہے ہیں، ایک تو سیل فون کے پیکیجنگز نے آدھی نوجوان نسل کو تباہ کر دیا ہے، باقی ان ڈراموں کے ذریعے آپ لوگ کر رہے ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھا کیا، میں خود ماما ہی سے کہتی رہتی ہوں کہ اچھی اصلاحی قسم کی کہانیوں پر صاف سترے ڈرامے بناؤ، لیکن وہ کہتی ہے، لوگ یہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ حد ہے بھی۔“

صوفیہ بیگم کے انداز میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔ چکن کے سرمنی کلر کے سوٹ میں ان کی سفید اور شفاف رنگت دکھ رہی تھی۔

”کیا کیا جائے ماما! یہ دور ہی ایسا ہے، زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔“ کباب کھاتے ہوئے سارہ نے تبصرہ کیا۔

”واہ بیٹا! یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ زمانہ کون سا آسمانی مخلوق نے آکر بسایا ہے، وہاں بھی آپ جیسی زمینی مخلوق ہے اور آپ بھیڑ بکریاں تھوڑی ہیں جن کو جو جہاں چاہے، ہانک کر لے جائے۔ بیٹا! اپنی اخلاقی اقدار اور روایات کو خود زندہ رکھنا پڑتا ہے اور جو قوم ایسا نہیں کرتی، وہ تاریخ کے اوراق پر عبرت کا نشان بن جاتی ہے۔“ صوفیہ بیگم کے ہاتھوں سارہ کی دھلائی پر خضر نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”ماما! کس کو عبرت کا نشان بننا رہی ہیں آپ؟“ وہ رسٹ وارج باندھتے ہوئے بڑی عجلت میں باہر آئی تھی۔

ان تینوں نے چونک کر اسے دیکھا، کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی لمبی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور کولہا پوری چپل میں وہ آج نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ آج خلاف عادت ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ پنک لپ گلوں، بلش آن اور بڑی مہارت کے ساتھ آئی لانٹرو کا استعمال بھی کر رکھا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کا بھی بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے کمر تک آتے سلکی بالوں کو نیچے سے ہلکا سا رول کر رکھا تھا۔

”ماشاء اللہ بیٹا! اللہ نظرید سے بچائے۔“ انہوں نے خضر کے بالکل پاس کھڑی اپنی نازک سی بیٹی کو محبت بھرے انداز سے دیکھا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ کپل تھا۔

”مبارک ہو ماما! آج آپ کی اس بیٹی نے بھی آخر کار ہاتھ منہ دھو ہی لیا، کون سا منتر پڑھ کر پھونکا ہے خضر تم نے؟“ سارہ کے ذہنی انداز اور شرارتی نظروں سے وہ دونوں سٹپٹے۔

”توبہ ہے سارو! ایسے نہ میری بیٹی کے پیچھے پڑ جایا کرو۔“ ماما نے اسے ٹوکا تو وہ ہستے ہوئے بولی۔

”آپ کو یاد ہے ماما! اس نے آخری دفعہ شلوار قمیص مومی آپ کی شادی پر پہنا تھا، آج سے کوئی تین سال پہلے۔“

”تمہیں کیا پر اہلم ہے، میں پہنوں یا نہ پہنوں؟“ وہ بری طرح پی تھی۔

”مجھے ویسے تو کوئی پر اہلم نہیں۔ ہاں جب لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ ڈیزائنر سارہ عزیز کی بہن یہ اول جلول حلے والی لڑکی ڈیزائنر ہے تو وہ میرے کام کے حوالے سے بہت مشکوک ہوتے ہیں۔ ویسے ارفع! اچھی خاصی ہو، میرے فیکسٹ فیشن شو میں ماڈلنگ کیوں نہیں کرتیں؟“ سارہ ایک دم جوش میں آئی۔ ارفع کو وہ اکثر و بیشتر اسی طرح سے راضی کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی، لیکن ارفع کو اس کام میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ صاف انکار کر دیتی تھی۔

”یار کر لو ناں! میری بہت زبردست برائیدل ڈریس

کی کلیکشن سامنے آنے والی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سب دلہنوں کو مات دے دو گی۔“ سارہ نے اس کی منت کی۔

”جی نہیں! ارفع کسی کیٹ واک میں حصہ نہیں لے گی۔“ خضر نے ایک دم ہی اس کی بات کاٹ کر عجلت میں کہا۔ وہ ایک لمحے میں سنجیدہ ہوا تھا۔ اس کے تیزی سے بدلتے تاثرات پر وہ تینوں ہی بری طرح سے چونکی تھیں۔ جس کلاس سے ان کا تعلق تھا وہاں یہ بالکل ایک عام سی بات تھی۔ خود ماہرہ اور سارہ بھی اپنے فیشن شو میں حصہ لے چکی تھیں۔

”اس میں کیا حرج ہے؟“ سارہ کو اس کا یوں ٹوکنا بہت برا لگا تھا، لیکن وہ پھر بھی قدرے سنبھل کر بولی۔

”حرج کوئی نہیں ہے، لیکن مجھے پسند نہیں کہ ارفع ایسی کسی کیٹ واک کا حصہ بنے۔“ سارہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات کی وجہ سے اس نے اپنا انداز قدرے ہلکا پھلکا رکھا۔

”کیوں؟ جب تم اپنے دوست حسن کی فارمل ڈریسز کے فیشن شو میں حصہ لے سکتے ہو تو ارفع اپنی سگی بہن کے لیے کام کیوں نہیں کر سکتی؟“ سارہ نے بڑی حیرت بھری ناگواری سے اپنے اس بہترین دوست کو دیکھا، جس کی شخصیت کا یہ رنگ اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات ارفع کی خاموشی تھی۔

”اس کیٹ واک میں، میں نے مجبوراً حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد میں کسی ایسی ایکٹیوٹی کا حصہ نہیں بنا۔ اور جہاں تک ارفع کی بات ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ میں اس کے معاملے میں کتنا حساس ہوں، لیکن پھر بھی اگر ارفع ایسا کرنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ ایک دم ہی جذباتی ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ناراضی کا عنصر صاف جھلک رہا تھا۔

”کیا فضول بحث کر رہی ہو سارہ! تمہیں ارفع کے مزاج کا علم نہیں؟ وہ کیوں تمہارے کسی فیشن شو میں حصہ لے گی؟ خضر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہے ناں ارفع؟“ صوفیہ بیگم کے لہجے کی معنی خیزی اور اس میں

موجود جواب کو ارفع نے بڑی تیزی سے سمجھا تھا۔
 ”کیا ہو گیا ہے خضر! تمہیں پتا تو ہے مجھے ان فضول
 فیشن شوز اور کیٹ واک میں کوئی دلچسپی نہیں پھر کیوں
 بحث کر رہے ہو؟ چلو! اب نکلیں۔“ اس کے لاپرواہ
 انداز پر صوفیہ بیگم کے چہرے پر بڑی تیزی سے سکون
 کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے زیادہ تیزی سے سارہ کا رنگ
 پھیکا پڑا تھا۔ خضر نے اضطراب سے کھڑے کھڑے پہلو
 بدلا۔ وہ اب بہت غور سے سارہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے
 دانستہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

”واہ سارہ! دیکھ لی تمہاری دوستی۔ خبردار! تم نے
 اکیلے کبھی ارفع کو اپنے فیشن شو میں حصہ لینے کی
 دعوت دی میں مر گیا ہوں کیا۔“

”ابھی تو نہیں مرے لیکن دوبارہ ایسے فضول
 ڈانٹا لگ بولے تو میرے ہاتھوں ضرور شہید ہو جاؤ
 گے۔“ سارہ نے اس کے کندھے پر زوردار مکارا۔

”ہائے ہائے! مار دیا ظالم لڑکی نے۔۔۔ اف میرے
 کندھے کی دو تین ہڈیاں تو ٹوٹ ہی گئی ہوں گی۔“ وہ
 مصنوعی تکلیف کے احساس سے دہرا ہوا رہا تھا۔

”پورا ایکٹر ہے۔ آئیے دو آپلی کافون۔ ان کے اگلے
 ڈرامے میں بنگ کر داتی ہوں۔“ سارہ نے دھمکی دی۔
 ”ایکٹنگ تو اس کی اپنے پروگرام میں بھی عروج پر
 ہوتی ہے جب مختلف سیاستدانوں کو شہر دے کر
 آپس میں لڑا رہا ہوتا ہے۔ ہر وقت ڈرامے نہ کیا کرو
 سمجھے!“ ارفع نے اس کا بازو پکڑا اور زبردستی کھینچ کر
 پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

وہ دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا کر گول گول گھومتی ہوئی
 ایک معصوم سی بچی لگ رہی تھی۔ بارش اس کی
 کمزوری تھی اور اسلام آباد کی پہاڑیوں سے اسے
 عشق تھا۔ اس وقت وہ رات کی وجہ سے بارش کی
 بوندوں کو دیکھ تو نہیں سکتی تھی لیکن انہیں محسوس
 کرتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیلے خوب صورت
 رنگوں کو خضر حیات بہت آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ وہ

دونوں ”منال ریسٹورنٹ“ کے نسبتاً ”ر سکون گوشے
 میں بیٹھے آسمان سے گرتی بوندوں کو تسلسل سے گرتا
 دیکھ رہے تھے کہ اچانک ارفع نے اٹھ کر بے اختیار
 بارش کو انجوائے کرنا شروع کر دیا تھا۔

”خضر! بارش کی بوندیں کتنی خوب صورت ہوتی
 ہیں ناں۔۔۔“ وہ کھلکھلائی۔

”ہاں! لیکن تم سے زیادہ خوب صورت دنیا کی کوئی
 چیز نہیں۔“ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے سامنے والی
 کرسی پر بٹھاتے ہوئے انتہائی جذب اور سچائی سے کہا۔
 وہ چونکی۔ ایک دلکش سی مسکراہٹ نے اس کے
 چہرے کا احاطہ کیا۔

”میں تمہیں دنیا کی سب سے خوب صورت چیز
 لگتی ہوں؟“ وہ ایک ترنگ کے عالم میں سامنے بیٹھے
 حد درجہ دلکش شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے سامنے
 اسے اپنا آپ کبھی بھی اہم نہیں لگا تھا۔ اس کے فینز
 میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ خود اس کی روزانہ
 آنے والی ای میلز پڑھتی تھی اور دل کھول کر ہنستی
 تھی۔ وہ دونوں بہت سالوں سے محبت کی مضبوط ڈور
 سے بندھے ہوئے تھے۔ اے لیونز کے بعد جب وہ
 پاکستان آیا تھا تب اس نے پہلی دفعہ اپنی محبت کا اظہار
 کیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ دونوں ایک ان کے
 معاہدے کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔

”اس میں کوئی شک ہے کیا؟“ خضر نے بے اختیار
 ہی اس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا تھا۔ ارفع جیسی
 پر اعتماد اور بولڈ لڑکی بھی ایک لمحے کو جھینپ گئی تھی۔ وہ
 دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں حد درجہ
 جذباتی تھے۔ دونوں کی دن میں کئی دفعہ لڑائی ہوتی لیکن
 اس کے باوجود ان کا ایک دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں
 تھا۔ جن دنوں وہ آسٹریلیا اپنی اسٹڈی کے سلسلے میں گئی
 تھی ان دنوں بھی وہ وہاں کے کئی چکر لگا آیا تھا۔ ان کی
 روز اسکائپ (skype) پر بات ہوتی تھی ایک
 دوسرے کو ویسے گئے کارڈز پھول اور گفتگو کی تعداد
 بھی ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ دونوں اپنی چھوٹی
 سے چھوٹی بات بھی ایک دوسرے سے بیان کرنے کے

عادی تھے۔

”اوائے! تمہاری جوڑی پھر یہاں پہنچ گئی۔ بابا!
 جان چھوڑ دو اس کی۔“ نتاشا کی آواز پر وہ دونوں بری
 طرح اچھلے۔ وہ ان کے سامنے کھڑی کھلکھلا رہی
 تھی۔

”تم کہاں سے ہر جگہ ٹپک پڑتی ہو۔۔۔“ ارفع نے
 اپنے بری طرح ڈولتے ہوئے دل کو بمشکل سنبھالتے
 ہوئے اسے گھورا۔ نتاشا سارے زمانے کی شرارت
 اپنے چہرے پر سجائے کھڑی تھی۔ وہ ارفع کی بہترین
 دوست تھی۔ ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے کے
 بعد وہ ایک انگلش اخبار سے وابستہ تھی۔

”یار! معید کہنے کے ساتھ آئی تھی لیکن اسے
 اپنی کوئی پرانی گرل فرینڈ نظر آگئی۔ جو تمہاری طرح
 خوب صورت بھی ہے۔ بس وہ وہیں اس کو بیٹھا پٹا رہا
 ہے اور میں چونکہ سچ کی علمبردار ہوں۔ اتنا جھوٹ
 برداشت نہیں کر سکتی اس لیے ٹھٹھنے کے لیے یہاں آ
 گئی۔“ اس نے بے تکلفی سے اپنے ماموں زاد کزن
 کے بارے میں بتایا جو اس کے ساتھ ہی اخبار کے لیے
 انوسٹی گیشن (تفتیشی) رپورٹرنگ کرتا تھا اور خضر
 کا بھی ایک اچھا دوست تھا۔

”اچھا! ارفع کی طرح خوب صورت ہے تو میں بھی
 معید کے ساتھ لائن مار کر آتا ہوں۔“ خضر نے شوخی
 سے کہا۔

”خیر! ارفع جیسا تو کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ بے
 ساختہ بولی۔

”تم لوگ ایک دوسرے کو کمپنی دو۔ مجھے سامنے میز
 پر خاور کچھ دوستوں کے ساتھ نظر آ رہا ہے میں ذرا ان
 سے مل کر آتا ہوں۔“ خضر بھی اپنے دوستوں کو دیکھ کر
 بے تاب ہوا۔ وہ وہاں جا ہی رہا تھا کہ راستے میں لڑکیوں
 کے ایک گروپ نے اسے گھیر لیا۔ وہ شاید اسے پہچان
 چکی تھیں۔

”ارفع تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“ نتاشا نے اس کی
 نظروں کے تعاقب میں دیکھا جہاں خضر راجا اندر بنا
 کھڑا ہنس رہا تھا۔

”ڈر کس بات کا؟“ ارفع نے خضر سے نظریں ہٹا کر
 حیرت سے اپنی اس پر خلوص سی دوست کو دیکھا۔
 ”خضر کے حوالے سے۔۔۔ دیکھو ناں! وہ میڈیا سے
 تعلق رکھتا ہے اور ڈشنگ پر سنالٹی کا مالک ہے میں
 نے اکثر دیکھا ہے کہ مختلف فنکشنز میں لڑکیاں اس
 کے گرد منڈلا رہی ہوتی ہیں۔۔۔“

”کم آن نتاشا! ڈونٹ بی سلی۔ مجھے اس سے کوئی
 فرق نہیں پڑتا۔ ایک تو مجھے خضر پر اپنی ذات سے بڑھ
 کر اعتماد ہے اور دوسری بات یہ کہ جو میں ہوں وہ بس
 میں ہوں۔ خضر کو مجھ سے بڑھ کر کوئی اور مل سکتی ہے
 کیا؟“ نتاشا نے چونک کر اس کے بے داغ حسن کو
 دیکھا۔ اس کی خوب صورتی کو اس کے پر اعتماد انداز
 نے چار چاند لگا رکھے تھے۔ نتاشا نے متفق انداز سے
 اپنے کندھے جھٹکے۔

”تم ٹھیک کہتی ہو یار! حسن میں بڑی طاقت ہے۔
 یہ تو کھل جاسم سم کی طرح ایک جاوٹی اسم ہے۔“
 نتاشا کے لہجے میں حسرت کے ساتھ ساتھ کتنی بھی
 تھی۔ وہ عام سے خدو خال کی حامل ایک انتہائی عام سی
 لڑکی تھی۔ ویسے وہ بلا کی ذہین اور پر اعتماد تھی لیکن اپنی
 شخصیت کے حوالے سے وہ تھوڑا احساس کمتری کا شکار
 بھی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے نتاشا! خوب صورتی ہمیشہ کامیابی کی
 دلیل نہیں ہوتی۔ تم دیکھو! شوبز میں کبھی کتنی خوب
 صورت مگر ڈفر لڑکیاں آتی ہیں تو وہ ایک دو دفعہ کے بعد
 پھر نظر نہیں آتیں۔“ وہ کافی کا آرڈر دے کر اس کی
 طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”لیکن یار! تم مانویا نہ مانو حسن۔ بذات خود ایک
 سفارش ہے جس سے بہت سے کام ہو جاتے ہیں۔
 ان لڑکیوں کو شوبز میں آنے کا موقع تو ملنا ناں! ورنہ تو کتنا
 ہی ٹیلنٹ صرف اس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے رل
 رہا ہے۔ کون دے گا انہیں ایک چانس؟“ وہ تھوڑا سا
 بخ ہوئی۔

”سار لوگ ایسے نہیں ہوتے نتاشا!“ ارفع نے
 تاسف بھرے انداز سے اس کے چہرے کو دیکھا جو تلخی

کے احساس کے ساتھ اور بھی عام سالگ رہا تھا۔
 ”زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں مائی ڈیر! اب تم اس معید کو دیکھ لو۔ ویسے ساری دنیا میں اپنی اور میری دوستی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ مجھ سے اپنے آفس کے ڈھیروں کام کروالیتا ہے، لیکن جہاں کوئی اچھی صورت دیکھتا ہے پھسل جاتا ہے پھر اس کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں اس کے ساتھ ہوں اب دیکھ لو! میں پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہارے ساتھ ہوں۔ اسے ان تیس منٹس میں تیس سیکنڈز کے لیے بھی میرا خیال نہیں آیا ہوگا۔ تم لکھ لو! جب وہ لڑکی چلی جائے گی وہ تب سوچے گا کہ میں کہاں گئی۔“ اس کے لہجے میں بس تلخی ہی تلخی تھی۔ ارفع اسے دیکھ کر رہ گئی۔
 ”دیکھو! اسے احساس تک نہیں کہ ہم کھانا کھانے آئے ہیں۔ وہ اس وقت مزے سے اس ماڈل گرل کے ساتھ ڈنر اڑا رہا ہوگا۔“

”ایسے بدگمان نہیں ہوتے۔ وہ پاگل تھوڑا ہی ہے جب تمہارے ساتھ کھانا کھانے آیا ہے تو تمہارے ساتھ ہی کھائے گا ناں۔ اس کو تو اس نے کافی یا چائے پر رُخ دیا ہوگا۔“ ارفع نے اسے تسلی دی۔

”تم سے زیادہ جانتی ہوں میں اسے۔۔۔ پانچ سال پرانا تعلق ہے ہمارا۔“ اس نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں۔

”ایسے ہی ہر وقت منفی باتیں نہ سوچا کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟“ ارفع نے اسے محبت بھرے انداز سے ڈنٹا۔ اسی وقت خضر وہاں چلا آیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی تھیں نتاشا! وہ واقعی ایک آفت چیز کو بٹا رہا ہے۔ بہت ہی کمینہ ہے یہ معید۔“ خضر نے ارفع کے ہاتھ سے کافی کا گپ پکڑ کر اپنے منہ سے لگایا اور پھر گردن کو خم دے کر انتہائی عزت و احترام سے اسے واپس کر دیا۔

”اب پیو، یقین کرو اس میں محبت کی چاشنی شامل کر دی ہے میں نے۔“

”وہ ابھی تک فارغ نہیں ہوا اس لڑکی سے؟“ ارفع نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے

پوچھا۔

”لو! وہ اور فارغ۔۔۔؟“ خضر ہنسا۔ ”وہ تو اس کے ساتھ مزے سے ڈنر اڑا رہا ہے۔ دنیا جہاں کی چیزیں اس ہیلن آف ٹرائے کے سامنے سجا رکھی ہیں۔ تجھے تو لگتا ہے گھر تک چھوڑنے جائے گا۔“

نتاشا نے جن نظروں سے ارفع کو دیکھا تھا وہ بری طرح خفت کا شکار ہوئی۔ جب کہ نتاشا کا چہرہ اس اطلاع کے ساتھ بالکل دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔

”اسے کیا ہوا؟“ خضر نے اس کی آنکھوں میں ابھی ابھی آنسو دیکھے تھے۔ وہ سخت حیران ہوا۔

”اسے تو کچھ نہیں ہوا، لیکن مجھے لگتا ہے کہ معید کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔ نتاشا کو ڈنر پر لے کر آیا تھا اور اب کھانا کسی اور کے ساتھ کھا رہا ہے۔“

”سو سڈیاریا!“ خضر کو سخت افسوس ہوا۔ ”یہ تو سخت زیادتی ہے۔“ اسے حقیقتاً افسوس ہوا تھا۔
 ”یہ مرد حسن دیکھ کر پھسل کیوں جاتے ہیں؟“ ارفع رنجیدہ ہوئی۔

”ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ محبت ان چیزوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یقین کرو! اگر مجھے نتاشا سے محبت ہوتی اور تم میرے سامنے آ جاتیں تو مجھے کبھی تم میں کشش محسوس نہ ہوتی۔“ وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مردانہ مضبوط نہیں ہوتا۔ وہ سب سے پہلے لڑکی کی خوب صورتی پر ہی پھسلتا ہے۔ یہ محبت و جنت تو بہت بعد کی چیز ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تو خضر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”چلو چھوڑو! میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا، پھر تم اتنی خوب صورت شام کیوں برباد کر رہی ہو؟“ وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

”میں تمہاری شام برباد کر رہی ہوں۔۔۔؟ میں؟“ وہ نہ جانے کیوں اتنی حساس ہو رہی تھی۔

”تم میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ تمہیں

اچھی طرح علم ہے کہ میرا کیا مطلب تھا۔ میں مانتا ہوں کہ نتاشا تمہاری دوست ہے اور جو اس کے ساتھ ہوا، مجھے اس کا افسوس بھی ہے، لیکن اس میں برانہ ماننا نتاشا کا اپنا قصور ہے۔ وہ معید کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس نے کوئی پہلی دفعہ اس کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ وہ کیوں نہیں اسے چھوڑ دیتی؟“ خضر نے آج صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔ ارفع کو اس کی بات سے سخت صدمہ ہوا۔

”وہ کیسے اسے چھوڑ سکتی ہے؟ وہ اس سے محبت کرتی ہے خضر۔۔۔“

”محبت کرتی ہے تو پھر اس کی عادتوں سے بھی سمجھوتہ کرے۔“ وہ قدرے اونچی آواز میں بولا۔

”محبت میں سمجھوتہ نہیں ہوتے خضر! محبت اگر سمجھوتے کی راہ پر چل نکلے تو وہ محبت نہیں رہتی۔“ وہ بولی نہیں بھڑکی تھی۔

”یہ اچھی منطق ہے۔ اگر محبت میں سمجھوتہ نہیں ہوتے تو کیا نفرت میں ہوتے ہیں؟ اگر کسی تعلق کو قائم رکھنا آپ کی مجبوری ہے تو سمجھوتے کی ڈور کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو باندھ سکے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کریں۔ آج کے دور میں کوئی فرشتہ نہیں ہوتا۔ ہم اگر کسی سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں اس چیز کا پر مٹ نہیں مل جاتا کہ ہم اس شخص کو ویسا بنا دیں جیسا کہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”محبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان اپنی عزت نفس کو اٹھا کر طاق پر رکھ دے۔“ ارفع کو شدید غصہ آ رہا تھا۔

”مائی ڈیر! اپنی عزت نفس کو کسی شخص کے لیے چکنا ہی محبت ہے۔۔۔ جہاں ”میں“ آ جاتی ہے وہاں سے محبت رخصت ہو جاتی ہے۔“ وہ تھوڑا سا دھیمہ ہوا۔

”میں تو ایسی محبت کو اٹھا کر گلی میں پھینک دوں جو میری عزت نفس کو کچل دے۔ میرے لیے یہ زیادہ

آسان ہے کہ میں اس محبت کو ہی ختم کر دوں۔“ اس لہجے میں اس قدر زہر تھا کہ خضر کچھ لمحوں تک بول نہ سکا۔

”جو محبت ٹیوب لائٹ کے بٹن کی طرح ہو، جب چاہو روشن کر لو، جب چاہو آف کر لو۔ وہ سب کچھ ہو سکتی ہے، لیکن ”محبت“ نہیں۔“ خضر بحث کا اختتام کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آج کی ملاقات بھی حسب معمول ایک لڑائی پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔



”ہائے سویٹ ہارٹ!“ پورے بیس دن بعد نتاشا اچانک ہی اس کے اسٹوڈیو میں آئی تھی۔ وہ ایڈیٹنگ روم میں اپنی ڈاؤنٹری کی ایڈیٹنگ میں بری طرح مگن تھی۔ پچھلے بیس دنوں میں اس نے کئی دفعہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کا سیل فون مسلسل آف جا رہا تھا۔ آج بلک جینز پر زرد کرتا بننے والی اچانک ہی آگئی تھی۔ ارفع کو حقیقتاً اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ وہ خاصی تروتازہ لگ رہی تھی۔

”تم زندہ ہو۔۔۔؟“ ارفع ایڈیٹنگ کا کام ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے تکلفی سے سامنے رکھے صوفے پر براجمان ہو گئی اور بڑی دلچسپی سے سامنے دیوار پر لگی ایل سی ڈی پر اس کی نئی ڈاؤنٹری فلم کے مناظر دیکھنے لگی۔

”ہاں! نہ صرف زندہ ہوں، بلکہ اچھی خاصی ہٹی کٹی ہوں۔۔۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولی لیکن ارفع نے لمحوں میں اس کے قہقہے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا تھا۔

”کہاں روپوش ہو گئی تھیں تم؟ میں نے تمہاری تلاش میں کنوؤں تک میں بانس ڈلوادیے تھے۔“ ارفع کے فکر مند انداز پر وہ ایک دفعہ پھر ہنسی۔

”خدا کے واسطے نتاشا! کم از کم میرے سامنے ایسے مت ہنسا کرو۔“ ارفع نے باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ ایک دم ہی چپ ہوئی تھی۔

”میں نے معید گھامڑ کو بھی قون کیا تھا، لیکن وہ بھی

تمہاری طرف سے لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔
 ”میں فاروق بھائی کے پاس دبی چلی گئی تھی۔“
 اس نے اپنے سب سے بڑے بھائی کا بتایا جو کافی سالوں سے اپنے بیوی بچوں سمیت وہیں مقیم تھے۔
 ”اس اچانک دورے کی کوئی خاص وجہ؟“ ارفع نے اس کے سپاٹ چہرے کو کھوجنے کی ناکام کوشش کی۔

”ایسے ہی۔۔۔ بھائی کا فون آیا تو میں نے سوچا کہ میں چکر ہی لگا آؤں۔“ اس نے ارفع کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کے لیے ہشاش بشاش انداز میں بولی۔
 ”یہ تمہارا جیمز بانڈ کہاں افغانستان کی سرحدوں پر گھومتا پھر رہا ہے۔۔۔“ اس نے خضر کا تذکرہ کیا جو پچھلے ایک ہفتے سے ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں گھن چکر بنا ہوا تھا۔

”ویسے تم دبی میں تھیں اور پاکستان کی سب خبریں تمہیں بتا رہیں۔“ ارفع کے جل کر رونے پر نتاشا نے خوش دلی سے ہنسنے لگایا۔

”ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کے بارے میں سب خبریں رکھتے ہیں جناب!“

”بڑی مہربانی جناب کی۔“ ارفع الیکٹرک کیمٹل پر چائے کبابی رکھنے لگی۔

”ویسے تم نے اچھا خاصا اسٹوڈیو بنا لیا ہے یا!“
 نتاشا نے توصیفی نظروں سے چاروں جانب دیکھا۔ وہ کافی عرصے بعد اس کے اسٹوڈیو میں آئی تھی جو اس نے اپنے گھر کی انیکسی میں بنا رکھا تھا۔

”یہ تمہارے یا جوج ماجوج نظر نہیں آرہے؟“
 نتاشا نے اس کے دونوں اسسٹنٹس کے بارے میں پوچھا۔

”وہ دونوں کچھ میٹرل خریدنے کے لیے مارکیٹ تک گئے ہیں۔ تم سناؤ کب آئیں پاکستان؟“ ارفع خاصے مصروف انداز میں بولی۔ اس نے الیکٹرک کیمٹل کا بٹن بند کر دیا تھا۔

”میں رات ہی پہنچی ہوں اسلام آباد۔“

”ہوں۔۔۔ یہ تمہیں آفس سے اتنی لمبی چھٹی کیسے مل گئی یار! تمہارا باس تو بہت خزانٹ سنا نہیں ہے اس معاملے میں؟ مجھے معید بتا رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی بارات والے دن بھی آفس آیا بیٹھا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے ہی چھٹی کر کے گیا تھا۔“

”یہ معید نے تمہارے ساتھ اتنی باتیں کرنا کب سے شروع کر دی ہیں۔۔۔“ نتاشا نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا تھا، مگر وہ چونک گئی۔

”یار! جناح سپر میں ملا تھا مجھے کچھ دن پہلے۔۔۔“
 اس نے دانستہ اسے نہیں بتایا کہ وہ اس دن بھی کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ اسے ہرٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”ہاں! وہ ایسا ہی ہے، لیکن معید نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں جاب سے ریزائن کر کے گئی ہوں؟“
 اس کے اس انکشاف پر ارفع کپ میں چینی ڈالنا بھول گئی۔ سخت حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”تم نے جاب سے ریزائن کر دیا نتاشا اور مجھے بتایا تک نہیں؟“ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اس نیوز پیپر میں جاب کرنے کا کتنا جنون تھا۔

”بس یار! تھک گئی تھی۔۔۔ سوچا کچھ بریک ہی لے لیا جائے۔“ اس نے ٹانگیں پھیلا کر سستی سے کہا۔
 ”تو بریک لینے کے لیے جاب چھوڑنا ضروری تھا کیا؟“ ارفع نے کڑے توروں سے اسے گھورا۔ اسے نتاشا کی ذہنی حالت کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”معید نے تمہیں نہیں روکا؟“ وہ اب خشک دودھ کپوں میں ڈالتے ہوئے تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

”وہ مجھے کیوں روکے گا؟“ اس نے بے زاری سے الٹا سوال کیا تو ارفع کو یقین ہو گیا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔
 ”تمہاری معید کے ساتھ صلح نہیں ہوئی کیا ابھی تک۔۔۔؟“

”ہماری لڑائی کب تھی مائی ڈیئر۔۔۔؟“ وہ اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے زبردستی مسکرائی۔ ”تم چھوڑو ان سب باتوں کو۔ یہ بتاؤ! تم اور خضر کب شادی کر رہے ہو؟ قسم سے بہت دنوں سے

شادی کا کھانا نہیں کھایا۔“ ارفع کی تیوری چڑھ گئی۔
 ”تم مجھے وہ بات بتاؤ جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟“
 ”کم ان ارفع! میری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے اور تم مجھے کتنی عزیز ہو، اس چیز کا تمہیں بخوبی اندازہ ہے۔ میں تم سے کیسے کچھ چھپا سکتی ہوں۔“ نتاشا نے ایسے مکھی اڑائی جیسے اس کی بات کو بھی اڑا رہی ہو۔

”اگر میں تمہیں عزیز ہوں تو تم میرے لیے کیا ہو؟ یا مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ کیا مجھے یہ سب دہرانے کی ضرورت ہے نتاشا؟“ اس کے لہجے میں کچھ تھا جو نتاشا نے بے اختیار نظر چرائی تھی۔

”تمہاری رگ رگ سے میں واقف ہوں۔ کیا چیز تمہیں خوش کرتی ہے اور کس سے تم ہرٹ ہوتی ہو مجھے سب ایسے ازبر ہے کہ کبھی کبھی خضر بھی حیران ہو جاتا ہے۔“

”خضر مجھ سے جیلس نہیں ہوتا؟“ وہ بہت عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔

”وہ تم سے کیوں جیلس ہوگا؟ وہ بہت لونگ ہے اور ان تمام رشتوں اور چیزوں سے محبت کرتا ہے جو مجھے خوش کرتی ہیں۔“ اس کے انداز میں اندھا اعتماد اور مان تھا۔

”وہ تم سے محبت کرتا ہے ناں اس لیے۔۔۔ اصل میں کچھ لوگوں کی محبت کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے۔ کچھ میرے جیسے چھوٹے دل اور چھوٹے ظرف کے بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے محبوب کو چھونے والی ہواؤں تک سے بھی لڑنے لگتے ہیں۔“ وہ خاصی رنجیدہ تھی۔
 ارفع کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔
 ”محبت کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ میری بہت کیر کرتا ہے اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔“ وہ بہت دلکشی سے مسکرائی۔

”اگر خضر تمہیں چھوڑ دے تو تم کیا کرو گی؟“ اس کے انتہائی عجیب سوال پر بھی ارفع کے چہرے پر وہ ہی ازلی سکون طاری تھا۔

”خضر مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔“ نتاشا کو بے اختیار اس کے آج تمہاری سوئی ہماری شادی پر کیوں اٹک گئی ہے؟“ وہ حیران ہوئی۔

اس پر رشک آیا تھا۔
 ”ظاہر ہے! تم جیسی حسین لڑکی اسے دوبارہ مل سکتی ہے؟“

”میں اگر حسین و جمیل نہ بھی ہوتی۔۔۔ تب بھی خضر مجھ سے ایسے ہی محبت کرتا۔“ ارفع کی بات پر نتاشا تھوڑا سا الجھی۔

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔ حسن مرد کی پہلی ترجیح ہوتا ہے۔“ اس کا وہ ہی پرانا احساس کمتری ایک دفعہ پھر پوری قوت سے بیدار ہوا تھا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگے بلند قامت شیشے میں اپنا اور ارفع کا عکس دیکھا۔ وہ اس وقت ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں ایک مہکتا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔ اس کے مد مقابل نتاشا کی اپنی شخصیت بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے، زرد چہرہ، چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں اور غیر متناسب ناک، کچھ بھی تو متاثر کن نہیں تھا۔ اس کا قد خاصا لمبا تھا لیکن جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ، وہ حد درجہ کمزور تھی۔ اپنے قد کے لحاظ سے اس کا وزن بھی خاصا کم تھا۔

”تم ساری فضول بحث کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ! تم اب کیا کرو گی؟“ ارفع نے انتہائی محبت سے اپنی سب سے عزیز دوست کا چہرہ دیکھا تھا۔ جو کم از کم اسے بہت پیارا تھا۔ وہ اس کے فکر مند لہجے پر مسکرائی۔

”یار! تمہاری دوست لاکھ عام سی ہو، لیکن اس نے صحافت کی دنیا میں بہت خاص کام کیا ہے۔ میرے ریزائن کی خبر جیسے ہی پھیلی، بہت سے اچھے اداروں سے آفر آگئی، لیکن میں ابھی کچھ بریک لینا چاہتی ہوں۔ پچھلے کئی سالوں سے پاگلوں کی طرح کام کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ میرا ویٹ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ایک آدھ ماہ کے بعد کسی نہ کسی بہتر آپشن کو جوائن کر لوں گی۔“ وہ خاصی مطمئن تھی۔

”دیش گریٹ۔۔۔“ ارفع بھی خوش دلی سے مسکرائی۔

”اب تم بتاؤ! تم لوگ کب شادی کر رہے ہو؟“
 ”آج تمہاری سوئی ہماری شادی پر کیوں اٹک گئی ہے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اچھے اور خوب صورت تعلق کو کوئی نہ کوئی نام دے دینا چاہیے۔ بے نام رشتوں کی وقعت وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو جاتی ہے۔“ وہ آج کل کچھ زیادہ ہی فلسفہ بولنے لگی تھی۔

”خضر کی بھی یہی خواہش ہے، لیکن کچھ مسئلے مسائل ہیں۔ ایک تو وہ اپنا گھر بنوا رہا ہے، اوپر سے عفیوہ آئی اور ان کے میاں دوبارہ اٹلی چلے گئے ہیں، پھر ماما سنجیدگی سے سارا کے لیے کسی بہتر پروپوزل کی تلاش میں ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایک دفعہ ہی دونوں کو بھگتائیں۔ بس مزید کچھ پانچ چھ ماہ ہی لگیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اپنے بالوں کو کھول کر اب برش کر رہی تھی۔

”کیسا گھر بنوا رہا ہے خضر؟“ نتاشا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”گھر تو حیات انکل نے اپنی زندگی میں ہی شروع کروا دیا تھا۔ وہ اور آئی اسی سلسلے میں پاکستان آئے تھے جب کراچی سے آتے ہوئے مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹکرانے والے جہاز میں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے گھر کی تعمیر روک دی گئی تھی کیونکہ خضر بہت زیادہ اپ سیٹ تھا، پھر وہ بھی انگلینڈ چھوڑ کر یہاں شفٹ ہو گیا۔ اب جب سے شاوی کا پلان کیا ہے تب سے گھر کی کنسٹرکشن دوبارہ اشارت کی ہے۔“

”خضر کا نہ خیال کہاں ہوتا ہے۔۔۔؟“ نتاشا نے یونہی پوچھا تھا۔

”اس کی ایک خالہ اور ایک ماموں ہی ہیں۔ خالہ انگلینڈ میں اور ماموں آسٹریلیا میں ہوتے ہیں۔“

”وہ ہی ماموں جن سے ملنے کے بہانے وہ تم سے ملنے آتا تھا۔۔۔“ نتاشا کے شرارتی انداز بروہ کھلکھلا کر نہی تو وہ پلک جھپکے بغیر اس کی سنہری آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں کو دیکھنے لگی۔ اس نے اس لمحے اپنی دوست کے لیے انہی خوشیوں کی دعا دل میں کی تھی۔



”یہ تم آج کل ماما کے ساتھ کن چکروں میں بڑی

ہو؟“ ارفع نے اس دن خضر کے فلیٹ پر بڑا کامیاب چھپایا مارا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز خربوزہ کھانے میں مگن تھا اور اسے دیکھ کر بڑی خوش دلی سے مسکرایا تھا۔

ارفع نے غور سے اس کا تھکا تھکا سا چہرہ دیکھا۔ وہ خاصا کمزور سا لگ رہا تھا۔ پندرہ دن کے دورے نے اس کی صاف شفاف رنگت کو کمبھلا کر رکھ دیا تھا اور آنکھوں کے گرد ملے ملے سے حلقے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔

”یہ آج تم مجھے اتنا گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو،“ نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس کا دھیان مکمل طور پر خربوزے کی طرف تھا لیکن اس نے اس کی محویت کو ایک لمحے میں محسوس کر لیا تھا۔

”تم کیا دھوپ میں دوڑیں لگاتے رہے ہو جو اس قدر کالے پیلے اور کمزور لگ رہے ہو۔۔۔“ اس نے تولیہ اٹھا کر سامنے ٹیرس کی ریلنگ پر پھیلایا۔

”سچ کہو،“ واقعی کالا پیلا سا لگ رہا ہوں؟ اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے گھریلو سے روپ میں اسے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ ارفع نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اس حلقے میں بھی اتنا وجہ و خوب رو لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اسے دیکھ نہیں پائی۔

”بتاؤ ناں۔۔۔!“ وہ بے اختیار ہی ہنسا تھا۔ اس کی چوری اس نے پکڑ لی تھی۔ خضر نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ اس نے جینز پہنا کم کر دی تھی۔ اب بھی سرخ رنگ کے لان کے سوٹ میں تھی۔ اس کے ہمیشہ گول مول جوڑے میں بندھے گئے بال بھی آج فریج ٹیل میں بندھے ہوئے تھے جو کمر تک آ رہی تھی۔ یہ ہیرا سائل شاید نہیں یقیناً ”سارہ کا کارنامہ تھا۔ وہ ان معاملات میں بالکل کوری تھی۔

”بتاؤ ناں کہاں بڑی تھے؟ پرسوں بھی ماما بتا رہی تھیں تم ان کے ساتھ تھے۔ کل بھی مجھے بتا چلا کہ تم آئے ہوئے ہو، جب میں اپنے اسٹوڈیو سے گھر میں آئی تب تک تم پھر ماما کے ساتھ جا چکے تھے۔“ وہ کمرے میں پھیلے کنشن اب ترتیب سے ایک جگہ رکھ

رہی تھی۔

”تمہیں اعتراض میرے ماما کے ساتھ جانے پر ہے یا تم سے نہ ملنے پر؟“ وہ خربوزے سے فارغ ہو کر اب اپنی شرٹ کی آستین فولڈ کرتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔

”فضول باتیں مت کرو خضر!“ وہ بری طرح جھنجھلائی اور اس کے پاس پڑی پلیٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”یار! اصل میں ماما کے بے سہارا خواتین کے لیے بنائے گئے ادارے میں آزاد کشمیر سے ایک لڑکی کو لایا گیا ہے جس کے تایا زادے رشتہ نہ ملنے پر اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا اور پورے خاندان کو اس لڑکی کے کردار کی طرف سے بھی بدگمان کر دیا تھا۔ وہ پچھلے کئی دن سے سرکاری ہسپتال میں بے سہارا تھی۔ ماما کو کسی نے بتایا۔ وہ اسے نہ صرف اپنے ادارے میں لے آئیں، بلکہ اس کا کیس بھی لڑ رہی ہیں اور اس کا علاج بھی ہو رہا ہے۔“

”اوہ سو سیڈ! کتنا ظلم ہے۔“ اس کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

”ماما نے گھر میں ذکر ہی نہیں کیا۔۔۔“

”ان کو میں نے منع کیا تھا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”میں نے سوچا کہ تم ڈسٹرب ہو جاؤ گی۔ یاد نہیں اولڈ پیپلز ہوم سے آنے کے بعد تم پورا ایک ہفتہ نہیں سو سکی تھیں؟“ وہ انتہائی محبت سے کہہ رہا تھا۔

”کیسی ہے وہ لڑکی اب؟“ وہ واقعی ڈسٹرب ہو گئی تھی۔

”پتا نہیں میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ابھی ایک سرجری ہوئی ہے اور کچھ مزید آپریشن ہونے ہیں۔ ماما نے عفیوہ آئی کو اس کے کیس کی رپورٹس اٹلی بھیجی ہیں جہاں تیزاب یا آگ سے بھس جانے والوں کے لیے ایک ادارہ ”اسمائیل آگین فاؤنڈیشن“ کے نام سے کام کر رہا ہے جس کی ایک ذیلی شاخ لاہور میں بھی ہے۔ یہ اطالوی ادارہ سافٹ ماریا ہسپتال کی مدد سے کام

کرتا ہے۔ اس میں اطالوی پلاسٹک سرجنوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی سرجن بھی کام کرتے ہیں۔“ خضر نے تفصیل سے بتایا۔

”تو کیا یہ سرجن پاکستان والی برانچ میں بھی آتے ہیں؟“ ارفع نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہاں! وہ علاج کرنے کی غرض سے باقاعدگی سے پاکستان بھی آتے ہیں اور جن مریضوں کا علاج یہاں ممکن نہ ہو، انہیں اٹلی لے جایا جاتا ہے، کیونکہ یہ علاج سالوں پر محیط ہوتا ہے اس لیے انہیں اٹلی میں علاج کے ساتھ ساتھ کوئی ہنر بھی سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔“

”اس علاج کے لیے رقم کون دیتا ہے خضر؟“ وہ سخت حیران ہوئی۔

”یہ علاج ان عطیات سے ہوتا ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائی دیتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کی رقم کس مذہب یا فرقے کے لوگوں کے علاج کے لیے خرچ ہو رہی ہے وہ لاکھوں ڈالر کی تعداد میں عطیے دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہاں مفت علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اٹلی کے ایک ہسپتال میں پاکستان اور بنگلہ دیش میں تیزاب یا آگ سے بھس جانے والی غریب اور مظلوم مسلمان خواتین کا علاج بھی ہوتا ہے۔“ خضر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اوہ مائی گاڈ!“ وہ سامنے پڑے فلور کنشن پر بیٹھ گئی۔

”ماما چاہ رہی ہیں کہ میں اس ٹاپک پر کوئی پروگرام کروں۔ بس اس سلسلے میں تھوڑا بڑی تھا۔ کچھ ریسرچ ہو رہی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنے پروگرام میں لے کر آؤں۔“ وہ اسے سادہ سے انداز میں بتا رہا تھا، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی بات سن کر ایسے بھڑک جائے گی۔

”تمہیں شرم نہیں آئے گی خضر اس لڑکی کو میڈیا کے سامنے لاتے ہوئے؟ ذرا سوچو! اس پر کتنا بڑا ظلم ہوا ہے اور تم اسے دنیا کے سامنے تماشا بنانا چاہتے ہو؟ چار لوگ اس سے ہمدردی کریں گے تو آٹھ اس کے

کردار پر بھی انگلی اٹھائیں گے۔ ظاہر ہے! تم دوسری پارٹی کا بھی تو موقف سامنے لاؤ گے۔“

”کتنا دھرم معیار ہے تمہارا ارفع! تمہیں یاد ہے کہ اسی کمرے میں تم اسی موضوع پر میرے ساتھ شرمین عبید کے لیے لڑی تھیں؟ تب اس کا کام اور اس کا آسکر ایوارڈ سب کچھ تمہیں کتنا متاثر کر رہا تھا تب تمہیں لگ رہا تھا کہ میں محدود ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ اب جب کہ میں بھی اسی موضوع پر کام کرنا چاہ رہا ہوں تو تم کیوں اتنا بھڑک رہی ہو؟“ اس نے ارفع کو جواب کیا تھا۔ اس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بالکل چپ ہو گئی۔ ایک منٹ کے بعد وہ قدرے دھیمے انداز میں بولی۔

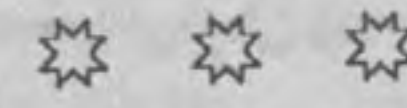
”میں شرمین کو آسکر ایوارڈ ملنے پر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔“

”تو اس کو آسکر بھی تو اسی موضوع پر کام کرنے پر ملا تھا۔ کرتی وہ مغرب کے کسی تکلیف دہ پہلو پہ کام پھر میں دیکھتا! یہ تعصب پسند گورے کیسے اس کو ایوارڈ دیتے ہیں۔“ وہ خطرناک حد تک تلخ ہوا تھا ”اور جہاں تک بات موضوع کی ہے تو میں بھی اسی موضوع پر کام کرنا چاہتا ہوں، اسی کی مذمت کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری دفعہ تمہیں خواتین کے جذبات کا خیال آگیا؟ کیا شرمین کی ڈاکو منتری میں خواتین نہیں تھیں؟ کیا ان کو ساری دنیا نے نہیں دیکھا ہو گا؟“

”ہاں! تم نے سوچا ہو گا کہ جب ساری دنیا اس بہتے گنگا سے ہاتھ دھو رہی ہے تو تم کیوں پیچھے رہو۔“ اپنی خفت پر قابو پانے کے چکر میں بہت غلط جملہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس کی بات پر خضر کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا وہ کچھ لمحوں کو تو ششدر سا رہ گیا۔ اس نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا تھا۔

”بہت غلط بات کر رہی ہو تم ارفع عزیز“ اس کے چہرے پر ایسا کچھ تھا کہ ارفع جیسی لڑکی کو بھی سانب سوکھ گیا۔ وہ بہت غصے سے ٹی وی لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے پوری قوت سے بیڈ روم کا دروازہ بند کیا تھا۔ اس کے اس انداز پر

ارفع کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اسے اتنے اشتعال میں دیکھا تھا۔ وہ تو انتہائی دھیمے مزاج کا بہت صبر و تحمل والا شخص تھا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بہت مایوسی سے سامنے والے بند دروازے کو دیکھا۔ اسے پہلی دفعہ اپنے اوپر شدید غصہ آیا تھا۔



اس دن نتاشا کی سالگرہ تھی۔ وہ اس کے لیے پھولوں کا گلہ سہ اور کیک خرید کر بہت تیزی سے راحت بیکرز کی سیڑھیاں اتر رہی تھی جب اس نے اپنے بالکل سامنے معید کو اس میڈے کی بوری جیسی رنگت کی حامل لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر بری طرح سٹپٹا گیا۔ اس نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا کیونکہ وہ اس کی نتاشا کے ساتھ دھواں دھار محبت کی سب سے بڑی گواہ تھی۔

”یہ تم آج کل شتر بے مہار کی طرح کہاں گھومتے رہتے ہو جو ہمارے لیے ٹائم ہی نہیں؟ کل خضر بھی لگہ کر رہا تھا کہ اس نے افغانستان سے آنے کے بعد تمہیں کئی ٹیکسٹ کیے، مگر تم نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔“ اس نے آج اسے آڑے ہاتھوں لینے کا فیصلہ اچانک ہی کیا تھا۔ سیاہ سوٹ میں اس کی رنگت اس وقت دمک رہی تھی۔ اپنے ساتھ اس لڑکی کی موجودگی میں ارفع کی اس سرعام ”گلاس“ سے اس کی رنگت ایک دم متغیر ہوئی تھی۔

”بس یار! کچھ بڑی تھا۔ اس سے ملو یہ میری دوست ماہم ہے۔ ابھی ابھی اس نے شو بیز جوائن کیا ہے۔“ وہ زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ اس لڑکی کا تعارف کروا رہا تھا جو ارفع کے حسین سراپے سے بری طرح خائف ہو کر اب پارکنگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو! ارفع نے کسی بھی مسکراہٹ سے بے نیاز ہو کر اسے ہیلو کیا تھا اور پھر اسے جان بوجھ کر نظر انداز

کر کے ایک دفعہ پھر معید کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا انداز سراسر سیر چڑانے والا تھا۔ ماہم کے تن بدن میں آگ ہی تو لگی تھی تب ہی وہ انتہائی بے زاری سے اپنی رست و اچ پر بار بار ناظم دیکھ رہی تھی۔

”ہاں یار! آؤں گا بہت جلد، تم سناؤ کیسی ہو؟ آج کل تمہارا کام بڑا زوروں پر ہے۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے تمہاری اسلام آباد کی کچی آبادی پر بنی ڈاکو منتری دیکھی تھی، کمال کر دیا تم نے۔“ وہ عجلت بھرے انداز میں بولا۔

”حیرت ہے“ آج کل ”تمہارے پاس کچھ“ اور ”بھی دیکھنے کا ٹائم ہے، ورنہ مجھے تو لگتا تھا کہ تم آج کل زمین پر دستیاب ہی نہیں ہو۔“ اس کے ٹھیک ٹھاک طنز پر وہ ایک لمحے کو بوکھلایا۔

”اپنی ہاؤ، بہت جلد ملاقات ہوگی اپنی تازہ ترین مصروفیات سے وقت ملے تو کال کر لینا پھر کوئی مل بیٹھنے کا پروگرام بنائیں گے۔“ اسے لگا تھا کہ اس کے الوداعی کلمات پر معید نے بے ساختہ سکون کا سانس لیا تھا۔ تب ہی وہ فوراً اختتامی کلمات ادا کر کے اس بے زاری لڑکی کے ساتھ راحت بیکرز میں گھس گیا تھا۔

وہ گاڑی اڑاتے ہوئے نتاشا کے نئے آفس میں پہنچی۔ اس وقت نتاشا کے آفس میں دو تین بکے اور ایک کیک پہلے سے ہی پڑا تھا۔ وہ کمپیوٹر پر خاصی مصروف دکھائی دے رہی تھی۔

”بھئی برتھ ڈے سویٹ ہارٹ!“ ارفع نے اس سے گلے ملتے ہوئے اس کے رخسار پر پیار کیا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”صبح سے تم دونوں کے پیچھے خوار ہوتی پھر رہی ہوں، پہلے صبح اس نواب خضر حیات کو دوش کیا پھر اسے ناشتا بنا کر ٹھنسوایا۔ وہ آج مکمل نخرے اٹھوانے کے چکروں میں تھا۔ اس کے بعد جناب کو آفس چھوڑا پھر راحت گئی اور اب تمہاری طرف ہوں۔“ وہ اسے جلدی جلدی ساری تفصیل بتا رہی تھی۔ خضر اور نتاشا کی برتھ ڈے ایک ہی دن ہوتی تھی جس کو کچھ عرصہ

پہلے تک وہ چاروں اکٹھے خوب انجوائے کر کے مناتے تھے، لیکن اب معید کی اور ہی چکر میں تھا۔

”یہ پھول اور کیک کیا معید نے بھجوائے ہیں؟“ اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ نتاشا کے چہرے کی رنگت پھلکی ہوئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”ملا تھا آج کمینہ، راحت بیکرز کی سیڑھیوں پر اسی میڈے کی بوری کے ساتھ۔ ٹھیک ٹھاک طبیعت فریش کر کے آئی ہوں اس کی۔“ وہ جگ سے پانی گلاس میں ڈالتے ہوئے خاصی تپ کر بولی۔

”میڈے کی بوری کون؟“ نتاشا نے سخت حیرت سے اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔

”وہ ہی پھلکے ٹھیکج جیسی وہ ماڈل گرل جو پتا نہیں کون سی کریم کے اشتہار میں آئی ہے۔“ ارفع کی بات پر نتاشا کھلکھلا کر ہنسی۔

”واہ! کیا نام دیا ہے تم نے اسے۔“

”یہ میں نے نہیں دیا۔ خضر ایک دن غصے میں کہہ رہا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے اب پانی پی رہی تھی ”اچھا سا لیچ کرواؤ مجھے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح سے دونوں نے مجھے خوار کر دیا ہے۔“ گلاس میز پر رکھتے ہوئے وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں! رات کا ڈنر منال پر ہم دونوں کو خضر دے رہا ہے۔“ اس نے مزید ایک اور اطلاع دی۔

”لو خواجوا! وہ بدکی۔“ میں خواجوا اس اہم دن پر ایک ہڈی بن کر درمیان میں بیٹھ جاؤں۔“

”تو تم کون سا پہلی دفعہ بیٹھو گی؟ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تمہاری بھی کیا معید کی طرح یادداشت کھو گئی ہے؟ یاد نہیں، ہم ہمیشہ سے ایسے ہی اکٹھے ڈنر کرتے آئے ہیں؟“ ارفع جھنجھلا کر اسے یاد کروا رہی تھی۔

”پہلے کی بات اور تھی ارفع۔۔۔ اس وقت ہم چاروں اکٹھے ہوتے تھے۔۔۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی بات کی وضاحت کرے۔

”کیوں اب ہم ٹینوں کے کیا سینگ آگ آئے ہیں یا معید کوئی تیس مار خان تھا جو اس کے بغیر جاتے

ہوئے ہمیں کوئی اغوا کر لے گا؟ آج کے دن تو کم از کم نتاشا ہمدانی تم کوئی بو لگی نہ مارو۔“ وہ کیک کے ڈبے سے فریش کریم انگلی سے چاٹتے ہوئے جل کر بولی۔
”تم یہ بتاؤ کہ تمہاری خضر کے ساتھ صبح کب ہوئی؟“ آخری دفعہ تو تمہاری زبان نے خوب شر پھیلایا تھا۔“ نتاشا نے پلیٹیں نکالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا، کیونکہ اس لڑائی کے بعد وہ سیدھی اسی کے پاس آئی تھی۔

”میں خوا مخواہ ڈرتی رہی۔ شام میں ایک بکے اور سوری کا کارڈ لے کر اس کے فلیٹ میں گئی تو وہ کینہ پھر تروڑ کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ”ارفع! آجاؤ بہت میٹھا ہے۔ مل کر کھاتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے کبھی خفا رہی نہیں سکتے۔“ اس کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔
”اللہ تم دونوں کو ہمیشہ ایسا ہی ہنسنا بتا رکھے۔“ وہ خلوص دل سے کہتے ہوئے کیک کاٹنے لگی۔ ارفع نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ایک بات پوچھوں نتاشا؟“ وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا معید کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے؟“ اس نے سو فیصد درست انداز لگایا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی پھر تھوڑا سا جھجکتے ہوئے بولی۔

”معید نے اس دفعہ کچھ زیادہ عجیب نہیں کیا؟ حسن پرست اور فلرٹی تو وہ پیدا نشی تھا، لیکن ہر دفعہ باہر کی خاک چھان کر تمہارے ہی قدموں میں بیٹھا تجدید محبت کر رہا ہوتا تھا۔ میں اس کے والہانہ پن اور شدتوں کی گواہ ہوں، میں جھکتی تھی کہ وہ باہر بس ایسے ہی منہ مارتا ہے، محبت تو وہ تم سے ہی کرتا ہے، لیکن اس دفعہ وہ تو ہم سے بھی نظریں نہیں ملاتا رہا۔“ ارفع کو دکھ ہوا تھا۔

”وہ کچھ دن تک اب تم لوگوں سے نظریں ملائے گا بھی نہیں۔ اس کے بعد ڈھیٹ بن کر آکر تم لوگوں کو بھی بتا دے گا کہ اس نے ماہم قریشی کے ساتھ کورٹ میرج کر لی ہے۔“ نتاشا نے ایک ہتھوڑا ہی تو ارفع

کے سر پر مارا تھا۔ وہ سخت بے یقینی، تعجب اور صدمے کی کیفیت کے زیر اثر نتاشا کا سیاہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔
”نتاشا! وہ بمشکل بولی۔ ”کب؟ اور تمہیں کس نے بتایا؟“

”جس دن میں دہی گئی تھی، اسی سے دو دن پہلے اس نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اس سے کورٹ میرج کی تھی۔ اس کے بعد ماموں، ممانی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ اب ایک فلیٹ میں رہ رہا ہے۔“ وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”اور تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔؟“ اسے سخت دھچکا ہی تو لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو ایک ڈیڑھ ماہ سے اس قدر تکلیف دہ بات اکیلے ہی برداشت کرتی آئی تھی۔

”کیا بات بتاتی یار! اس نے تو مجھے خاندان بھر میں تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے دکھ اس کی شادی کا نہیں۔ ان الفاظ کا ہے بجن سے اس نے میری شخصیت کے پرچے اڑا دیے۔ وہ ماموں سے اتنا ڈرتا تھا، لیکن ماہم کے لیے ان کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے ماموں سے کہا ”آپ اپنی عام سی شکل و صورت کی بھانجی کو زبردستی میرے سر منڈھنا چاہتے ہیں، اس کے لیے آپ کوئی اور احمق ڈھونڈیں۔ مجھ سے کسی قربانی کی امید نہ رکھیے گا۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے ایک قطار کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے نچلے لب کو بے دردی سے کچل رہی تھی۔ اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ معید اس سے اور خضر سے کیوں چھپتا پھر رہا ہے۔
”اوہ مائی گاڈ!۔“ ارفع نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گھومتا ہوا سر تھاما۔ ”اور وہ جو ہمارے ساتھ مل کر شادی کی پلاننگ کرتا تھا، وہ بیڈ روم کی کلر اسکیم، وہ گھر کا نقشہ۔ وہ ہنی مون کے لیے اسکاٹ لینڈ جانے کے پروگرام۔۔۔“

”ڈرامے کرتا تھا۔ فلرٹ کر رہا تھا مجھ سے۔ اسے ہر وقت اپنی وجاہت کو سراہنے کے لیے کسی بے وقوف کی ضرورت تھی، جو اسے میری شکل میں مل گئی۔ اس کے جھمکے کا آفس کا سارا کام میں کرتی تھی اور

وہ عیاشیاں کرتا پھرتا تھا۔۔۔“ وہ بے آواز رو رہی تھی۔
”خضر کو بہت پہلے سے اس کی فطرت کا پتا تھا۔ وہ مجھے اکثر باتوں باتوں میں سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی شادی کا اسے بہت پہلے پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھے صدمے سے بچانا چاہتا تھا، لیکن جو ذلت آپ کی قسمت میں لکھی جا چکی ہو، اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ تم سوچ نہیں سکتیں، دہی میں پندرہ دن میں نے کیسے گزارے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت رک گیا ہو، لیکن وقت کتنا ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، ختم ہو جاتا ہے۔“ گردن جھکائے دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ بول رہی تھی جب کہ ارفع سانس لینا بھول گئی تھی۔
”خضر کو اس کی شادی کا پتا تھا، اس نے مجھے بھی نہیں بتایا۔؟“ ارفع کو ایک اور شاک لگا تھا۔

”وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے یار، وہ ہر اس چیز سے جو تمہیں دکھ دے، اس سے بچانا چاہتا ہے۔ وہ مجھے بھی بار بار کہہ رہا تھا، ارفع بہت اب سیٹ ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے بھی اسے منع کر دیا تھا۔“ اس نے فوراً صفائی دی۔

”بہت زیادتی کرتے ہو تم دونوں مجھ سے۔۔۔“ اس کا لہجہ نرم ہوا۔ ”تمہیں اس وقت میری ضرورت تھی یار! دکھ بانٹنے سے ختم تو نہیں ہوتا، لیکن اس کی تکلیف کی شدت ضرور کم ہو جاتی ہے۔“

”کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو بانٹنے سے بھی کم نہیں ہوتے۔ دل کسی طور بھی نہیں ٹھہکتا۔ بس ان کے لیے واحد مرہم وقت ہوتا ہے، وہ ہی اس کی شدت کو کم کرتا ہے، لیکن اپنی ذات کی بے وقعتی کا احساس کبھی بھی کم نہیں ہوتا۔ یہ دکھ بار بار سراٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“ وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ارفع کے دل کے اندر ایک گہرا سناٹا سا چھا گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج کے بعد ان تینوں کی گفتگو میں معید نامی شخص کا ذکر اب کبھی نہیں آئے گا۔ اس رات ڈنر میں پہلی دفعہ ایسا ہی ہوا تھا۔



میں تیری چھاؤں میں پروان چڑھوں

اپنی آنکھوں پہ تیرے ہاتھ کا سایہ کر کے تیرے ہمراہ میں سورج کی تمازت دیکھوں اس سے آگے نہیں سوچا دل نے پھر بھی احوال یہ ہے کہ اک بھروسا ہے کہ دل سبز کیے رکھتا ہے اک دھڑکا ہے کہ خون سرد کیے رکھتا ہے۔۔۔

خضر کا ایس ایم ایس پڑھ کر پہلی دفعہ اس کا دل ایک عجیب سی لے میں دھڑکا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنے ایک نئے پراجیکٹ کے سلسلے میں خاصی مصروف تھی۔ ریسرچ اور اسکرپٹ نے اسے کھن چکر بنا رکھا تھا۔ اور اسے خضر کی مصروفیات بھی ان دنوں خاصی بڑھ گئی تھیں۔ وہ صوفیہ بیگم کے ساتھ تیزاب سے متاثرہ خواتین کے پروگرام میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ صوفیہ بیگم نے بھی اسے اپنے کاموں میں لگا رکھا تھا۔ آتے جاتے اسے اس کشمیری لڑکی کی داستان سننے کو مل رہی تھی۔ صوفیہ بیگم اس کے معاملے میں حد درجہ پرجوش تھیں۔ وہ اس کے کزن کے خلاف کورٹ میں چلی گئی تھیں۔ ان ہی دنوں اسے ماہی آبی کے ہاں بیٹی کی پیدائش کی خبر ملی تو وہ فوراً ”کراچی چلی گئی۔ اس سے پہلے ان کا ایک بیٹا تھا۔ پندرہ دن وہاں قیام کے دوران بھی اس کا خضر سے رابطہ خاصا کم ہوا تھا۔ جب بھی فون پر بات ہوتی، پتا چلتا کہ وہ ماما کے ساتھ ہے۔ جس دن اس کی واپسی کی فلائٹ تھی اس دن اس کا کافی عرصے کے بعد میسج آیا تھا۔

”جان من! سنا ہے کہ آج شاہی سواری ہمارے شہر میں قدم رنجہ فرما رہی ہے۔ باقی تو سب کچھ ٹھیک ہے بس اپنے جہاز کو مارگلہ کی پہاڑیوں سے ذرا بچا کر رکھنا۔“

”بے فکر رہو! تم اتنے خوش قسمت نہیں ہو کہ میں اتنی جلدی تمہاری جان چھوڑ دوں۔“ اس نے بھی جوابی حملہ کیا تھا۔

”پورے چوبیس سال سے تمہیں بھگت رہے ہیں۔ کیا تم اپنی سلور جوبلی پر ہمیں خوش ہونے کا موقع

نہیں دوگی۔ وہ اس کی شرارت سمجھ کر ہنسی تھی۔
 ”کیا ہوا؟ کس کامیج ہے؟“ ماہی آپنی جو سامنے
 ہی بیٹھی اپنی بیٹی کے ناز حرے اٹھانے میں مصروف
 تھیں۔ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
 ”آپنی! خضر کامیج ہے، ایسے ہی تنگ کر رہا
 ہے۔“ اس نے صاف ٹالا تھا۔

”بھئی! کب تک تم دونوں میسج میسج کھیلتے رہو
 گے۔ میں نے تو ماما سے بھی کہا ہے کہ فوراً شادی
 کروں، اچھا خاصا لڑکا ہے۔ اکیلا خوب صورت اور
 پڑھا لکھا، صاحب جائیداد، آج کل کے حالات کا پتا
 تھوڑی چلتا ہے۔ لڑکیاں خود گلے کا پار بننے کو تیار پھرتی
 ہیں۔“ ماہی آپنی کی فکر مندی پر اسے ہنسی آگئی۔
 ”کیا ہو گیا ہے آپ کو، آپ نے بھی نتاشا کی طرح
 باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔“

”ہاں! تو اس بیچاری کے ساتھ کون سا اچھا ہوا ہے۔
 وہ بھی تو اس کے ماموں کا بیٹا تھا، کیا نام تھا بھلا اس کا۔“
 ماہی آپنی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر الجھن کا اظہار کیا۔
 ”عبدالمعید۔“ اس نے آپنی کی مشکل آسان
 کی۔

”ہاں ہاں! وہی، جو اکثر نتاشا کے ساتھ ہمارے گھر
 بھی آتا تھا۔ سارے جہان میں اس بے چاری کا اشتہار
 لگا کر اب اس فضول سی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے
 جس کا پہلا ہی ڈراما پٹ گیا ہے۔“ ماہی آپنی کو نتاشا
 کے حوالے سے اس پر سخت غصہ تھا۔ نتاشا کا بچپن
 سے ان کے گھر میں آنا جانا تھا، اس لیے پورے گھر کی
 اس کے ساتھ انسیت تھی۔

”آپنی! آپ خضر کو معید کے ساتھ ملا رہی ہیں۔“
 اس کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

”میری جان! یہ سارے مردانیں بیس کے فرق
 سے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔“ ماہی آپنی اپنی بیٹی کا
 ہمہ بردار ہوتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولیں۔

”خیر! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، ہمیشہ ایسا
 نہیں ہوتا۔“ اس نے فوراً اختلاف کیا۔

”اللہ نہ کرے کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا ہو۔ بس

ماما کو عفیوہ یا سارہ کی وجہ سے شادی لیٹ نہیں
 چاہیے۔ سارہ اب اتنی بھی تم سے بڑی نہیں۔ صرف
 دو سال کا فرق ہے۔ وہ ویسے بھی تم سے چھوٹی لگتی
 اور عفیوہ شادی کے لیے اٹلی سے ایک ہفتے کی پھرتی
 لے کر آ سکتی ہے۔“ ماہرہ آپنی نے بیٹھے بیٹھے سارہ
 مسئلہ چٹکی بجا کر حل کر دیا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں آپنی! یہ خالصتاً ماما
 ڈیپارٹمنٹ ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے
 جھٹکے۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنے سیل فون پر آنے والے
 میسج کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آپنی نے بھی اسے
 مصروف دیکھ کر مزید اس موضوع پر بات کرنا مناسب
 نہیں سمجھا تھا، لیکن انہوں نے دل ہی دل میں ماما سے
 دو ٹوک انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اسے کراچی سے آئے ہوئے بھی ایک ہفتہ ہوئے
 کو آگیا تھا، لیکن خضر اس کے ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔
 بری طرح تمللا رہی تھی جب اس دن نتاشا اس سے
 ملنے کے لیے آگئی۔

”تھینکس گاڈ! تم آگئیں، ورنہ اس خضر کے
 نے تو بہت تنگ کر رکھا ہے۔“ اسے گلے لگاتے ہوئے
 ارفع نے فوراً ہی خضر کی شکایت لگائی تھی۔
 ”ہاں! اس کا سارا وقت آج کل ہمز ہسپتال کے
 برن سینٹر میں گزر رہا ہے۔“ نتاشا نے ہنستے ہوئے اسے
 اطلاع دی۔

”برن سینٹر میں وہ کیوں۔۔۔؟“ اسے تعجب ہوا۔
 ”وہ ہی تمہاری ماما والا کیس۔۔۔ اس لڑکی کو وہیں رکھا
 ہوا ہے ناں! پچھلے دنوں ممی کافی بیمار رہی ہیں۔ ان کو بلکا
 سا انجانا کا مسئلہ ہوا تھا، اس لیے میرا زیادہ وقت ادھر
 ہی گزر رہا تھا۔ وہیں میں نے خضر کو اکثر دیکھا تھا۔“
 تفصیل سے بتا رہی تھی۔

”اوہ سو سیڈ، کیا ہوا آنٹی کو؟ تم نے مجھے بتایا ہی
 نہیں۔“ وہ پریشان ہوئی۔

”بس یار! پچھلے دنوں انہوں نے میری کافی ٹینشن

لی لی تھی۔ اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلتا ہی تھا۔“ وہ
 صاف گوئی سے بتا رہی تھی۔
 ”اب کیسی ہیں وہ؟“ ارفع نے فوراً پوچھا تو وہ بے
 دلی سے مسکرائی۔

”اب اللہ کا شکر ہے کہ کافی بہتر ہیں، لیکن شوگر
 کے مریض کی طبیعت خراب ہونے کا پتا تھوڑی چلتا
 ہے۔ خیر! تم سناؤ، ماہی آپنی کیسی تھیں اور ان کی گڑیا۔“
 نتاشا کی بات پر وہ اسے تفصیل سے بتانے لگی۔
 وہ پل بھر کو رکی ہی تھی کہ نتاشا نے فوراً سخت حیرت
 سے پوچھا۔

”تمہیں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو ہے اور
 خضر تم سے ملنے نہیں آیا؟“

”نہیں! بس دو تین دفعہ فون پر ہی بات ہوئی
 ہے۔“ ارفع نے اس سے بات کرتے ہوئے اپنے بیڈ
 روم کی کھڑکیوں کے پر دے ہٹائے۔ بڑا غضب کا موسم
 تھا۔ کالے سیاہ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔

”اف! ترس گئی تھی میں کراچی میں ایسے موسم کو۔“
 نتاشا بھی اٹھ کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی
 سامنے ہی لٹ گرین آسٹریلیئن گھاس والا لان ایسے
 لگ رہا تھا جیسے کسی نے زمرد کی چادر پھیلا دی ہو۔
 ارفع کے بنگلے کا لان خاصا خوبصورت تھا۔ سارہ اور ماما
 دونوں کو ہی باغبانی کو جنون تھا جس کا اندازہ ان کے لان
 کو دیکھ کر بخوبی ہو جاتا تھا۔

”لو! آگیا تمہارا مجنوں۔۔۔“ نتاشا نے خوش دلی سے
 کہا۔ وہ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے ادھر ہی آ رہا تھا۔
 بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ لائٹ بریل شرٹ پہنے وہ
 خاصا تروتازہ لگ رہا تھا۔ شیو بھی لگتا تھا کہ آج دل لگا
 کر کی تھی۔ ارفع کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی
 تھی۔ ٹھیک دو منٹ کے بعد وہ اوپر تھا۔

”خیال آگیا تمہیں میرا، کون سے ایسے خفیہ مشن
 میں مصروف تھے جو ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر میں
 آتے ہوئے مصیبت پڑ رہی تھی۔“ ارفع اسے دیکھتے
 ہی شروع ہو گئی تھی۔ وہ خجالت سے کان کھجانے لگا، پھر
 اگلے ہی لمحے وہ ان کے سامنے رکھی سفید کرسی پر بیٹھتے

ہوئے قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

”تمہیں تو پتا ہی ہے کہ تین دن سے سی این جی کی
 ہڑتال چل رہی ہے، غریب بندہ ہوں، سوچا کہ ذرا
 ہڑتال ختم ہو جائے پھر چلتا ہوں۔“ اس کی اداکاری
 عروج پر تھی۔

”کیوں ہسپتال میں تم کیا گاڑی کے بغیر بڑوں سے
 اڑ کر جاتے تھے؟“ نتاشا نے بھی اسے آڑے ہاتھوں
 لیا۔

”توبہ ہے! تم دونوں تو میرے خلاف اچھا خاصا محاذ
 بنا کر بیٹھی ہو۔ پتا ہوتا تو بلیٹ پروف جیکٹ پہن آتا۔
 افغانستان کے بعد کہیں اور پہننے کا موقع ہی نہیں ملا۔“
 ”جس طرح کے خوفناک موضوعات پر تم آج کل
 پروگرام کر رہے ہو، لگتا ہے کہ اسے پہننے کا موقع آنے
 ہی والا ہے۔“ ارفع اس کا ٹانگ شوا کر ڈیکھا کرتی تھی۔
 ”کوئی پروا نہیں۔ موت کا ایک دن معین ہے، پھر
 بندہ کیوں ڈرتا پھرے۔۔۔“ وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔

”تم آخر بڑی کہاں تھے؟“ ارفع کی سوئی وہیں انکی
 ہوئی تھی۔

”اسی ماما کے تیزاب والے کیس میں بڑی تھا وہ جو
 پلو شہ نامی لڑکی کے ساتھ ظلم ہوا ہے، یقین کرو! اسے
 دیکھ کر دل دکھ کے احساس سے بھر جاتا ہے۔ اس قدر
 معصوم سی لڑکی ہے جس کا واحد قصور اپنی خاندانی
 روایات کے برعکس گریجویشن کا ایگزیم دینا تھا۔ اس
 کے والد سارے خاندان سے ٹکر لے کر اپنی بیٹی کو پڑھا
 رہے تھے جس کا ان کے جیٹھ کے بچوں کو بہت رنج
 تھا۔ اوپر سے انہوں نے پلو شہ کے رشتے سے انکار کو
 اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور اس بیچاری کا سارا مستقبل ہی
 تباہ کر دیا۔“

”ایسے تو بے شمار کیسز موجود ہیں۔ ہم کس کس کا
 رونا روئیں۔۔۔“ نتاشا کچھ رخ ہوئی۔

”لیکن نتاشا! تم ذرا اس انیس سال کی لڑکی کو دیکھو،
 جس کے سامنے ایک پہاڑی زندگی پڑی ہے۔ اس کا
 قصور صرف تعلیم حاصل کرنا تھا۔ یار! یہ ظلم نہیں تو
 اور کیا ہے۔۔۔؟“ وہ حد درجہ جذباتی ہوا۔

”خضر حیات! ہم کس کس کی جنگ لڑیں گے؟ ہر کسی کو اپنے حصے کی جنگ خود لڑنا پڑتی ہے اور تھکن خود ہی برداشت کرنا ہے۔“ نتاشا کی لہجہ میں کمی نہیں آئی تھی۔

”ہم کسی ایک کو تو انصاف دلا سکتے ہیں ناں۔۔۔“ وہ بالکل بھی مایوس نہیں تھا۔ ”تم ذرا پلوشہ درانی کی سسکیاں سنو۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد اپنا چہرہ دیکھ کر منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخیں سنو تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں کم از کم بے حسی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ میں اسے ضرور انصاف دلاؤں گا۔“ اس کے چہرے سے جھلکتا غم ان دونوں کو حیران کر گیا۔

”لیکن ذرا دھیان سے۔ اس کو انصاف دلانے کے چکروں میں کہیں اس کے ساتھ مزید بے انصافی نہ کر جانا۔“ نتاشا استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ وہ بری طرح الجھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس کے اوپر یہ غیر انسانی سلوک کرنے والے درندے چین سے تھوڑی بیٹھیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم انجانے میں اسے مزید مشکل میں ڈال دو۔“ نتاشا نے وضاحت دی۔

”نہیں! اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہم لوگ اسے باہر بھجوا رہے ہیں۔“ اس کے انکشاف پر وہ دونوں چونکیں۔

”یہ ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ نتاشا نے اسے غور سے دیکھا۔

”میں اور ماما۔۔۔ وہ سادگی سے بتا رہا تھا۔

”اللہ ہی خیر کرے۔۔۔“ نتاشا کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”آئی اتنی شارب خاتون تو نہیں ہیں جو ان چکروں میں پڑ رہی ہیں۔ دھیان رکھنا ارفع! اپنی ماما اور ان کے میاں کے نتیجے کا۔“ اس کے انداز کی کڑواہٹ میں ہلکی سی شرارت بھی شامل ہو گئی تھی۔

”تم جب بھی سوچنا منہ ہی سوچنا۔ مانا کہ تمہارا بلڈ گروپ نیگٹیو ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ تمہارا رویہ بھی منفی ہو جائے۔“ خضر شاید برامان

گیا تھا تب ہی وہ کچھ سنجیدہ ہو کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا جو ابھی ابھی ملازمہ وہاں رکھ کر گئی تھی۔ نتاشا کے چہرے پر بڑی سرعت سے ایک تاریک سایہ دوڑا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے خضر! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نتاشا جسٹ مذاق کر رہی ہے۔ تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو؟ ارفع کی گلابی رنگت سرخی مائل ہو رہی تھی۔ خضر اور نتاشا دونوں نے ہی اپنی اپنی جگہ خود کو سنبھالا تھا۔

”اُس اوکے ارفع! مجھے معلوم ہے کہ خضر بھی مذاق ہی کر رہا ہے۔ تم کیوں اتنی حساس ہو رہی ہو۔“ نتاشا نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

”آئی ایم سوری! اگر تم دونوں ہرٹ ہوئی ہو۔۔۔“ خضر کا لہجہ پتا نہیں کیوں دونوں ہی کو کچھ سپاٹ سا لگا تھا۔ وہ چائے کا گلاس اٹھا کر ٹیرس کی گرل کے پاس پہنچ گیا۔ کالے بادلوں میں۔ ایک ارتعاش سا رہا ہوا تھا۔

ہوا جو اپنے دامن میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھر کر لائی تھی اب اسے حاتم طائی کی طرح لٹا رہی تھی۔ ایک دم سے ہی سرمئی اندھیرا پھیلا اور ساتھ ہی بارش نے ہر طرف جل جھل کر دیا۔ تیز ہوا کے جھونکے بارش کی بوندوں کو سمیٹے ٹیرس کے فرش کو بھی گیلایے جا رہے تھے ان لوگوں نے اپنی کرسیاں کچھ اور پیچھے کر لی تھیں۔

”بارش کبھی کبھی اداسی کے ساتھ ساتھ عجیب سی وحشت بھی لے آتی ہے۔“ ماما نے کہا۔ نتاشا کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ارفع نے بے اختیار ہی اس سے نظر جرائی تھی۔ جبکہ خضر پلٹ کر اس کی طرف آیا۔ اس کی پرپل شرٹ اچھی خاصی بھیک چکی تھی۔ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”نتاشا ہدانی! جس دن تم اپنے آپ کو یہ سمجھا لو گے کہ زندگی جیسی قیمتی چیز صرف ایک شخص کے پیچھے خراب نہیں کی جاتی، اس دن تمہیں موسموں سے وحشت اور اداسی محسوس نہیں ہوگی۔“ نتاشا نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا ایسے جیسے کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہی ہو۔ باہر برستی بارش کے شور میں ایک

دم ہی اضافہ ہوا تھا۔

”وہ صرف ایک شخص ہی نہیں تھا، میں نے اس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی خضر!“ اس کے لہجے میں اعتراف جرم کی سی کیفیت تھی۔

”کیا فائدہ ایسی محبت کا جو انسان کو توڑ کر رکھ دے۔ جذبات زندگی کے لیے ضروری ہیں، لیکن پوری زندگی پر ان کو حاوی کر لینا اپنی ذات کے ساتھ سخت نا انصافی ہے۔ تم کتنے دن تک اس ایک طرفہ محبت کا سوگ مناؤ گی؟ نکل آؤ اس یو ٹیوٹا سے۔ مجھے یقین ہے، اسی ٹیرس پر اسی کرسی پر بیٹھ کر تم کبھی کوئی کہ معبود سے محبت تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔ اسی جگہ پر بیٹھ کر تم کسی اور کے گن گاؤ گی، کیونکہ جہاں سے شاخ ٹوٹتی ہے وہیں سے دوسری نکلتی ہے، یہ قانون فطرت ہے۔“ وہ بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

”مجھے کیسے کسی دوسرے شخص سے محبت ہو سکتی ہے؟“ وہ سخت بے یقین تھی۔

”کیوں نہیں ہو سکتی؟ محبت ایک بار نہیں بار بار ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم ساری زندگی ایک ہی شخص کی یادوں کا خیمہ تان کر دنیا سے کٹ نہ جائیں۔ انسان بہت عجیب ہے۔ وہ جینے کے لیے سوچنا نہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔“ وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کر رہا تھا۔ نتاشا نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے بمشکل مسکرا رہا تھا۔

”کیا تمہیں ارفع کے علاوہ کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟“ اس نے ایک دم ہی بہت عجیب سوال کیا تھا۔

بادل زور سے گر جا تھا۔ ارفع اور نتاشا نے سخت حیرت سے انتہائی بے تکی انداز میں ہنستے ہوئے خضر کو دیکھا۔ وہپاگلوں کی طرح ہنسنے جا رہا تھا۔

دونوں کو بہت عجیب احساس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی ایک مقام پر آکر ٹھہری گئی تھی۔ ساون کی بارشوں نے عجیب دھوپ چھاؤں والا موسم کر رکھا تھا۔

وہ آج کل کچھ اکتائی سی پھر رہی تھی۔ نئے پراجیکٹ کو کرنے میں بھی مزا نہیں آ رہا تھا اور اسے نتاشا ایک دفعہ پھر اچانک دینی چلی گئی تھی، لیکن اس دفعہ وہ بتا کر گئی تھی کہ آفس کے کام سے گئی ہے۔ ماما کی مصروفیات کا دائرہ بھی بڑھ گیا تھا اور سارہ بھی اپنی ایک اور ایگزیکشن میں مصروف تھی۔ اس دن وہ بڑے اکتاہٹ بھرے انداز سے اپنے اسٹوڈیو سے نکلی اور سیدھی گھر پہنچی تو سارہ نیک مسک سے تیار گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

”یہ تمہارے منہ پر کیوں بارہ بجے ہوئے ہیں؟“ اس نے ایک دم ہی اس کی بے زاری کو محسوس کیا تھا۔

”کچھ نہیں یار! بوریت ہو رہی تھی۔ سوچ رہی ہوں کہ خضر کی طرف چکر لگا لوں۔ تم اگر باہر جا رہی ہو تو پلینز مجھے ڈراپ کر دو۔“

”وہ تو میں ڈراپ کر دوں گی، لیکن ذرا خضر کے کان میری طرف سے کھینچنا کہ کون سی آفت آگئی تھی جو اس نے اچانک ہی اپنا ٹاک شو ختم کر دیا۔“ سارہ کو ایک دم ہی یاد آیا تھا۔

”خضر نے ٹاک شو ختم کر دیا۔ کب؟“ سارہ کی بات بے ساختہ کاٹتے ہوئے اس کی آواز بلند ہوئی۔

سارہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیوں، تمہیں نہیں بتایا اس نے؟“

”نہیں! مجھ سے تو کئی دن سے اس کی بات ہی نہیں ہو پائی۔ کچھ میں مصروف تھی اور کچھ وہ۔۔۔“ ارفع نے مضطرب انداز میں بتایا۔ ”لیکن تمہیں کس نے بتایا؟“

”مجھے تو پیرسوں رات ماہرہ آبی نے کال کر کے بتایا تھا، بلکہ وہ سخت خفا ہو رہی تھیں کہ اتنی اچھی ریشنگ تھی اس کے پروگرام کی اور اس نے بیچ میں ہی چھوڑ دیا۔ چینل والے اگلے ہی دن نیا بندہ لے آئے۔ سب کو پتا تھا کہ وہ ماما کی آپنی کا کزن ہے اس لیے میڈیا کے لوگوں کو ان سے ہی پوچھنا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ میں نے کہا ارفع کو پتا ہو گا۔“ سارہ نے اس کے ساتھ چلتے چلتے وضاحت دی۔ وہ ایک دفعہ پھر الجھن بھرے

ماہنامہ شعاع

131 اکتوبر 2012

انداز میں ارفع کو دیکھ رہی تھی۔
 ”تمہاری خضر کے ساتھ آج کل کوئی لڑائی وغیرہ تو نہیں چل رہی؟“ وہ فوراً ”مشکوٰۃ“ ہوئی۔
 ”ہرگز نہیں۔۔۔“ اس نے فوراً ”تردید کی۔“
 ”اچھا! پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے تمہیں نہ بتائے؟“ اس کی الجھن میں اب پریشانی کا اضافہ ہوا تھا۔ ”خیر! اب جا رہی ہو تو پوچھ لینا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بتانے کے لیے وقت نہ ملا ہو۔“
 سارہ اب ارفع سے زیادہ خود کو مطمئن کر رہی تھی۔
 ”مجھے بتانے کا وقت نہ ملا ہو۔۔۔؟“ ارفع اس بات پر سوچنا نہیں چاہ رہی تھی، لیکن ذہن اسی ایک بات کے علاوہ کچھ بھی سوچنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سوچوں میں گم خضر کے فلیٹ تک آگئی اور اسے پتا نہیں چلا۔ سارہ نے پہلے ہی اس سے معذرت کر لی تھی، کیونکہ اس کی کوئی میٹنگ بھی جہاں اس کا وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے اسے یقین تھا کہ وہ گھر ہی میں ہو گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ ارفع نے ایک ہی نظر میں محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ نہیں اچھا خاصا تھکا تھا سا ہے۔ شیو بھی لگتا تھا کہ کئی دن سے نہیں بنائی تھی۔

”یہ تم نے اپنا جلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ ارفع نے نرم انداز میں پوچھا، حالانکہ اس کا مزاج پچھلے ایک گھنٹے سے خاصا جارحانہ تھا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا تھا۔

”ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ بس پچھلے کچھ دن سے کچھ طبیعت ڈانواں ڈول رہی تھی، اس لیے کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کر رہا۔“ وہ لی وی لاؤنج کے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”کہاں مصوف تھے پچھلے دنوں؟“ وہ سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کا چہرہ کھوج رہی تھی۔

”کہاں مصوف ہونا ہے یار، وہ ہی روٹین کے کام اور دنیا کے بکھیرے۔۔۔“ وہ سستی سے جمائیاں لے رہا تھا۔ ارفع کو اپنا سارا ضبط فضا میں تحلیل ہوتا محسوس

ہوا تھا۔

”اب کون سی مصوفیت ہے؟ اپنا پروگرام تو تم چھوڑ چکے ہو، پھر بھی اتنے مصوف ہو کہ تمہیں کسی کو یہ اطلاع دینے کی بھی فرصت نہیں۔۔۔؟“ وہ ترخ کر بولی۔ خضر کا جمائی کے لیے اٹھا ہاتھ فضا میں ہی جلد ہو گیا۔ وہ لمحے بھر کو چونکا اور بڑی تیزی سے اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”مجھے تمہیں بتانا تھا، لیکن۔۔۔“

”فار گاڈ سیک خضر! اب یہ مت کہنا کہ تمہارے ہرٹ ہونے کے خیال سے نہیں بتایا تھا اور یہ کہ تم مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

”تم مجھے ایسے فضول قسم کے ڈرامے کر کے پریشانی سے مت بچایا کرو، میں کوئی بچی نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور سیارے پر بستی ہوں جو مجھے تمہاری پریشانیوں کی اطلاع نہ پہنچے۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

خضر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ لیک کر اٹھا اور اس کے بالکل سامنے کاریٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”میں تمہیں قتل کر دوں گا، اگر تم نے ایک بھی آنسو اور نکالا۔“ اس کے اس والہانہ انداز اور ہاتھوں کی گرمی سے اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلی دفعہ اس کے سامنے روئی تھی۔ وہ اسے دنیا کی مضبوط ترین لڑکی سمجھتا تھا۔ اس کا یہ دعوا آج غلط ہو گیا تھا۔

”تم بہت عجیب ہو گئے ہو خضر! مجھے نہیں معلوم کیسے؟“ لیکن مجھے اس کی وضاحت کرنا نہیں آرہی۔۔۔“ اس کے بچکانہ انداز پر خضر کے چہرے پر ایک معدوم سی مسکراہٹ ابھری۔

”کیوں میرے سر پر سینگ آگ آئے ہیں کیا؟“ وہ دانستہ غیر سنجیدہ ہوا۔

”کاش سینگ ہی نکل آتے۔ کچھ کنفیوژن تو دور

ہوتی۔۔۔“ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

”کیا کنفیوژن ہے، مجھے بتاؤ! میں کلیئر کرتا ہوں۔“

”تم مجھ سے باتیں چھپانے کیوں لگے ہو؟“ ارفع کی بات پر اس نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

”یار! ایسا کچھ نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بس میرا پروڈیو سر سے کچھ نظریاتی اختلاف ہو گیا تھا۔ بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ میں اس کا ایگری منٹ اس کے منہ پر مار آیا پتا تو ہے کہ کتنا جلالی خون ہے میرا۔ غصہ سال میں ایک دو دفعہ ہی آتا ہے، لیکن جب آتا ہے سامنے والے کے کڑا کے نکال دیتا ہے۔“

”تو یہ بات تم مجھے بتا نہیں سکتے تھے؟“ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ رونے کے بعد اس کی آنکھوں میں ایک دلکشی سی اتر آئی تھی۔ خضر نے بمشکل اس سے نظریں ہٹائی تھیں۔

”تم نے میری ٹھیک ٹھاک کلاس جو لینی تھی۔ خیر! وہ تو اب بھی لے ہی رہی ہو۔ میری ایک اور جگہ بات چیت چل رہی ہے، امید ہے کہ دو چار دن میں فائنل ہو جائے گی، پھر دیکھنا میں ان پینل والوں کے کیسے چھکے چھڑاتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر کچن سے دو گلاس لے آیا۔ فرق سے کولڈ ڈرنک نکالی اور اسے اب گلاسوں میں انڈیل رہا تھا۔ ارفع نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

”یہ تم نے میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک کب سے کرنا شروع کر دیا ہے؟ پہلی دفعہ ایسے لگا ہے کہ میں ”تمہارے“ گھر آئی ہوں۔“ وہ آج ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی تھی۔

”تم نے بھی تو میرے سامنے بزدل اور جذباتی خواتین والے ڈرامے شروع کر دیے ہیں۔ آج پہلی دفعہ ہی تو تم میرے سامنے روئی ہو۔“ جواب میں وہ اسے چھیڑنے لگا۔

”تم نے بھی تو عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دی ہیں، پیکل مرووں والی۔۔۔“ وہ کون سا کسی سے کم تھی۔ اچانک اس کی نظر میز پر رکھے خواتین کے ناولز

کے ایک بنڈل پر پڑی۔ اسے سخت حیرت ہوئی۔ ”یہ تم نے خواتین کے ڈائجسٹ اور ناول کب سے پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟“ اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ہلکا سا چونکا۔

”یہ میرے ایک دوست نے منگوائے تھے یار! ورنہ مجھے ان چیزوں میں کہاں دلچسپی ہے۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ ”یہ نتاشا کے آج کل کچھ زیادہ ہی دبی کے چکر نہیں لگ رہے۔۔۔؟“ اس نے اچانک بات ہی بدل دی۔

”ہاں! کہہ رہی تھی کہ آفس کا کچھ کام ہے۔ وہ لوگ وہاں اپنا کوئی آفس بنا رہے ہیں۔“ اس نے فوراً بتایا۔

”اچھا! مجھے بھی کچھ دنوں کے لیے انگلینڈ جانا ہے۔ بابا کی برابری کا کچھ مسئلہ ہے۔ سوچا ہے کہ اس دفعہ جا کر سیل ہی کر آؤں۔۔۔“

”اچھا! کب جا رہے ہو۔۔۔؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”شاید اگلے ہفتے۔۔۔“ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی کسی سوچ میں گم ہوا تھا۔

”میں بھی ساتھ چلوں؟“

”کیا۔۔۔؟“ خضر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کیوں۔۔۔؟“ پھر وہ ایک دم سے پریشان ہوا تھا۔

”یار! مذاق کر رہی ہوں۔۔۔“ وہ ہنسی تو خضر کے

چہرے پر سکون کا بڑا واضح تاثر ابھرا تھا۔

”تھینکس گاڈ! ورنہ میں کس کس کو وضاحتیں دیتا پھرتا کہ یہ لڑکیوں میرا دم چھلا بی ہوئی ہے۔“ وہ

اسے پھر تنگ کر رہا تھا۔ ارفع آج کافی دن کے بعد

پر سکون ہوئی تھی۔

خضر انگلینڈ چلا گیا اور نتاشا دبی سے واپس آگئی۔ اس دفعہ اس میں بہت مثبت تبدیلی آئی تھی۔ وہ خلاف توقع بہت خوش تھی۔ ارفع اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن نتاشا کچھ مصروف تھی اور بہت جلد ہی اس کی

مصروفیت کا راز کھل گیا تھا۔

وہ اس دن اس کے اسٹوڈیو میں ہنسی مسکراتی اور کھلکھلاتی ہوئی آئی تھی۔ اس نے اپنا ہیرا سائل بھی تبدیل کر لیا تھا جو اس پر بہت بیچ رہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی ملاحیت اور کشش تھی۔ ارفع کچھ لمحوں کے لیے بے اختیار اسے دیکھے گئی۔

”یہ دیکھو! کیا ہے؟“ وہ دوری سے ایک سنہری کارڈ لہراتے ہوئے آ رہی تھی۔

”کون سی لائبریری نکل آئی ہے جو ایسے جھنڈے کی طرح لہراتی آ رہی ہو۔“ ارفع نے اس بے اختیار گلے لگاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”یار! آپس کی بات ہے سارا خاندان یہی کہہ رہا ہے کہ نتاشا کی لائبریری نکل آئی ہے۔“ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی جوت اور بائیں گال پر پڑنے والا ڈمپل آج اسے کچھ خاص بنا رہا تھا۔ نتاشا نے ہاتھ میں بکرا سنہری کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”تمہاری شادی کا کارڈ ہے کیا۔۔۔؟“ ارفع نے سو فیصد درست اندازہ لگایا تھا۔ اسے ایک فطری سی مسرت کا احساس ہوا اس نے فوراً ”بے تابی سے کارڈ کھولا۔

”یہ منصور احمد کون ہے؟“ ارفع نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا۔ نتاشا آج کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

”خضر بالکل ٹھیک کہتا تھا کہ جہاں سے شاخ ٹوٹتی ہے وہیں سے پھر پھوٹتی ہے جان من۔۔۔“

”تم ان شاخوں اور درختوں کو چھوڑو مجھے بس اتنا بتاؤ کہ یہ منصور صاحب کہاں سے ٹپکے ہیں اور کیا حدود اربعہ ہے ان کا؟“ ارفع کو شدید بے چینی ہو رہی تھی۔

بھابھی کا فرسٹ کزن ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں جاب کرتا ہے۔ سی اے کیا ہوا ہے۔ وہ جھینٹے ہوئے بتا رہی تھی۔

”مجھے اصل بات بتاؤ کہ تمہیں کہاں ملا؟ اب خدا کے واسطے یہ مت کہنا“ ارفع میرج ہے۔“ ارفع نے

اسے دھمکی دی۔

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ اریخ میرج ہے۔۔۔“

لاست ٹائم جب معید کا سوگ منانے دینی گئی تھی یہ بھی بھابھی کی طرف آیا ہوا تھا۔ ان دنوں میں اپنے غم میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ میرے اندر گہرائیاں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اس کے بعد یہ بہانے سے پاکستان بھی آیا تب ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے جھٹ پروپوز کر دیا۔

میں نے بھی سوچا، پہلی دفعہ کوئی ہینڈ سم بندہ میری بھی منتیں کر رہا ہے۔ مان ہی جاتی ہوں اس سے پہلے کہ بھاگ جائے۔ وہ اپنے پرانے انداز سے مزے لے لے کرتا رہی تھی۔

”شرم تو نہ آئی میرے بغیر منگنی کرواتے ہوئے۔“ ارفع نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

”لوجی! تم سب کو انوائٹ کرنے کے چکروں میں پڑتی تو اتنی دیر میں بندہ ہی مکر جاتا۔ ناں بابا ناں! اس دفعہ بکے کام کروائے ہیں۔ منگنی کے بجائے نکاح کروایا ہے۔ رخصتی اب پندرہ دن بعد ہے۔“ اس کے انکشاف پر ارفع کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کوئی اور کارپٹ بمباری رہتی ہے تو وہ بھی کر دو۔“ ارفع خفا ہوئی۔

”وہ بمباری یہ ہے جناب! کہ معید صاحب کی بیگم نے خلع کے لیے مقدمہ کر رکھا ہے۔ دونوں کی تین ماہ بھی نہیں چل سکی سو معید بدھو لوٹ کے گھر آچکے ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ ارفع نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”وہ تمہارے نکاح پر آیا تھا کیا؟“ اس کے منہ سے پھسلا

”جی جناب! یہ دیکھنے آیا تھا کہ اس کے والد صاحب کی عام سی شکل و صورت کی حامل بھانجی کا نکاح کس احمق سے ہو رہا ہے، لیکن اسے اس احمق کو دیکھ کر اور اس کی کوالیفیکیشن کا سن کر خاصا شاک لگا تھا۔ اس لیے بمشکل بیس منٹ ہی بیٹھا تھا۔“ وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

”اب مجھے یقین آیا ہے کہ اگر آپ کی قسمت

اچھی ہو تو زندگی خود بخود خوب صورت ہو جاتی ہے ورنہ میں نے پچھلے دنوں کچھ خوب صورت لوگوں کو بھی قسمت کے آگے رلتے دیکھا ہے۔“

”تھینکس گاڈ! تمہیں یہ بات سمجھ میں آئی ورنہ میں اور خضر تو ہمیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔“ ارفع نے بھی اس کے خیالات میں مثبت تبدیلی پر شکر ادا کیا تھا۔

”یہ خضر کب انگلینڈ سے واپس آئے گا؟ اب تم لوگ بھی فوراً شادی کر لو، گھر تو اس کا تقریباً بن چکا ہے۔“

”ہاں! یاما بھی یہ ہی کہہ رہی ہیں۔ سارہ کا پریوزل بھی فائنل ہو گیا پچھلے ماہ۔۔۔ اس کے سسرال والے بھی بہت اصرار کر رہے ہیں اس لیے ان شاء اللہ بہت جلد۔“ ارفع نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بھی تم لوگوں کی شادی انیڈ کر کے ہی جاؤں گی۔ بار بار آنا کون سا آسان کام ہے۔“

”تمہیں کس چیز کا مسئلہ ہے، سوئس بینکوں والے تو ویسے بھی امیر کبیر لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کا آدھا پیسہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ تمہارے میاں کو بھی خوب خواہ دیتے ہوں گے۔ آرام سے آئی جاتی رہنا۔“

ارفع نے اسے چھیڑا تو وہ ایک دفعہ پھر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے دمک رہے تھے۔ ارفع سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ واقعی خوش تھی یا خوش نظر آنے کی اداکاری کر رہی تھی۔ اگر یہ اداکاری تھی تو لا جواب تھی۔

وہ بہار کی ایک قرمزی شام تھی۔ جب وہ نتاشا کو اس کی شادی کی شاپنگ کروا کر ٹھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نتاشا پتا نہیں کیوں اپنی شاپنگ کے سلسلے میں اتنی حساس ہو رہی تھی یا پھر ساری ہی لڑکیاں اپنی شادی کے سلسلے میں اتنی ہی حساس ہو جاتی ہیں۔ بہت مشکل سے آج اس کی شادی کے جوڑے کا کام نبھایا تھا۔ ارفع کا بازو اوروں میں گھوم گھوم کر پورا بدن ٹوٹ رہا

تھا۔ ماہرہ آپنی کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کو بھی وقت نہیں دے پا رہی تھی۔ ذہنی اور جسمانی ٹھکن کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس وقت خلاف معمول صوفیہ بیگم سارہ اور ماہرہ آپنی کولائونج میں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ایک لمحے میں اس نے ناخوشگوار فضا کو محسوس کیا تھا۔ وہ سب کو سلام کر کے سامنے صوفے پر بیٹھی تو صوفیہ بیگم نے خاصے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

”ارفع! تمہاری آخری دفعہ خضر سے کب بات ہوئی تھی؟“ وہ اندازہ نہیں کر پائی کہ صوفیہ بیگم کے انداز میں اجنبیت زیادہ ہے یا روکھاپن۔

”میری اس سے فون پر بات تو ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی جبکہ اسکاٹ پر برسوں۔“ وہ ان کے اس انداز پر الجھ گئی۔ ”کیوں خیریت۔۔۔؟“

”اس وقت کہاں تھا وہ۔۔۔؟“ وہ عجیب کسوٹی کھیل رہی تھیں۔

”لندن میں۔۔۔“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”اس نے تمہیں کیا بتایا کہ وہ پاکستان کب آئے گا؟“ صوفیہ بیگم کا چہرہ سپاٹ اور انداز بھی حیران کن حد تک روکھاپن لیے ہوئے تھا۔ وہ کچھ تشویش کا شکار ہوئی۔

”اس نے یہ ہی کہا تھا کہ وہ چیزوں کو وائینڈ اپ کر رہا ہے۔ کچھ ٹائم لگے گا۔ یہ ہی کوئی ایک یا ڈیڑھ ماہ۔۔۔“

اس نے حیرت سے جواب دیا، پھر جھنجھلا کر پوچھا۔ ”ماما! کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں ہوا، کیا اس نے تم سے کوئی ذکر کیا تھا کہ وہ اٹلی جائے گا۔۔۔؟“ صوفیہ بیگم کا لہجہ گہری کھوج لیے ہوئے تھا۔ ارفع نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کیا اس نے تمہیں برسوں انٹرنیٹ پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس وقت اٹلی میں ہے؟“

”کیا مطلب؟ خضر اٹلی میں ہے؟“ اس نے سخت حیرت، تعجب اور بے یقینی سے صوفیہ بیگم کا چہرہ دیکھا۔

کمرے میں ایک بو جھل سانسنا بہت تیزی سے پھیلا

تھا۔ صوفیہ بیگم کو اس کے سوال میں اپنا جواب مل گیا تھا۔

”وہ اٹلی کیا کرنے گیا ہے؟ مجھے تو اس نے ایسا کچھ نہیں بتایا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچانک پروگرام بن گیا ہو۔ آپ کو کیا عفیوہ آپنی نے بتایا ہے؟“ اس کا پہلا دھیان فوراً اپنی وہاں مقیم بہن کی طرف گیا تھا۔ اگر خضر وہاں گیا تھا تو اس نے یقیناً قیام بھی وہیں کیا ہو گا۔ ”مجھے عفیوہ نے نہیں بتایا۔“ صوفیہ بیگم نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ”وہ عفیوہ کے گھر نہیں ٹھہرا۔ اس کو تو عفیوہ نے اچانک مارکیٹ میں دیکھا تھا اسے وہاں پہنچے پورے پانچ دن ہو چکے تھے۔ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔“ صوفیہ بیگم نے ایک اور ہم اس کے سر پر پھوڑا تھا۔ وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔

”اما! آپ اس سے دو ٹوک انداز میں بات کریں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ چھ ماہ پہلے تو اس نے مجھے فون کر کر کے سر کھایا ہوا تھا کہ اما سارہ سے پہلے ان کی شادی کیوں نہیں کرتیں۔ اب جب کہ گھر بھی مکمل ہو چکا ہے تو وہ کیوں شادی کی ڈیٹ مزید آگے چھ ماہ تک بڑھانا چاہتا ہے۔“ ماہی آپنی کی بات پر ارفع کو شک لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے ان کا تہا ہوا چہرہ دیکھا۔

”مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھ سے تو وہ بات ہی نہیں کر رہا۔ اس نے عفیوہ کو یہ پیغام دیا ہے، کیونکہ میں نے عفیوہ سے کہا تھا کہ اسے بتا دو کہ سارہ کے سسرال والے اگلے ماہ شادی کا کہہ رہے ہیں۔ اس نے آگے سے عجیب ہی بات کر دی۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسا کہے گا۔ میں نے عفیوہ سے کہا ہے کہ اس سے دوبارہ بات کرے۔“ صوفیہ بیگم کی بات پر ایک سردی لہر ارفع کے وجود میں دوڑی۔

”لیکن وہ آخر اٹلی کرنے کیا گیا ہے؟ اور وہ بھی کسی کو بتائے بغیر۔ پھر وہاں پہنچ کر اس نے عفیوہ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ یہ بات کم از کم مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔“ ماہرہ آپنی کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ ”ایسی صورت میں جب وہ عفیوہ کے سامنے بھی آئیں بائیں شائیں کر رہا تھا۔ عفی نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ

بڑی ہی عجیب حرکتیں کر رہا تھا اور اس کے باوجود اصرار کے وہ ان کے گھر ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوا۔“

”کم آن آپنی! کیوں ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی ہیں؟ اور سے عفی آپنی بھی آپ کی طرح وہی ہیں۔ ہو گا اس کا کوئی کام۔ آجائے گا تو پوچھ لیجئے گا۔“ سارہ نے ارفع کے تاریک ہوتے چہرے کو دیکھ کر بے زاری سے کہا۔ ارفع خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے ناگ کی طرح سر اٹھا رہے تھے۔ خضر اسے کچھ عرصے سے قدم پر چونکا رہا تھا۔

”میں پاکستان آ گیا ہوں اور تم سے ملنا چاہتا ہوں کیا تم میرے فلیٹ پر آ سکتی ہو؟“ دو دن بعد ہی خضر کی کال پر وہ اڑتے ہوئے اس کے فلیٹ پہنچی تھی۔ وہ خاصا ٹھکا تھا کسا لگ رہا تھا۔ اس کا بڑا سا سیاہ بریف کیس بھی ٹی وی لائونج میں پڑا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی پہنچا تھا۔ اس کے فلیٹ کی چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک مہینہ اور چھ دن بعد آیا تھا۔ اسے دیکھ کر آج پہلی دفعہ ارفع کو اپنی سانسیں بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ بہت غصے میں آئی تھی لیکن اسے دیکھ کر اس کا سارا غصہ اس کے اندر ہی کہیں منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ وہ دینر قالین پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی بالکل اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ سیاہ سوٹ میں اس کی دلکشی ہمیشہ بڑھ جاتی تھی، لیکن آج اس دلکشی میں اداسی، بے چینی اور اضطراب بھی جھلک رہا تھا۔

”پلیز! مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ میں اٹلی کیوں گیا تھا، کیونکہ مجھے خود معلوم نہیں، میں وہاں کیا کرنے گیا تھا۔ میں وہاں سے آ گیا ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے وجود کا ایک حصہ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔“ خضر کے لہجے میں کچھ تھا جو ارفع کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سخت حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ غیر ارادی طور پر اس کے سامنے پڑے صوفے پر اضطرابی انداز میں بیٹھ گئی۔

”مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے کروں؟“ ارفع کو وہ بری طرح الجھا ہوا لگا تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟ کیسے کروں۔۔۔؟ ویسے ہی کرو، جیسے تم کرتے آئے ہو۔“ ارفع نے اس کا تقرر اور پریشانی میں ڈوبا چہرہ غور سے دیکھا۔ اسے اپنے اندر بے چینی کی شدید لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

”میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا ارفع!“ اس نے حلق میں اٹکے گولے کو بمشکل نکتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

”میں اب تک بہت زیادہ ہرٹ ہو چکی ہوں خضر! تم وہ بات کرو جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔“ ارفع نے وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ارفع! ہم انسان بہت سادہ اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ ہم بہت آگے کی پلاننگ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر ایک ذات ہے جو سب سے بڑی پلان میکر ہے۔ وہ ذات ”کن“ کہتی ہے اور بہت کچھ عدم سے وجود میں آ جاتا ہے۔ آج سے تین ماہ پہلے میری زندگی بھی بہت ہموار تھی، لیکن پھر اس میں ارتعاش برپا ہو گیا۔“ ارفع نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔

”بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں بہت دن سے سب سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ یقین مانو ارفع! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ ہو سکتا ہے میرا قصور ہو بھی، اوپر والی ذات بہتر جانتی ہے۔“ وہ کچھ چپ ہوا۔ خوف اور اضطراب ارفع کے وجود میں خون کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے بے ربط باتیں کرتے خضر کو خوفزدہ انداز میں دیکھا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو خضر؟“ ارفع نے خود کو کسی دلدل میں گرتا ہوا محسوس کیا تھا۔

”دیکھو ارفع! تم بہت خوب صورت، حسین اور زندگی سے بھرپور لڑکی ہو۔ تمہارا ساتھ کسی بھی شخص کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہو سکتا ہے۔“

تین ماہ پہلے تک میں بھی خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا۔۔۔“ خضر کی بات پر ارفع نے لفظ ”تھا“ کو بہت غور سے سنا۔ اسے ایسے لگا، جیسے کمرے کی دیواریں اس کے اوپر اچانک ہی سے آن گری ہوں۔

”مجھے تم سے بہت محبت تھی۔“ خضر کی بات پر وہ سانس لینا بھولی۔

”مجھے آج بھی تم سے محبت ہے۔“ ارفع کو ایسے لگا کسی نے چند سائیس اسے مستعار دے دی ہوں۔

”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زندگی میں تمہاری موجودگی میں بھی کوئی آ سکتا ہے اور یہ کہ زندگی مجھے ایک عجیب و غریب دوراہے پر لے آئے گی۔“ ارفع کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کا لہجہ زیادہ عجیب ہے یا بات۔

”کون ہے وہ؟“ ارفع نے بمشکل سانس لی۔ کمرے میں گھٹن کا احساس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔

”وہ مجھے جب پہلی دفعہ ملی تو میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے جلے ہوئے چہرے پر دوسری نگاہ ڈال سکوں۔“ خضر نے اپنے تھیلے کو ایک دم ہی الٹ دیا تھا۔

”اس کا آدھا چہرہ بری طرح جلا ہوا تھا اور باقی آدھے چہرے سے ساری دنیا اندازہ لگا سکتی ہے کہ وہ زندگی کی رعنائیوں اور دلکشی سے بھرپور ایک لڑکی تھی۔ اسے ایک ناکردہ گناہ کی سزا ملی۔ وہ انیس سال کی معصوم لڑکی جس کی سوچوں میں بھی کسی مرد کا گزر نہیں ہوا تھا، اس کو ایک ناکردہ جرم کی سزا بھگتنا پڑی۔ اس کے کزن نے اس کا پھول جیسا چہرہ تیزاب سے جھلسا دیا تھا۔ اما نے مجھے اس سے ملوایا تھا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ اما اور میں نہ صرف اس کا علاج کروانا چاہتے تھے بلکہ اسے انصاف بھی دلانا چاہتے تھے۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو اضطرابی انداز میں مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ارفع کو اپنے وجود میں نشتر سے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”میں جو اس کو ہمت دلانا تھا اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا تھا، اس لڑکی کی اس سے بڑی بدنصیبی

انگلش دنیا کا بہترین ٹوتھ پیسٹ ہے

کیونکہ اس میں ہے لیکوئیڈ کیشیم کے ساتھ ڈبل فلورائیڈ، تاکہ آپ کے دانتوں کو ملے

Maximum نہیں بلکہ Guaranteed Cavity Protection



Dr. Riaz Ahmed
Dental Surgeon



چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم وہ دیکھتے ہیں جو ہمارا دل ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔ ”ارفع کو لگا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ کوئی اس کے سر پر ہتھوڑے مار رہا ہے۔ وہ ہر اسال نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں بہت اذیت میں ہوں یا۔۔۔“ خضر نے بات کرتے کرتے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ”میں اسے چھوڑ نہیں سکتا، لیکن تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس موضوع پر اتنا سوچا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ میں مزید ایک گھنٹہ بھی اس پر اور سوچوں گا تو میرا دل غ پھٹ جائے گا۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بے آواز رو رہا تھا۔ ارفع کی قوت گویائی کہیں گھو گئی تھی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اس سے لڑ سکے، ”جتنے چلائے لیکن وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل مفلوج ہو گئی تھی۔

”وہ کہتی ہے کہ اس نے اللہ سے دعا مانگی ہے کہ وہ چاہے اس کا چہرہ ٹھیک نہ کرے، لیکن خضر حیات کو اس کا نصیب بنا دے۔“ خضر کے ہونٹ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

”ماما نے اسے علاج کی غرض سے اٹلی بھیجنا تھا، لیکن اس نے منع کر دیا۔ ماما ناراض ہو گئیں تو اسے میں نے اپنے ایک دوست کے کلینک میں شفٹ کروا دیا۔ ماما سمجھ رہی ہیں کہ اس کے والدین اسے آکر لے گئے ہیں۔“ وہ اسے ایک عجیب سی داستان سنا رہا تھا۔

”میں نے اسے بہت مشکل سے اٹلی جانے پر راضی کیا۔ کتنے محاذوں پر جنگیں لڑیں۔ کتنے ڈرامے کیے۔ اس کے خاندان والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اسے دارالامان بھیج دیا جائے۔ وہ اسے قبول نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت مشکلوں سے ایک دوست کے ذریعے اسے باہر بھجوایا۔ ماما کو اس بات کا علم نہیں۔ وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں نے بھی اس کیس کو چھوڑ دیا ہے۔“ اس نے ایک اور ہم اس کے اعصاب پر پھوڑا تھا۔

”اس کے اٹلی جانے کے بعد مجھے لگا کہ میری زندگی نارمل ہو جائے گی۔ میں انگلینڈ میں تھا جب مجھے پتا چلا

کیا ہوگی وہ جو اپنے چہرے کو مسخ حالت میں دیکھ کر چیخیں مارتی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ زندگی نے ایک اور تماشا کیا۔ اس کو اپنے واحد میچا سے محبت ہو گئی۔“ ارفع نے خوفزدہ نظروں سے آنکھیں چراتے خضر کو دیکھا۔

”تم مجھے اصل بات بتاؤ خضر۔۔۔“ اس کے حلق سے بمشکل نکلا تھا۔

”پتا نہیں مجھے کیا ہوا“ ارفع! خدا کی قسم مجھے نہیں پتا، لیکن مجھے اس لڑکی کا جلا ہوا چہرہ برا نہیں لگتا۔“ اس کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے۔ ارفع۔۔۔ وہ جب ہنسی ہے تو اس کے بائیں گال پر کیسا ڈمپل پڑتا ہے۔ وہ جب خاموش ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں ایک اداس جھیل کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں۔ وہ جب خوش ہوتی ہے تو اس کے لہجے کی کھنکھناہٹ میں کشی گھنٹیاں بجتی ہیں، مجھے یہ تمام چیزیں ازبر ہیں۔ میں نے اس سے بھاگنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں جہاں جاتا ہوں وہ ایک چٹان کی مانند میرے سامنے آجاتی ہے۔ مجھے کوئی راستہ سمجھائی نہیں دیتا۔ اس کے چہرے کا صرف ایک حصہ جلا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ کوشش کرے تو زندگی کی طرف واپس آسکتی ہے۔ میں نے انگلی پکڑ کر اس کو دوبارہ چلنا سکھایا ہے۔ میرا دل اور میرا ضمیر نہیں مانتا کہ میں اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنی زندگی میں گن ہو جاؤں۔“

وہ آنکھیں بند کیے بڑے پرسکون انداز میں اسے وہ داستان ایسے سنا رہا تھا جیسے وہ کسی اور کی ہو۔ ارفع شدید صدمے اور بے یقینی سے بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی روح تک بھونچال کی زد میں تھی۔

”غلط کہتے ہیں لوگ کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ غلط کہتے ہیں یہ بھی کہ انسان کسی کے چہرے یا جسمانی حسن کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر اس سے محبت کرتا ہے۔ اصل میں جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس کی ہر چیز ہمیں خود بخود پیاری لگنے لگتی ہے۔ ہم اسے دنیا کی نظروں سے دیکھنا

کہ اس کا زور بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم میں کیسے انگلینڈ سے وہاں چلا گیا۔ کوئی طاقت تھی جو مجھے دھکیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کافی حد تک بہتر ہو گئی۔ مجھے اب سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟ میں اللہ کے سامنے بہت رویا ہوں، گڑ گڑایا ہوں کہ مجھے درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ میں نے سات دن استخارہ کیا ہے۔ میری سمجھ نہیں آیا کہ اللہ اسے میرے لیے بہتر کیوں کہہ رہا ہے۔ ”ارفع کو ایسے لگا تھا کہ کسی نے اسے ایفل ٹاور سے دھکا دے دیا یا کوئی ٹرین اس کے اوپر سے اس کے پرچے اڑاتی گزر گئی ہو۔ رخساروں سے پھسلتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے زمین پر گر رہے تھے۔

وہ اٹھ کر بالکل اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اسی جگہ پر اس نے ارفع کو پہلی دفعہ روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی جگہ وہ اسے بری طرح ٹوٹے بکھرتے دیکھ رہی تھی۔ اسے کند چھری کے ساتھ ذبح کیا جا رہا تھا۔ درد اور اذیت کی شدت نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد آنسوؤں کی چادر اتنی گہری ہو گئی تھی کہ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ارفع! اگر اللہ نے اسے میرے لیے بہتر خیال کیا ہے تو وہ تمہارے لیے محبت میرے دل سے نکال کیوں نہیں دیتا؟ میں دو کشتیوں کا مسافر بن کر زندگی کیسے گزار سکتا ہوں؟ مجھے سکون کیوں نہیں آتا؟ میرا دل ٹھہر کیوں نہیں جاتا؟ میرا ضمیر مجھے ملامت کیوں کر رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا؟“ اسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

”خضر! اگر میں تمہیں کہوں کہ تم اس لڑکی کو چھوڑ دو تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے؟“ وہ اس ساری گفتگو میں بس اتنا ہی بولی تھی۔ خضر کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ بنا کسی توقف کے بولا۔

”ہاں! چھوڑ دوں گا، لیکن اس کے بعد ساری زندگی اللہ اور ضمیر کی عدالت میں کبھی سر اٹھا کر نہیں کھڑا ہو سکوں گا۔“

”پھر تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، کوئی شکایت نہیں۔ پوری ایمانداری کے ساتھ اس لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لو۔ جب اللہ سے مشورہ کر لیا جائے تو پھر شکوک و شبہات میں نہیں پڑتے اللہ انسانوں کے لیے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔“ اگرچہ اس کی سانس حلق میں اٹک رہی تھی لیکن وہ اب بڑے ہموار لہجے میں بول رہی تھی۔

”میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ خضر کو اپنا دل کسی گہری کھائی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ”پھر میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔ اگر میں تم سے تعلق رکھوں گی تو میں اپنے ضمیر اور اللہ کی عدالت میں کبھی سر اٹھا کر نہیں کھڑی ہو سکوں گی۔“ وہ اس کی بات پر شدید بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی مدھم ہو گئی۔

”ارفع! میں تم دونوں کو آرام کے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ اگر تم اپنا دل بڑا کر لو۔“ وہ التجائیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”سوری خضر! تمہارے معاملے میں میری محبت کا ظرف بہت چھوٹا ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اٹھی۔

”فار گاڈ سیک ارفع! تمہارے بغیر زندگی گزارنا میرے لیے زیادہ اذیت ناک ہو گا۔ پلیز! میری بات مان جاؤ۔“ وہ اس کے سامنے گڑ گڑا رہا تھا۔

”خضر!“ وہ اس کی جانب مڑی۔ ”اگر تمہارے دل میں میرے لیے واقعی کہیں محبت ہے تو پلیز! مجھے یہ بات دوبارہ مت کہنا۔ میں تمہیں کھلے دل سے اس لڑکی کو اپنانے کی اجازت دیتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنے ساتھ کسی آزمائش میں مت ڈالو۔“ اس کی آواز انداز اور الفاظ میں کچھ تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

”تم استخارہ کر چکے ہو اور جب اللہ سے مشورہ کر لیا جائے تو پھر بندوں سے مشورہ کر کے خود کو گناہ گار مت کرو۔ ضروری نہیں ہوتا کہ زندگی میں جو چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہوں وہ سب ہی مل جائیں۔ میرا خیال اب دل سے نکال لو اور پوری ایمان داری سے وہ کام کرو

جس کا مشورہ تم اللہ سے کر چکے ہو۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک دم سے کمرے سے نکلی تھی۔ قسمت نے ان دونوں کے ساتھ بہت عجیب کھیل کھیلا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی چابی وہیں بھول آئی تھی۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ وہ بمشکل اپنے پاؤں گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ اس کا دل اس کا سارا وجود دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

وہ پیدل ہی پورا ایک سیکڑ کر اس کر آئی تھی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی جب مرکز کے قریب مناشا نے اسے دیکھا۔ اس کا آفس وہیں قریب ہی تھا۔ اس نے دیکھا وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

وہ سخت حیرت، تعجب اور بے یقینی کے ساتھ اپنے سامنے بیڈ پر لیٹی نڈھال سی ارفع کو ٹٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم پچھلے دو دن سے بخار میں جھلس رہا تھا۔

”تم نے خضر حیات سے شادی سے انکار کیوں کیا ہے ارفع؟“ وہ انتہائی زیرک نگاہوں سے اس کا بے تاثر چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہی اس دن اسے گھر تک لائی تھی۔ سارے راستے ارفع ہچکیوں سے روتے ہوئے آئی تھی، لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ گھر آتے ہی وہ بے سدھ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ شدید ذہنی دباؤ میں ہے، اس لیے اسے مزید ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ وہ ادویات کی وجہ سے غنودگی میں تھی جب اس نے ایک دن ہسپتال میں بالکل اپنے پاس کھڑے خضر کو دیکھا۔ وہ مکمل ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ جتنی خاموشی سے آیا تھا اس سے بھی زیادہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اسے سارہ نے بتایا تھا کہ خضر انگلینڈ واپس چلا گیا ہے، تب اس نے سب کو یہی بتایا تھا کہ اس نے خضر سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ ابھی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لعنتوں، ملامتوں کا ایک سلسلہ خضر کے خلاف شروع ہو جائے۔ سارہ ماہرہ آپنی اور حتیٰ کہ

عفیوہ آپنی نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگالیا تھا لیکن اس کی ”نہ“ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ خضر انگلینڈ میں شفٹ ہونا چاہتا تھا۔ اسی بات پر دونوں کا اختلاف ہوا اور بات بہت آگے تک برہہ گئی۔

سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ وہ سب بھی یہ ہی سمجھے تھے کہ خضر غصے میں پاکستان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ایک رات اس نے ان سب کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ خضر کے علاوہ ہر بندے سے شادی کو تیار ہے، لیکن اس سے کسی قیمت پر نہیں۔ اس کا لہجہ اس قدر دو ٹوک اور لچک سے عاری تھا کہ سب خاموش ہو گئے۔ جس دن ماما نے خضر کو انتہائی شرمندگی سے فون کر کے کہا تھا کہ وہ سخت شرمندہ ہیں کیونکہ ارفع اس سے شادی کے لیے کسی صورت راضی نہیں، اسی رات اس کا آخری میسج آیا تھا۔

”ارفع! پلیز میرے اوپر اتنے احسان مت کرو کہ میں ان کے نیچے ہی دب کر کسی دن مر جاؤں۔“ اس نے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا، کسی نے بھی خضر کو ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ لیکن اس دن جس حالت میں مناشا اسے گھر لے کر آئی تھی اور اس نے جس طرح اسے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صرف اس ایک بات پر ارفع اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہے اور خضر جیسا بندہ بھی اس کے فیصلے پر کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ یہ بات اس کی عقل سمجھنے سے عاری تھی۔

”فار گاڈ سیک ارفع! مجھے بہلاؤ مت۔ میں نے تمہارے اور خضر کے ریلیشن شپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں اس بات کو مان نہیں سکتی کہ تم اتنی سی بات پر اتنا بڑا فیصلہ کر لو۔“ اس نے بنا کسی تمہید کے ایک دفعہ پھر اس سے پوچھا تھا۔

”یہ اتنی سی بات نہیں تھی مناشا!“ ارفع کے حلق سے بہت دھیمی سی آواز نکلی تھی۔ وہ جبراً مسکراتے ہوئے بمشکل اٹھی تھی۔ مناشا نے فوراً لپک کر اس کے پیچھے تکیہ رکھا تھا۔

”یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی کہ جس کے لیے

اتنے سالوں کا اتنا خوب صورت ریلیشن ختم کر دیا جائے۔

”کبھی کبھی جو چیزیں کسی اور کے لیے بہت معمولی ہوتی ہیں کسی دوسرے کی ساری زندگی ہوتی ہیں مانی ڈیپیر!“ اس کی گلابی رنگت میں زردیاں سے کھل گئی تھیں۔

”پھر بھی ارفع! تم اپنے فیصلے پر دوبارہ سوچو۔ خضر کو بھی سوچنے کا نام دو مجھے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے بھی اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ کیوں بنا لیا ہے اور تم بھی کیوں اڑی ہوئی ہو۔ آخر! انگلینڈ شفٹ ہونے میں ہرج ہی کیا ہے؟ وہ ٹانگیں جھلاتے ہوئے شدید بیزاری سے کہہ رہی تھی۔ ”تم تو ویسے بھی زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہی ہو۔“

”لیکن مجھے اب نہیں رہنا۔“ ارفع نے بے زاری سے کہا۔

”تو نہ رہنا، لیکن دانشمندی سے بات کو ہینڈل کرو۔ خضر نے آج تک تمہاری کوئی بات ٹالی ہے جو اب ٹالے گا؟ مان جائے گا وہ، لیکن پیار سے سمجھاؤ۔“ نتاشا نے اسے سمجھانے کی ایک دفعہ پھر کوشش کی۔ ”مجھے اس فیصلے پر نہ آج سوچنا ہے اور نہ کل۔“ اس کے انداز میں چٹانوں کی مضبوطی محسوس کر کے وہ بری طرح جھلا گئی تھی۔

”تم کو تو میں خضر سے بات کروں؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔!“ ارفع کے دو ٹوک انداز پر وہ ٹھٹکی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ نتاشا نے سخت برا مانا تھا۔ ”تم دونوں ایسا کیوں کر رہے ہو یا ر! خضر کو فون کرتی ہوں تو وہ اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ تمہاری ماما نے سارہ نے اور ماہی آبی، ہم سب نے اس سے اگلوانے کی کوشش کی ہے، لیکن اس نے بھی اپنے منہ کو تالا لگا کر لگتا ہے، چالی نہیں پکڑا دی ہے۔ پتا نہیں تم دونوں کو بیٹھے بیٹھائے کیا سوچ رہی۔ سارے گھر کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔“

”ایسا کیا کر دیا ہے ہم لوگوں نے جو تم سب لوگ

روز سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ اور ایسا کیا انوکھا ہو گیا ہے؟ کیا تمہارا اور معید کا بریک اپ نہیں ہوا تھا؟“ اس کے تلخ انداز میں کہنے پر نتاشا کے چہرے پر بڑی سرعت سے ایک تاریک سایہ دوڑا تھا۔

”پلیز ارفع! تم خود کو میرے ساتھ مت ملاؤ۔ ہمارے گیس میں تو میں ایک طرفہ طور پر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ صرف ٹام گزار رہا تھا۔ ایسے معاملات کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن تمہارا کیس تو بہت مضبوط تھا۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ تم لوگ شادی کرنے والے ہو۔“

”خدا کے واسطے نتاشا! ساری چیزوں کا حل شادی نہیں ہوتی۔ کہاں لکھا ہے کہ جس سے محبت ہو تو اس سے شادی ضرور کرو؟“ اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ نتاشا کو اس کے رد عمل پر حیرانی ہوئی۔

”سویت ہارٹ! ہم لوگ یورپ میں نہیں رہتے، جہاں لوگ محبت کی وجہ سے شادی کے بغیر بھی ایک ساتھ ایک روم شیئر کرتے ہیں۔ ہمارا مذہب ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے رشتوں کو نام دینا پڑتا ہے۔“ نتاشا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کچھ نرم ہوئی۔

”تو میں کون سا اس کے ساتھ رہنے کا اعلان کر رہی ہوں جو مجھے کسی نام کی ضرورت پڑے؟ وہ واپس چلا گیا ہے وہاں جا کر کسی نہ کسی سے شادی کر ہی لے گا، بات ختم۔“

”تو تم کیا کرو گی؟“ نتاشا کے تیز لہجے پر اس نے بے ساختہ آنکھیں چرا میں اور پلکوں کو تیزی سے جھپک کر ان میں آنے والی نمی کو چھپایا۔

”میں نے فی الحال کچھ نہیں سوچا، لیکن میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔“ اس کے جواب پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔



دن گزرتے جا رہے تھے، لیکن ان میں بے رنگی اور بے کیفی کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا۔ سارہ کی شادی کی تاریخ

طے ہو گئی تھی۔ اس دن صوفیہ بیگم کے چہرے کی رنجیدگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ یہ ہی سوچا تھا کہ ان دونوں کو اکٹھے وداع کریں گی، لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سارہ کی شادی صوفیہ بیگم نے خوب دھوم دھام سے کی تھی۔ خضر اس کی شادی پر نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے سارہ کو شادی پر گاڑی کا تحفہ دیا تھا۔

ارفع نے خود کو بہت زیادہ مصروف کر لیا تھا۔ اسی دوران وہ ایک چھ ماہ کا ڈاکو منٹری فلمز سے متعلقہ ایک اور کورس کرنے امریکہ چلی گئی تھی۔ امریکہ قیام کے دوران ہی اسے پتا چلا کہ نتاشا سونٹز ریلینڈ اپنے میاں کے ساتھ شفٹ ہو گئی ہے۔ واپس آ کر اس نے کئی پراجیکٹس اکٹھے شروع کر لیے تھے، سوائے سر سمجھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ سارہ کے ہاں بیٹے کی پیدائش اور خضر کی شادی کی اطلاع اسے اکٹھے ہی ملی تھیں۔

”دیکھو ذرا خضر کو۔۔۔ تم سے اگر ناراضی تھی تو کم از کم ہمیں تو شادی پر بلا لیتا۔ پتا نہیں، کس کے ساتھ شادی کی ہے اس نے۔ کچھ خبر نہیں۔“ سارہ اپنے بیٹے کے ساتھ ان دنوں میکے میں ہی تھی اور خضر کی شادی کی خبر نے ماما کے ساتھ اسے بھی کافی رنجیدہ کیا تھا۔ وہ جو کسی چینل پر آنے والی ڈاکو منٹری غور سے دیکھ رہی تھی اس کی بات پر چونک گئی، لیکن وہ خود کو بے پروا ثابت کرنے کے لیے مسلسل ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

”ظاہر ہے! اسے شادی تو کرنی ہی تھی۔ آخر کوئی کسی کے لیے کب تک جوگ لے سکتا ہے۔“ صوفیہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو میز پر رکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ انہیں کچھ عرصے سے ارفع سے بہت گلے شکوے تھے، وہ اپنے لیے آنے والے ہر رشتے میں سے کوئی نہ کوئی نقص نکال کر مسترد کر دیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صوفیہ بیگم کی شکایتوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ سارہ ان کے قریب ہی رہتی تھی اس لیے صوفیہ بیگم اکثر اس کے سامنے ہی

اپنے دکھڑے روتی تھیں اور وہ بھی صوفیہ بیگم کی تمام شکایتوں کو بہت غور سے سنتی تھی۔

”ویسے ماما اس نے شادی کی کس سے ہے، آپ کو اس نے بتایا؟ مجھ سے تو دو منٹ کی بات ہوئی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ تصاویر میل کرنا، لیکن اس کے انداز سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔“ سارہ نے تجسس سے پوچھا لیکن بات کے اختتام تک اس کے لمحے میں باؤسی در آئی۔

”وہ کبھی بھی تصاویر میل نہیں کرے گا۔“ ارفع نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

”وہ بھلا مجھے کیوں بتائے گا اور سچ پوچھو! تو میں نے خود بھی اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ کوئی بھی ہو، ہمیں کیا۔“ صوفیہ بیگم حد درجہ آزرہ ہوئی تھیں۔

”ہاں! کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ اس نے بھی اعتراف کیا۔ ”ماما مسز علوی نے جو ارفع کے لیے اپنے بھانجے کے پروپوزل کا ذکر کیا تھا، اس کا کیا بنا؟“ سارہ کی بات پر ارفع نے جھٹکے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”مجھے مسز علوی کے کسی بھانجے سے شادی نہیں کرنی۔ جب میں ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ اگلے دو سال تک میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تو آپ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی۔“ وہ بھڑک کر کھڑی ہو گئی۔ صوفیہ بیگم اور سارہ دونوں ہی کی آنکھوں میں بے زار کن سا استعجاب سمٹ آیا تھا۔

”آخر کب تک نہیں کرو گی تم شادی؟ جب خضر سے شادی سے تم نے خود انکار کیا تھا تو اب کس چیز کا سوگ منا رہی ہو۔۔۔؟“ سارہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”خضر کوئی دنیا کا آخری مرد نہیں تھا اور تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں اس کا سوگ منا رہی ہوں؟“ وہ سوکھی لکڑی کی طرح چیختی تھی۔

”تو پھر ہر آنے والے پروپوزل سے انکار کیوں کر رہی ہو؟“ سارہ کی آواز جھنجھلائی ہوئی تھی۔

”اس لیے کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ جب میرا ایسا کوئی ارادہ بنے گا تو میں تم لوگوں کو یہ بھانت

بھانت کے لوگوں کو دیکھنے کے شغل سے بچالوں گی، اس لیے برائے مہربانی میرے حال پر رحم کریں اور یہ شادی وادی والے ڈرامے اور جذباتی بلک میلنگ میرے ساتھ نہ کریں۔“ ارفع کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ وہ قطعی لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

”دیکھ لیں ماما! کنڈاماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ ہمیں اس کی خضر والی بات مانی ہی نہیں چاہیے تھی۔“ سارہ نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا جو پہلے ہی خاصے صدمے کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔ ”سارہ! کہیں کوئی اور تو نہیں ہے۔۔۔ جس کے لیے۔۔۔؟“ صوفیہ بیگم کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

”کم آن ماما! ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور فرض کریں۔ ایسا کچھ ہو بھی تو آپ شروع سے ہمارے ساتھ اتنی فریڈی رہی ہیں۔ اسے اچھی طرح پتا ہے کہ آپ کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی، ماما! آپی اور عقیقہ آپنی دونوں کی شادیاں ان کے کلاس فیلوز کے ساتھ ان کی پسند سے ہوئی ہیں۔ صرف میرے معاملے میں آپ کو بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے اس لیے میرا نہیں خیال کہ ارفع کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہے۔“ سارہ نے صاف گوئی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا ہو، جس کے بارے میں اسے لگتا ہو کہ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اسٹینٹس یا کوالیفیکیشن کے حساب سے۔۔۔؟“ صوفیہ بیگم کے اندیشے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ سارہ ان کی بات پر ہنسی۔

”ماما! اس کے مزاج کا پتا تو ہے آپ کو۔ اپنے سے کسی بھی لحاظ سے کم کوئی شخص اسے پسند آ سکتا ہے بھلا۔۔۔؟ اور ایسی صورت میں جب وہ خضر جیسے پندے کو چھوڑ چکی ہو۔“ اس کی بات میں اتنی تلخی تھی کہ صوفیہ بیگم کو اپنے تمام اندیشے فضا میں تحلیل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ انہوں نے یک دم ہی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ اس بات کی طرف تو واقعی ان کا

دھیان نہیں گیا تھا۔



وہ شاہ بلوط کے درخت کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے پچھلے دو گھنٹے سے وہیں ایک ہی پوزیشن میں کھڑی تھی۔ وہ جب کھڑے کھڑے وہاں تھک گئی تو اسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ زمین پر اگی گھاس کی پتیاں توڑ کر اسے منھی میں بالکل بے دھیانی سے مسل رہی تھی۔ اس وقت وہ اٹلی کے ایک ہسپتال کے بالکل سامنے بنے ایک خوب صورت پارک میں تھی۔ اس وقت وہ بیرونی دنیا سے یکسر لاطعلق تھی۔ اس کے اندر تو پھوڑ کا ایک جہان آباد تھا۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے تک اس کا اٹلی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان میں خواتین پر ہونے والے جسمانی تشدد پر ایک ڈاکو منڑی بنا رہی تھی۔

بس اسی دوران ارفع نے اٹلی آنے کا ارادہ کر لیا۔ اسے پلوشہ ویرانی کی تلاش میں زیادہ وقت نہیں ہونی چاہی۔ خوش قسمتی سے جب وہ ہسپتال پہنچی، اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہیں ایک ڈاکٹر نے بڑے خوشگوار انداز میں اس کی ہسٹری بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا شوہر بہت ہنڈ سم ہے اور اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ کچھ ماہ پہلے ہی ان کی شادی ہوئی ہے اور وہ امید سے بھی ہے۔

ارفع نے جب اسے دیکھا تو وہ دائیں کروٹ پر لیٹ ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی وہ جلد انتہائی شفاف اور سرخ و سپید تھی۔ اس نے سوتے ہوئے کروٹ لی تھی۔ ارفع کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ابھی اس کے کافی سارے آپریشن ہو چکے ہیں اور بہت سے باقی ہیں۔ اتنے آپریشنز کے بعد بھی اس کی طرف دیکھنا ایک دشوار کن مرحلہ تھا تو پہلے اس کی حالت کیا ہوگی، وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس نے ایک نگاہ میں اس کے چہرے پر پھیلی

سکون مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ وہ سوتے ہوئے بھی شکر اراہی تھی۔ ارفع کے لیے کمرے میں ٹھہرنا دشوار ہو گیا۔ وہ باہر آگئی۔ موسم نے بھی اچانک ہی انگریزی لی تھی۔ گہرے سیاہ بادل نہ جانے کہاں سے آئے تھے۔ انہوں نے آسمان پر اپنی چادر بچھا دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل جھل ہو گیا تھا۔

بارش اور آنسو دونوں ہی اپنی پوری شدت کے ساتھ برس رہے تھے۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ اسے بے پناہ تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ انتہائی اعصاب شکن لمحات تھے۔ وہ ارد گرد کے لوگوں کی حیرت سے بے نیاز بس انجانے راستوں پر چلتی جا رہی تھی۔ اس کا سیاہ لباس بری طرح بھیک چکا تھا۔ وہ سنگاں فٹ پاتھ پر بے سنگ مرمے کے بیچ بیٹھ گئی۔ چھٹی کا دل تھا۔ اس لیے بہت کم لوگ باہر نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں ٹانگیں بیچ پر اوپر رکھے نہ جانے کتنی دیر تک روٹی رہی۔

بارش اور آنسو دونوں اکٹھے ہی تھے۔ وہ اب بالکل خاموش تھی جب ارغوانی پھولوں کی روش سے چلتا ہوا ایک اطالوی جوڑا اس کے سامنے آ کر رکا تھا۔ وہ دونوں کسی کالج کے اسٹوڈنٹس لگ رہے تھے۔ سنہری ریشم جیسے بالوں والی لڑکی کے ہونٹ بالکل اسٹری کی طرح سرخ تھے۔ وہ اپنی گہری نیلی آنکھوں کو حیرت سے پھیلا کر اٹالین میں کچھ پوچھ رہی تھی۔ ارفع نے بے زاری سے سر کے اشارے کو نفی کے انداز میں ہلایا۔ وہ اب انگلش میں اس سے اس کی خیریت پوچھ رہی تھی۔

ارفع زبردستی مسکرائی۔ ان کے بغور دیکھنے پر ارفع کو تھوڑی سی الجھن ہوئی۔ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا جس نے گہرے سبز رنگ کی پتلون پر سرخ شونے سے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے تھوڑا سا جھک کر سنہری بالوں والی لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک چاکلیٹ نکال کر بڑے دوستانہ انداز میں ارفع کی طرف بڑھائی۔ اس لڑکی کے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ تھی۔ ارفع نے نہ چاہتے ہوئے بھی چاکلیٹ اس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ وہ

لڑکا ایک دفعہ پھر شونے کے انداز میں اسے کچھ کہہ رہا تھا۔

”یہ کہہ رہا ہے کہ تم اتنی خوب صورت ہو کہ تمہارے چہرے سے نظر ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔“ لڑکی نے ہنس کر کہا۔

ارفع کو نہ جانے کیوں لگا تھا کہ منہ میں رکھا چاکلیٹ کا ٹکڑا حلق میں پھنس گیا۔ وہ ایک دفعہ پھر اسی ابتزاز بنی کیفیت کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے خالی نظروں سے دونوں کو دیکھا جولا ابالی انداز میں فٹ پاتھ پر بڑے پتھر کو ٹھوکر لگاتے ہوئے آگے لے جا رہے تھے۔ بارش کب کی رک چکی تھی مگر آسمان پر بادل پھر برسنے کو تیار تھے۔ تیز ہوا اور ختوں کے پتوں سے شاہیں شائیں کرنی گزر رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ اس کی گردن سے ٹیسس اٹھنے لگیں اور ایک ہی جانب دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

”میرے چہرے سے نظر ہٹانا اگر مشکل کام ہے تو خضر نے یہ کام اتنی آسانی سے کیسے کر لیا؟“

اس نے ہاتھ میں پکڑا باقی چاکلیٹ کا ٹکڑا سامنے درخت کے ساتھ لگے ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔ اتنے ماہ گزرنے کے بعد بھی اس کا دل اس تلخ حقیقت کو ماننے سے انکاری تھا کہ خضر اس کی زندگی سے نکل چکا ہے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ پُر حدت قطرے مسلسل اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔ اس کے اندر خالی پن پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ اگلے دن پاکستان چلی گئی۔



لان میں لگے شاہ بلوط کے درختوں کے نیچے سفید لوہے کی کرسیوں پر آنے سامنے بیٹھے ارفع اور نتاشا کے مابین ایک محسوس کن بوجھل سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ نتاشا صوفیہ بیگم کے اچانک انتقال پر بطور خاص اس سے ملنے اور افسوس کرنے آئی تھی۔ اس کے اٹلی سے واپس آنے کے تقریباً ”ڈیڑھ سال کے

Doctor with fluoride

تھے۔ دل میں کوئی پھانس سی چھ گئی تھی۔
”تم اس کامنہ توڑ دیتیں اس کا گریبان پکڑتیں تم
کیوں اتنی آسانی سے اس سے دستبردار ہو گئیں۔“
اس کی آواز میں خفگی تھی۔

”تم کسی کو کچھ تو بتاتیں۔ تم نے یہ اچھا نہیں
کیا۔“ نتاشا کی آواز میں دکھ، صدمہ اور ناراضی کے
سارے ہی رنگ تھے۔

”کیا بتاتی؟“ وہ بولی تو اس کی آواز میں ایسی تلخی تھی
کہ نتاشا سے دیکھتی رہ گئی۔

”تم نے اس کی بیوی کو دیکھا ہے نتاشا؟“ وہ بہت
عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

”ہاں! دیکھا ہے اور اللہ معافی دے اتنے آپریشن
ہونے کے باوجود بھی اس کی طرف دیکھنا کسی بڑی
آزمائش سے کم نہیں تھا۔“ نتاشا کانوں کو ہاتھ لگا رہی
تھی۔ ارفع نے اس کی بات پر گہری سانس بھری۔

اسے وہ جھلسا ہوا چہرہ میرے چہرے سے زیادہ خوب
صورت لگنے لگا تھا، پھر بتاؤ میں کیا کرتی؟“ وہ استہزائیہ
انداز میں ہنسی۔ نتاشا کامنہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ
گیا۔

”وہ اس کے اور میرے بیچ میں خدا کو لے آیا تھا۔
اس کا کہنا تھا کہ اس نے استخارہ کیا اور پلوشہ درانی کی
طرف اشارہ ہوا۔ اب بتاؤ! میں کون ہونی ہوں، اللہ
کے کاموں میں دخل دینے والی۔“ وہ بمشکل بولتے
ہوئے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں! بس ایک وہ ہی اللہ کا ولی رہ گیا ہے ناں جس
کو اشارے ہونے تھے۔“ نتاشا کو بے تحاشا غصہ آ رہا
تھا۔

”ایسے نہیں کہتے نتاشا! ہم کون ہوتے ہیں اللہ کے
نام سے ہونے والے کاموں میں شک کرنے والے۔
وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ پلوشہ کے لیے محبت اللہ ہی نے
اس کے دل میں ڈالی تھی ورنہ اسے اس کا چہرہ دنیا کا
حسین ترین چہرہ نہ لگتا۔ تم خود سوچو! کوئی کسی پر ترس
کھا کر یا ہمدردی کے نام پر بھی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا
ہے؟“ اس کی دلیل پر نتاشا چپ رہ گئی۔

بعد صوفیہ بیگم کا ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے بالکل
اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ ارفع تقدیر کے اس وار پر بالکل
شدر رہ گئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ
اظہار اتنی مضبوط نظر آنے والی صوفیہ بیگم کا دل اتنا
کمزور ہو سکتا ہے۔ سارہ جو اپنے میاں کے ساتھ
آئرلینڈ شفٹ ہو گئی تھی۔ عفیہہ اپنی جوانی میں تھیں
وہ دونوں جب تک پہنچیں صوفیہ بیگم کو منوں مٹی
کے نیچے دفن کیا جا چکا تھا۔ اس کی مینوں بہنیں ماما کے
چالیسویں تک وہیں رکی رہی تھیں۔ عفیہہ اپنی نے
اور سارہ نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا، لیکن
اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماہرہ اپنی البتہ کراچی سے
اسلام آباد شفٹ ہونے کے ارادے سے گئی تھیں۔
نتاشا کے بیٹا ہوا تھا اس لیے وہ فوری طور پر تو نہیں آ
سکی تھی، لیکن پاکستان پہنچنے پر سب سے پہلے اسی کے
پاس آئی تھی۔ نتاشا نے بائیں کرتے کرتے اچانک
گما۔ ”ارفع! میں انگلینڈ گئی تھی۔ وہاں مجھے خضر ملا
تھا۔“ ارفع نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ نتاشا
کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

”ارفع! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟“ وہ
بہت غور سے ارفع کے چہرے پر پھیلی تاریکی کو دیکھ
رہی تھی۔

ارفع کچھ نہیں بولی۔ وہ شاہ بلوط اور امتاس کی
شاخوں سے لپٹی ہوئی شام کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے
اعصاب تن گئے تھے۔

”میں کبھی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم
دونوں کے درمیان اتنا کچھ ہو جائے گا اور تم لوگ کسی کو
کانوں کان خبر نہیں ہونے دو گے۔“ نتاشا کے چہرے پر
بجھی ہوئی راکھ جیسی مسکراہٹ تھی۔

”میرا ذہن آج بھی اس حقیقت کو ماننے سے
انکاری ہے کہ تم جیسی خوب صورت، حسین اور مکمل
لڑکی پر کوئی کسی اور کو ترجیح دے سکتا ہے۔ مجھے خضر
نے بتایا کہ تم نے اسے خود پلوشہ سے شادی کرنے کی
اجازت دی تھی۔ تم کتنی بے وقوف ہو ارفع۔“
نتاشا کی بات پر ارفع کے گلے میں بے شمار آنسو اٹکے

پھر
کوئی اور تو تھ پیسٹ
کیوں؟



Anfords
Values Life

دانتوں کی تمام تکالیف کا مکمل علاج!

”تم خود سوچو! تمہارا کہنا ہے کہ اس کی طرف دیکھنا کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں تو پھر کوئی مرد بغیر کسی جذبے کے اپنے آپ کو کیوں امتحان میں ڈالے گا؟ یقین مانو مجھے بھی بہت تکلیف ہوئی تھی اس کے اس فیصلے سے، لیکن پھر اللہ نے میرے دل کو صبر دے دیا۔“ ارفع کا انداز بہت سادہ تھا۔ نتاشا نے رشک بھری نظروں سے اس کے مطمئن چہرے کو دیکھا۔

”نتاشا! صبر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، لیکن اللہ اپنے بندوں پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ اس نے بہترین فیصلہ کیا۔ اس نے ایک جان بچالی۔ وہ لڑکی اگر یہاں ہوتی تو اب تک اپنے خاندان کے انتقام کی آگ میں جل چکی ہوتی۔“ وہ بہت بر سکون تھی۔

”لیکن ارفع! تمہارا اور اس کا تعلق...؟“ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

”میرا اس کا تعلق قسمت میں اتنا ہی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے ناں کہ میں نے اللہ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔“ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔“ ارفع کی بات پر نتاشا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”ایسے فیصلے آسان تھوڑی ہوتے ہیں اور اللہ اپنے خاص بندوں کو ایسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو ارفع...“ نتاشا نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ”خضر شروع ہی سے خاص بندہ تھا اور اس کی مشکل پسند طبیعت کو آسان چیزیں کہاں پسند آتی تھیں۔ ایسا کام وہ ہی کر سکتا ہے، میرے جیسوں کے بس کی بات نہیں۔“ نتاشا کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ وہ کچھ لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

”وہ اپنی بیوی کا ذکر بہت محبت سے کر رہا تھا، لیکن مجھے اس وقت ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے ڈراما کر رہا ہے۔ اس کی بیٹی بہت خوب صورت ہے اس نے اس کا نام فاطمہ رکھا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ارفع کو یہ نام بہت پسند تھا۔“ اس کی بات پر ارفع کو ایک دم چپ لگی

تھی۔

”تم اس کی زندگی میں نہیں ہو، لیکن پھر بھی ہر جگہ ہو۔ وہ جتنی دیر تک میرے ساتھ رہا، تمہارا ذکر کرتا رہا۔ اس کی بیوی بھی تمہیں جانتی ہے اور تمہاری بہت احسان مند ہے۔ اس نے اسلام آباد والے گھر کو ادھورا ہی چھوڑ دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے اس گھر میں تمہارے ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ اس گھر میں کسی کو بھی نہیں لے جاسکتا۔“ نتاشا بہت آہستگی کے ساتھ اسے وہ باتیں بتا رہی تھیں جو اسے مضطرب کر رہی تھیں۔

”نتاشا! کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟“ ارفع نے ایک گہری سانس لے کر بے چینی سے پہلو بدلا۔

”میں اس موضوع کو اپنی زندگی سے حتم کر چکی ہوں، پھر ایسی باتوں، یادوں یا چیزوں کا کیا فائدہ جو آپ کو سوائے تکلیف اور اذیت کے کچھ نہ دیں۔ میں اپنی خواہشوں اور خوابوں کے سارے پرندے فوج کر چکی ہوں۔“

”صرف ایک آخری سوال... تم لوگوں نے اسے اما کے انتقال کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“ نتاشا نے کھوجتی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی انتہائی کمزور اور رنجیدہ سی دوست کو دیکھا۔ اتنے حادثات کے بعد بھی اس کی آب و تاب ویسے ہی قائم تھی۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے ایسا دانستہ نہیں کیا۔ اس کا سارہ کے ساتھ رابطہ تھا جو سارہ کے آرلینڈ جانے کے بعد شاید ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اما کی ڈیوٹی پر عفیوہ آئی نے کہا تھا کہ اس کو اطلاع کر دیں، لیکن سارہ نے ہی بتایا کہ اس کا وہ نمبر مسلسل بند ہے۔ شاید اس نے نمبر تبدیل کر لیا ہو۔ اس سے زیادہ ہم میں سے کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”چلو! ٹھیک، لیکن تم بتاؤ تم نے زندگی کے لیے اب کیا سوچا ہے؟“ نتاشا نے بظاہر سرسری سے انداز میں خاصا اہم سوال کیا تھا۔

”مجھے کیا سوچنا ہے، پہلے کون سا میری سوچوں کے

مطابق ہی ہوا ہے۔“ ایک تلخی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آکر ٹھہر گئی۔

”اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ انسان سوچنا ہی چھوڑ دے۔“ نتاشا نے برا سامنے بنایا۔

”میرا دل نہیں کرتا، کچھ بھی سوچنے کو، بس ایسیا چل رہا ہے، چلنے دو۔“ اس کے چہرے پر تھکن نمایاں ہو گئی۔

”جب سارے فیصلے تم نے خود کیے، پھر اپنے دل کو بھی سمجھاؤ، ایسے زندگی نہیں گزرتی۔“ اس کے اعتماد بھرے انداز پر ارفع نے چونک کر اسے دیکھا جو شادی کے بعد ٹھہر گئی تھی۔

”نتاشا! تمہیں معیاد نہیں آتا؟“ اس کے ایک دم پوچھنے پر نتاشا کے چہرے پر پھیلنے والا تاریک سایہ ارفع سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

”نہیں...“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ ”جب بھی اس کے حوالے سے کچھ ذہن میں آیا تو بس اپنی ذات کی بے وقعتی کے حوالے سے کی جانے والی تذلیل کے لمحات ہی یاد آئے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھا وہ۔ مجھے اس سے محبت تھی، لیکن اس محبت کے بعد مجھے پتا چلا کہ محبت سے زیادہ عزت اہم ہوتی ہے اس نے مجھ سے محبت نہیں کی... نہ کرتا، لیکن میری عزت تو کرتا۔ سارے خاندان میں تمنا بنا کر رکھ دیا۔“ وہ ایک دم ہی پھٹی تھی۔ ”آج مجھے دیکھو ارفع! میں کہاں ہوں اور وہ کہاں؟ میرے رب نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا... ایک محبت کرنے والا شریک حیات، دولت، اسٹیٹس، اولاد، بتاؤ! اس چیز کی کمی ہے میرے پاس...؟ اور وہ کہاں ہے، نہ ڈھنگ کی جاب، نہ پیسہ، نہ سکون، نہ کوئی اسٹیٹس۔ دوسری شادی کی تو پتا چلا کہ اولاد نہیں ہو سکتی۔ اب دوسری بیوی بھی چھوڑ کر چلی گئی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس رہی تھی۔ ارفع نے گہری نظروں سے اسے جانچا۔

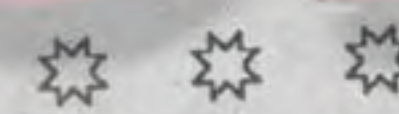
”پلیز نتاشا! ایسے مت ہنسو، اللہ کو یہ سب پسند نہیں۔ یہ تمام چیزیں آتی جانی ہیں۔ ان کا بھروسہ نہیں۔“

”ارفع! میں معیاد پر نہیں، اس محبت پر ہنس رہی ہوں، جس کا راک الپ کر میں نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال اس شخص کے لیے غارت کر دیے تھے۔ خضر ٹھیک کہتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب تم اپنی اس بے وقوفی پر ہنسا کرو گی۔ دیکھو! کتنی جلدی وقت آ گیا۔ میں نے اللہ پر چھوڑا تھا ناں، اس نے میرے لیے بہترین کیا۔“ وہ لاپرواہی سے اپنی پلیٹ لے رہی تھی۔ ارفع نے رشک بھرے انداز سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی تھی۔

”تم اب مجھے انسانوں کی طرح بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟ اپنے اتنے قیمتی سال ایسے ضائع نہ کرو ارفع۔“ ارفع کو اس کے خلوص پر ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

میں نے بھی سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ میرے لیے بھی ویسا ہی بہترین کرے گا جیسا اس نے تمہارے لیے کیا، اس لیے کہ وہ سب جہانوں کا رب ہے۔“

نتاشا جواب ہو گئی۔ اس نے شدید حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی ارفع کو انتہائی پرسکون انداز سے ہاتھ میں پکڑے کپ کی سطح کھرچتے ہوئے دیکھا تھا۔



ماہرہ آبی اور ان کے بچوں کے آنے کی وجہ سے گھر کی رونق میں ایک دم ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ ارفع نے اپنا اسٹوڈیو اب خاصا جدید کر لیا تھا۔ اس نے کافی سارے پراجیکٹس پر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی فارغ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ فراغت کے لمحات اس کے لیے بعض دفعہ بہت اذیت ناک بن جاتے تھے۔ اس کا بہترین حل اس نے مصروفیت میں ڈھونڈ لیا تھا۔

اس کی خواتین پر گھریلو تشدد کے حوالے سے بننے والی ڈاکو منٹری پر نیشنل لیول پر ایوارڈ ملا تھا اور اس کے کام کو خاصی پذیرائی مل رہی تھی۔ وہ دن بہ دن جتنی

مصروف ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی بہنوں کی پریشانی میں بھی ویسے ہی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن بھی وہ بیک کندھے پر ڈالے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی جب کچن سے آتی ماہرہ آپنی نے اسے دیکھا۔

”ارفع! آج پلیر جلدی گھر آجانا۔ میں نے شام کی چائے پر کچھ لوگوں کو انوائٹ کیا ہے؟“ ماہرہ آپنی نے سنجیدگی سے اس کے مصروف انداز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ رستہ واپس کو باندھنے میں الجھی ہوئی تھی۔ ان کی بات پر چونکی۔

”خیریت...؟ کن لوگوں کو انوائٹ کیا ہے جو میری موجودگی ضروری ہے؟“ اس نے اپنے لہجے کو سرسری بنا کر پوچھا۔

”آئی عقیقہ کے جاننے والے ہیں ان کی دوست کا بیٹا ہے۔ لڑکے نے سی اے کر رکھا ہے اور ملٹی نیشنل کمپنی میں اونچی پوسٹ پر ہے۔ بہت ہینڈ سم اور سلجھا ہوا لڑکا ہے اور اکلوتا بھی ہے۔“

ارفع نے سر اٹھا کر الجھن بھرے انداز میں انہیں دیکھا وہ خاصی سنجیدہ تھیں۔

”تو آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔“ اس نے بے زاری سے بیگ کی زپ بند کی تھی۔

”تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں، کیونکہ وہ تمہیں دیکھنے آرہا ہے۔“

”کیوں؟ میں کوئی عجوبہ ہوں یا کوئی تماشا ہوں جسے وہ دیکھنے آرہا ہے؟“ ارفع کے حلق تک کڑواہٹ گھلی تھی۔ ماہرہ آپنی نے سخت ناراض نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھو ارفع! تم بچی نہیں ہو جو تمہیں ان چیزوں کی سمجھ نہیں ہے۔ ماما تمہارے لیے کتنی اپ سیٹ تھیں، اب تم ہم سب کو پریشان مت کرو تمہارے بہنوئی کا پروڈکشن ہاؤس بہت متاثر ہو رہا ہے۔ وہ اسلام آباد مزید نہیں رک سکتے۔ ہمیں کراچی واپس جانا ہے تم ان چیزوں کو کیوں نہیں سمجھتیں۔“

”میں سب سمجھتی ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو پر اہلم ہے تو آپ لوگ جاسکتے ہیں۔ کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ تم ہو، ہم تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ وہ بھڑک اٹھیں۔

”میں اکیلی کب ہوں سارے ملازمین ہیں۔ سب سے بڑی بات رحمت بواہیں اور میں تو ویسے بھی اپنے کام میں بڑی ہوتی ہوں۔ مجھے کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کے بے نیاز انداز پر ماہرہ آپنی تپ کھیں۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے ارفع! تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو، ہمیں بہت پڑتا ہے۔ ہم لوگوں کی بے ہودہ باتیں نہیں سن سکتے۔ اپنی یہ ساری تقریر تم عقیقہ کے سامنے کرنا، وہ تمہاری طبیعت سیٹ کرے گی۔“ ان کا لہجہ درشت اور جھنجھلا یا ہوا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ عقیقہ کا وہ کافی لحاظ کرتی ہے جب کہ ان کے اور سارے کے ساتھ اس کی بے تکلفی تھی اس لیے ہر بات میں بحث پر اتر آتی تھی۔

”میں خود عقیقہ آپنی سے بات کر لوں گی۔ آپ لوگوں کو میرے حوالے سے لوگوں کی بے ہودہ باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں، جس کو کوئی تکلیف ہے وہ مجھے آکر کہے۔“ ارفع کا منہ سرخ ہوا تھا۔

”لوگ ایسے اقوال زریں آپ کے سامنے نہیں پیٹھ پیچھے آکر ارشاد فرماتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تین تین شادی شدہ بہنیں ہیں اور ایک جوان جہان چھوٹی بہن کو اکیلے چھوڑ رکھا ہے۔“ ماہرہ آپنی پھر سابقہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

”جن لوگوں میں اتنی ہمت نہ ہو کہ آپ کے منہ پر آکر بات کر سکیں، میں ایسے لوگوں کی پروا نہیں کرتی۔ جن لوگوں کو شام میں چائے پر بلوایا ہے، ان سے میری طرف سے معذرت کر لیں۔ میرا ابھی ایسی نمائشی پریڈ کا کوئی ارادہ نہیں۔“

اپنی بات کر کے وہ رکی نہیں تھی۔ ماہرہ نے اپنے اندر اچھی اشتعال کی لہر کو بمشکل دبایا تھا۔ ارفع کا یہ دو ٹوک انداز انہیں سخت ناگوار گزرا تھا۔ وہ غصے میں اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ آج عقیقہ سے بات کر کے انہیں ارفع کی ہٹ دھرمی کے

بارے میں بتائیں گی۔ وہ دوبارہ اس موضوع پر اب خود ارفع سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں اس پر شدید غصہ تھا اور ابھی تو شام کو آنے والے مہمانوں کو کس طرح سے ٹالنا تھا، اس سوچ نے ان کی جھنجھلاہٹ اور کوفت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ارفع کا آج کا سارا دن ہی بے کار گزرا تھا۔ آؤٹ ڈور ریکارڈنگ پر کیمرے میں ہونے والی فنی خرابی نے اس کا موڈ خاصا خراب کر دیا تھا۔ اس کا اسسٹنٹ بھی آج دماغی طور پر غیر حاضر تھا۔ ٹیم کے دیگر لوگ بھی گرمی اور دھوپ کی وجہ سے خاصے بے زار تھے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید کہیں سے بادل جھومتے جھامتے آئی جائیں۔ وہ گرمیوں کی ایک خاموش سی دوپہر تھی فضا میں عجیب سی بے دلی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ املتاس کے پیلے پھولوں سے لدے درختوں کے نیچے کھڑی اپنے اسسٹنٹ کو کیمرے سے نبرد آزما ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سورج کی مکمل روشنی میں املتاس کے درختوں کے کچھ سین لینے تھے۔ اس لیے بادل خواستہ آؤگئی تھی، لیکن آکر سخت پچھتا رہی تھی۔ یہ پنڈی کا کوئی گاؤں تھا اور پورے دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔

اس نے سامنے پہاڑوں پر پھیلتی دھوپ اور اداسی کے رنگوں کو اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں ان کے ملنے جلنے والے اس کو یا اس کی بہنوں کو بھی ڈسکس کرتے ہیں۔ اس کا تعلق جس کلاس سے تھا، وہاں کسی کے پاس بھی ایک دو سرے کی ذاتیات کو ڈسکس کرنے کا کہاں وقت ہوتا ہے، لیکن یہ اس پر آج اور اک ہوا تھا کہ طبقہ کوئی بھی ہو، لوگ دوسروں کی ذات پر بات کرنے کا وقت کہیں نہ کہیں سے نکال ہی لیتے ہیں۔ دوسروں کے زخموں کو کریدنا اور ان سے لطف اندوز ہونا تو ویسے بھی کچھ لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ

ہوتا ہے۔ چھوٹی ذہنیت کی کوئی کلاس نہیں ہوتی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ کیمرے کا فالٹ میں کوشش کے باوجود نہیں تلاش کر پایا۔ اسے کسی ایکسپرٹ کو دکھانا پڑے گا۔“ اس کا اسسٹنٹ ساجد بازو کی پشت سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے اکتائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ارفع نے چونک کر اس کی بے زار شکل دیکھی۔

”کیا ہوا ہے ساجد...! طبیعت ٹھیک ہے؟“ ارفع نے اسے غور سے دیکھا۔

”جی نہیں میڈم! عجیب سی طبیعت ہے۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کر رہا۔“ وہ متذبذب انداز میں اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

”گھر میں سب خیریت ہے ناں؟“ اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔ وہ سب کو ایک فاصلے پر ہی رکھتی تھی۔

”جی! خیریت ہے۔ بس دل ہی ایک عجیب سی ضد پر اتر ا ہوا ہے۔ اس کی اپنی ہی منطقیں ہیں۔ جو چیز اسے بھاتی ہے اس کے لیے خود سے ہزار دلیلیں گھڑ لیتا ہے اور جو نہ بھاتی ہو وہ ہیرے کی ہی کیوں نہ ہو دس ہزار برائیاں اس میں ڈھونڈ لیتا ہے۔“ ساجد بہت عجیب سے انداز میں ہنسا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا اور پچھلے چند سال سے ارفع کے ساتھ تھا۔ ارفع بھی خود ترسی میں مبتلا ہوئی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو ساجد! ایسا ہی ہوتا ہے لیکن ہم جیسے لوگ جو اپنی باگیں دل کے ہاتھوں میں پکڑا دیتے ہیں وہ بہت خوار ہوتے ہیں۔ دل پر پاؤں رکھنا سیکھو۔“ اس نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے نصیحت کی۔ وہ اب جانے کے لیے تیار تھی۔

”جیسے آپ نے سیکھ لیا ہے۔“ ساجد کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ ارفع نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے فوراً ”نظریں چرائیں۔“

”سب سامان گاڑی میں رکھواؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں نکلنا چاہیے۔“ ارفع کا انداز قدرے سخت اور دو ٹوک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ساجد اس کے اور خضر کے

بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ شروع شروع میں اس نے پوچھنے کی بھی کوشش کی، لیکن ارفع سے جھاڑ کھانے کے بعد دوبارہ اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

اس کی گاڑی جب اپنے سیکڑ میں داخل ہوئی اس وقت شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے ماحول کو ایک اداس سارنگ دے دیا تھا۔ اس کا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن وہ آگئی تھی۔ اس کی گاڑی روش سے پور ٹیکو کی طرف رواں دواں تھی۔ اپنے گلاسز اتار کر اس نے ڈیش بورڈ میں رکھے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اسی وقت ایک بال اڑتی ہوئی اس کے پیروں میں آگری۔ لش گرین لان سے ایک ڈھالی سا لہ انتہائی کیوٹ سی بچی بھاگتے ہوئے اس طرف آئی تھی۔ اس کے پیچھے ماہرہ آپنی کا چار سالہ بیٹا سنی تھا۔ بچی خاصی صحت مند اور پیاری تھی۔ اس نے گلابی رنگ کے اسکرٹ پر سفید ٹاپ پہن رکھا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید اور آنکھوں کا رنگ ہیزل گرین تھا۔ اس کے سیاہ سلی اور گھنے بال ایک پونی میں قید تھے۔ اس کے بالوں میں گلابی اور سفید ہی رنگ کی خوب صورت پنیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کو پھیلانے دیکھ رہی تھی۔

”ہائے سویٹ ہارٹ“ اس نے سنی کے ساتھ اس گڑیا کو بھی پیار کیا اور اشارے سے سنی سے پوچھا۔

”کیا گھر میں کیٹ آئے ہوئے ہیں؟“

”یس آئی۔۔۔!“ سنی نے بال اٹھاتے ہوئی انتہائی مصروفیت بھرے انداز میں جواب دیا۔ اس کا موڈ ایک دم ہی خراب ہوا۔ لگتا تھا کہ ماہی آپنی نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود مہمانوں کو بلا لیا تھا۔ ارفع کا چہرہ واضح انداز میں بجھا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز سے اندر بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ وہ ٹھنک کر اپنی جگہ پر جم گئی۔ اس کا دل پوری رفتار سے دھڑکا تھا۔ سامنے صوفے پر تھکے تھکے انداز میں نیم دراز خضر کو دیکھ کر اس کے قدم ساکت ہو گئے تھے۔ اس کے بالکل پاس

سنگل صوفے پر انتہائی خاموش سی ماہی آپنی بیٹھی تھیں۔ ارفع چند لمحے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں کھڑی رہی، پھر اس نے بہت سرعت سے خود کو سنبھالا تھا۔

”السلام علیکم! کیسی ہو ارفع۔۔۔؟“ خضر کی گہبھر آواز آج پورے ساڑھے تین سال بعد اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہو؟“ اس نے حلق میں اٹکتے گولے کو بمشکل نگلا تھا۔ بھاری قدموں کے ساتھ صوفے تک پہنچنا ایک دشوار کن مرحلہ تھا۔ وہ بالکل اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا وہ خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی نمایاں تھے۔

”تم کب آئے پاکستان؟“ وہ خود پر قابو پا کر اعتماد سے بولی۔

”میں صبح دس بجے آیا تھا۔ اب تو آئے ہوئے بھی آٹھ نو گھنٹے ہو گئے ہیں۔“ وہ اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا اور بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ارفع کو اس کی نظروں کا ارتکاز کرب میں مبتلا کر رہا تھا۔ ماہرہ آپنی خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ دونوں ہی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کریں۔ ایک بو جھل سی خاموشی کا وقفہ درمیان میں آیا تھا۔ اس وقفے کو خضر نے ہی ختم کیا تھا۔

”میری بیٹی فاطمہ سے ملی ہو تم؟“

”ہوں! ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہے۔“ ارفع نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہت زیادہ شرارتی ہے۔۔۔ پلوٹہ کی ڈنٹھ کے بعد اسے سنبھالنا میرے لیے بہت مشکل مرحلہ تھا۔“ وہ اتنے سادہ انداز میں بتا رہا تھا کہ ارفع ششدر رہ گئی۔

”پلوٹہ کی ڈنٹھ۔۔۔ کب ہوئی اس کی ڈنٹھ۔۔۔؟“

تم نے بتایا ہی نہیں۔۔۔“ وہ دم بخود اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”تم لوگوں نے ماما کے انتقال کا مجھے بتایا تھا۔۔۔؟“ وہ انتہائی آزدگی اور تاسف سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے نناشا

نے بتایا، جب ان کی وفات کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مجھے کتنا شاگ لگا تھا۔ میں کتنے ہی ماہ اس صدمے سے نکل ہی نہیں پایا کہ تم لوگوں نے مجھے اتنا غیر سمجھا۔ میں اسی دنیا میں تھا۔ میرا سیل نمبر تبدیل ہوا تھا۔ لیکن ای میل ایڈریس، پوسٹل ایڈریس سب کچھ تو وہی تھا۔“ وہ آزدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

ارفع اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ اس وقت کتنی اذیت سے گزرا ہو گا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بے سبب صوفے کی تھیلی پر لیکرس کھینچ رہی تھی۔

”بس ماما کی اچانک ڈنٹھ نے اتنا بوکھلا دیا کہ کئی ماہ تک ہمیں خود بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے؟ اس کے بعد سوچا کہ تمہیں بتا دوں، پھر خیال آیا کہ تم اپنی بیمار بیوی کو دیار غیر میں چھوڑ کر کیسے آؤ گے؟“ اس نے بمشکل صفائی دی تھی۔

”پلیز ارفع! کم از کم میرے ساتھ جھوٹ مت بولو۔ مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ تم اپنی زندگی کی کتاب سے میرے نام کے صفحات ہی پھاڑ چکی ہو۔ تم لوگوں نے دانستہ طور پر مجھے نہیں بتایا۔“ وہ تھوڑا سا رخ ہوا۔

”ہاں! پھر تم نے بھی دانستہ طور پر ہمیں نہیں بتایا“

”ہے ناں۔۔۔؟“ ارفع نے فوراً اس کی بات قطع کی۔

”یہ ایسے بدلے لینے تم نے کب سے شروع کر دیے خضر!“

اس کی بات پر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔

”میری تو مجبوری تھی۔ ایک ڈر اور خوف تھا کہ پلوٹہ کو ماما جانتی تھیں۔ عفیوہ آپنی نے بھی دیکھ رکھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ میری بیوی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موت کے بعد بھی کوئی اس کے بارے میں غلط کمٹس دے۔“

اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”خضر! کیا تمہیں ہم لوگ اتنے جاہل لگتے تھے کہ کسی مرے ہوئے بندے کے بارے میں غلط

کمٹس دیتے؟ یہ سب تمہارے خود ساختہ خوف تھے جب کہ تمہیں اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ سب جانتے ہیں کہ تم سے شادی سے انکار میں نے کیا تھا۔ اس کے بعد تم کسی سے بھی شادی کرتے، ان کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔“ طیش کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی اور سارے وجود پر چھا گئی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو ارفع! وہ سب میرے خود ساختہ خوف تھے۔ میں نے پلوٹہ سے شادی تو کر لی تھی، لیکن ساری زندگی اس خوف سے نہیں نکل پایا کہ ماما اور عفیوہ آپنی کو پتا نہ چل جائے۔“ وہ زبردستی مسکرایا تھا۔

”کیا ہوا تھا پلوٹہ کو۔۔۔؟“ لفظ اس کے حلق سے بمشکل برآمد ہوئے تھے۔

”نروس بریک ڈاؤن۔۔۔!“ ایک تاریک سایہ اس کے چہرے پر لہرایا۔ ”بہت حساس دل لڑکی تھی۔ جتنا عرصہ زندہ رہی، اس کو یہی لگتا رہا کہ میں نے اس سے شادی کر کے شاید دنیا کا سب سے عظیم اور انوکھا کام کیا ہے۔ وہ مجھے بار بار کہتی تھی کہ میں دوسری شادی کر لوں، کیونکہ اسے لگتا تھا کہ شاید میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے رویوں اور سوالات سے بہت عاجز تھی جب فاطمہ پیدا ہوئی تو ہم نے فلپائنی آیا رکھ لی، کیونکہ فاطمہ نے جیسے ہی ہوش سنبھالا وہ اس کے پاس آنے سے۔۔۔ بھجکتی تھی۔ یہ بات اسے بہت تکلیف دیتی تھی۔ ایک رات جب سوئی تو اس سے اگلے دن بیدار ہی نہیں ہوئی۔“ اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بمشکل ہی سن پائی تھی۔

”کتنا عرصہ ہو گیا اس کی ڈنٹھ کو؟“ ارفع نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”چھ ماہ ہونے کو ہیں۔ فاطمہ کی دوسری سالگرہ کے تین ماہ بعد۔“

”تو تم نے اتنی چھوٹی بچی کو اکیلے کیسے سنبھالا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ اس کی آیا ساتھ تھی، لیکن پھر وہ بھی واپس اپنے ملک چلی گئی۔ اب

پچھلے دو ماہ سے میں خود سنبھالتا ہوں۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

”سب دوستوں نے سمجھایا کہ پاکستان واپس چلے جاؤ۔ وہاں کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا کیونکہ وہ اب بڑی ہو رہی ہے اور اسے بعض دفعہ بھلانا بہت مشکل لگتا ہے۔ اس لیے یہاں آیا ہوں اور ماہی آپ سے کہا ہے کہ رحمت بوا کو بھیج دیں، لیکن وہ کچھ تذبذب کا شکار ہیں۔“ وہ تھوڑا سا پریشان تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ فاطمہ اور سنی ایک دوسرے کے پیچھے داخل ہوئے۔ فاطمہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا وہ خالصتاً ”برطانوی لہجے میں انگلش میں اپنے پیار کو رو بن چڑیا کے بارے میں بتا رہی تھی جو اس نے لان میں دیکھی تھی۔ وہ خاصی پر اعتماد بنی تھی۔ اس کا اندازہ ارفع کو اس کی گفتگو سے ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں سنی مختصر کی وجہ سے کچھ جھجک رہا تھا۔

”خضر! میں نے رحمت بوا سے بات کی ہے۔ وہ چلی جائیں گی، لیکن ابھی فی الحال تم سکون سے نہیں رہو۔“ ماہرہ آپنی اپنی بیٹی کا فیڈر ہلاتے ہوئے اندر آئی تھیں۔

”تھینکس گاڈ! آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ آپ نے میری کتنی بڑی مشکل آسان کر دی۔“ وہ کچھ پرسکون ہوا۔

”ویسے خضر! لگتا ہے کہ تمہاری بیوی خاصی خوب صورت تھی۔ تمہاری بیٹی نے سوائے تمہاری کھڑی ناک کے علاوہ کوئی بھی نقش نہیں لیا۔“ ماہرہ آپنی بے تکلفی سے کہہ رہی تھیں۔

ان کی بات پر خضر نے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔ ارفع کو ایک شدید بے چینی نے گھیر لیا تھا۔ اس نے بہت غور سے اس معصوم سی گڑیا کی شکل کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی مسکرا مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔ ارفع نے اس کے پھولے پھولے گالوں کو آستکی سے چھوا تھا۔ وہ تھوڑا سا شرمناک تھی۔

”یہ بہت شرارتی ہے ماہی آپ! میرے سونے کے

بعد خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے اور لان میں گھریلوں کے پیچھے بھاگتی ہے۔ مٹی میں سارے کپڑے گندے کر لیتی ہے۔“ وہ بہت محبت سے بتا رہا تھا۔

”سارے بچے ہی بہت شرارتی ہوتے ہیں۔ تم کون سا کم تھے۔ بھری دوپہر میں ارفع کو لے کر باہر نکل جاتے تھے۔ ایک دفعہ یاد نہیں، تم دونوں بچپن میں کم ہو گئے تھے اور پھر مختلف علاقوں میں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرایا تھا؟“ ماہرہ آپنی نے ہنستے ہوئے یاد دلایا تھا۔

وہ ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہوا تھا۔ ارفع کے لیے بھی وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ دل کو ایک بے چینی سی لاحق تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی ایسے واپس بھی آ سکتا ہے۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ شاور لے کر جو لیٹی تو اسے فوراً ہی نیند آ گئی۔

ماہرہ آپنی جو کھانے کے لیے اسے بلانے آئی تھیں، اسے گہری نیند میں دیکھ کر پھر واپس چلی گئیں۔

اگلے تین دنوں کے لیے اسے پشاور جانا پڑ گیا تھا۔ وہ وہاں خاصی مصروف رہی۔ واپس آئی تو ماہرہ آپنی ہی سے اسے پتا چلا کہ خضر آج کل کوئی فیکٹری لگانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی خاصا مصروف تھا۔ فاطمہ کی دیکھ بھال ابھی ماہرہ آپنی اور رحمت بوا ہی کر رہی تھیں۔

”خضر کی بیٹی ماشاء اللہ بہت ذہین ہے، بہت باتیں کرتی ہے۔“ کھانے کی میز پر ماہرہ آپنی اسے بڑے خوشگوار انداز میں بتا رہی تھیں۔ وہ خاموش رہی۔

”میں نے خضر سے کہا کہ یہ بالکل تم پر گئی ہے اور لگتا ہے کہ تمہاری طرح ایک بولڈ اینکو پرسن بنے گی۔“

ماہرہ آپنی ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے خاصی خوش تھیں۔ اس کا اندازہ ان کی باتوں اور لہجے سے بخوبی ہو رہا تھا۔

”وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ارفع نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اور یہ کہ اسے کسی اچھے انسان سے شادی کرنی چاہیے۔“ چکن جل فریزی کے ڈونٹے کی

طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ فضا میں معلق ہوا۔ ایک ناگواریت کا بڑا گہرا تاثر بڑے واضح انداز میں اس کے چہرے سے جھلکا تھا۔

”کیوں؟ اس کو میری شادی ہونے یا نہ ہونے سے کیا برا بھلا ہے؟ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے، وہ کون ہوتا ہے ایسا کہنے والا؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا چچ پلیٹ میں پٹخا تھا۔ ماہرہ آپنی نے سخت حیرت سے اس کا رد عمل دیکھا۔

”کیا ہو گیا ارفع! وہ ہمارا فرسٹ کزن ہے اور پھر تمہارا وہیسٹ فرینڈ رہا ہے۔ اس میں اتنا زیادہ مشتعل ہونے کی کیا بات ہے؟“

”وہ میرا فرسٹ کزن ہے۔ لیکن شادی میرا بالکل ذاتی مسئلہ ہے۔ اس میں مجھے کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں، خواہ وہ خضر حیات ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈائننگ روم میں آتے خضر نے بڑے تعجب اور حیرت سے اس کا یہ آخری جملہ سنا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ واپس پلٹتے ہوئے وہ ایک لمحے کو ٹھکی اور اگلے ہی لمحے وہ تیر کی طرح سے وہاں سے نکل گئی۔

”اسے کیا ہوا۔۔۔؟“ وہ ہاتھ کے اشارے سے پوچھ رہا تھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔۔۔ اور کیا ہونا ہے۔“ ماہرہ آپنی ٹھٹھا کر بولیں۔ ارفع کا یہ انداز انہیں خاصا مشتعل کر رہا تھا۔

”ٹیک اسٹ ایزی۔۔۔! وہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ ”آپ آرام اور سکون سے بات کریں، آپ کو پتا تو ہے کہ وہ کتنی جذباتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک جاتی ہے۔“

”یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ تم سے شادی سے انکار اس نے خود کیا۔ ہم سب نے سمجھایا۔ لیکن اس نے اپنی ہٹ دھرمی نہیں چھوڑی۔ ماما اس کی وجہ سے اتنا آپ سیٹ رہیں۔ اب اس نے مجھے تنگ کر رکھا ہے۔“ ماہرہ آپنی اس سے حد درجہ بے زار تھیں اس کا اندازہ ان کے لہجے سے خضر کو بخوبی ہو رہا تھا۔ اسے حد

درجہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ ماہرہ آپنی کو اصل حقیقت بتا دے، لیکن پھر مصلحتاً ”چپ رہا۔“

شام کو وہ کافی کامک اٹھائے لان میں آیا تو وہ سامنے سیڑھیوں پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ارفع نے ایک لمحے کو چونک کر اسے دیکھا، پھر سامنے لان میں لگے فوارے پر نظر جمادی۔

”ارفع! میں نے سوچا ہے کہ میں ماہی آپنی عفیوہ آپنی اور سارہ کو اصل بات بتا دوں۔ وہ جو ہر وقت تمہیں الزام دیتی رہتی ہیں یہ سلسلہ تو ختم ہو۔“ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”اس سے کیا ہو گا۔۔۔؟“ اس کا انداز خضر کو بہت ساٹ لگا۔

”اس سے کم از کم ان کو حقیقت تو پتا چلے گی ناں۔۔۔! اور دوسرے میرے ضمیر کا بوجھ کم ہو جائے گا۔“ اس کی آواز دھیمی ہوئی۔

”پھر کیا ہو گا؟ وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔“ وہ اس کا رٹا لے کر تمہیں کوئی ایوارڈ دیں گی یا مجھے اتنی بڑی بات آسانی سے سہ جانے پر کوئی میڈل دیں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ سب تجھے جھاڑ کر تمہارے پیچھے بڑ جائیں گے۔ کسی کو یہ یاد نہیں رہے گا کہ تم نے کوئی نیکی کی تھی۔ سب کو میرا دکھ یاد رہے گا۔ اس کے بعد ایک اور تماشا شروع ہو جائے گا۔ مجھ پر نہ سہی، اپنی معصوم بیٹی پر رحم کھاؤ۔ یہاں کسی کا طرف اتنا برا نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ زمین پر رکھ کر اس کا دھواں دھواں چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

”یہ جو ماہی آپنی تمہاری بیٹی پر متاثراتی پھر رہی ہیں ناں، اس حقیقت کو جاننے کے بعد سب سے زیادہ اس کے اور اس کی مری ہوئی ماں کے خلاف زہرا اگیں گی۔ خضر حیات! اب جذباتیت چھوڑ دو۔ زندگی اتنی آسان نہیں ہے اور نہ ہی۔ تین گھنٹے کی کوئی فلم ہے جس کے بعد سب اچھا ہو جاتا ہے۔“ اس کے انداز میں

محسوس کی جانے والی ناراضی کی جھلک تھی۔
”ٹھیک ہے! پھر تم شادی کر لو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو؟“ خضر نے اچانک کہا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں؟“ اس نے کڑے انداز سے اسے گھورا۔

”تو پھر یہ کیا ہے؟ پراجیکٹس، ڈپلومے، ڈاکومنٹریز خود کو اتنا بڑی کر رکھا ہے، جب شادی کرنی ہی ہے تو وقت پر کر لو۔ کم از کم ہم سب کی ٹینشن تو ختم ہو۔“ وہ بھی تھوڑا سا ناراض ہوا۔

”تو تم سب لوگوں کو کس نے کہا ہے کہ میری ٹینشن لو؟ تم سب کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ مجھے جو کام کرنا ہے، میں کر لوں گی۔ مجھے تم سب لوگوں کے ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں۔“ اس نے انتہائی غصے سے اپنا سرخ قدرے موڑ کر چائے کا گلاس اٹھالیا۔

”ہم تمہیں ڈکٹیشن نہیں کر رہے ارفع! ہم سب کو تم سے محبت ہے اور تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔“ اس نے خود پر قابو پا کر قہقہے سے کہا۔

”تم خود کیوں نہیں دوسری شادی کر لیتے، جب کہ تمہاری بیٹی کو تو ضرورت بھی ہے؟“ تلخی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔ وہ اس کی بات پر زبردستی مسکرایا۔

”میں ایک تجربے کے بعد جان چکا ہوں کہ میں ایک اچھا شوہر نہیں بن سکتا۔ میں اپنی تمام تر کوشش اور محبت کے باوجود جب پلو شہ کو خوش نہیں رکھ پایا تو کسی اور کو کیا رکھ پاؤں گا۔“ اس کا چہرہ تناؤ کا شکار ہوا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ وہ تم سے خوش نہیں تھی؟“ ارفع نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہر بات کہنے والی تھوڑی ہوتی ہے۔ اسے میری محبت مجبوری اور ترس کے ریسر میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے وہ اکثر خود کو گلی محسوس کرتی تھی۔ یہی وہ سوچیں تھیں جنہوں نے اس کی زندگی کی ڈور کو کاٹ دیا۔ میرے ساتھ خوش ہوتی تو کیا اسے نروس بریک ڈاؤن ہوتا؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے

اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا۔ ارفع نے بے ساختہ اپنی نظریں اس سے چرائی تھیں۔

”بابا! یہ میری بیٹی فلائی مرگئی۔“ فاطمہ آنکھوں میں مونے مونے آنسو لیے بھاگتے ہوئے آئی۔ وہ اپنا ہاتھ کھول کر مری ہوئی تیلی باپ کو دکھا رہی تھی۔ اس کے پیچھے سنی بھی بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا سانس بے ربط تھا۔

”انکل! میں نے اسے منع کیا تھا کہ اسے زور سے مت پکڑو، لیکن یہ کہتی تھی کہ میں اسے پیار کر رہی ہوں۔ اس نے زور سے پکڑا اور بیٹی فلائی مر گئی۔“ سنی نے جلدی جلدی وضاحت کی۔

”بابا! پیار کرنے سے بھی کوئی مرتا ہے کیا؟“ فاطمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ارفع نے بے ساختہ ہی اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ ارفع کے ساتھ لگانے پر وہ ہچکچاہٹ لے کر رونے لگی۔

”ہاں بیٹا! کچھ لوگ پیار کرنے سے بھی مر جاتے ہیں جیسے آپ کی ماما۔“ خضر کے لہجے سے بے ساختہ ہی دکھ جھلکا تھا۔

”خضر! یہ کوئی بات ہے بھلا بچوں سے کرنے والی؟“ ارفع نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

خضر نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ وہ دانستہ خاموش رہا تھا۔ ارفع نے بہت جلدی فاطمہ کو بہلا لیا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد دوبارہ ایک اور تیلی کی تلاش میں سنی کے ساتھ نکل گئی۔

”خضر! تم شادی کر لو۔ اپنے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کے لیے۔“ وہ خلوص دل کے ساتھ بہت نرمی سے کہہ رہی تھی۔

”تم کرو گی مجھ سے شادی۔“ وہ بہت بے رحم انداز کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ ارفع نے بے ساختہ ہی نظریں چرائی تھیں۔

وہ ان دونوں کی زندگی میں آنے والی ایک خوب صورت سی گلابی شام تھی۔ ایسی شام جس کے دامن

میں ہجر کی کوئی رات نہ تھی۔ آسمان پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے انگلیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے نم جھونکے بتا رہے تھے کہ نزدیک ہی کہیں بارش ہو رہی ہے۔ ویسے بھی ساون کی بے وقت کی بارشوں کا پتا بھی کہاں چلتا ہے۔ بہت عرصے کے بعد ساون ان دونوں کو اچھا لگا تھا۔ ہلکی ہلکی کن من سی شروع ہو گئی تھی۔ ان کی گاڑی ایرپورٹ کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

بلیو جینز پر سفید کرتا پہنے سیاہ گلاسز میں وہ آج پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ممتا کا نور اس کی دلکشی میں مزید اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ اس نے دائیں کندھے پر سفید رنگ کا ایک اسٹائلش سائیکل لٹکا رکھا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی چار سالہ کیوٹ سی بیٹی کا ہاتھ تھام رکھا تھا جس نے گلابی رنگ کا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر ایرپورٹ پر لوگوں کی چہل پھل دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ سیاہ پینٹ اور سرمئی رنگ کی شرٹ میں اس کا باپ تھا۔ جس نے اپنی گود میں اپنے چھ ماہ کے بیٹے کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے اپنا ٹرائی بیگ کھینچتا ہوا لایا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بر سکون مسکراہٹ تھی۔ وہ بہت عرصے بعد کھل کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے دیکھا اس کی بیٹی نے ماں سے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور وہ سامنے ایک جوڑے کے ساتھ جانے والی تین سالہ بچی کی طرف بھاگی تھی جس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ سی گیند تھی۔

”فاطمہ! فاطمہ! واپس آؤ بیٹا۔“ اس کی ماں اسے بلا رہی تھی۔ جب کہ وہ اس بچی کے ساتھ بڑے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملا رہی تھی۔

”بہت شرارتی ہو گئی ہے یہ۔“ وہ انتہائی محبت بھرے انداز سے اپنے شوہر سے بولی۔ ان دونوں کی آج لندن کے لیے فلائٹ تھی۔ وہ لوگ چھٹیاں گزارنے کے لیے تین ماہ کے لیے باہر جا رہے تھے۔ ”ہری بات فاطمہ! بال واپس دو۔“ اس نے اپنی

بیٹی کو ڈانٹا جو کہ دوسری بچی سے زبردستی گیند لے چکی تھی۔ وہ دونوں اس جوڑے کے پاس پہنچ گئے جو کہ انتہائی خوشگوار انداز سے فاطمہ کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ ان کی بیٹی منہ بسور رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔۔۔!“ اس کی ماں نے مچلتی ہوئی فاطمہ کے ہاتھ سے گیند زبردستی لے کر اس بچی کو تھمائی۔ ”اٹس اوکے!“ اس بچی کی ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہے بالکل آپ کی طرح۔“

”تھینکس۔۔۔!“ وہ خوش دلی سے ہنسی۔

”آپ کی بیٹی کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے۔“ وہ خاتون مزید کہہ رہی تھیں۔ ان کی بات پر اس نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا جو قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”آف کورس۔۔۔!“ وہ دونوں میاں بیوی اکٹھے بولے۔ ان کی بات پر وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس جوڑے نے خوشگوار حیرت سے اس کے شوہر کو دیکھا جو انتہائی محبت بھرے انداز سے کہہ رہا تھا۔

”ارفع! تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔۔۔؟“

”مجھے یقین ہے خضر! کہ میری بیٹی کی شکل مجھ سے بہت ملتی ہے۔“ اس نے فاطمہ کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے بہت اطمینان سے کہا۔

اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اس قدر روشنی تھی کہ خضر کے لیے اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا انتہائی دشوار لگ رہا تھا۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی۔ اس کی قسمت میں لکھے ہجر کے سالوں کے بعد ملنے والا ایسا ستارہ، جو اس کی زندگی میں بالآخر روشنی لے آیا تھا۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو بارش کی بو چھاڑ سے بچایا تھا۔ وہ بارش کے قطروں کو محسوس کر کے فلقاریاں مار رہا تھا۔ خضر حیات نے جہاز میں اپنے ساتھ بیٹھی ارفع عزیز کو دیکھ کر اطمینان اور سکون سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اسے لگا تھا کہ وہ ایسا ابن آدم ہے جسے اپنی گمشدہ جنت واپس مل گئی تھی۔

سکس سحر عمان

”کیا تم خوش رہ پاؤ گی؟“
عجیب سوال تھا۔ اس کی آنکھوں میں کربیاں چھنے لگیں لیکن وہ پھر بھی مسکرا دی۔

”جب کتاب زیست سے محبت کا باب ہی مٹا ڈالا ہے تو خوشی غم کا سوال کیسا علی...! جینا تو پڑتا ہے نا“
چاہے خوشی سے جیویا اداسی سے... زندگی کے دن تو پورے کرنے پڑتے ہیں نا۔“

”لیکن مہو! ہم جدا ہونے کے لیے تو نہیں ملے تھے۔“ اس کی مضطرب پلکیں دل کی دنیا تاراج ہونے پر ماتم کنناں تھیں مگر اس کے سامنے کھڑی لڑکی کا حوصلہ نکال تھا۔

”مگر وصل قسمت سے ملتا ہے علی! اس کے نرم پیروں میں کوئی کنکر چبھتا تھا وہ ”سی“ کر کے رہ گئی اور پھر جھک کر اپنے گلابی پیر کی ایڑی دیکھنے لگی۔ معمولی سے کنکر نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لیا تھا شاید! اس کی ایڑی پہ چھوٹا نشان بن گیا تھا۔ اسے ہمیشہ ساحل کے کنارے پرنگے پاؤں چلنے کی عادت تھی۔ وہ جوتے وہیں چھوڑ آتی تھی جہاں سے وہ سنگ چلنے کا آغاز کرتے تھے۔ اس نے شروع سے ہی واپسی کے لیے ایک در کھلا رکھا تھا۔

علی ارسل کے پورے وجود میں اس قدر نشتر پیوست تھے کہ اسے یہ احساس ہی نہ رہا کہ وہ مہرین ابراہیم کی معمولی سی تکلیف پر بھی تڑپ جایا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نمی اس کے دل کو بے چین سا کر دیتی تھی اور پھر وہ کتنے بہانوں سے کتنے جتن کر کے اس کے گلاب ہونٹوں پہ ہنسی کی شفق پھوٹے

دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہنستی جاتی تھی اور وہ اپنی محبت پر مسرور ہوتا رہتا مگر آج اس کے اپنے دکھ اتنے تھے کہ وہ مہرین ابراہیم کی یہ تکلیف فراموش کر گیا۔ وہ اب قدرے لڑکھڑاتے ہوئے چل رہی تھی۔ علی ارسل نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا اور نہ اس نے سہارا مانگا تھا۔

”محبت کے سفر میں تپتے صحرا کو آبلہ پا طے کرنا ہوتا ہے علی! ہجر کا سورج سر بر تار تار ہے اور ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ ہم کسی نخل و گلستان کی امید پر چلتے رہتے ہیں برگ آوارہ کی تلاش میں... لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم فوراً پر آکر رک جاتے ہیں۔ یہاں خبر ہوتی ہے کہ سراب کیا ہے حقیقت کیا ہے۔ جدا ہونے کے لیے بہت سا حوصلہ چاہیے ہوتا ہے علی! پھڑک کر ہر کوئی نہیں جی لیتا... زندگی جینے اور اسے گزارنے میں بھی بہت فرق ہے مگر فیصلہ تو کرنا پڑتا ہے۔ وصل یا فراق... محبت انسان کے اختیار میں نہیں تو تقدیر کیسے ہو سکتی ہے؟“

وہ اب رگ گئی تھی۔ علی ارسل بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہر گیا۔

سرمنی سمندر کی لہروں میں عجیب سی بے یقینی تھی۔ وہ کبھی ساکت ہو جاتی تھیں اور کبھی دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہونے لگتیں۔

”تم اتنے خاموش کیوں ہو علی!“
”تمہارے اس فیصلے نے میرے لب سی دیے ہیں مہو! میرے ہونٹوں پہ قفل پڑ گیا ہے۔ گو کہ میرے ذہن دل میں ان گنت سوال اٹھ رہے ہیں۔ میں تم سے



ہو۔ کوئی خیال تمہارے بغیر نہیں۔ گہری سوچ تمہارے بن ادھوری ہے۔ یہ ریت رواج ہماری محبت سے بڑھ کر ہیں کیا؟ میں نے سو دویاں سے الگ ہو کر تم سے محبت کی تھی اور تم مجھے اس لیے چھوڑ رہی ہو کہ تمہاری برادری میں باہر رشتہ نہیں کرتے۔ کیا پہلے تمہیں یہ معلوم نہ تھا؟“

”علی! میں نے تمہیں آغاز میں ہی یہ سب بتا دیا تھا۔“ وہ اس کی بات پر حیران سی ہو کر بولی تھی۔

پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تم کو جدا ہونا تھا تو ملی کیوں تھیں مجھے... لیکن میں جانتا ہوں تمہارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہو گا۔ تم مجھے لا جواب کر دو گی مگر مہو! تمہیں ایک بات بتا دوں میں تم سے پچھڑ کر زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں رہ ہی نہیں سکتا تمہارے بن... اس کی آواز بھرانے لگی۔

”میں نے کب کب تمہیں نہیں سوچا۔ زندگی کے ان چھ برسوں میں تم میل پل یاد بن کر میرے ساتھ رہی

Powered by
IBL

Talian Bajana Chor Dain



istemal karein
MOSFREE
MACHAR KI
NO ENTRY

SEARLE

FIREBOLT 63

”مگر تم نے کہا تھا کہ ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔ محبت کوشش سے نہیں ہوتی لیکن اس کا حصول کوشش سے مشروط ہے۔“

”تب میں بہت خوش گمان تھی علی! کہ ہمارا خلوص میں ایک کردے گا لیکن پچھلے ڈیڑھ سال سے میں نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا تمہیں پالنے کے لیے مگر موائے الزامات اور پابندیوں کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اب الزام سہتے سہتے تھک چکی ہوں۔ تم مرد ہو، خود مختار ہو۔ اپنی منوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو لیکن میں نہ خود مختار ہوں نہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر کچھ کر سکتی ہوں۔ مجھے عزت کے ساتھ محبت دینا ہے۔ میں محبت کو داغ نہیں بنانا چاہتی۔“

”تم نے ٹھیک نہیں کیا میرے ساتھ مہر! وہ روئے کو تھا۔“

”میرے ساتھ کب کسی نے ٹھیک کیا ہے! اس کا ضبط پہلی بار چھلکا تھا۔ اس کا لہجہ گلوگیر لگتا۔“

”اپنی محروم حسرتوں کا گوشوارہ کروں یا رائیگاں سافٹوں سے دکھ کا فسانہ تحریر کروں۔ بے وفائی میری طریت نہ تھی لیکن مجبور اناؤں نے قدموں کو زنجیر کر دیا ہے۔ ایک طرف تم ہو میری محبت کا غور۔ ایک طرف میرا نسب۔ میرے باپ کی انا فیصلہ کس کے ت میں گیا یہ قسمت کا لکھا ٹھہرا مگر علی! مہرین راہیم بزدل کم ہمت اور بد قسمت ضرور ہے لیکن بے فائز نہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا اور ہو سکے تو مجھے ناف کروینا۔“

وہ اشکوں کا سیل رواں ہتھیلی میں چھپا کر واپسی کے لیے پلٹ گئی اور علی ارسل ساحل کے کنارے پر تنہا مڑا رہ گیا۔

چار بجے اس کی اسلام آباد کی فلائٹ تھی۔ ”چاچو! وعدے کے مطابق آپ نے 12 دسمبر کی تک واپس آنا ہے ہر صورت۔ ورنہ میں آپ

سے سخت خفا ہو جاؤں گی۔ آپ کا آفیشل ورک نہ ہوتا تو میں کبھی بھی اپنی شادی سے چار دن پہلے اسلام آباد نہیں جانے دیتی۔“ اس کی بھیجی اس کا لپ ٹاپ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”او کے ان شاء اللہ۔“ ٹیکسی گیٹ پر آچکی تھی۔ اس کے ملازم نے سامان اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا اور وہ وہیں رک کر اسے عادتاً اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرنے لگا۔

”میں اپنا بہت سارا خیال رکھوں گی چاچو! مگر آپ کو بھی اپنا خیال رکھنا ہے۔ میرا خیال رکھنے کے لیے تو یہاں بہت سے لوگ ہیں مگر آپ تو ہر سفر میں تنہا ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں آپ اپنی محبت کو کبھی نہیں بھول سکے۔“

وہ اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھی اور علی ارسل کی آنکھیں بائیس سال بعد بھی نم ہو گئی تھیں۔

”محبت کو کون بھول پاتا ہے لگی! وہ فریم لیس گلاسز اتار کر آنکھیں مسلنے لگا تھا۔“

”وہ تو بھول گئیں نا آپ کو جنہوں نے آپ سے محبت کی۔“

”ہاں ہو سکتا ہے گردش ایام نے اس کی زندگی اتنی مصروف کر دی ہو کہ اسے مجھے یاد کرنے کے لیے فرصت بھی نہ ملتی ہو لیکن محبت پھر محبت ہے مہرین بیٹا!“

”پھر مہرین۔! آپ مجھے مہو کیوں نہیں کہتے سب کی طرح۔“

”تمہیں یہ نام تو میں نے اس لیے دیا تھا مہرین! کہ مجھے دنیا سب سے زیادہ عزیز نام ہی یہی تھا اور بھائی جی نے کہا تھا کہ وہی نام رکھوں جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پسند ہو۔ کتنی عجیب فرمائش تھی پھر میں نے تمہارا یہی نام رکھ دیا لیکن ”مہو“ کہنے کا حق تو بس اسی نے مجھے دیا تھا وہ میں کسی اور کو کیسے۔“

”چاچو! کہاں کھو گئے؟“ وہ اب اس کا شانہ ہلا رہی تھی اور ٹیکسی ڈرائیور ہارن دینے لگا تھا۔

”او کے بیٹا! مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے مہرین

کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”او کے چاچو! پلین سے اترتے ہی کال کیجیے گا۔ میں منتظر رہوں گی۔“

”ہاں ان شاء اللہ۔“ وہ اسے رخصت کرنے گیٹ تک آکر پلٹ گئی تھی۔ رات کے اس وقت سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور وہ اس کے لیے جاگ رہی تھی۔ اسے گھر میں سب سے زیادہ محبت علی ارسل سے ہی تھی۔

دسمبر کا اوائل تھا۔ موسم میں خشکی زیادہ اور سردی کم تھی۔ یہ راتیں اسے بہت بے چین اور مضطرب کرتی تھیں کیونکہ انہی دنوں تو وہ دونوں جدا ہوئے تھے لیکن بائیس برس بعد بھی اسے مہرین ابراہیم اور دسمبر کی آخری زرد شام بہت شدت سے یاد آتی تھی۔ سڑک پہ زیادہ ٹریفک نہ تھا اسی لیے شور و غل بھی کم تھا۔ وہ اپنے اندر کی وحشت سے گھبرا کر لپ ٹاپ آن کرنے لگا تھا لیکن وقت کم ہی رہ گیا تھا۔ اس لیے شیشے سے باہر دیکھنے لگا جہاں رات کی تاریکی اپنے جوبن پر تھی مگر سڑک کے کنارے لگے بجلی کے پول کی زرد روشنیاں اطراف میں پھیل کر ماحول کو بہت دلکش بنا رہی تھیں۔

”مجھے وہ راتیں بہت اچھی لگتی ہیں جب آخری راتوں کا چاند اپنی نیم وا آنکھوں سے زمین والوں کو دیکھتا ہے اور ایسے میں میرا دل پتا ہے کیا چاہتا ہے علی! وہ اشتیاق سے کہتی اور علی ارسل اس کے چاند چہرے کو تکتا رہتا۔

”کیا چاہتا ہے؟“

”کہ میں اور تم سنسان سڑک پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے رہیں اور تب تک چلتے رہیں جب تک ہماری ٹانگیں جواب نہ دے جائیں۔“

وہ آخر میں ہستی تھی۔ اس کی جھرنوں سی ہنسی ابھی بھی اس کی سماعتوں میں گونجی تھی۔ لیکن ڈرائیور نے ٹیکسی روکی وہ چونک کر کراچی شہر کے خوب صورت

ایر پورٹ کی عمارت دیکھنے لگا۔ پھر خفیف سا ہو کر نیچے اتر آیا۔ ڈرائیور نے اس کا سامان اس کے پاس رکھ دیا تھا۔ وہ والٹ نکال کر کرایہ دینے لگا۔

ڈپارچر لاؤنج میں کافی رونق تھی۔ فلائٹ میں کچھ ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔

”ماما! آپ کبھی میری بات بھی مان لیا کریں سیلا سے پوچھ لیا تھا میں نے۔ وہ خفا نہیں ہوں گے۔“ اس کے سامنے سے سولہ سترہ سالہ خوب صورت نوجوان گزرا تھا۔ اس کے لمبے کی جھنجلاہٹ اسے بہت بھلی محسوس ہوئی۔

”آپ نے سیاسی جماعتوں کی طرح ہر اہم موقع پر کوئی نہ کوئی بیان فوراً جاری کرنا ہوتا ہے۔“

اسے ہنسی آئی اور پھر یکدم ہی وہ چونک کر اس لڑکے کو اور اس کے آگے چلتی خاتون کو دیکھنے لگا۔

”فراز! زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ محض تمہاری ضد یہ میں کراچی آئی ہوں۔“

اس نے پلٹ کر اپنے بیٹے کو گھورا تھا۔ علی ارسل کے مسکراتے لب یکدم سکڑ گئے۔ گرے براؤن کاٹن کے پرنٹڈ شلوار قمیص پر اپنے مخصوص انداز میں دوپٹا اوڑھے وہ مہرین ابراہیم تھی۔ علی ارسل کے لیے وقت

تھم سا گیا تھا۔ اس کی نظریں اپنے بیٹے پر تھیں اور علی ارسل کی اس پر بائیس سالوں میں اس کی زندگی میں کچھ نہیں بدلا تھا لیکن مہرین ابراہیم بہت بدل چکی تھی۔ اس کی گلابی رنگت میں زردیاں گھلی تھیں۔

آنکھوں کے گرد خلتے نمایاں تھے۔ علی ارسل نے اسے اتنا سوچا نہ ہوتا تو شاید پہچان ہی نہ پاتا۔

”مہرین! اس کے لب ہلے تھے۔

”ماما! اب آہی گئی ہیں۔ تو زنی کی طرف جانے میں کیا حرج ہے؟“

”جسٹ اسٹاپ اٹ۔ خاموشی سے اپنی پھپھو کی طرف چلو زنی سے خود جا کر مل آنا۔ میں نہیں جاؤں گی وہاں۔“

وہ سخت لمبے میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی۔

دفعتا! اس کی نگاہ بائیں طرف اٹھی اور اٹھی رہ

گئی۔ اس کی نگاہوں میں حیرت نہیں پیاس اور تشنگی تھی۔ وہ دونوں بائیس سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بائیس سالوں میں مہرین صرف دوبار کراچی آئی تھی اپنے ماں باپ کے انتقال پر ورنہ تو اس کا ناتا مکمل طور پر اس شہر سے ٹوٹ چکا تھا۔ جس کی مانوس اور اداس فضاؤں میں علی ارسل بس رہا تھا۔ وہ اس سے بے خبر نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بائیس برس بعد بھی علی ارسل محبت کی شاہراہ پر تنہا کھڑا ہے۔ اس نے کسی سے پچھرنے پر اپنی دنیا اجاڑ لی تھی۔

”مہرین! اگر زندگی میں کبھی کسی موڑ پر تم مجھے ملو گی تو ہمیشہ کی طرح اپنا منتظر پاؤ گی۔“

اس نے بہت دفعہ یہ کہا تھا اور آج مہرین کو لگا تھا کہ وہ اپنی وفا میں سچا تھا۔ بے وفاتو مہرین ابراہیم بھی نہ تھی لیکن اس کے حصے میں جرم لکھا جا چکا تھا۔ وہ آج بھی محروم تمنا کا کلمہ لیے اس کی راہ میں آکھڑا ہوا تھا اور وہ آج بھی مجبور رہے بس تھی۔

”ماما! آپ ماموں لوگوں سے ملنے کیوں نہیں جاتیں۔ میں اور زنی تو یونیورسٹی فیلو ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں جان کر معلوم ہوا تھا کہ ہمارا کتنی قریبی رشتہ ہے اور آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اب میں اس کے گھر نہیں گیا تو وہ مجھ سے سخت خفا ہو جائے گا۔ ماما! آپ کیوں دوسروں کے دل کی پروا نہیں کرتیں۔“

وہ اب بہت آہستگی سے شکوہ کنال تھا۔ مہرین ابراہیم کی پلکیں بھگنے لگیں۔

”میرے دل کی پروا کس نے کی تھی فراز؟“

”چلیں ماما! آپ رک کیوں گئیں۔“ بیگ شولڈر پر ڈال کر اس نے ٹرائی آگے بڑھائی ماں کو پکارا۔

مہرین ابراہیم نے چونک کر اسے دیکھا اور علی ارسل کے قریب سے کسی اجنبی کی طرح گزر گئی۔ اس کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ ڈپارچر لاؤنج میں بھگدڑ سی مچ گئی۔

”مہرین! علی ارسل نے بے اختیار اسے آواز دی لیکن وہ بہت سے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو چکی تھی۔

بائیس برس بعد اس کی خوابیدہ محبت نے سسکاری بھری۔ سوئے ہوئے جذلوں میں ارتعاش برپا ہوا تھا لیکن چند لمحوں کا فسون تھا یہ۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو مگر یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے پچھڑ کر جی نہ سکے گا اور یہی تو ہوا تھا۔ مہرین ابراہیم اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی جس کے خواب وہ تا عمر دیکھتا رہا تھا۔ لیکن اس خواب کو تعبیر ملی نہ اس کے جذلوں کو قرار۔ وہ پھر سے پکھلنے لگا تھا اس کا وجود جیسے گردش ایام کی بے مہر اور سرد ہواؤں نے برف کر دیا تھا۔ اس پہ ہلکی سی ضرب لگی تھی لیکن یہ بے سود تھا۔ اس نے تو خسارے کا سودا تب ہی کر لیا تھا۔ جب چھبیس برس کی عمر میں محبت اس سے جدا ہوئی تھی۔ کر لاتے ہوئے دل پہ اس کی یادوں کے پھاے رکھتے ہوئے وہ اپنے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ ذہن کے ایک گوشے میں چند اڑتے پڑتے الفاظ بھٹک رہے تھے۔

گئے دنوں کی عزیز باتیں

نگار صبحیں گلاب راتیں

بساط دل بھی عجیب شے ہے

ہزار جیتیں ہزار ماتیں

جدائیوں کی ہوا میں محلوں کی

خشک مٹی اڑا رہی ہیں

گئی رتوں کا لال کب تک

چلو کہ شاخیں تو ٹوٹی ہیں

چلو کہ قبروں پہ خون رونے سے

اپنی آنکھیں ہی پھوٹی ہیں۔!



میرا دل تیری سیڑھی سے ڈنکا

موبائل فون ہاتھ میں پکڑے وہ کافی بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اور ہر گزرتے پل کے ساتھ اس کے سر پر چمکتے تھے سورج کا اثر دماغ پر ہو رہا تھا اس کی بے چینی غصے اور جھنجھلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔ سہ پہر ڈھلنے کو تھی مگر سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی دل کی بھڑاس نکال کر جانا چاہتا تھا اور اس کی بد قسمتی کہ چھت پر کوئی کرا، کسی ایک طرف کوئی چھپر بھی نہیں تھا جس کے نیچے کھڑے ہو کر وہ انتظار کی یہ کوفت

بھری گھڑیاں گزار سکتا۔

”اللہ تمہیں سمجھے روی! تم نے تو آج میرا تیل نکال دیا۔“ وہ دل ہی دل میں اسے کوستے ہوئے پتا جا رہا تھا۔

”ہائے ہادی.....! کیا کر رہے ہو اتنی دیر سے یہاں کھڑے ہوئے؟“ پاس والی چھت سے نازیہ نے پکارا تھا۔ دو تین بار مسکرا کر دیکھنے کے بعد جب اسے ہادی کی طرف سے کوئی ریپانس نہ ملا تو وہ اسے مخاطب

مکمل ناول



”پھر تو میں ہرگز فون بند نہیں کرنے والا۔۔۔ کرتارہ انتظار۔۔۔“ زین نے دھمکی دی۔
”خبیث انسان! رومی کا فون آنے والا ہے۔“ اس نے دانت پیسے۔

”اوہ! میں خواہ مخواہ ہی اتنا ایکسائینڈ ہو گیا تھا۔ تجھے تو بس اسی کے فون آسکتے ہیں۔ میری ہمدردیاں تیرے ساتھ ہیں اور تیرے لیدر کے نئے جوتے میرے پاس۔“
”کیا؟“ وہ زین کے اس انکشاف پر۔

”اتنا اور ایکسائینڈ مت ہو میرے یار! تو اب یہی کہے گاناں کہ دوستوں میں کوئی تیرا میرا نہیں ہوتا۔ میں نے اسی لیے تو فون کیا ہے، تجھے جب بھی اس کی ضرورت پڑے بلا جھجک آگے لے جانا۔ دوستوں میں کیسا تکلف اچھا فون بند کرتا ہوں رومی کا فون آنے والا ہو گا۔ گڈ بائے!“ زین نے جلدی جلدی کہہ کر فون بند کر دیا۔ پتا تھا بھس گئے ڈھیر میں جلتی ہوئی تیلی ڈال دی ہے۔

”اماں۔۔۔ اماں۔۔۔“ وہ چلا تے ہوئے نیچے آیا۔
”کیا ہے۔ کیوں باؤلوں کی طرح چلا رہے ہو؟“ اماں بچن میں تھیں وہیں سے جچ کر بولیں۔

”زین میرے جوتے لینے آیا تھا؟“ وہ وہیں آکر پوچھنے لگا انداز کافی غصے والا تھا۔

”ہاں۔ آیا تو تھا۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”کچھ کہہ رہا تھا کہیں جانا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا صفی!“ انہوں نے پکوڑوں سے لطف اندوز ہوتے صفی کو دیکھا۔

”زین بھائی کہہ رہے تھے انہیں انٹرویو دینے جانا ہے تو ہادی کے سب سے اچھے اور نئے والے جوتے چاہئیں۔ جو ابھی تک نہ تو اس نے پہنے ہوں اور نہ اسے پڑے ہوں۔“ کچھپ کے چٹکارے لیتے ہوئے صفی نے کہا مگر جب اسے اپنی طرف گھورتے ہوئے پایا تو سٹپٹا کر بولا۔

”یہ میں نہیں زین بھائی کہہ رہے تھے۔“
”تو کیوں آدھا ہوا جا رہا ہے۔ لے آئے گا واپس کھا نہیں جائے گا۔“ اماں کو غصہ آگیا تھا۔ وہ تیج و

کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔
”کیا ہے۔۔۔ کیوں سربرسوار ہو؟“ وہ غرایا۔ ”تم جو صبح دوپہر شام یہاں اپنی ملاقاتیں بھگتاتی ہو میں نے کبھی تم سے پوچھا ہے؟“

”اچھا تو کسی سے ملنے آئے ہو۔“ اس نے معنی جیزی سے سر ہلایا۔ ”ویسے کس سے ملنے آئے ہو۔“ وہ یہ کہہ کر ہانسی صاحب کی چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ ہادی اسے مزید کوئی سخت جواب دیتا، اس کا سیل گنگنا اٹھا۔ خوشی سے اچھلتے ہوئے اس نے اسکرین پر نگاہ ڈالی اور اگلے ہی پل ساری خوشی کا فور ہو گئی مگر کال ریسیو کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ اسے پتا تھا جب تک وہ بات نہیں کرے گا زین اسی طرح بیل پر بیل دیتا رہے گا بلکہ ہو سکتا ہے وہ خود ہی آن دھمکتا۔

”ہیلو! اٹھ مار انداز میں کہتے ہوئے اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

”اوئے! کہاں مر گیا ہے تو۔ تجھے اندازہ بھی ہے پچھلے ایک گھنٹے میں تجھے کتنے ایس ایم ایس کر چکا ہوں۔ پورے ایک ہفتے کا کوٹہ ختم کر دیا ہے میں نے۔“

زین اس کی آواز سنتے ہی اپنے مخصوص مبالغہ آمیز انداز میں شروع ہو گیا تھا۔

”ایسی بڑھانٹے سے پہلے تو ایک بار آئینے میں اپنا تھوڑا دیکھ لیتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ تیرے موبائل میں ایک دن کے ایس ایم ایس پیکیج کا بیلنس تو ہوتا نہیں ہے اور بات کر رہا ہے تو ایک ہفتے کی۔۔۔ چل فون بند کر دے اب کسی کا فون آتا ہے۔“ اس نے اس سے جان چھڑانی چاہی مگر وہ سری طرف زین کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کیا مطلب۔۔۔ کس کا فون آنے والا ہے؟“
”وہ میں تجھے نہیں بتا سکتا۔ اٹ از سیکرٹ۔“ بات کرتے ہوئے اس نے دائیں طرف دیکھا نازیہ جاچکی تھی۔

تاب کھا کر رہ گیا۔ دل ہی دل میں زین کا حشر کرنے کی ٹھان لی۔
”یہ پکوڑے کہاں سے آئے؟“ پلٹتے ہوئے اس کی نظر پلیٹ میں بیچ رہے دو تین پکوڑوں پر پڑی تو ٹھٹک گیا۔

”نیچے سے آئے تھے۔“ صفی نے جلدی سے ایک پکوڑا منہ میں رکھا اور دوسرا ہاتھ میں لے لیا۔
”پھر تو پالک کے ہی ہوں گے یا آلو کے۔“ وہ کچھ بے دلی سے بولا۔

”ہاں۔۔۔ تم تو جیسے لاث صاحب کی اولاد ہوناں۔ صبح و شام خوان سجتے ہیں تمہارے ہاں۔ وہ بیچارے خلوص سے مجبور ہو کے کچھ بھیجیں اس پر بھی تمہارے خرے۔ فکر مت کرو ہمیں بھی شام کو آلو ٹنڈے بنارہی ہوں۔ جیب میں پیسے ہوں تو کر لینا اپنے لیے بریانی پلاؤ کا انتظام۔“

اماں کو پکوڑیوں کے بھیجے ہوئے پکوڑوں پر اس کی تنقید ذرا پسند نہیں آئی۔ صفی ہنسنے لگا۔
”واقعی بھائی! آپ اپنے لیے لائیں تو ایک پلیٹ بریانی میرے لیے بھی لے آئیے گا۔ ٹنڈے تو مجھے بھی ذرا اچھے نہیں لگتے۔“

”تو کہاں جا رہا ہے؟“ اماں نے پکارا۔
”اسٹور کھولنے جا رہا ہوں اور کہاں جاؤں گا۔“ کالر جھٹکتے ہوئے اس نے کچھ بیزاری سے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے اپنا موبائل گھر پہ چھوڑ جا۔“

”ہیں۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔
”زینہ کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ مبارک باد کا فون کرنا ہے اسے۔“

”ہاں تو گھر کے فون سے کریں ناں۔ مجھے کیوں کہہ رہی ہیں۔“ ہادی واقعی پریشان ہو گیا۔ وہ موبائل گھر پر چھوڑ جاتا اور اماں رومی کی کال ریسیو کر لیتیں تب کیا ہوتا۔

”ارے اس کے موبائل میں وہ موٹی دوسری سم ہے۔ گھر کے فون سے کروں تو ایک منٹ تین روپے کا پڑتا ہے۔“ اماں کو اور کچھ یاد نہ ہو بے شک کمپنیوں کے کال ریٹ ضرور ازبر رہتے تھے۔

”اچھا! ابھی میرے موبائل میں بیلنس نہیں ہے۔ ڈلو اوں گا تو شام میں بات کر لیجے گا۔“ اسے بروقت بہانہ سوچا۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا پھر جیسے اس کی شکل پر ترس کھا کر بولیں۔ ”اس کے پیسے میں تجھے دے دوں گی پر تو ڈلو ضرور لینا۔“

”بس اماں! آپ فکر ہی نہ کریں۔“ وہ انہیں تسلی دیتا ہوا جلدی سے باہر نکل آیا۔ اماں کا موڈ بدلتے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔

”ہادی بھیا!“ داخلی دروازے کی طرف بڑھنے سے پہلے ہی سونا کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔
”اسٹور جا رہے ہیں؟“ اسے اپنی جانب تکتا پا کر سونانے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
”کوئی کام تھا؟“

”امی کی دوائی ختم ہو گئی ہے ویسے تو میں جانے کا سوچ رہی تھی مگر اب آپ جا رہے ہیں تو کسی بچے کے ہاتھ یہ دوائیاں بھجوا دیجئے گا پلیز۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ خطی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو کھر آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

”آئی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ اسے اچانک ہی خیال آیا۔ پرسوں رات ان کی طبیعت اچانک بہت بگڑ گئی تھی تب ہادی ہی انہیں ہسپتال لے کے گیا تھا۔ ”اللہ کا شکر ہے۔ اب تو بہت بہتر ہیں۔“ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

ہادی اپنا میڈیکل اسٹور سنبھال رہا تھا۔ میڈیکل میں جانے کی اپنی شدید خواہش کو اسے تب دبان پڑا تھا جب حامد بھائی اپنی مشہور زمانہ ”زن مریدی“ کے باعث پیوہ ماں کو بے سہارا چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ حالانکہ تمرین بھائی اماں کی سگی بھانجی تھیں اور اماں کے پاس انہیں بیاہ کر لانے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ بیوہ عورت ہیں، کل کلاں کو کوئی تریا چلتا آکر ان کے سب سے بڑے اور کماؤ پوت کو لے اڑی۔ تب وہ کیا کریں گی۔ اس وقت انہیں قطعی نہیں پتا تھا کہ بظاہر بہت بھولی اور سیدھی سادی تمرین کس طرح ان کے سینے پر مونگ دلنے والی ہے اور ان کی نظروں کے سامنے ان کے بیٹے کو اپنا بے دام غلام بنانے والی ہے۔ تمرین نے ایک سیال سے بھی کم عرصہ ان کے ساتھ گزارا تھا اور اس قلیل سی مدت میں ان ساس بہو کے درمیان کتنے معرکے ہوئے تھے یہ خود انہیں بھی یاد نہیں تھا۔ اس کے بعد تو اماں کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ ادھر کوئی تمرین کا نام لیتا اور ادھر وہ جھولی بھر بھر کے بددعا میں دینا شروع ہو جاتیں۔

حامد کے الگ ہو جانے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اخراجات کا آن پڑا تھا۔ تب ہی اماں نے بینک سے جو جمع جتھا باقی تھا اس سے اوپر دو کمرے بنوائے اور خود اوپر شفٹ ہونے کے بعد نیچے کا حصہ کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ پھر ہادی نے بھی مستقل آمدنی کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے تھے۔ اس کے ڈاکٹر بننے کا خواب تو چمکا چور ہو ہی چکا تھا سو وہ اس میڈیکل اسٹور کو غنیمت جان کر جی جان سے اسے سنبھالنے میں لگ گیا۔



وہ اس وقت ایک گاہک کو فارغ کر رہا تھا جب اس کا فون بجنے لگا تھا۔ دیکھا تو رومی کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

”ہاں بھئی مہارانی صاحبہ! یاد آگئی میری۔ وقت مل گیا مجھے فون کرنے کا۔“ اس کے لہجے میں خود بخود ناراضی در آئی تھی اور دوسری طرف اس کی ہنسی کے جلت رنگ بچ اٹھے۔

”سوری ہادی! عین وقت پر آئی آگئی تھیں۔ اب میں ان کے سامنے تو تمہیں فون نہیں کر سکتی تھی ناں۔“

”کیوں؟ تم تو کہتی ہو انہیں سب پتا ہے اور تمہاری آپنی کو اور کوئی کام نہیں ہے۔ جب دیکھو میکے آئی رہتی ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے مستقل وہیں شفٹ ہو جائیں، میرے بھائی کا خرچہ بھی بچ جائے گا اور انہیں دیگر القابات کے ساتھ ساتھ گھر داماد کا لقب بھی مل جائے گا۔“

”شٹ اپ ہادی!“ وہ بری طرح تپ گئی۔ ”تم ناں اپنے بھائی کی یہ ساری کھولن مجھ پر مت اتار کر۔ ان کے سامنے تو بڑے معصوم بنے رہتے ہو۔ میرے سامنے ہی تمہیں یاد آتی ہیں ان کی یہ کوالیٹی۔“

”ہاں تو ان کے سامنے کیسے کہہ سکتا ہوں ان کی سالی سے شادی جو کرنی ہے۔“ وہ ہنسا تھا۔ رومی چپ سی رہ گئی پھر کچھ دیر بعد کہا۔ ”اس کے لیے بھائی کو نہیں اپنی اماں کو مناؤ جب سے آپنی الگ ہوئی ہیں تب سے وہ ایک بار بھی یہاں نہیں آئیں اور خاندان بھر میں کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں امی کے خلاف کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ جادو گرنی تمہارا منہ پتا نہیں کیا کیا نام دے رکھے ہیں انہیں۔ خالہ کو یہ خیال بھی نہیں ہے کہ وہ ان کی بہن ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں وہاں یہی کہتی ہیں کہ فرحت نے ہی تمرین کو سکھا پڑھا کے بھیجا ہے اور اسی نے پیوہ بہن کو اس عمر میں خوار کیا ہے۔ اب بتاؤ! اپنی اور اپنی بسوکی لڑائی میں وہ امی کو کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔ ویسے بھی جتنے مینے آپنی ان کے ساتھ رہیں خالہ جی نے انہیں کوئی سکھ نہیں

دیا ایسے میں وہ الگ نہ ہوتیں تو اور کیا کرتیں۔“ وہ اسے سنار ہی تھی اور وہ چپ چاپ سن رہا تھا۔ ہادی کے لیے یہ وہ حقیقت تھی جیسے ناپتے ناپتے کسی مور کی نظر اپنے بد صورت پیروں پر پڑ جائے۔

”تم نے یہ سب سنانے کے لیے فون کیا ہے مجھے؟“ کچھ دیر بعد وہ قدرے چڑ کر بولا۔ زبان درازی میں رومی نے تمرین کا ریکارڈ تو ڈالا تھا۔ ”یہ بتاؤ مل کب رہی ہو؟“

”ابھی نہیں۔ بتایا تھا ناں تمہیں میرے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔“ وہ کچھ بے نیازی سے بولی۔ ”تو اس کا ہمارے ملنے سے کیا تعلق۔“ وہ حیران ہوا۔

”افوہ بھئی! تیاری کرنی ہے مجھے۔“ رومی جھلا گئی اور ہادی ہنس پڑا۔

”چھوڑو یار! تم نے کبھی ایگزامز کی تیاری تو کی نہیں ہے۔ ٹیسٹ کی تیاری کیا کرو گی۔“

وہ مذاق اڑانے لگا اور رومی نے دل ہی دل میں سونیا کو کو سا جس نے ہادی کے سامنے اس کی ٹالاکتی کا پردہ چاک کیا تھا۔ ایک سال پہلے جب عین ان کے رزلٹ آؤٹ ہونے کے دن وہ ان کے گھر آیا تھا۔

”ہاں لیکن امی نے مجھے وارن کیا ہے کہ اگر اس سال بھی میری کوئی سہلی آئی تو وہ مجھے کلج سے ہی اٹھوائیں گی۔“ اس نے تمرین کی سے بتایا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔

”سنو! میں آج آپنی کے ساتھ ان کے گھر جانے والی ہوں۔ یہاں اس چڑیا گھر میں تو مجھے کچھ یاد نہیں ہونے والا۔ تم ایسا کرو ناں وہیں آجاؤ۔“

”وہاں!“ ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے جب خالہ موسمی بخار کے باعث بستر پر پڑی تھیں تب وہ محض رومی کی خاطر ان کی طبیعت پوچھنے چلا گیا تھا۔ اب یہ اس کی بد قسمتی ہی تھی کہ اسی وقت ممائی بھی وہاں موجود تھیں اور ظاہر ہے کہ پھر اماں تک یہ خبر پہنچے زیادہ دیر نہیں لگی اور اس کے بعد جوان کی طبیعت خراب ہوئی تو ہادی ہاتھ پیر جوڑ کر انہیں یقین

دلانے لگا تھا کہ آئندہ وہ کبھی بھول کے بھی خالہ کے گھر کا رخ نہیں کرے گا مگر اب تو بات حامد بھائی کے گھر کی تھی جہاں وہ اس سے پہلے بھی اماں کی لاعلمی میں دو تین بار جا چکا تھا۔ اس لیے کچھ رد و کد کے بعد بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے مگر بھائی! میرا مطلب ہے وہ کچھ کہیں گی تو نہیں۔“

تند خو تمرین بھائی کی تیوریوں پر پڑے بل ہی اسے ڈرانے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ وہ اکثر حیران ہو کے سوچتا بھی کہ حامد بھائی ان پر کیسے فدا ہو گئے۔

”جی نہیں! وہ کچھ نہیں کہیں گی اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہیں۔“

یہ رومی نے نیا انکشاف کیا تھا۔ اسے جھٹکا لگا۔ ”اچھا! لگتا تو نہیں۔“

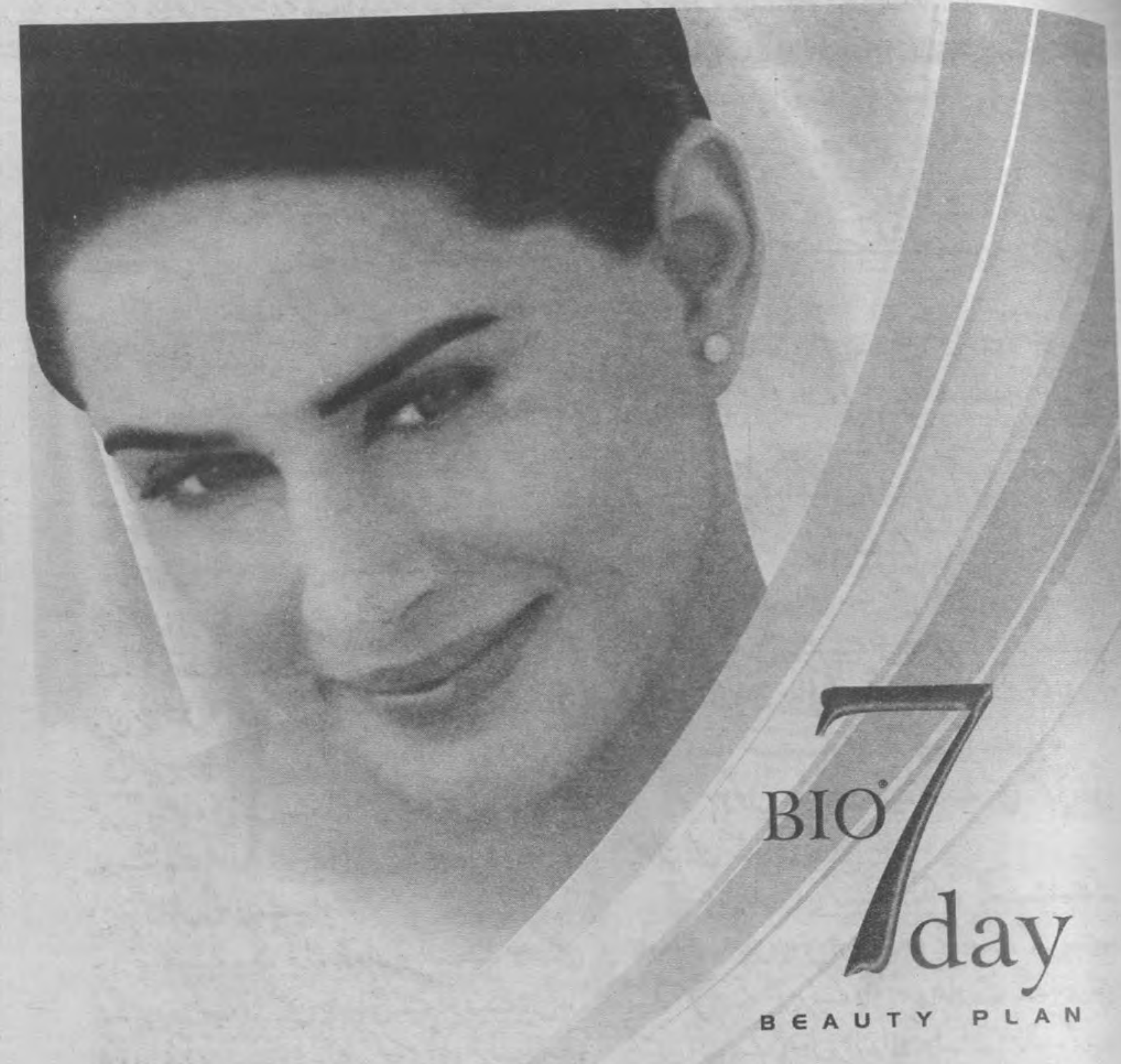
”خیر! تم وہ سب چھوڑو ناں تم بس آجانا اور سنو! میری برتھ ڈے بھی آنے والی ہے اس مہینے کی سولہ کو تو ایسا کرو گفت مجھے ایڈوائس میں دے دو۔ گفت کچھ ایسا ہونا چاہیے جسے میں اپنے کلج کے فیشنر ول فنکشن میں پہن سکوں سمجھ گئے؟ اچھا اب میں فون رکھتی ہوں امی کب سے آوازیں دے رہی ہیں۔ اوکے ہائے۔“

اس نے جلدی جلدی جملے ادا کر کے فون بند کر دیا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی اپنے مطلب کی بات کہنے کے بعد وہ ہادی کی کوئی بات سننے کی زحمت نہیں کرتی تھی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وہ پلٹا اور زین پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔

”تو کب آیا؟“

”جب تو اپنی اس سے بات کر رہا تھا۔“ زین مسکراتے ہوئے اسٹور کی اکلونی کرسی پر براجمان ہوا۔ ”تیرا اکلوتا دوست جگر یار اور سچا بھن ہونے کے ناتے مجھے تیرے مستقبل کی بڑی فکر ہونے لگی ہے یار! میری دوستی میری وفاداری مجھ سے تقاضا کر رہی ہے کہ میں تجھے اس رومی نام کے کیککس سے بچاؤں۔“

وہ چہرے پر خاصے درد مند اور غور و فکر کے تاثرات



BIO 7 day
BEAUTY PLAN

میک اپ کم سے کم
نیچرل خوبصورتی ہر دم

ہائے 7 سے پہلی پلان
تجربہ کار ماہرین نے اس کو تیار کیا ہے اور اس کے فوائد کو ہر روز کی ہر ایک چیز پر
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔
میک اپ کے لیے استعمال کیا جائے۔



Manufactured By
FACON COSMETICS
P.O. Box 444 Lahore, Pakistan
http://www.faconcosmetics.com
Bio Help Line 0900 00028
Find us on facebook

ہو تیں تو اب... کم از کم اب تو اس کے رنگ ڈھنگ
دیکھ کے کچھ سمجھ لے خبردار ہو جا! ہر بار وہ تجھ سے کچھ
نہ کچھ اٹھنے کے لیے کوئی نئی فرمائش کرتی ہے اور تو
اسے پورا کرنے کی فکر میں ہلکا ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھی
اچھی طرح جانتی ہے یہ بات کہ تو اپنے گھر کا واحد کماؤ
پوت ہے۔ تو بھی یہ بات جانتا ہے کہ تیری بھولی بھالی
سیدھی سادی اماں کبھی آکر اسٹور کا حساب کتاب
چیک نہیں کر سکتیں۔ تجھ سے جواب دہی نہیں کر
خرچ تیرے ہاتھ میں ہے اور تو اپنی آمدنی کے واحد
ذریعے سے حاصل ہونے والے حلال کمائی کو بے
دردی سے اس پر لٹا رہا ہے۔ میں تو شکر کرتا ہوں کہ یہ
میڈیکل اسٹور ہے، جنرل اسٹور نہیں۔ ورنہ ان کے
گھر کا مینے بھر کا راشن بھی یہیں سے جاتا، وہ بھی کبھی
نہ ملنے والے ادھار پر۔ اسے کچھ سنجیدہ موڈ میں
محسوس کر کے زین نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔
”جھے لگتا ہے۔ وہ مجھے الونار ہی ہے؟“ ہادی نے
اسے دیکھا۔

”بالکل نہیں۔“ زین نے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔
”وہ تو تو پہلے سے ہی ہے۔ اب تو تجھ میں گدھے والی
خصوصیات پیدا ہونے لگی ہیں جو بوجھ ڈھوتا ہے۔ دو
وقت گھاس چرتا ہے۔ موڈ میں ہو تو خرمستیاں کرتا
ہے اور سوچنے سمجھنے کا کام اپنے مالک پر چھوڑ دیتا ہے۔“

”جتنی بکواس کرنی ہے کر لے۔ کسی دن میں نے
بھی تجھے زہر کا انجکشن لگا کے اس دنیا سے فارغ نہ کر
دیا تو میرا نام بھی ہادی عبدالودود نہیں۔“ ہادی نے
خاصے پر عزم انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ زین
چونک گیا۔

”اچھا تو تیرے پاس زہریلے انجکشنز کا اسٹاک
بھی ہے۔ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا یہ جو آئے
دن عجیب و غریب کمپنیوں کے عجیب و غریب بندے
بیٹھے رہتے ہیں تیرے پاس اس کا کچھ تو نتیجہ نکلے گا ہی۔
سدھر جا! اس سے پہلے کہ جیل کی ہوا کھانی پڑے۔“
ہادی جو لب بھیچے اسے دیکھ رہا تھا کوئی کیسیلا جواب

سجائے کہہ رہا تھا۔ ہادی کے پاس اس وقت صرف
موبائل ہی تھا جو وہ زین کی اس بکواس پر اس کے سر پر
مار سکتا تھا۔ اس نے بے حد مشکل سے خود پر ضبط کیا۔
”اور میرا جوش مارنا خون مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں
تیرا گلا دبا دوں کچھ شرم کر لے۔ کہیں سے تھوڑی سی
غیرت ادھار لے لے اپنی ہونے والی بھابھی کے
بارے میں ایسی گل افشانی کرنے سے پہلے تو نے اپنی
زبان کیوں نہ کاٹ لی۔“ ہادی کے نتھنے پھڑکنے لگے
تھے۔ زین نے بے ساختہ ایک تہقہہ لگایا۔

”اور وہ قیامت تک ہونے والی ہی رہے گی۔“
”تو... تو میرا کیسا دوست ہے یا ر! بجائے میری مدد
کرنے کے بجائے مجھے یہ بتانے کے کہ میں رومی کے
لیے اماں کو کیسے مناؤں۔ تو مجھے بد دعا میں دے رہا
ہے؟“ تاسف سے کہتے ہوئے وہ روہانسا ہونے لگا مگر
زین پر مطلق اثر نہ ہوا۔

”یہ بد دعا نہیں ہے میرے جگر! یہ تو دعا ہے جو
میرے معصوم دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے مگر رہنے
دے! تو کہاں سمجھے گا۔ اس کے عشق میں تو جس طرح
اپنا تن من اور آج کل تو دھن جتنی بے دردی سے لٹا
رہا ہے اس سے ثابت ہو چکا ہے کہ تیرا ذہن اب کسی
جوگا نہیں رہا۔ نہ تو تجھے اپنی بیوہ ماں کی وہ امیدیں نظر
آتی ہیں جو وہ تجھ سے جوڑے بیٹھی ہے اور نہ ہی اپنے
چھوٹے بھائی کا مستقبل۔“

”تو کہنا کیا چاہ رہا ہے؟“ وہ ہونٹ چبانے لگا۔ ”تجھے
لگتا ہے میں بھی حامد بھائی کی طرح انہیں چھوڑ جاؤں
گا؟“

”یقیناً“ ایسا نہیں ہو گا اگر تو رومی کا خیال دل سے
نکل دے تو۔“ زین بھی سنجیدہ ہو گیا۔
”یعنی سارے مسئلے کی جڑ رومی ہے؟“ ہادی نے
ایک گہری سانس لی۔

”اول تو اس کی بہن کو جھیلنے کے بعد تجھے اس سے
بھلائی کی توقع رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ پھر بھی
اگر تیرا گل دل اس پر آ ہی گیا اور تیرے بھس بھرے
دلغ نے یہ بہانہ بنا ہی لیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں

دینے ہی لگا تھا کہ کاؤنٹر پر ایک گاہک کی آمد ہوئی۔
 ”ہادی بھائی! پچاس کالوڈ کروادیں اس نمبر پر۔“
 وہ محلے کا ہی لڑکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہادی کو سونا کی
 تاکید یاد آئی۔

”ہاں کرتا ہوں۔ تم پہلے میرا ایک کام کرو۔“ اس
 نے دوائیوں کا شاپر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
 ”یہ دوائیاں جا کر ہمارے کرائے دار کے ہاں دے آؤ۔“
 ”سونا باجی کے گھر؟“ اس نے تصدیق چاہی۔
 ”ہاں وہی سیدھے وہیں جانا۔ ادھر ادھر گھومنے کی
 ضرورت نہیں اور واپس یہاں آنے کی بھی ضرورت
 نہیں ہے۔ تمہارا بیلنس لوڈ ہو جائے گا۔“
 ”یہ سونا کون ہے؟“ اس کے پلٹتے ہی زین نے
 پوچھا۔

”تو نہیں جانتا؟“ ہادی نے تعجب کا اظہار کیا۔
 ”چاندی کا شوہر؟“ زین نے کچھ سوچ کر اپنے تئیں
 صحیح جواب دیا۔
 ”یہ چاندی کون ہے؟“ اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے
 ہوئے اسے گھور کر زین پر طرح طرح کر گیا۔
 ”بتاناں! کون ہے یہ سونا؟“

”ہمارے نئے کرائے دار، بلکہ نئے تو نہیں
 رہے۔ اب تو انہیں چار پانچ مہینے ہو رہے ہیں۔“
 ہادی نے فریزر سے بول نکال کر اس کی طرف اچھالی
 جسے اس نے فوراً ہی مہارت سے سچ کر لیا۔

”تھینک گاڈ! تجھ جیسے زہریلے انسان سے تو میں
 واقعی کسی زہریلے انجکشن کی توقع کر رہا تھا۔“ اس نے
 ٹھنڈی بول سے بڑا سا گھونٹ لیا۔

”ویسے کمال ہے یار! انہیں یہاں شفٹ ہوئے
 پانچ مہینے ہو رہے ہیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ جب
 ہی میں کہوں آج کل تمہاری وہ میرا جیسی صورت اور
 دینا جیسی ڈرینک والی کرائے دار دروازے میں کھڑی
 نظر کیوں نہیں آتی۔“

”مجھے تو بڑا افسوس ہو رہا ہو گا۔“ ہادی نے ہنس کر
 اس پر چوٹ کی۔

”ہاں میں تو جیسے اسی کے لیے تیری گلی کے چکر کاٹا

کرتا تھا۔“ زین کو غصہ آ گیا۔

”تب کیوں چڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ سے تو بہت
 سے لوگوں نے اپنا روٹ چھینج کر کے اس گلی سے گزرتا
 شروع کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کیا پتا تیری دل پھینک
 فطرت نے بھی تجھے مجبور کر دیا ہو۔“ ہادی اب دل
 جلانے والی مسکراہٹ سے کہتے ہوئے بدلہ چکانے لگا
 تھا۔

”ویسے پہلے پہل اس نے کافی شرافت کا مظاہرہ کیا
 تھا مگر جیسے جیسے اس نے پر پرزے نکالے۔ اماں کو دیکھ
 دیکھ کر اختلاج قلب ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ اس
 کی وجہ سے میری انکوٹی پیاری اماں کو کوئی بڑا جھٹکا لگتا
 میں نے اسے گھر خالی کرتے کانٹوں دے دیا۔ حالانکہ
 کرایہ دینے میں اس نے کبھی اڑی نہیں کی تھی۔
 بلکہ مقررہ تاریخ سے پہلے ہی وہ اوپر آ کر کرائے کے
 ساتھ ساتھ اکثر بریانی اور قورمے کی ڈونگے بھی دے
 جاتی تھی۔“ اب کے ہادی نے سنجیدگی سے بتایا۔

”تو تم لوگوں نے مکان دیتے ہوئے کسی قسم کی کوئی
 چھان بین نہیں کی تھی؟“

”کیسی چھان بین کرتے یار! ہم تو سمجھ رہے تھے کہ
 چلو صرف میاں بیوی ہیں۔ زیادہ جھنجھٹ نہیں ہے۔
 یہ تو اس کے شوہر کے دہی سدھارنے کے بعد ہی
 ہمیں اس کے لپھنوں کا اندازہ ہوا۔ اللہ معاف کرے۔“
 ہادی نے کانٹوں کو ہاتھ لگایا۔

”اماں کو تو میری وجہ سے بھی ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں
 میں اس کے چکر میں نہ پڑ جاؤں کیونکہ دو تین بار وہ
 مجھے اپنے گھر بھی بلا چکی تھی۔ کبھی پانی کا مسئلہ ہوتا تو
 کبھی بجلی کی لائن میں گڑبڑ ہو رہی ہوتی۔“

ہادی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔
 ”اور یہ لوگ...؟“ زین نے سوالیہ نظروں سے
 اسے دیکھا۔

”نہیں یار! یہ لوگ تو بہت شریف اور خاندانی
 ہیں۔ بیوہ خاتون ہیں اور ان کی دو بیٹیاں۔ خود بھی ریشہ دار
 پچر ہیں اور بڑی بیٹی بھی کہیں ٹیچنگ کرتی ہے۔
 سب سے بڑی بات تو یہ کہ اماں ان سے بہت خوش

ہیں۔“
 ”ویسے اگر تو اپنی پرانی کرائے دار کو ہمارے ہاں بھیج
 دیتا تو زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ ہماری بلڈنگ کے فرسٹ
 فلور کا فلیٹ کب سے خالی پڑا ہے۔“ زین نے اٹھتے
 ہوئے کہا؟ ہادی اسے گھورنے لگا۔
 ”لگتا ہے اس نے تجھے اچھا خاصا متاثر کر ڈالا ہے۔“

”اس صورت میں تو بالکل نہیں جیسے تو سوچ رہا
 ہے۔ میں تو اس کی بریانی اور قورمے سے مستفید
 ہونے کی سوچ رہا تھا۔“ زین نے اصل وجہ بتائی۔
 ”بھابھیوں کے پکائے بد مزہ کھانے کھا کھا کر میرا تو
 اس دنیا سے ہی جی اچاٹ ہو گیا ہے قسم سے۔“

”تو تو شادی کیوں نہیں کر لیتا؟“ ہادی نے مخلصانہ
 مشورہ دیا۔
 ”پہلے نوکری تو کر لوں ورنہ بھائیوں کی کمائی سے
 بیوی پالنے کا الزام بھی لگ جائے گا مجھ پر۔“ وہ ہنس کر
 بولا۔

”نوکری سے یاد آیا۔ تیرے انٹرویو کا کیا بنا؟“
 ”کس انٹرویو کا؟“ وہ چونکا۔
 ”وہی جس کے لیے تو نے میری جوتیاں گھسائی
 تھیں۔“ ہادی کو یاد کر کے نئے سرے سے غصہ چڑھنے
 لگا، سودانت پس کر حتایا اور زین نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔

”وہی جو اس سے پہلے کے تمام انٹرویوز کا ہوتا آیا
 ہے۔“
 ”تیرا کچھ نہیں بن سکتا۔“ وہ تاسف سے سر ہلا کر
 رہ گیا۔

”اور تیرا بہت کچھ بن سکتا ہے بس اس روی نام کی
 بلا سے پیچھا چھڑالے۔“ وہ جاتے جاتے بھی اسے
 چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔ ہادی تلملا کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
 ”سونا! امی کو دوائی دے دی تھی؟“
 تعبیر اس وقت منہ ہاتھ دھونے کے بعد کاپیوں کا

”تم سے پوچھ رہی ہوں، سہری ہو گئی ہو کیا۔“ اپنی
 کمر کے پیچھے کشن رکھتے ہوئے اسے سونا کی خاموشی پر
 تاؤ آیا جو بڑی بے نیازی سے ڈائجسٹ میں منہ دیے
 بیٹھی تھی۔
 ”ہاں دے دی تھی دوائی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں
 ہوا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد امی کالی پی پھر سے ہائی ہو
 گیا۔ پھپھو کا فون آگیا تھا۔“ سونا کالج بھنایا ہوا تھا۔
 ”اچھا! میں کہاں تھی تب؟“ اسے حیرانی ہوئی۔
 ”نہانے گھسی ہوئی تھیں۔ تمہارے نہانے کا
 دورانہ کبھی دو گھنٹوں سے گھٹا ہے۔“ سونا نے اس پر
 بھی طنز کر ڈالا۔ وہ لب بھینچے اسے گھورنے لگی۔
 ”میں تو امی سے ان کی بات بھی نہیں کروانا چاہ رہی
 تھی۔ مگر تم جیسے ہی واش روم سدھاریں، ان کا فون
 آگیا، بس پھر مجبوراً امی کو ہی فون تھمانا پڑا مجھے۔“
 ”کہہ کیا رہی تھیں؟“ وہ کالی بند کر کے پھر سے
 سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ولید بھائی کی شادی طے ہو گئی ہے۔ یہی اطلاع
 دینے کے لیے فون کیا تھا لیکن مجھے پتا ہے انہوں نے
 صرف اسی پر بس نہیں کیا ہو گا اور بھی بہت کچھ کہا ہو
 گا امی سے اور پتا ہے امی مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں۔
 امی کہہ رہی تھیں کہ میں تمہیں یہ بات نہ بتاؤں ولید
 بھائی کی شادی والی۔“
 سونا نے بات ختم کر کے اسے دیکھا۔ اس کے
 ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
 ”ایک تو یہ امی بھی ناں... کیا سمجھتی ہیں میں مری
 جا رہی ہوں ولید کے پیچھے۔ اس کی شادی کی خبر سنوں
 تو خود کشی کر لوں گی۔“
 ”اور کیا پتا ایسا ہو بھی۔“ سونا نے مسکراہٹ دبا کر

سجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ تعبیر الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔
”خود کشی... یاد ہے جب تمہاری منگنی ٹوٹی تھی۔
تب تم نے کیساری ایکشن دیا تھا۔“ اسے یاد دلاتے ہوئے سونا نے جب اس کے چہرے پر چھائی برہمی کو دیکھا تو خائف سی ہو گئی۔

”ایسی بکواس کرنے سے پہلے کچھ سوچ لیا کرو سونا! وہ ری ایکشن میں نے منگنی ٹوٹنے پر نہیں دیا تھا۔“ تعبیر کے لہجے میں تلخی تھی۔

”بلکہ جس بات کو بنیاد بنا کر منگنی توڑی گئی تھی اس پر دیا تھا۔ ولید کوئی اس دنیا کا آخر مرد نہیں تھا کہ جس سے رشتہ ٹوٹنے پر میں زندگی بھر کنواری رہنے کے غم میں اپنی زندگی حرام کر لوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے اور افسوس بھی کہ جب تم لوگ ہی مجھے اتنا غلط سمجھ رہے ہو تو میں کسی اور سے کیا شکایت کروں گی۔“

”آئی نو تعبیر! آئی ایم سوری میں تو بس یونی مذاق کر رہی تھی۔“ سونا کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے یہ بات چھیڑی ہی کیوں۔

”کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں راہ چلتے کسی بھی شخص کا ہاتھ پکڑ لوں، محض امی کی سلی کے لیے، انہیں یہ بتانے کے لیے کہ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں نے کسی کے لیے جوگ نہیں لے رکھا اور دیکھ لینا کسی دن میں ایسا کر بھی گزروں گی۔“ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ بے نیاز رہنے کی اس کی تمام تر کوششیں اب بے سود ہونے لگی تھیں۔

”یا گل ہو گئی ہو تعبیر...!“ سونا نے بے یقینی سے اسے دیکھا ”وہ بیٹیوں کی ماں ہیں اور ہمارے لیے ان کی یہ فکر بالکل جائز ہے۔“ ہمیں کیا لگتا ہے وہ جان بوجھ کر نہیں ہوتی ہیں انہیں اس طرح پریشان اور مایوس رہنا اچھا لگتا ہے؟ ہمارے ان گھٹیا ترین رشتے داروں کی باتیں سن کر انہیں لطف آتا ہے؟ ہمیں یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ تمہارے منگنی ٹوٹنے سے تمہیں بھلے ہی کوئی فرق نہ پڑا ہو مگر امی کی ساری پریشانیوں اسی وجہ سے ہیں۔“

”کیسے ختم ہو گی امی کی یہ پریشانی...؟“ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد تعبیر نے سلگ کر پوچھا تھا۔
”میں نہیں جانتی...“ اس نے نگاہیں چرائیں۔
”مگر شاید تمہاری شادی سے۔“

”بات تو پھر وہی آگئی ناں۔“ اس نے گہری سانس لے کر سر ہلایا۔ ”میں شادی کر لوں چاہے کسی سے بھی کروں۔“

”اگر تمہاری منگنی نہ ٹوٹی ہوتی تو بات الگ تھی۔ اب کوئی پلٹ کر نہیں آتا، جب اسے یہ بات پتا چلتی ہے۔“

”تو کیا یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے؟“ اسے نجانے سونا کے انداز میں کیا بات محسوس ہوئی کہ اس نے سجیدگی سے دریافت کیا۔

”نہیں برا لگے گا مگر سچ تو یہ ہے کہ اس میں کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔“

سونا یہ کہہ کر اٹھ گئی تھی مگر وہ ساکت رہ گئی۔ سونا نے ٹھیک کہا تھا اسے یہ سن کر بہت برا لگا۔ کیونکہ اسے نہیں پتا تھا کہ سونا بھی اسے قصور وار سمجھتی ہے پھر تو اس کا بھی یہ خیال ہو گا۔ اس نے سر ہٹام لیا تھا۔

”کہاں ہے اس سارے معاملے میں میری غلطی؟“ صرف اتنی کہ میں نوکری نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ میں خود غرض نہیں بننا چاہتی تھی مگر اس کا مجھے کیا فائدہ ہوا... یہی کہ پھر بھی مجھے ہی قصور وار گردانا جا رہا ہے۔ مجھے ہی الزام دیا جا رہا ہے۔ میں ہی معتوب ہوں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ اپنی غلطی تلاش کر رہی تھی اور آنسو خود بخود اس کے رخساروں پر پھیلتے جا رہے تھے۔



تعبیر بہت حساس تھی۔ باپ کی وفات کے بعد ماں نے کن مشکلات سے گزر کر ان کی پرورش کی تھی۔ کس طرح نامساعد حالات کا مقابلہ کیا تھا، اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ دوست، احباب، رشتے دار تو ایک طرف ان میں سے کسی نے آکر احوال تک دریافت کرنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کہیں وہ

ہمدردی جتا نہیں اور ان سے مدد ہی نہ مانگ لی جائے۔ صرف ایک تایا جی تھے جو ہمیشہ ان سے باخبر رہا کرتے تھے اور ان کی وجہ سے وہ باقی خاندان والوں سے بھی جڑے ہوئے تھے۔

ان ہی دنوں جب تعبیر کا ماسٹرز مکمل ہونے والا تھا، تایا جی آکر اسے ولید کے نام کی انگوٹھی پہنا گئے۔ کتنے دن وہ بے یقین سی رہی۔ تایا جی تو خیر شروع سے ہی ان کی محبتوں سے بندھے ہوئے تھے مگر تائی جی کیسے مان گئیں اور ولید... وہ سوچ سوچ کر الجھتی رہتی۔ اگر ایک دن ولید نے اسے یونیورسٹی سے پک کر تے ہوئے اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہ کیا ہوتا۔

اس کا اضطراب تو ختم ہو گیا تھا مگر اس کی پریشانی نہیں۔ تائی جی کے ماتھے کے بل تو وہ اسی دن دیکھ چکی تھی اور اب تو وہ جب بھی آتیں، تیور اکڑے ہوئے ہی ہوتے اور تعبیر کو یہ ہرگز منظور نہیں تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی شروعات کسی بھی فرد کی ناراضی سے کرے۔ پھر یہ پریشانی بھی پس پشت چلی گئی، جب اس کا زلٹ آیا۔

امی گورنمنٹ ٹیچر تھیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ میں چند ہی ماہ تھے۔ جب کا تو اس نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اپنی قابلیت پر اسے اتنا بھروسہ تھا کہ اسے کہیں بھی بہت اچھی جاب مل سکتی ہے مگر یہاں بھی اس کی حقیقت پسند سوچ اور محتاط طبیعت کہ کسی کو کوئی اعتراض، کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس نے بھی ٹیچنگ کرنے کو ترجیح دی اور ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی مگر تب... اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ولید نے یہ سنتے ہی ایک ہنگامہ اٹھا دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعبیر نوکری کرے۔ بے شک وہ ٹیچنگ ہی کیوں نہ ہو۔ امی کو پتا چلا تو انہوں نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ولید کو نہیں پسند تو اسے یہ جاب چھوڑ دینی چاہیے مگر تعبیر کا فیصلہ اٹل تھا۔

ان کی ماں نے ان کے لیے جو کچھ کیا تھا۔ اس کا صلہ کیا وہ انہیں اس طرح دیتی کہ اب جب انہیں

ضرورت پڑنے والی تو وہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر صرف اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچتی۔

تعبیر نے ولید پر اپنا موقف واضح کر دیا تھا۔ نتیجتاً ان دونوں کے بیچ کافی گہری خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی تایا جی آئے تو شادی کی بات چھیڑ دی۔ تعبیر کو کوئی مسئلہ نہ ہوتا مگر وہ ولید کی فطرت جان چکی تھی۔ وہ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرنے والا ایک ہٹ دھرم قسم کا انسان تھا اور شادی کی یہ جلدی بھی یقیناً ”اسی کے کہنے پر محائی جا رہی تھی حالانکہ کچھ دن پہلے تائی نے خود کہا تھا کہ ولید کو ایک آفیشل کورس کے سلسلے میں جاپان جانا ہے اور شادی اس کی واپسی پر ہی ہوگی۔

تعبیر ضدی نہیں تھی مگر اس وقت اسے بھی جیسے ضد سی ہو گئی تھی اور اس نے شرم و لحاظ بالائے طاق رکھ کر خود ہی تائی سے کہہ دیا کہ اس کا ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ ولید واپس آجائے پھر دیکھا جائے گا۔ ولید تو اس سے پہلے ہی ناراض تھا، رہی سہی کسر اس کے انکار نے پوری کر دی۔ وہ چلا گیا اور جاتے ہوئے اس سے مل کر بھی نہیں گیا۔

اس کے جانے کے بعد کچھ ہی دن آرام سے گزرے تھے کہ تایا جی کی ”آنا“ ”فانا“ موت نے سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ بابا کی وفات کے بعد ایک وہی تو تھے بچن کے ہونے سے انہیں ڈھارس تھی جو اسے بالکل اپنے بابا جیسے لگا کرتے تھے۔ تعبیر کو اس صدمے سے سنبھلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ ولید سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ ہی تائی، تایا جی کے وفات کے بعد ان کے گھر آئی تھیں۔ امی پریشان تھیں تو الجھن اسے بھی ہو رہی تھی۔ مگر اس کی الجھن کچھ ہی روز قیامت ہوئی۔

تائی جی تو نہیں آئیں مگر کچھ دنوں بعد پھپھو ضرور آ گئی تھیں ان کا پیغام لے کر۔

تائی جی نے اپنی جانب سے یہ رشتہ توڑ دیا تھا اور وجہ اس کی نوکری بھی نہیں بلکہ اس کا کریکٹر بنا تھا۔ وہ گہرے صدمے میں تھی اس لیے نہیں کہ اس کی

منتہی ٹوٹی تھی بلکہ اس لیے کہ آج تک حد سے زیادہ محتاط رہ کر بھی پھونک پھونک کر ہر قدم اٹھانے کے بعد بھی اس کے کردار پر انگلی اٹھالی گئی تھی۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ تائی جی اسے پسند نہیں کرتیں مگر وہ رشتہ توڑنے کے لیے اس پر اتنا گھٹیا الزام لگائیں گی۔ اس کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

تایا جی کے جانے کی دیر تھی انہوں نے جیسے ہر لحاظ ختم کر دیا تھا۔ نجانے ولید سے کیا کہا گیا تھا مگر انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ یہ سب ولید کی خواہش پر ہوا ہے۔ اس وقت تعبیر کو یقین نہیں آیا تھا کہ ولید ایسا چاہ سکتا ہے۔ مگر جلد ہی اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ جب واپس آنے کے بعد ولید نے ایک بار بھی آکر ان سے سارا معاملہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ تعبیر کو ولید سے محبت نہیں تھی مگر اپنی عزت نفس پر اس شدید چوٹ نے اسے بہت دنوں سلگایا تھا۔

اب وہ مطمئن تھی مگر امی کو اس طرح اپنے لیے پریشان ہوتے دیکھتی تھی تو اس کا سارا اطمینان اضطراب میں بدل جاتا تھا۔ مگر مسئلہ سارا یہی تھا کہ ان کی یہ پریشانی دور کرنے کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔



”اماں! میری بلیک شرٹ کہاں رکھ دی آپ نے؟“ آدھے گھنٹے کی تلاش بسیار اور الماری کو الٹ پلٹ کر کے ناکام ہونے کے بعد اب وہ اماں کو آواز دینے لگا تھا۔

”خدا کے لیے اماں! مجھے دیر ہو رہی ہے پلیز! آکر میری شرٹ ڈھونڈ کر استری کر دیں۔“ الماری کا پٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے وہ کچھ اور بھی بلند آواز میں چلایا مگر کچھ فاصلے پر فون پر مصروف اماں نجانے کس رشتے دار خالہ کی غیبتیں سن رہی تھیں کہ ہادی کی آواز نے انہیں کسی مکھی کی بھنبھناہٹ سے بھی کم متوجہ کیا سو وہ اس پر کان کیا دھرتیں۔

”صبر کیجئے بھائی! ایک گھنٹے کا بیکج ختم ہو گا تو آپ

کو آپ کی شرٹ مل جائے گی۔“ میل فون پر گیم کھیلنے صفی نے اس کی بے چارگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے صبر کی تلقین کی۔ وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

”کیا کروں کوئی دوسری شرٹ پہن لوں؟“ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔

”لیکن نہیں۔۔۔ مجھ پر بلیک کلر زیادہ چلتا ہے۔ روی نے بھی یہی کہا تھا۔“ وہ آئینے کے سامنے آکر اپنا گورا چٹا چہرہ دیکھنے لگا۔ تازہ کی گئی شیو کی نیلا ہٹ نے چہرے کو کچھ اور بھی وجیہ بنا دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جاندار سی مسکراہٹ آگئی۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ صفی کے پاس آیا۔

”چل اٹھ صفی! جا کے دیکھ اماں نے میری شرٹ کہاں رکھی ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ صفی بدک کر دوڑ پڑا۔ ”بھائی ہوں آپ کا کوئی سگھر پھر تیلی بیوی نہیں کہ ایک منٹ میں چراغ کے جن کی طرح کہیں سے آپ کی شرٹ ڈھونڈوں۔ کوئی اور شرٹ پہن بیجئے ناں۔“

”مجھے یہی شرٹ پہننی ہے جسے اماں نے کسی خزانے کا نقشہ سمجھ کر کسی تجوری میں لاک کر دیا ہے۔“ وہ اماں کو سننے کے لیے اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ انہوں نے ایک گھوری اس پر ضرور ڈالی مگر فون بند نہیں کیا۔

”ایسا کریں وہ لائٹ گرین چیک والی شرٹ پہن لیں۔ آپ پر بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک دم ہیرو لگتے ہیں آپ اس میں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔“

صفی سنجیدہ سی شکل بنائے قسم کھانے کو تیار بیٹھا تھا بس کسی طرح اس کی جان چھوٹی سہادی سوچنے پر مجبور ہو ہی گیا اور پھر جب وہ اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا کہ اماں کی بات نے اس کے قدم روک دیے۔

”فرحت کس مزاج کی عورت ہے یہ تو ایک زمانہ جانتا ہے۔ جتنی بیٹیوں کو بیاہا ہے ان سب کو اماں کو نجانے کیسی کیسی بیٹیاں پڑھا کر جادو منتر پھونک کر اپنے

ماں باپ سے الگ کروالائی ہے یہ فسادن عورت۔۔۔ اور میں مرن جوگی نجانے کیسا پروردہ پڑ گیا تھا عقل پر کہ جاکر اس گھنی میسنی کو بیاہ لائی۔ اس ایک سال میں اس نے جو میرے ساتھ کیا ہے وہ تو پچیس سالوں میں کبھی میری ساس نے بھی میرے ساتھ نہیں کیا۔“

اماں کافی جوش میں خالہ اور بھابھی کے بچے ادھیڑنے میں مگن تھیں۔ وہ بے اختیار جھرجھری لیتا کمرے کی طرف بڑھ آیا۔

”اگر اماں کو پتا چل جائے کہ میں روی سے ملنے جا رہا ہوں تو پتا نہیں وہ میرا کیا حشر کریں۔“

”دیکھیں اماں۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ تھوڑی دیر بعد وہ پھر اماں کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر صد شکر کہ اب وہ فون بند کر چکی تھیں اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

”کیا ہے۔“ اس کے پکارنے پر اک بیزار سی نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ مالک کے تے چنے لگیں۔

”اس کف کا بٹن کہاں گیا۔“ اپنا بازو ان کے سامنے کرتے ہوئے اس کا لہجہ تند ہوا تھا مگر اماں کی ایک گھوری پردھما بھی ہو گیا۔ ”اب میں کیا کروں۔“ ”تو خود لگا لے ناں ہادی! اب کیا ایک بٹن کے لیے بھی تو مجھے پریشان کرے گا۔ یہ کام تو لڑکے خود بھی کر لیتے ہیں۔“

انہیں غصہ آیا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور انہوں نے ابھی تک ہانڈی بھی نہیں چڑھائی تھی۔ ایک گھنٹہ تو پہلے ہی فون پر برباد ہو چکا تھا۔

”یہ کام وہ لڑکے کرتے ہوں گے جو پارٹ ٹائم میں کالج اور بٹن لگانے کا کام کرتے ہوں۔ میں سوئی تو لگا سکتا ہوں مگر ٹانگے نہیں۔“ وہ بھی تپ گیا۔ جتنا وہ جلدی لکھنا چاہ رہا تھا اتنی ہی دیر ہوئی جارہی تھی۔

”غضب خدا کا! بوڑھی ماں کا کوئی خیال نہیں۔ ایک تو پہلے ہی مجھ اکیلی جان کو سو جھیلے ہیں اور اوپر سے تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے منہ بسورتا آجاتا ہے۔ تیری شادی کروں تو جان چھوٹے میری۔“ جھلا کر ہاتھ دھوتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگی تھیں۔

”ایک تو یہ فریدہ بھی ہمیشہ بے وقت ہی فون کرتی ہے۔“ وہ بٹن اور سوئی دھاگالے کر اس کے سامنے آ بیٹھیں۔ ”وہ بھی گھنٹہ گھنٹہ بھر کے لیے اب بھلا بندہ پوچھے ایسی کون سی بات ہے جو پانچ منٹ میں نہیں ہو سکتی۔ خود تو تین تین بسوؤں کے ہوتے ہوئے ویلی بیٹھی رہتی ہے دوسرے بھی اسے اپنی طرح ہی لگتے ہیں زمانے بھر کے فارغ۔“

”اماں پلیز! اب تو بتادیں آپ نے میری بلیک شرٹ کہاں رکھی ہے۔“ بے چینی سے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتے ہوئے اسے اچانک یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔

”وہ۔۔۔ اس کی تو میں نے صافیاں بنالیں۔“ اماں نے خاصی بے نیازی سے جواب دیا تھا اور ہادی ان کے جواب پر اس بری طرح اچھلا کہ سوئی کف کے بجائے اس کی کلائی میں اتر گئی۔ نتیجتاً ”منہ سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔“

”بس بیٹھا رہ آرام سے۔ زیادہ بڑھکیں نہ مار۔“ اماں کو لگا وہ غصے کا اظہار کر رہا ہے سو جھڑکنا ضروری سمجھا۔

”لیکن۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ صدے کے مارے اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔ وہ شرٹ اس نے کچھ دن پہلے ہی تو خریدی تھی اور بھی کبھی کافی مہنگی۔

”میں نے تجھے کتنی بار کہا ہے کالا رنگ نہ پہنا کر تجھے نظر لگ جاتی ہے۔ مگر تو سنتا ہے کسی کی بچپن میں جب تجھے کالے رنگ کا جوڑا پہناتی تھی تو دوسرے ہی دن تجھے بخار چڑھ جاتا تھا اور اس دن بھی تو نے یہی منحوس رنگ پہنا تھا ناں جب تیرا ایکسینڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ میں نے سوچا ایسے تو تو باز نہیں آئے گا۔ اچھا ہے اس کے ٹکڑے کروں۔“

”اماں! آپ نے ایک فضول سے وہم کے لیے میری شرٹ کا ستیا ناس مار دیا۔“ اس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

”السلام علیکم خالہ!“ ایک نرم نسوانی آواز نے اس

FACE FRESH

SKIN CARE COSMETICS

Flawless. Spotless. Fresh
PERFECT FAIRNESS



www.facebook.com/facefresh1
www.facebook.com/facefresh
www.twitter.com/facefresh1
www.facebook.com/facefresh
www.facebook.com/facefresh

داوے یہ رشتے دیکھ رہی ہیں یا موسمی پھل؟ اس کا نکتہ اعتراض اس بات پر تھا رومی کو شدید غصہ آیا۔
”ہادی! میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں اور تم... سنو! اگر امی نے میرا رشتہ کہیں اور طے کر دیا ناں تو پھر مجھ سے شکایت مت کرنا۔“

”ہاں تو میں ہمت جمع کر رہا ہوں ناں اماں سے بات کرنے کی۔“ وہ کچھ لاچارگی سے بولا۔
”تم میں تو اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اپنی اماں کے سامنے میرا نام تک لے سکو۔ تم انہیں میرے لیے کنوئیں کیسے کرو گے۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ سیکنہ مر جائے گی مگر کبھی تمہیں اپنی بہو نہیں بنائے گی۔“
”تم نے خالہ کو بتا دیا۔“ ہادی تو یہ سن کر اچھل ہی پڑا۔

”بتاتی نہ تو اور کیا کرتی۔ وہ تو میری منگنی طے کیے بیٹھی تھیں۔ اب بھی انہوں نے مجھے ایک مہینے کا ٹائم دیا ہے۔ اگر اس ایک مہینے میں تم اپنی اماں کو لے کر ہمارے گھر نہیں آئے تو وہ میری شادی کہیں اور طے کر دیں گی اور میں کچھ نہیں بولوں گی سمجھے تم!“
وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ ہادی بے چینی سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”دیکھو! میں مانتا ہوں۔ اماں اتنی آسانی سے نہیں مانیں گی مگر تمہیں بھی تو کچھ کوشش کرنی چاہیے ناں میری مدد کرنے کی۔ میرا مطلب ہے تم ان کی بھانجی ہو تو تمہیں انہیں اس بات کا احساس دلانا چاہیے۔
بھابھی کے الگ ہونے کے بعد تم نے جھانکا بھی نہیں کبھی ہمارے گھر۔ اماں ناراض ضرور ہیں مگر ان کی یہ ناراضی بھابھی کے لیے ہے۔ اگر تم ان کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ انہیں یہ یقین دلانے نہیں آو گی کہ ان کی اور بھابھی کی اس لڑائی سے تمہارا کوئی لینا دینا نہیں ہے تو وہ تمہیں اپنی بہو بنانے پر کیسے رضامند ہوں گی۔“

”سوری ہادی! جس کا دل مجھے جیتنا تھا۔ میں جیت چکی۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ تیزی سے بولی۔
”اگر تم مجھے ہو کہ میں نیک پروین بن کے

کے سوگ میں خلل ڈالتا تھا۔ وہ بے اختیار ہی چونک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگا۔
”تعبیر! آج تو بڑے دنوں بعد چکر لگایا تو نے۔ ارے اندر آنال دروازہ میں کیوں کھڑی ہے۔“
اماں اسے دیکھ کر اتنی پر جوش ہوئیں کہ اس کی آستین میں دھاگا سوئی سمیت ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے خود ہی دھاگا ایک جھٹکے سے توڑ کر تعبیر کی طرف دیکھا، جواب جھجکتے ہوئے اندر آرہی تھی۔

سیاہ چادر اوڑھے سنہری رنگت اور خوابیدہ سنہری آنکھوں والی تعبیر کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ اماں اس سے اس کی امی کی طبیعت پوچھنے لگی تھیں۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر ہر نکل آیا تھا۔
وہ ان کے گھر بہت کم آتی تھی۔ ایک تو وہ جاب کرتی تھی اس لیے بھی اور کچھ وہ رہتی بھی کافی الگ تھلگ تھی۔ آج اگر وہ خود سے آئی تھی تو یقیناً کسی وجہ سے ہی آئی تھی۔ وہ کچھ دیر تو سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر رومی کو خیالوں میں لے آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”کیسی ہو؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھی تو ہادی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ خود تو سیاہ رنگ نہیں پہن پایا تھا مگر رومی اس وقت سیاہ اور سرخ رنگ کے سوٹ میں کافی چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔
”ٹھیک ہی ہوں فی الحال۔“ بے نیازی سے چیونگم چباتے ہوئے وہ اپنے نیل پالش کو جانچتا چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”فی الحال... مطلب؟“ اس نے رومی کے الفاظ پر غور کیا تو چونک گیا۔

”امی میرے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں دھڑا دھڑ۔“
اس نے کچھ ناراضی سے اطلاع فراہم کی۔ خیال تھا یہ خبر ہادی کے دل و دماغ کو خاصا جھکا دے گی۔
”دھڑا دھڑ؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔ ”بائی

تمہاری اماں کے آگے پیچھے پھر کے ان کے خوشامدیں کر کے ان کا دل جیتوں گی تو تم غلطی پر ہو۔ مجھ سے یہ ڈھونگ نہیں ہوگا۔ تم خود انہیں مناسکتے ہو تو منالو مگر مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔

رومی نے نہایت قطعیت سے اس پر واضح کیا۔ ہادی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

”تو پھر تم مجھ سے یہ توقع کیسے رکھ سکتی ہو کہ میں اماں کو تمہارے لیے مناؤں گا۔“ ہادی نے جتنے سرد انداز میں کہا تھا۔ وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں حامد بھائی نہیں ہوں رومی! اس لیے تم اس بھول میں مت رہنا کہ میں اماں کی مرضی کے خلاف کچھ کروں گا۔ تم ان کی خفگی دور کرنے کے لیے ان کے پاس نہیں جاسکتیں اور وہ تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے چلی آئیں۔ کن خیالوں میں ہو تم۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ رومی غصے سے کھولتی بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو ٹھیک ہے نہ آئیں وہ میرا رشتہ مانگنے۔ میں بھی کوئی مر نہیں رہی ہوں تم سے شادی کے لیے۔“

”رومی۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔“ اسی وقت کمرے میں چائے کے لوازمات کے ساتھ داخل ہوتی بھابی نے اسے ٹوکا تھا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے ہادی! وہ ہماری خالہ ہیں۔ ہماری بزرگ ہیں اگر تم ان کے پاس چلی جاؤ گی تو شان نہیں کھٹ جائے گی تمہاری۔“

ان کے لہجے میں ڈانٹ کا غصہ نمایاں تھا۔ ہادی کو اپنی سماعتوں پر شہر ہوا اور پھر اپنی آنکھوں پر۔ وہ یقیناً بھابی ہی تھیں جو اماں کو اپنی بزرگ قرار دیتے ہوئے اپنی بہن کو گھر کر رہی تھیں۔

”میری تو خیر وہ صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ نجانے کیا کیا بد گمانیاں پالے بیٹھی ہیں میرے لیے اور اس میں قصور ان کا بھی نہیں ہے یہ جو ہر وقت آگ لگانے والے رشتے دار وہ اپنے گرد اکٹھا کیے رہتی ہیں وہی زہر بھرتے رہتے ہیں ان کے دل میں میرے خلاف مگر تمہارا معاملہ الگ ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو کم از

کم ان کی یہ غلط فہمی تو دور ہو ہی جائے گی کہ میں نے تم لوگوں کو ان سے تعلق توڑنے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے تو حامد سے بھی کہہ دیا ہے صاف صاف کہ وہ اپنے سارے گلے شکوے بھول کر پہلی فرصت میں اماں سے مل آئیں۔ ورنہ وہ پھر مجھے ہی کوسی رہیں گی کہ میں نے ہی جادو ٹونا کروا کر حامد کا دل ان سے پھیرا ہے۔“

وہ مسلسل بول رہی تھیں۔ ان کی اس تقریر پر رومی کی آنکھوں میں لہجہ بھر کے لیے الجھن سی ابھری تھی۔ شاید وہ بھی بہن کی اس کلیا پلٹ پر حیران تھی۔ ہادی کے لیے تو آج یہ ایک حیرتوں بھرا دن تھا۔ سب سے پہلے تو بھابی نے جس پر جوش انداز میں اس کا استقبال کیا تھا وہ بھی اس کے لیے کچھ کم حیران کن نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ جتنی بار بھی آیا تھا ان کی بیزاری اور چڑچڑاہٹ ہی دیکھنے کو ملی تھی جواب ان کے مزاج کا لازمی حصہ بنتی جا رہی تھی اور اس وقت بھی گو کہ اماں کے لیے ان کے لہجے میں کچھ زیادہ خوشواریت نہیں تھی۔ مگر پھر بھی پہلے کی نسبت یہ ایک کافی بڑی تبدیلی تھی کہ انہوں نے براہ راست اماں کو کچھ کہنے کے بجائے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے میں چلی جاؤں اور جو انہوں نے آپ کی تمام تر بھڑاس مجھ پر نکال دی تو؟“ رومی نے پسپا ہو کر بیٹھتے ہوئے ہچکچا کر سوال کیا تھا۔ ”ایسا نہیں ہو گا یقین کرو۔“ ہادی پر جوش ہو کر بول اٹھا۔ بھابی کی تقریر نے کچھ اثر تو کر ہی دیا تھا۔ ”اماں غصے کی تیز ضرور ہیں مگر دل کی بہت کھری ہیں۔ وہ کوئی بات زیادہ دیر دل میں نہیں رکھتیں۔ تمہیں دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوں گی کہ انہیں اپنی ناراضی یاد ہی نہیں رہے گی۔“

”ٹھیک ہے دیکھتی ہوں۔“ اس نے بادل خواستہ سر ہلایا۔

”دیکھتی ہوں“ کا کیا مطلب ہوتا ہے رومی! ایسا کہ تم آج ہی ہادی کے ساتھ چلی جاؤ۔“ بھابی نے کہا تو ہادی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

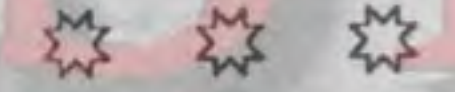
”ارے نہیں۔۔۔ میرے ساتھ نہیں!“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ بھابی تو اسے مروانے کا پلان بنائے بیٹھی تھیں۔

”تم اس طرح میرے ساتھ جاؤ گی تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں۔“ اس نے یہ نہیں کہا کہ پتا نہیں وہ کیا کر بیٹھیں۔ حالانکہ اسے یہی کہنا چاہیے تھا۔ ”انتا ڈرتے ہو ان سے۔“ بھابی نے طنزاً کہا تھا۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ میں ان سے اتنا ہی ڈرتا ہوں اور میں انہیں اپنی طرف سے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کا لہجہ بہت کچھ جتانے والا تھا۔ بھابی کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

”ارے ہادی! تم چائے تولے لو۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“

رومی نے موضوع بدلنے کے لیے اس کا دھیان بنایا تھا۔ وہ بھی اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ بھابی نے آج چائے کے ساتھ کافی اہتمام کیا تھا اور اس کی وجہ نہ سمجھنے کے باوجود وہ اس وقت یہ الجھن ذہن سے جھٹک کر ان لوازمات سے انصاف کرنے لگا۔ بھابی اگر آج خاطر میں کرنے کے موڈ میں تھیں تو وہ بھی یہ موقع چھوڑنے والا نہیں تھا۔



”تعبیر تم اوپر گئی تھیں؟“ دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ چائے بنا کر امی کے سامنے بیٹھی تو انہوں نے پوچھ لیا۔ وہ کچھ چونکی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”جی امی! میں نے سوچا آج جب آف لے ہی لیا ہے تو میں خود ہی انہیں جا کر کرایہ دے آؤں۔ اچھا نہیں لگتا ناں۔۔۔ وہ اپنے منہ سے کہیں تو۔۔۔“ چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

”کیسی تھیں ہادی کی امی۔۔۔“ ”ٹھیک تھیں اور آپ کی طبیعت پوچھ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ وہ تو روز آئیں آپ سے ملنے۔ مگر

ان کے بیٹے انہیں اتنا مصروف رکھتے ہیں کہ انہیں کہیں آنے جانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔“ انہیں بتاتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس میزوں اور گولڈن کلر کے کارڈ پر پڑی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا۔

”بہت ہی سادہ اور بھلی عورت ہے۔“ امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی مگر تعبیر انہیں دیکھنے کے بجائے کارڈ کے اندر لکھے مندرجات پڑھ رہی تھی۔ ”یہ کل نعیہ بھابی دے گئی تھیں اور آنے کے لیے۔ اصرار بھی کیا ہے۔“

امی نے اس کے ہاتھ میں کارڈ دیکھا تو اس کے چہرے پر تاسف کی ہلکی سی پرچھائیں، کوئی زیاں کا تاثر نکھو جتا چاہا مگر اس کا چہرہ ساٹ ہی رہا۔

”تو تحدید تعلق کا خیال آ ہی گیا انہیں۔“ کارڈ واپس اپنی جگہ پر رکھتے اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔

”آپ کو جانا ہو تو بتا دیجئے گا میں آپ کے کپڑے نکال دوں گی۔“ کارڈ میں تارتی اسی ہفتے کی درج تھی۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے مجھے جانا چاہیے؟“ پتا نہیں انہوں نے اس سے مشورہ طلب کیا تھا یا پھر اس کی رائے۔

”کیا فرق پڑتا ہے میں چاہوں نہ چاہوں آپ اس خاندان سے تعلق نہیں توڑنا چاہتیں اور نہ توڑ سکتی ہیں تو آپ ہی ڈیساڈ کیجئے کہ آپ کو جانا چاہیے یا نہیں۔“

”تم نے ٹھیک کہا رشتے دار کیسے بھی کیوں نہ ہوں ان سے کٹ کر نہیں رہا جاسکتا۔“ امی نے ایک گہری سانس کھینچی۔

”اگر تم دونوں کے مستقبل کی فکر نہ ہوتی تو میں۔“

”ہمارے مستقبل کی فکر۔۔۔“ تعبیر ان کی بات کاٹے بغیر نہ رہ سکی۔

”آپ ان خود غرض لوگوں سے جڑے رہنا چاہتی ہیں کیونکہ آپ کو ہمارے مستقبل کی فکر ہے؟ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ ان سے امید رکھ رہی ہیں امی!“

وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔

”تمہاری پھپھو معینہ کے لیے اشاروں کنایوں میں سونا کا کہہ چکی ہیں۔“ نظریں جراتے ہوئے ان کا لہجہ پست تھا۔ یہ مجبوری بھی انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے اس کا احساس انہیں آج ہوا تھا۔

”اشاروں میں کیا ہے۔ اگر رشتہ تو نہیں مانگا۔ بلکہ جنہوں نے رشتہ مانگا تھا۔ انہوں نے کون سا بوجھ چکا کر دیا آپ کا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہی سونا کے ساتھ ہو ایسا چاہتی ہیں آپ؟“

وہ اتنا رخ نہیں ہونا چاہتی تھی اور نہ ہی اس نے ابھی تک کبھی کھل کر ان سے اس موضوع پر بات کی تھی مگر آج ان کے خیالات جان کر اسے جو دھچکا لگا تھا۔ وہ ضبط نہیں کر پائی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ امی ایسی تھیں تو نہیں تھیں پھر اب وہ کیوں اتنی کمزوری کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

”خدا نہ کرے تعبیر ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ وہ دہل گئیں۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ خدا کے لیے امی! انسانوں سے اس لگانا چھوڑ دیں۔“ التجائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس کا لہجہ دھیمہ ہوا۔

”اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ آپ تو ہر حال میں اللہ پر توکل کرنے والوں میں سے تھیں۔ پھر اب یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ کیوں اپنے ہی پڑھائے ہوئے سبق بھول رہی ہیں کہ نصیب اللہ جوڑتا ہے انسان نہیں۔“

ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں، ان کا چہرہ دھندلا ہوتا نظر آیا۔

”سوری امی! مگر ایک بات میں آپ پر واضح کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ اسی لیے آپ میری فکر چھوڑ دیں اور سونا ابھی چھوٹی ہے۔ اس کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں ہوئی کہ آپ کو اتنا پریشان ہونے کی ضرورت ہو۔“ وہ دھیرے سے کہتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا۔ کیا باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔“ سونا ابھی ابھی برتن دھو کر آئی تھی۔ دپٹے سے

ہاتھ پونچھتے ہوئے نا سمجھی کے عالم میں دونوں کے چہرے دیکھنے لگی۔

”ولید کی شادی میں کس نے جانا ہے وہی ڈسکس کر رہے تھے۔“ تعبیر نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”کیا۔۔۔ آپ لوگ شادی میں جانے کا سوچ رہے ہیں؟“ سونا کی بلند آواز میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی۔

”کیوں۔۔۔ آپ کے ذہن میں یہ خیال آیا بھی کیسے

”زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے سونا! کوئی نہیں جا رہا ہے یہاں سے۔“ کنپٹیاں دباتے ہوئے امی نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔

”تو پھر یہ تعبیر کیوں کہہ رہی ہے کہ۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک کر اسے گھورنے لگی۔

”لگتا ہے تمہارا وہاں جانے کا بڑا دل ہو رہا ہے۔“ تعبیر اس کی بات نظر انداز کر کے امی سے مخاطب ہوئی۔

”پلیز امی۔۔۔ میں نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ مت جائیے۔ میں تو بس آپ سے اتنا چاہتی ہوں کہ

آپ بلاوجہ خود کو جھوٹے دلا سے نہ دیں۔ ان سے ایسی کوئی امید مت رکھیں جس سے آپ کا ہی دل دکھے۔

آپ پھپھو کی بات کر رہی ہیں۔ جب سے ہم یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ انہوں نے تو یہاں قدم بھی نہیں

رکھا۔۔۔ نجانے کب اور کس موڈ میں انہوں نے آپ سے کچھ کہہ دیا اور آپ ہیں کہ اسے دل سے لگا بیٹھی

ہیں۔ ان سے کہیں گی تو انہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ انہوں نے ایسی کوئی بات کی بھی تھی۔ میں آپ سے

پھر کہہ رہی ہوں۔ آپ نے جانا ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ مجھے آپ کے وہاں جانے سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

وہ اپنی بات ختم کر کے مزید ان کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی تھی۔ پیچھے سونا جو اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش میں ہونق سی بنی کھڑی تھی، اب امی کے پاس آکر ان کے کان کھانے لگی تھی۔

”ہاں زین! بھابھیاں کیسی ہیں تیری۔“

وہ اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ زین کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ اسے ہادی کے ساتھ بینک جانا تھا۔ ہادی کو بل جمع کروانے تھے اور اسے اپنا ایک چیک کیش کروانا

تھا اور اس مشقت کے بعد چچ کا وعدہ ہادی کی طرف سے تھا۔ اس وقت وہ ہادی کی امی کے بنائے ہوئے گاجر

کے حلوے سے انصاف کر رہا تھا کہ ان کے اس سوال پر منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

”اف خالہ! کیا پوچھ لیا آپ نے۔“ اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ فوراً گھبرا گئیں۔

”ہائے اللہ خیر کرے! کیا پھر کسی کی طبیعت خراب ہو گئی۔۔۔ ابھی پچھلے ہی دنوں تو مجھلی کا آپریشن ہوا تھا

وہ کیا کہتے ہیں وہ۔۔۔ سیزر۔“ سادہ لوح خالہ نا سمجھی کے عالم میں اس لفظ میں ہی الجھ گئی تھیں۔ ادھر زین بے

تحاشا جھینپ گیا۔

”نہیں خالہ! سب ٹھیک ہی ہیں۔“ اس نے جلدی سے انہیں اس الجھن سے نکالا۔ ”میرے کہنے

کا مطلب تھا ۴ نہیں اتنی جلدی کچھ نہیں ہو سکتا۔“

چنگیز خان کی اولادوں میں سے ہیں سب کی سب۔“ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی

کھلی تھی۔

”نال تو یہ بتاؤ تو کوری کیوں نہیں کر لیتا۔“ انہوں نے ایک نیا موضوع چھیڑا۔ زین کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ آگئی۔

”تیری ان کمینہ کی طرف بھابھیوں کا منہ بھی بند ہو جائے گا اور میں ہادی کے ساتھ ساتھ تیرے لیے

بھی لڑکی دیکھ لوں گی۔“

ہادی وقتاً فوقتاً ان سے ذکر کرتا رہتا تھا۔ اس لیے انہیں اندازہ تھا زین کی مشکلات کا۔

”میری فراغت تو صرف ایک بہانہ ہے۔ نوکری مل جائے گی تو وہ کسی نئی بات کو ایشو بنائیں گی اور کفن پھاڑ کر لو لیں گی۔ مجھے ان کی عادتوں کا پتا ہے خالہ! آپ

ٹینشن نہ لیں اور میں بھی ان کے سامنے کوئی پیما بچہ بنا نہیں بیٹھا رہتا۔ ایک کے بدلے دس سنا تا ہوں۔ اب تو وہ میری زبان درازی خاندان بھر میں مشہور کر چکی ہیں لیکن میں کوئی لڑکی تو ہوں نہیں کہ رشتہ نہ آنے کی فکر ہو سو کوئی پروا بھی نہیں۔“

وہ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں کہتا انہیں مطمئن کر رہا تھا کہ کہیں وہ اسے بالکل ہی بھابھیوں کے رحم و کرم پر رہنے والا کوئی مظلوم و یتیم بچہ ہی نہ سمجھ لیں۔

وہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور اپنے امیر باپ کا سب سے لاڈلا بیٹا تھا مگر تب تک جب تک وہ

زندہ تھے۔ ماں اس کے بچپن میں ہی گزر گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کی نسبت اپنے والد

سے زیادہ قریب تھا۔ اب تو خیر حالات ہی اور تھے مگر بھابھیوں نے کبھی ان کی زندگی میں بھی زین کا لحاظ

نہیں رکھا تھا اور اب تو ایک مضبوط وجہ بھی تھی ان کے پاس اس سے خار کھانے کی کہ شہر کی مصروف

ترین مارکیٹ میں ان کی چار چلتی ہوئی دکانوں میں سے بھی وہ حصے دار تھا اور اسی علاقے میں دو رہائشی بلڈنگز

سے آنے والے ماہانہ کرایوں میں بھی۔

زین کے والد حصے خرے کر کے نہیں مرے تھے۔ ورنہ اس کے دوسرے بھائی کب کے اس بڑے سے

گھر کوچ کر اپنے الگ الگ گھروں اور زندگیوں میں سیٹ ہو چکے ہوتے۔ اب اس جائیداد کے حصے ہوتے

تو ایک بڑا حصہ زین کے قبضے میں چلا جاتا جس کا یہ کوئی کام تھا نہ کوئی دھندہ۔ ہر مہینے اسے اتنی معقول رقم مل

جاتی کہ وہ اپنی شاہ خرچیاں پوری کر لیتا۔ جبکہ دوسرے بھائی دکانداری کرتے ہوئے خوار ہو رہے تھے۔ اسے

چونکہ اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی سارا دن سودے بازی کرنے والے گاہکوں کے ساتھ مغز

ماری کرنے کا شوق تھا سو پہلے اطمینان سے اپنی پڑھائی مکمل کی اور اب اپنے مطلب اور اپنے معیار کی نوکری

کی تلاش میں وقت گزار رہا تھا۔ اسی لیے بھابھیوں کو تو غصہ آتا ہی تھا کہ محنت ان کے شوہر کرتے اور ہر مہینے

ایک موٹی رقم اس شہزادے کی جیب میں چلی جاتی۔ سو وہ اس کے منہ پر ہی اسے مفت خور، طفیلہ نجانے کیا کیا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتی رہتیں۔

”چل پو! اٹھ اب نکلنے کی کر۔“ فریش اور نکھرے نکھرے ہادی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

زین نے پہلے تو سر سے لے کر پیر تک اس کا جائزہ لیا، پھر معنی خیز انداز میں سر ہلایا تھا۔

”یاد رہے تو بینک جا رہا ہے رومی سے ملنے نہیں۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے۔“ ہادی نے فوراً ”سپٹا کر اماں کو دیکھا جو چائے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔ ہادی کی قسمت اچھی تھی کہ یہ بات ان کی سماعتوں تک رسائی حاصل نہیں کر پائی۔ زین ہنسنے لگا۔

”یار! تو تو اس لڑکی کی طرح گھبرا رہا ہے جو ماں سے چھپ کر ڈیٹ پر جا رہی ہو۔“

”کر لے بکواس باہر نکل پھر میں تجھے بتاتا ہوں۔“ ہادی نے بمشکل اپنا غصہ دبایا۔ زین نظر انداز کر کے خالہ سے کہنے لگا۔

”خالہ! میری تو نوکری کا مسئلہ ہے۔ مگر ہادی کے لیے تو آپ لڑکی دیکھ ہی لیجئے۔ برسر روزگار ہے میرا یار، اچھا خاصا ہٹا کٹا مسٹرڈا ہے۔ کہیں ہاتھ سے ہی نہ نکل جائے۔“

اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے آخری جملہ وہ زیر لب برید لایا تھا۔ ہادی کا چہرہ سرخ پڑنے لگا غصے اور ضبط کے باعث۔

”ہادی کے لیے تو میں لڑکی دیکھ چکی ہوں۔ بس اب تو جلدی سے نوکری تلاش کر لے تو پھر تم دونوں کی ممکنہ ایک ساتھ ہی کرواؤں گی۔“ اماں نے مسکراتے ہوئے برعزم لہجے میں کہا۔ ہادی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور زین کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک آگئی۔

”تو پھر وعدہ رہا خالہ! میرے لیے بھی لڑکی آپ ہی دیکھیں گی۔ ویسے بھی اپنی بھابیوں کی پسند پر مجھے کچھ زیادہ بھروسہ نہیں۔“ وہ ان سے وعدہ لینے لگا تھا۔

”ارے بالکل۔۔۔ میرے لیے تم کوئی ہادی سے کم

تھوڑا ہی ہو۔ میں تو جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تین کے بجائے چاروں بیٹوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔“

”تھینک یو خالہ!“ زین کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

”یار! یہ اماں کیا کہہ رہی تھیں۔“ سیڑھیاں اترتے ہوئے ہادی نے ہر اس لہجے میں کہا تھا۔

”یہی کہ تیرے سرے کے پھول کھلنے والے ہیں اور کسی پیاری سی لڑکی کی قسمت پھوٹنے والی ہے۔ لیکن میں خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہو، بس رومی نہ ہو۔“ زین نے یہ بات کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہادی اسے گھور رہا ہے۔

”تو۔۔۔ تو دوستی کے نام پر ایک بد نما داغ ہے۔“

”اور مجھے اس پر فخر ہے۔ آج کل تو داغوں کو اچھا ثابت کرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ایڈورٹائزمنٹ کی جا رہی ہے۔“ زین نے بے فکری سے بات اڑائی۔

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ تجھے رومی سے اتنا شدید بیڑ کیوں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو نے اس پر لائن ماری ہو اور اس نے تجھے لفٹ نہ کروائی ہو۔“ ہادی نے پر سوچ انداز میں کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ زین ہنس پڑا۔

”تیرے دوست کی وجاہت پر آج تک بہت سی لڑکیاں قربان ہوئی ہیں۔ مگر جسے میں دل دوں گا۔ وہ صرف ایک ہی ہوگی اور میں اسے اپنا بنا کر دم لوں گا“

چاہے وہ مجھے لفٹ کروائے یا نہ کروائے۔ سمجھ گئے؟“

زین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا سونا کی آواز آئی تھی۔

”ہادی بھیا!“ وہ شاید دروازے کے پاس ہی شل رہی تھی۔ جب ہی تو باتوں کی آواز سن کر فوراً ہی دروازہ کھول کر جھانکا تھا مگر ہادی کے ساتھ کھڑے زین کو دیکھ کر وہ ٹھنک گئی۔ زین کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ زین کی آنکھوں میں بے اختیاری تھی اور

سونا کی آنکھوں میں حیرت۔

”ہاں سونا! کچھ کام تھا؟“ ہادی پوچھنے لگا۔

”سونا۔“ زین چونکا۔ ”اس کا نام تو چاندی ہونا

چاہیے تھا یا پھر۔۔۔ چاندنی۔“ اگلے روپ اور چاندی سی رنگت والی اس لڑکی کو دیکھ کر وہ سوچے بنانہ رہ سکا۔

”کیا صفی گھر پر ہے اصل میں کچھ سودا منگوانا ہے تو؟“ وہ دھیرے سے گویا ہوئی تھی۔

”نہیں وہ تو گھر پر نہیں ہے لیکن تم فکر مت کرو وہ جہاں کہیں بھی ہے میں اسے فون کر کے آنے کے لیے کہہ دوں گا۔“ ہادی نے اسے تسلی دی۔

”شکریہ۔“ وہ مسکرائی، پھر ایک آخری نظر دوبارہ اس پر ڈالی۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو اور ماتھے پر بکھرے بالوں سے وہ اسے کافی لاپرواہ و جوان لگا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔

”بد تمیز۔“ دل ہی دل میں اسے لقب دیتی وہ کافی زور سے دروازہ بند کر گئی تھی اور زین کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”مجھے رومی کے لیے اچھا سا لفٹ لینا ہے۔“ بینک سے نکلتے ہی ہادی نے اسے اپنا اگلا پروگرام بتایا۔ یہ سنتے ہی زین یوں اچھلا کہ پارکنگ ایریا سے نکلنے والی بائیک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

”او بھائی! آنکھیں کیا گھر پر ہی چھوڑ آئے ہو۔“ موٹر سائیکل سوار نے اسے کافی خونخوار نگاہوں سے گھورا تھا۔ زین خون کے گھونٹ پی کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”کیا پھوٹے ابھی تم۔۔۔؟“

”مجھے طارق روڈ لے چلو۔“ ہادی اس کے ساتھ اس کی بائیک پر آیا تھا۔ اس لیے یہ نئی فرمائش بلکہ آزمائش اس کافی تاؤ دلا گئی تھی۔

”جہنم لے چلوں؟“ اس نے دانت پیسے۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس سے پہلے میں

رومی کے لیے گفت ضرور لوں گا۔ بھی! اس کے پاس میری کوئی آخری نشانی بھی تو ہونی چاہیے۔“ ہادی نے مسکراتے ہوئے اس کا مزید جی جلایا۔

”اتنی جڑ کسی عورت کو اپنی سوکن سے بھی نہیں ہو گی۔ جتنی مجھے اس رومی سے ہے۔ خدا کی قسم۔“

زین واقعی بیزار ہو گیا تھا۔ پھر ہادی نے محض ایک گفت کی خاطر پورے دو گھنٹے اسے اپنے ساتھ خوار کروایا تھا اور آخر میں زین کے ہاتھ پیر جوڑنے پر اس نے ایک جیولر شاپ سے رومی کے لیے بے حد خوب صورت چاندنی کے نگین خرید لیے تھے۔

”جب تجھے آخر کار یہیں آنا تھا تو اتنی دیر بوتیکس اور کاسیٹیکس شاپ میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ زین نے تھک کر سوال کیا تھا۔

”اصل میں میں نے سوچا میں اس کے لیے کچھ ایسا لفٹ لوں۔ جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھے اور جو کبھی برائیاں نہ ہو۔ سمجھ رہے ہونا میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو؟“ اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔ ہادی چونک گیا۔

”تو تمہیں کیا لگتا ہے میں فلرٹ کر رہا ہوں؟“

”نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ خلاف توقع اس نے بحث کرنے کے بجائے بات ختم کر دی۔ ہادی ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”تعبیر! میں اوپر جا رہی ہوں۔“ وہ کچن میں اسے یہ بتانے آئی تھی۔ وہ شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں؟“

”بس ایسے ہی عبور ہو رہی تھی۔“ اس نے کچھ اس طرح منہ بنا کر کہا کہ تعبیر کو ہنسی آگئی۔

”تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے اوپر تمہاری کوئی بہت

”آپ کی ناراضی تو امی اور آپنی سے تھی نال خالہ!
پھر ہمارا کیا قصور تھا کہ آپ نے ہمیں بھی اپنے دل سے
نکال دیا۔ آپ کو کبھی اپنی اس بھانجی کی یاد نہیں آئی۔
آپ جانتی ہیں کتنا پیار کرتی تھی میں آپ سے۔۔۔ میرا
کتنا دل کرتا تھا آپ سے ملنے کے لیے لیکن ہر بار میں
یہاں آتے آتے رہ جاتی تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں
ان پر آیا غصہ آپ مجھ پر نہ نکال دیں۔“

”کیا کرتی ہیں آپ؟“ وہ سونا کی جانب متوجہ ہوئی
جو خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔
”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”زہ نصیب۔۔۔ آج یہ ہمارے گھر کے بھاگ کیسے جاگ گئے۔“ وہ اسے دیکھ کر کھل گیا تھا۔ اماں اس وقت کچن میں تھیں، سو اس نے اپنی خوشی ظاہر کرنے میں کسی جمل سے کام نہیں لیا۔

”ہٹے سامنے سے۔ مجھے جانا ہے۔“
 ”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔ میں آپ کو چاندنی
 کہہ کر پکاروں گا تو آپ برا تو نہیں مانیں گی؟“
 وہ ہنوز اس کے سامنے جما کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تو

ہونٹ کاٹتی رہی پھر ہنا کوئی جواب دیے اس کی سائیڈ سے ہو کر کافی تیزی سے دروازہ پار کر گئی۔ زین کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آئیے آکر چائے پی لیجئے اور یہ سونا آپی کہاں گئیں۔“ صفی جو اسے بلانے آیا تھا حیرت سے دریافت کرنے لگا۔

”جلی گئیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”کمال ہے وہ بنا بتائے جاتی تو نہیں ہیں۔“ صفی حیرت سے بڑبڑایا تھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”تم نے کبھی بتایا نہیں ہادی! کہ تمہاری ایک اتنی خوب صورت پڑوسن بھی ہے۔“

روی فون پر اس سے بہت چبھتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ویسے تو وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ مگر جانے سے پہلے اماں نے اسے علیحدگی میں بلا کر خاص طور پر اس بات کی تاکید کی تھی کہ اس نے فرحت کے گھر قدم بھی نہیں رکھنا اور روی کو چھوڑ کر باہر سے ہی واپس آ جانا ہے۔ اس نے اماں کی اس تاکید پر من و عن عمل کیا تھا۔ روی کے شدید ترین اصرار کے باوجود کیونکہ ہادی کو کچھ عرصہ پہلے کی اماں کی ناراضی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ دوبارہ انہیں خفا کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

”اگر میں تمہارے سامنے اپنی خوب صورت پڑوسن کی خوبصورتی کا ذکر کرتا تو تم میری جان نہ لے لیتیں۔“ اس نے ہنس کر کہا تھا۔ ”ویسے ڈونٹ وری۔“ وہ میرے لیے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔

”یہ تو ہر لڑکا کہتا ہے۔“ اسے تسلی نہیں ہوئی۔ جب سے اس نے سونا کو دیکھا تھا۔ عجیب سی جلن ہونے لگی تھی۔

”اور کتنی بے تکلفی تھی اس لڑکی کے انداز میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کا گھر ہو۔ اس سے زیادہ تو میں

اپنے آپ کو غیر محسوس کر رہی تھی وہاں۔“

”افوہ روی! تم چھوڑو ناں یہ ٹاپک۔“ وہ بیزار ہو گیا مگر روی جب ایک بات کا پیچھا لے لیتی تو پھر چھوڑتی نہیں تھی۔

”ہاں تم تو یہی کہو گے چھوڑ دو لیکن مجھ سے پوچھو کیا کیا وہم ستانے لگے ہیں مجھے۔ برامت ماننا مگر مرد ذات کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا کب ایک سے دل اکٹا کر دوسری پر آجائے۔ وہ بھی تب جب کوئی صبح و شام نظروں کے سامنے ہی رہتی ہو۔“

”اچھا۔۔۔ تو تم مجھ سے کیا سننا چاہتی ہو؟“ وہ زچ ہوا۔

”فی الحال تو کچھ نہیں۔“ اس نے فوراً ہی ٹون بدلی۔

”یہ بتاؤ تم نے خالہ سے بات کی؟“

”ہادی!“ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا اماں دروازے میں آکھڑی ہوئی تھیں۔

وہ چونکا۔ ”جی اماں۔“

”بات کرنی ہے مجھ سے کیا کر رہا ہے۔“ اب وہ اندر داخل ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک نظریل کو دیکھا پھر سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب۔

”کچھ نہیں۔۔۔ آپ کہیں کیا کہنا ہے؟“

”تو بیٹھ جا پہلے ایسی نہیں ہوگی بات۔“ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ان کے لہجے سے برہمی چھلکی تھی اس کے جان چھڑانے والے انداز پر۔ بے اختیار اسے کال منقطع کرنی پڑی اور ان کے پیروں کے قریب بیٹھ کر اس نے دوبارہ پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”میں نے تیرے لیے لڑکی دیکھی ہے۔“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”نہیں۔“ وہ دل ہی دل میں چیخا۔ ”روی سے ملنے کے بعد بھی اماں اس لڑکی کو نہیں بھولیں۔ نجانے وہ کون ہے جو میرے سارے ارمان جلانے پر تلی ہوئی ہے۔“

”ویسے تو مجھے یقین ہے تجھے بھی وہ لڑکی ضرور پسند آئے گی۔ لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ اس کی ماں سے

بات کرنے سے پہلے ایک بار میں تجھ سے پوچھ لوں۔“

”کون ہے وہ۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پوچھنا پڑا۔

”تعبیر!“ اماں کا جواب تھا یا پھر کوئی ہم جو اس کے اعصاب پر پھٹا تھا۔ اگر وہ بیٹھا نہ ہوتا تو یقیناً اسے کسی چیز کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آ جاتی۔

”نت۔۔۔ تعبیر۔“ وہ ہکا کر بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ مانتی ہوں میں کہ تیرے مقابلے میں وہ لڑکی ہیرا ہے مگر وہی ہے جو تجھے اور اس گھر کو سنوار سکتی ہے۔“

”لیکن، لیکن اماں! وہ وہ لوگ اتنے انجان اور۔۔۔“

اسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں سوجھ رہے تھے۔

”لو انجان کیوں؟“ نہیں غصہ آ گیا۔

”پچھلے سات مہینوں سے ساتھ ہیں اور پرکھنے کے لیے تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ بوڑھی ضرور ہوں۔ کم عقل بھی ہوں دھوکے بھی بہت کھائے ہیں مگر اتنی پاگل بھی نہیں ہوں کہ برے بھلے کی پہچان ہی نہ کر سکوں اور ان کی تو صورتیں ہی بتاتی ہیں کہ ان کا تعلق کسی اچھے اور باعزت خاندان سے ہے۔ کیسی باجیا اور معصوم صورت والی بچیاں ہیں۔ تو نے کبھی انہیں کوئی ایسی ویسی حرکت کرتے دیکھا ہے؟“

وہ پوچھ رہی تھیں اور ہادی اچھا خاصا شرمندہ ہو گیا۔

”نہیں اماں! میرے کہنے کا مطلب تھا کہ پتا نہیں وہ غیروں میں رشتہ کرتے بھی ہوں یا نہیں۔ کیا پتا اس کا پہلے ہی رشتہ طے ہو چکا ہو۔ کیا پتا وہ ممکن شدہ ہو!“

”تجھے ان پریشانیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، میں معلوم کر چکی ہوں۔ اس کا کہیں رشتہ طے نہیں ہوا۔ تو بس مجھے یہ بتا دے کہ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟“ انہوں نے بات سمیٹتے ہوئے اس کے اچھے ہوئے تاثرات پر نگاہ ڈالی۔

”نہیں اماں!“ وہ ایک دم جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ نے ایسا کیوں سوچ لیا۔ کہاں میں اور کہاں وہ۔“

میں میں اس کے قابل نہیں ہوں۔“

اس کا ذہن کسی ساواہ سلیٹ کی مانند ہو رہا تھا۔ اسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا گلو خلاصی کے لیے۔ بھلا تعبیر جیسی لڑکی پر وہ کیا اعتراض کرتا۔ اگر بیچ میں روی نہ پڑتی تو یقیناً وہ خود کو خوش قسمت سمجھتا۔ تعبیر اسے ہمیشہ بہت خاص لڑکی لگی تھی اور اس سے بالکل الگ اور اپنی پہنچ سے بہت اوپر۔

”دیکھ ہادی! اب میں تیری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ تو رہنے دے اپنے یہ بہانے۔ حلد کی بار مجھ سے غلطی ہوئی جو اپنوں پر اعتبار کر لیا۔ پر اب ایسا نہیں ہوگا۔ خاندان کی کوئی لڑکی میں اس گھر میں نہیں لانے والی اور نہ ہی اب میری عمر رہی ہے ان رشتے کرانے والیوں کے ساتھ جا کر گھر گھر کی خاک چھاننے کی۔ یہ میرے دیکھے بھالے لوگ ہیں اور تعبیر جیسی لڑکی میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔ یہ بات تو یاد رکھ لے اور اچھی طرح سوچ لے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“

اماں اگرچہ اس کے اور روی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں مگر انہوں نے بات کچھ اس انداز میں کی کہ وہ چور سا بن گیا۔ وہ تو اتنی محتاط ہو گئی تھیں کہ خاندان کی کسی بھی لڑکی کو بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں اور جو ہادی خاص روی کا نام لے لیتا تو پھر تو گویا ایک بھونچال ہی آ جاتا۔

وہ اپنا فیصلہ بنا کر نکل گئی تھیں اور ہادی سر تھامے اس ناگمانی مصیبت سے نبٹنے کی تدبیر سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

”بھائی لوگ سب کچھ بیچ باج کر اپنا اپنا حصہ لینے کی سوچ رہے ہیں۔“

وہ اس وقت ایک گاہک کو فارغ کر کے بیٹھا ہی تھا کہ جب زین نے آتے ہی یہ خبر سنا لی۔

”اچھا یہ تو تیرے لیے خوشی کی خبر ہے۔“ ہادی فوراً ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”خاک خوشی کی خبر!“ زین جو اس دوران ایک کارٹن پر بیٹھ چکا تھا برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔

”ہر ماہ جو ایک معقول رقم ملا کرتی تھی اب اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“

”تو اچھا ہے ناں رقم ملنا بند ہوگی تو تم سیریس ہو کے نوکری کے بارے میں سوچو گے۔ ویسے اپنے حصے کا کرو گے کیا کوئی بزنس وغیرہ؟“

”نہیں یار! بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ بزنس تو نری ٹینشن ہوتی ہے۔ میرے لیے تو لگی بندھی نوکری ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی اپنے حصے میں میں ان سے اپنا گھر مانگ چکا ہوں۔“

”گھر کون سا؟“ ہادی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جس میں اس وقت وہ پورا چڑیا گھر آباد ہے۔“

زین نے ہنس کر بتایا۔

”پاگل ہو تم زین! اتنے بڑے گھر کا کیا کرو گے۔“ وہ بے اختیار رول اٹھا۔

”اسٹیڈیم بناؤں گا۔“ وہ تپا۔

”ظاہر ہے رہوں گا اور کیا کروں گا۔ وہ گھر ابو نے اپنی محنت کی کمائی سے بنایا تھا اور میری اس گھر سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں اور جاؤں اس لیے میں نے ان سے کہہ دیا کہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے سوائے اس گھر کے۔ نوکری مجھے آج نہیں تو کل مل ہی جائے گی مگر گھر بنانا بہت مشکل ہوتا ہے ہادی! اسی لیے میں نے سوچا ہے میں اس گھر کو نئے سرے سے بنا کر سجا کر اپنی چاندنی کے ساتھ اس میں اپنی چھوٹی سی دنیا بساؤں گا۔“

تصور کے پردے پر ایک دلکش عکس لہرایا تھا اور آنکھوں میں جگنو جل اٹھے تھے۔

”یہ... یہ چاندنی کون ہے۔“ ہادی جو مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بے صبری سے پوچھنے لگا۔

”میرے خوابوں کی ملکہ... میرے خیالوں کی ملکہ۔“ وہ دھیرے سے گنگناتا تھا۔ ہادی کا منہ بن گیا۔

”چلو جب خوابوں کی ملکہ حقیقت بن کر آئے گی تب پوچھوں گا۔“ اس نے دل ہی دل میں ارادہ باندھا۔

جبکہ زین آنکھیں میوند کر گنگناتے لگا تھا ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان بھی تھی۔

”لگتا ہے تو نے کل رات یہ فلم دیکھی تھی!“ اس کی نظریں کچھ کھوجتی ہوئی تھیں۔ زین بے اختیار ہنس پڑا۔

”تین گھنٹے کسی مووی پر ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ میں اتنی دیر تیری شکل دیکھ لوں۔“

”تو تو نہیں بتائے گا۔“ ہادی کے تیور کڑے ہوئے۔

”تو جانتا ہے۔“ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کون؟“ اس نے بے صبری سے پوچھا۔

”تیری پڑوس۔“

”کیا...؟“ ہادی شدید رہ گیا۔ ”تو تعبیر کی بات کر رہا ہے؟“

”تعبیر... یہ کون ہے؟“ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

”اس دن تو تو اسے سونا کہہ رہا تھا۔“

”اوہ... سو... نا!“ یہ نام سنتے ہی ہادی نے معنی خیزی سے سر ہلاتے ہوئے نام کو کافی کھینچ دیا۔ پھر قدرے توقف سے کھٹکارتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ زین! وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”جانتا ہوں۔ تیری طرح نہیں ہوں میں۔ اپنی پسند پر بھروسہ ہے۔“ وہ اسے چڑانے کی خاطر بولا۔

”کیا مطلب ہے تیرا مجھے بھی اپنی پسند پر پورا بھروسہ ہے۔“ ہادی نے کچھ غصے کچھ جوش سے کہا۔

”اسی لیے اپنی اماں کے سامنے اس کا نام لینے کے خیال سے ہی چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے مذاق اڑا رہا تھا اس کی آنکھوں میں بے بسی اتر آئی۔

”ویسے اس دن رومی تیرے ہی کہنے پر آئی تھی ناں؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”ہاں!“ اس نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال تھا اس سے ملنے کے بعد اماں کے خیالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی تو آ ہی جائے گی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اماں

اب بھی ان کے لیے ایسے ہی خیالات رکھتی ہیں جیسے ہٹلر کے یہودیوں کے لیے تھے۔“

”شرم کرے... اپنی اماں کو ہٹلر کہہ رہا ہے۔“

زین نے گھرک کر شرم دلانی چاہی۔ وہ کچھ جھینپا پھر کہنے لگا۔

”اور پتا ہے انہوں نے میرے لیے لڑکی کون سی ڈھونڈی ہے۔ تعبیر... سونا کی بہن۔“

”پھر تو فوراً مان جا... جیسی سونا ہے ویسی ہی اس کی بہن بھی ہوگی۔“ زین نے یہ سنتے ہی مشورہ دیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا یار! کیا کروں۔“ زین نے یہ باتیں چھیڑ کر اس کی بے چینی پھر سے بڑھا دی تھی۔ وہ ٹھٹھکتا رہا۔

”ایک ہی حل ہے۔“ زین نے اچانک کہا تو وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

”اپنی بھابی سے اس بنگالی عامل کا پتا لے لے۔ جس سے انہوں نے حامد بھائی کو مٹھی میں کرنے کے لیے تعویذ لیا تھا۔ تیرا مسئلہ یوں حل ہو جائے گا۔“

اس نے چنگی بجائی۔ ہادی چند لمحے تو اسے خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا پھر تاسف سے سر ہلانے لگا۔

”مجھ جیسا بے شرم انسان اس روئے زمین پر کوئی نہ ہو گا۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے۔ تو مجھے اپنی اماں پر تعویذ گنڈے کروانے کا کہہ رہا ہے۔“

”یہ تیری اپنی نیت کا فتور ہے یار! میں تو تجھے تیرے کبھی نہ ہونے والے سرالیوں پر تعویذ کروانے کا کہہ رہا ہوں تاکہ تیری وہ نام نہاد خالہ اپنی تمام اکڑ اور طنطنہ گھر پر ہی چھوڑ کر تیری اماں سے معافی مانگنے آئے بشمول تیری بھابی کے اور رومی کا رشتہ خود ان کی جھولی میں ڈال جائے۔“ زین نے کافی سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا واقعی... ایسی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے مطلب ایسا بھی کوئی تعویذ ہو سکتا ہے کیا؟“

اس کے قریب آکر وہ آس بھرے لہجے میں پوچھنے لگا تھا۔ مگر جب زین نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تب اسے اپنے بیوقوف بننے کا احساس ہوا۔

”یار! تجھے تو رومی نے واقعی پاگل کر دیا ہے۔“ وہ شرارت سے اسے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”آج تو میں تیری جان لے کر رہوں گا۔“ وہ جارحانہ تیور لیے اس کی جانب بڑھا۔

”ٹھیک ہے مگر اس سے پہلے کسی بنگالی بابا کا ایڈریس ضرور حاصل کر لے۔ جیل جانے سے بچت ہو جائے گی ان کے کسی چلے کی بدولت۔“ زین کے ہاتھ تو موقع لگا تھا۔

وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتا اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جانتا تھا اب نجانے کتنے عرصے تک زین اس بات پر اس کا ریکارڈ لگاتا رہے گا۔

☆ ☆ ☆

تعبیر کو آج کافی دیر ہو گئی تھی۔ چونکہ بچوں کے امتحانات ہو رہے تھے اسی لیے اس پر کام کا دیاؤ بندھ گیا تھا اور آج تو وہ اتنی تھک گئی تھی کہ اس نے گھر پہنچتے ہی سونے کا سوچا تھا۔ مگر اس کا یہ ارادہ دھرا کا دھرا ہی رہ گیا جب اس نے امی کو کچن میں کھڑے دیکھا۔

”امی! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اور سونا کہاں ہے؟“

انہیں روٹیاں بناتے دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور سونا کی لاپرواہی پر غصہ بھی آیا۔ ابھی امی کی طبیعت پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ کام کرنے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”سونا اوپر گئی ہے۔“ انہوں نے آخری روٹی توے سے اتار کر ہاٹ پائٹ میں رکھی۔

”تم یہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو جاؤ! جا کر کپڑے تو بدل لو تب تک سونا بھی آجائے گی۔“ انہوں نے اسے کچن کے دروازے میں کھڑے دیکھا تو ڈپٹ کر بولیں۔

”سونا کو اوپر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی اور جانا ہی تھا تو کم از کم اپنا کام تو کر کے جاتی۔“ اس سے اپنا غصہ نہیں چھپ رہا تھا۔

”اسے میں نے ہی بھیجا ہے میں نے سوچا تھا تم

فریش ہو کر آؤگی تب بتاؤں گی مگر تم تو تفتیش کرنے ہی تھری ہو گئی ہو۔“ ان کے لہجے میں بھرپور ناراضی تھی۔

”ہاوی کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ صبح باتھ روم میں سلب ہو گئی تھیں۔ کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میں دیکھنے گئی تھی انہیں۔ ڈاکٹر نے تقریباً ایک ہفتہ مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسے میں کیا کریں گی بیچاری۔ اکیلی عورت ہیں اور پھر عمر بھی کافی ہو گئی ہے۔ ان کی تو کوئی بیٹی بھی نہیں ہے جو ان کی خدمت کر سکے۔ اب ہم پر دوسری ہیں۔ ہم کام نہیں آئیں گے تو اور کون آئے گا۔ اس لیے میں نے آتے ہی سونا کو اوپر بھیج دیا۔ اب تم کھانا کھا لو تو تم بھی ہو آنا۔“

امی نے تفصیل بتائی تو اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔ تھوڑی دیر میں سونا آگئی۔

”ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ تعبیر نے تفکر سے پوچھا۔

”چوٹوں کی شدت سے انہیں بخار چڑھ گیا ہے۔ ابھی جب میں آرہی تھی تب ہی ہاوی بھیا دوبارہ ڈاکٹر کو لینے گئے تھے۔ اب تو شاید آگے ہوں میں تو آنا بھی نہیں چاہ رہی تھی مگر آنٹی نے زبردستی بھیج دیا کہ صبح سے یہاں ہو، تھک گئی ہو۔ گی۔“ کہتے ہوئے وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

تعبیر اٹھ کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”ویسے تو مجھے بہت تھکن ہو رہی ہے۔ نیند بھی بہت آرہی ہے مگر میرا خیال ہے میں ابھی اوپر چلی جاؤں۔“ اپنی سرخ ہوئی آنکھوں اور پڑمرہ چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے بر سوچ لہجے میں کہا تو سونا تکیے پر کہنی ٹکا کر اسے دیکھنے لگی۔

”بالکل ٹھیک ہے تمہارا خیال۔ آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے اور۔۔۔ جو آج جو میں نے محسوس کیا تعبیر! تو مجھے یوں لگا جیسے انہیں گھر کی دیکھ بھال کے لیے کسی پہلو کی نہیں بلکہ ان کا جی اچھا کرنے کے لیے، ان کا خیال رکھنے کے لیے ایک بیٹی کی سی اپنائیت اور فکر مندی کی ضرورت ہے۔“

لا ابالی سی سونا کے منہ سے ایسی تدبیر والی بات تعبیر کو حیران کر گئی۔ اسے نہیں پتا تھا وہ اندر سے اتنی حساس ہو سکتی ہے۔

”ان کے بیٹے تو ہیں۔ ان کے لیے پریشان بھی بہت ہیں مگر بہت بڑا فرق ہوتا ہے بیٹے اور بیٹی میں اور آنٹی کو شاید آج یہ فرق کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا جب ہی تو وہ بات بات پر اتنی دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔ میں نے ان کے گھر کا سارا کام تو دیکھ لیا تھا۔ مگر ایک بہت بڑی خرابی جو مجھ میں ہے کہ میں کبھی اپنے جذبات کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی۔ میں نے ان سے یہ نہیں کہا کہ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تعبیر! میں نے ان سے یہ تک نہیں پوچھا کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“

سونا متاسف بھی تھی اور نادام بھی۔ تعبیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”تم بھی ناں سونا! بالکل ہو بالکل۔ تم ان کی دیکھ بھال کے لیے ان کے گھر میں تھیں۔ اس سے بڑی ان کے لیے کیا بات ہو سکتی ہے۔“

”ہاں لیکن کبھی کبھی زبانی کلامی اظہار بہت ضروری ہوتا ہے۔“ وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”خیر ابھی تم جارہی ہو نا اوپر۔۔۔؟“

”ہاں۔“ تعبیر نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اوپر تھی۔

”ہیلو! میں کچھ مدد کروں؟“ کچن میں جھانکتے ہوئے اس نے کھٹور پڑ کرتے صفی کو مخاطب کیا۔

وہ یہاں آئی تو خالہ کے کمرے میں عیادت کے لیے تین چار رشتے دار خواتین آئی بیٹھی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھی۔ خالہ کی طبیعت پوچھی۔ ایک دو باتیں کیں اور پھر کچن میں چلی آئی۔ جہاں موجود صفی اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔

تعبیر ان کے گھر بہت کم آتی تھی اور تب بھی وہ صرف ڈرائنگ روم تک محدود رہی تھی۔ سونا کی طرح

بے تکلفی سے اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھا تھا۔

”کیا کر رہے تھے؟“ اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنائیت سے پوچھا۔

”چائے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ صفی نے کچھ شرمندگی سے بتایا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”در اصل اماں نے بھی ہم سے چائے بنوائی ہی نہیں۔ حالانکہ جس گھر میں لڑکی نہ ہو وہاں بہت سارے کام لڑکے ہی کرتے ہیں۔ مگر اماں نے کبھی ہمیں یہ عادت ہی نہیں ڈالی۔ وہ ہر کام خود کرتی تھیں اور اب جب وہ بیمار ہیں تو پتا چل رہا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے چوٹے پر رکھی پٹیلی کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں اس نے سب کچھ ایک ساتھ ہی ڈال دیا تھا۔

”اچھا ہٹو میں بنا دوں۔“

دھوئیں بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ایک پٹیلی اٹھالی۔ صفی سینے پر ہاتھ باندھے سلیب سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔

”ویسے تو اس وقت ہمارے ہاں چائے کبھی نہیں بنتی۔ مگر آج بہت کچھ معمول سے ہٹ کے ہو رہا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ مثلاً کیا کیا؟“ صفی کی بنائی گئی عجیب و غریب چائے کو چولہے سے اتارتے ہوئے تعبیر نے اسے دیکھا۔

”سب سے پہلے تو اماں پر آئی یہ اچانک مصیبت۔“ صفی نے بتانا شروع کیا۔

”ویسے آج مجھے ایک بات پتا چلی کہ آنٹی جی کافی سوشل ہیں۔ سونا بتا رہی تھی سارا دن انہیں دیکھنے کے لیے محلے دار اور رشتے دار خواتین کا تانتا بندھا رہا اور ابھی بھی ان کے پاس چار خواتین آئی بیٹھی ہیں۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہے ان کا دل بہلا رہے گا بیماری میں تو انسان کچھ زیادہ ہی فرسٹرڈ ہو جاتا ہے۔“

”ان کا دل پہلے نہ بہلے۔ ہماری حالت ضرور تنگی ہوتی رہے گی۔“ کینٹ سے نمکو کا پیکٹ نکالتے ہوئے وہ ہنس کر بولا۔ تعبیر ٹھنک گئی۔

”ایسے کیوں بول رہے ہو صفی!“

”حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“ اس نے کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ ”صبح سے نجانے کتنے لوگ آئے ہیں اور سب کے لیے سونا آپی نے نجانے کتنی بار چائے بنائی ہے۔ کتنی بار کولڈ ڈرنکس سرو کیں۔ کتنے برتن جمع ہوئے ہیں اور کتنی بار دھلے ہیں اف میرے خدا۔۔۔!“

”کوئی بات نہیں صفی! جس گھر میں کوئی بیمار پڑتا ہے تو عیادت کے لیے تو لوگ آتے ہی ہیں اور ان کی خاطر تو اضع بھی کرنی پڑتی ہے۔“ وہ نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ مگر ان کو کم از کم اتنا احساس تو ہونا چاہیے کہ ہمارے گھر میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنے میں اتنی دشواری ہو رہی ہے تو ان کی خاطر تو اضع کون کرے گا۔ آپ کو پتا ہے صبح پھپھو اور ممانی ایک ساتھ آئی تھیں۔ پھپھو کی چار بیٹیاں ہیں اور ممانی کی تین مگر دونوں اکیلی آئی تھیں اور بہانے شاید پہلے سے سوچ کے آئی تھیں۔ پھپھو کے مطابق فضا کے کالج ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ عظمیٰ کو شام میں اپنے آنے والے سرالیوں کی خاطر مدارات کی تیاری کرنی تھی۔ شامیہ کے پاؤں میں اچانک موج آگئی تھی۔“

تلخی سے کہتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا۔ تعبیر نے کچھ حیرت سے اس سترہ سالہ جذباتی لڑکے کو دیکھا۔

”ابھی وہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ چھوٹے چچا آگئے اپنی فیملی سمیت اور ان سب کے لیے کھانے کا انتظام بیچاری سونا آپی کو اکیلے کرنا پڑا۔ آپ ہی بتائیے ان کے کھانے کے لیے رکنے کی کوئی تک نہ بنی تھی۔ جبکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اماں بستر پر بڑی ہیں اور ہم میں سے تو کسی کو انڈا ابلانا بھی نہیں آتا۔ خود تو ان میں سے کسی نے اتنی مدد بھی نہیں کی کہ اٹھ کر سلاہی بنا لیتا۔ مجھے یقین ہے جتنا کام آج سونا آپی کو یہاں کرنا پڑا ہے۔ اتنا تو انہوں نے کبھی اپنے گھر میں بھی نہیں کیا ہو گا۔“

وہ پر جوش انداز میں بولتا جا رہا تھا اور پیچھے دروازے میں کھڑے ہاوی کے اضطراب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا

تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا مگر اس نے صفی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بے خیالی میں تعبیر کو دیکھ گیا۔ جو میروں کلر کے لباس میں دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے چولہے کے سامنے اس طرح کھڑی تھی کہ ہادی کو نہیں دیکھ پارہی تھی۔ وہ خود ہی اس کے متوجہ ہونے سے پہلے وہاں سے نکل کر چھت پر چلا آیا اور پاکٹ سے سیل نکال کر رومی کو کال ملائی۔

”تمہیں یاد ہے کہ نہیں صبح میں نے تمہیں کچھ بتایا تھا۔“ اس کے کال ریسیو کرتے ہی وہ اسے بولنے کا موقع دیے بغیر تند لہجے میں گویا ہوا تھا۔ رومی حیران ہو گئی۔

”کیا ہادی... کون سی بات کر رہے ہو؟“
”اوہ! تو تم واقعی بھول گئی ہو مجھے پہلے سے پتا تھا۔ تمہیں یاد رہے بھی کیسے سکتا ہے۔ تمہیں تو صرف اپنے مطلب کی باتیں یاد رہتی ہیں ناں۔“

”مجھے لگتا ہے ہادی! تم کسی سے جھگڑا کر کے آ رہے ہو۔ ایسا کرو جا کر دو گلاس ٹھنڈا پانی پیو اس کے بعد اگر مجھ سے بات کرنا۔“

وہ بھی رومی تھی۔ کیسے اس کا درشت لہجہ برداشت کر لیتی۔ اس لیے ٹھک سے فون بند کر دیا تھا۔ سرخ بڑتے چہرے کے ساتھ سیل کو دیکھتے ہوئے اس نے جھشکل اسے دیوار پر دے مارنے کی خواہش کو دبایا تھا۔ وہ اس کا منگنا موبائل فون تھا رومی نہیں کہ اس پر اپنا غصہ اتار لیتا۔

☆☆☆

”یہ آپ نے کیا کیا خالہ! میں تو سوچ رہا تھا آپ نے میرے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہوگی اور تب ہی میں نے تو ساری تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ بس کارڈز چھپوانے کی کسر تھی اور آپ ہیں کہ یہاں بستر پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں۔“
یہ زین کا مخصوص انداز تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ نئی نئی جاب کی مصروفیت میں وہ کئی دن سے ہادی سے نہیں مل سکا تھا۔ آج جب اس سے ملا تو اس کی

زبانی خالہ کی بیماری کا سن کر فوراً ہی انہیں دیکھنے چلا آیا تھا۔ بستر پر نیم دراز خالہ چند دنوں میں ہی کافی کمزور ہو گئی تھیں۔ اس کی باتوں پر ہولے سے مسکرائیں۔
”لو لڑکی دیکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ یہ کام تو اماں بستر پر بیٹھے بیٹھے بھی کر سکتی ہیں۔ بلکہ کر رہی ہیں پچھلے چار دنوں سے۔“ صفی جو پاس ہی کرسی پر بیٹھا سیب کاٹ رہا تھا، چپ نہ رہ سکا۔
”اچھا کون سی لڑکیاں؟“ زین نے چونک کر دلچسپی سے پوچھا۔

”رہنے دے۔ وہ سترے مطلب کی نہیں ہیں۔“
ہادی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا تھا۔

”تو بتا زین! اگر تجھے کوئی لڑکی پسند ہے تو میں بتا دیر کیے اس کا ہاتھ مانگنے چلی جاؤں گی۔“ اماں نے کہا تو ہادی حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”کیا کہہ رہی ہیں اماں!“
”کیوں فارسی بولی ہے میں نے جو تجھے سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ بد مزہ ہوئیں۔

”نہیں! لیکن فرق ضرور کیا ہے۔ مجھ پر تو اپنی مرضی ٹھونس دی اور زین سے اس کی پسند پوچھ رہی ہیں۔ یہ نا انصافی کیوں؟“ اس کے انداز میں بھرپور احتجاج تھا۔
”کیوں بھائی! آپ نے کیا۔“ لومیرج کا پلان بنایا تھا۔ ہادی کی بات پر صفی نے بے ساختہ پوچھا وہ سٹپٹا گیا۔

”نہیں امیرا وہ مطلب نہیں تھا لیکن۔“
زین ہنسنے لگا۔ ”بات یہ ہے دوست! کہ خالہ کو تیری پسند پہ اعتبار نہیں ہے۔ کیوں خالہ! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔“ زین نے شرارت سے کہتے ہوئے ان سے بھی تائید چاہی۔

”اور نہیں تو کیا۔ ایسے بندے کی پسند کا بھروسہ بھی کیا کیا جاسکتا ہے جو سبزیوں تک میں تازہ اور باسی کا فرق نہیں کر سکتا۔“

”سبزی اور لڑکی میں بڑا فرق ہوتا ہے اماں!“ ہادی نے چبا کر الفاظ ادا کیے۔ ”اور جو آپ کو پسند آئی تھی ناں اس کا نتیجہ بھی دیکھ چکے ہیں ہم۔“

”اور اب اسی طرح کا ایک نتیجہ بھگتنے کے لیے تو اپنی اماں کو طعنے دے رہا ہے۔ شرم آنی چاہیے تجھے۔“ اس کی بات پر زین ناگواری کا اظہار کیے بنانہ رہ سکا۔
”جانے دے زین! یہ مجھے بس اس لڑکی کا نام بتائے جس کی وجہ سے آج یہ میرے منہ کو آ رہا ہے۔“ اماں پر قوف نہ تھیں کہ اس کے بگڑے تیوروں سے کچھ اخذ نہ کیا تیں۔

”کوئی نہیں ہے۔“ اس نے نگاہیں چرا لیں۔
”بتا دے۔ اگر کوئی ہے تو...“ زین نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر معنی خیزی سے کہا تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کرنے لگا۔

”السلام علیکم۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی پر جوش انداز میں سلام کرتی سونا کی نظرس جب زین پر پڑیں تو آواز دھیمی ہو گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر سیدھا ہوا گریٹھ گیا تھا اور آنکھوں میں شوق کے کئی رنگ جھلما اٹھے۔

”اندر آئیے ناں۔ اسٹینچو کیوں بن گئی ہیں۔“ صفی ہنوز اسے دروازے میں جمے دیکھ کر بول اٹھا۔

”گھبرائیے مت۔ یہ اپنے زین بھائی ہیں اور کسی جنگل سے بالکل نہیں آئے۔“

”صفی! اماں نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ جبکہ سونا گہری سانس لیتے ہوئے اندر چلی آئی۔

”پھر تو واقعی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے بھائی ہیں تو میرے بھی بھائی ہی ہوئے ناں۔“

ٹپکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اماں کے پاس جا بیٹھی تھی۔ اس کی بات پر جہاں زین کے چہرے کا رنگ بدلا تھا وہیں ہادی نے بمشکل اپنے مقصد کا گلا گھونٹا۔

”کیسی طبیعت ہے خالہ آپ کی۔“ وہ ان کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

زین مستقل اسے دیکھ رہا تھا۔ زرد رنگ گو کہ زین کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا مگر اس وقت سونا کو زرد رنگ پہنے دیکھ کر اسے اس رنگ سے بھی عشق سا ہوتا محسوس ہوا۔

”صفی! یاد بھی ہے یا بھول گیا کہ تو چائے چڑھا کے

آیا ہے۔ وہ تو ایل ایل کے سوکھ گئی ہوگی۔“ اماں نے یاد دلایا۔

”وہی دیکھنے کے لیے جا رہا تھا کہ آپ نے سیب کاٹنے کے لیے بٹھالیا۔ اب کیا میں دو گھڑی بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ آپ تو ایک دن میں ہی مجھے اس طرح ٹرینڈ کرنا چاہ رہی ہیں جیسے کوئی لڑکی سالوں کی تربیت کے بعد ہوئی ہے۔“

نروٹھے لہجے میں کہتے ہوئے صفی اچھا خاصا جھلا گیا تھا۔

”تم رہنے دو صفی! میں دیکھ لیتی ہوں۔“ سونا جو پہلے ہی زین کی موجودگی کے باعث جانے کے لیے کوئی بہانہ سوچ رہی تھی غورا اٹھ کھڑی ہوئی، پھر خالہ کے کسی اعتراض یا انکار سے پہلے ہی وہاں سے نکل کر کچن میں چلی آئی۔

”جا کر کہہ دے اپنے دل کا حال۔ موقع اچھا ہے۔“ ہادی نے اس کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا تو وہ چونک گیا۔

”تھینکس یار!“ وہ پرجوش انداز میں اس کا ہاتھ دبا کر اٹھ گیا۔

”کیا آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟“ سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کے دلکش سراپے کو نگاہوں میں قید کرتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔

”یاگل۔“ اس کا دل بے ساختہ بول اٹھا۔ مگر دل کی آواز کو نظر انداز کر کے اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”ہادی بھیا کے دوست۔“

زین کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ ”پھر تو آپ بہت کم جانتی ہیں میرے بارے میں۔“

”میں جانتا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں ایک کے بعد ایک ماحس کی تیلی جلا رہی تھی۔

”لیکن مجھے تو ہے۔“ وہ اس کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور جب میں کسی کے لیے اپنے دل میں کچھ اسٹرونک فیلینگز محسوس کرتا ہوں تو پھر یہ بات میں اس سے شیر کیے بنا نہیں رہ پاتا۔ چاہے وہ

نفرت ہو یا محبت۔“ زین نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکا، جہاں لمحہ بھر میں حیرانیاں سی پھیل گئی تھیں۔

”آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے نفرت ہے؟“ وہ اس کی بات سمجھ کر بھی تجاہل سے کام لے رہی تھی۔ زین ہنس پڑا۔

”ہاں! اتنی نفرت کہ میں ساری زندگی بطور سزا آپ کو خود پر مسلط کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے اتنی اچانک یہ بات کہی کہ سونا ششدر رہ گئی۔ اور خود کو سنبھالنے میں اسے کئی پل لگ گئے۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے مجھے یہ چائے اندر لے کے جانی چاہیے۔“ وہ راہ فرار اختیار کرنا چاہ رہی تھی مگر زین یہ موقع گنوانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”ضرور لے کے جائیے لیکن اس سے پہلے اپنا جواب دیتی جائیے مس چاندنی!“ زین نے کافی زور دیا اس نام پر جو وہ خود ہی اسے دے چکا تھا۔

”کیسا جواب بھی! آپ نے مجھ سے کون سا سوال پوچھا ہے۔“ سونا اس بات پر دھیان دیے بغیر کہ زین نے اسے کیا کہہ کر پکارا، کچھ جھلا کر بولی تھی۔

”اف۔۔۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں، مجھے بھائی مت کہئے۔“

”مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے آپ کو بھائی کہنے کا۔“ اس کی ہیرا ہٹ اب جھنجھلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔

”پھر کیا کہنے کا شوق ہے۔“ زین نے فوراً اس کی بات پکڑتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

”ارے خواہ مخواہ ہی۔ آپ تو گنجل ہوئے چلے جا رہے ہیں۔“ سونا کو اس کے اعتماد پر حیرت ہو رہی تھی۔

”خواہ مخواہ کیوں۔۔۔ جب میرا دل اٹھتے بٹھتے سوتے جاگتے آپ کے نام کی مالا جپتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کا دل مجھے یاد نہ کرے۔“ اس کا انداز اتنا پُر یقین تھا کہ اس کا دل انواں ڈول ہو گیا۔ وہ چند لمحے تو

کچھ بول نہ سکی۔

”مجھے لگتا ہے آپ پاگل ہو چکے ہیں۔ اپنا علاج کروالیں۔“ چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ اس کی طرف دیکھ کر بغیر اپنی بات کہہ کر باہر نکل آئی۔

”رومی! تم بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ بہترین موقع ہے کہ میں اماں کو تمہارے لیے کنوینس کر سکتا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر رومی کو فون کر کے اس کی منت کر رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ فائدہ اٹھاؤ اس موقع سے مجھے کیا کہتے ہو۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اکھڑی ہوئی تھی۔ ہادی نے ایک گہری سانس لی۔

”دیکھو رومی! اماں کو بستر پر بڑے آج پانچواں دن ہے۔ وہ خود سے کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ اور پتا ہے وہ تمہیں یاد بھی کر رہی تھیں۔ اس دن آئی تھیں تو اب بھی آجاؤ۔ زیادہ نہیں، بس دو تین دن کے لیے۔ شاید وہ تمہیں اپنی بہو بنانے پر غور کر لیں۔“

”اف! یہ خالہ جی کی طبیعت ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتی۔“ وہ جیسے عاجز آگئی۔ ”تمہیں پتا ہے ہادی! میں نے ان کے لیے کتنی دعائیں کی ہیں۔“ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس نے ہادی کی اماں کے لیے دعائیں ضرور کی تھیں مگر اس لیے نہیں کہ اسے ان کی کوئی فکر تھی بلکہ اس لیے کہ ہادی ان کی تیمارداری کے لیے اسے بلانے کی ضد چھوڑ دے۔

”اچھا کی ہوں گی۔ مگر انہیں تمہاری دعاؤں کا پتا تب ہی چلے گا جب تم خود آ کے انہیں بتاؤ گی۔ ابھی تو تعبیر اور سونا آ کے ہر کام دیکھ رہی ہیں اور سچ کہوں تو میں ان کے سامنے بہت شرمندگی محسوس کرنے لگا ہوں۔“

”شرمندگی کیوں! بڑوسی ہیں کیا اتنی سی مدد بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ تب گئی تھی۔

”اور تم تو ان کی سگی بھانجی ہو۔ جب تم ان کی دیکھ بھال کے لیے یہاں نہیں آ سکتیں تو ان سے یہ تو

کیسے رکھ سکتی ہو۔“

”تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اس دنیا میں ان کی واحد بھانجی میں ہی ہوں۔“

”نہیں! اور بھی ہیں مگر مجھے تو صرف تم سے مطلب ہے ناں۔“ اس کا لہجہ بھاری ہوا تھا۔ وہ چپ سی رہ گئی۔

”دیکھو ہادی۔۔۔ مجھے خالہ کی فکر ہے بلکہ تم سے زیادہ ہے مگر۔۔۔ میرے ایگزائمز ہونے والے ہیں۔ میرے سر پر ان کی بھی ٹینشن ہے۔ پھر میں امی سے کیا کہوں گی۔ اگر خالہ خفا ہیں تو کم ناراض امی بھی نہیں ہیں۔ میں آتا بھی چاہوں تو وہ کہاں آنے دیں گی۔ پچھلے دنوں جب امی بیمار پڑی تھیں تب خالہ جی بھی انہیں دیکھنے نہیں آئی تھیں۔“

”تو تم نہیں آؤ گی۔“ اس کی باتوں سے ہادی نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

”کوشش کروں گی۔ مجھے لگتا ہے آپی بلارہی ہیں مجھے۔ میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے۔“

اس نے ہادی کی مزید کوئی بات سننے بغیر فون بند کر دیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے فون کو دیکھا پھر ٹھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”شاید زین ٹھیک کہتا ہے۔ میں واقعی اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اور شاید اپنے جذبات بھی۔“ بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے اس نے یاسیت سے سوچا تھا۔ اسی پل صافی نے اندر جھانکا۔

”بھائی! آپ کو اماں بلارہی ہیں۔“

وہ چونک گیا۔ ”کیا کہہ رہی ہیں۔“

”پتا نہیں۔۔۔ مجھے تو نہیں بتایا۔“ صافی نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔

”جلدی آئیے گا۔ میں باہر جا رہا ہوں اسی لیے دوبارہ نہیں آؤں گا۔ ایسا نہ ہو اماں انتظار کرتی رہیں اور آپ بھول ہی جائیں۔“ وہ تاکید کرتا نکلا تو اس نے بھی موبائل کمرے میں ہی چھوڑ کر اماں کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ سوچ کے دانے گھما رہی تھیں۔ اسے دیکھتے

ہی بولیں۔

”کہاں تھا تو۔ صبح سے ایک بار بھی یہاں جھانک کے نہیں گیا۔ ابھی بھی صافی سے کہہ کر تجھے بلانا پڑا ہے۔“ وہ ناراضی سے دریافت کر رہی تھیں۔ ہادی نادوم سا ہو گیا۔

”سوری اماں۔۔۔ اسٹور میں ہی رہا آج سارا دن۔ آپ بتائیے دوائی لی آپ نے۔“ سائیڈ ٹیبل پر پڑی دوائیاں چیک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں! لے لی تھی۔ تجھے میں نے اس لیے نہیں بلایا۔“ وہ بیزار سی ہو گئیں۔ ”تو یہ بتا تو نے کیا سوچا؟“

”کس بارے میں؟“ ہادی نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تو ان کے چہرے پر چھائی برہمی کو دیکھ کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میرا مطلب ہے۔ مجھے کیا سوچنا تھا جو آپ یوں پوچھ رہی ہیں۔“

”شکایت ہے ہادی! یہ قدر ہے تیرے دل میں ماں کی کہ تجھے اب میری کمی پاتیں بھی یاد نہیں اور یہاں میں پاگل اس انتظار میں بیٹھی ہوں کہ تو مجھے اپنا جواب دے تو میں تعبیر کی ماں سے بات کروں۔“ انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور وہ ان کی بات سنتے ہی مضطرب سا انگلیاں چٹکانے لگا۔

”مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت اور دے دیجئے۔“ اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے ملجی لہجے میں کہا۔ ”میں اگلے ہفتے آپ کو حتمی جواب دے دوں گا پکا۔“

”تو پچھلے دس دن سے تو کیا جھک مار رہا تھا۔“ انہیں غصہ آ گیا۔

”میں نے تجھ سے کہا بھی تھا ہادی! میں اب مزید دیر نہیں کرنے کی۔ یہ تو اگر میں بستر پر نہ ہوتی تو تیری

ہاں یا نہ سننے بغیر کب کا رشتہ ڈال آتی۔ تجھ سے تو وہ زین اچھا ہے۔ سگا نہیں ہے مگر ماں کہہ دیا ہے تو اب بیٹا بن کے دکھا رہا ہے۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی اور اس نے سچ سچ سارا اختیار مجھے سونپ دیا اور

جانتا ہے، جب میں نے سونا کے بارے میں اس کی

رائے پور بھی تو اس نے فوراً کہہ دیا کہ آپ جہاں چاہیں رشتہ طے کروں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے اور ایک تو ہے کہ ماں کے کہے کی کوئی عزت ہی نہیں۔ وہ کہے جا رہی تھیں اور ہادی ان کے انکشافات پر منہ کھولے بھونچکا بیٹھا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ زین نے کہا تھا آپ سے؟“ وہ خاموش ہوئیں تو اسے پوچھنے کا خیال آیا۔

”ہاں تو اور کس نے کہا۔“ وہ خفگی سے بولیں تو ہادی ان کے بھولہن پر جھلا اٹھا۔

”آپ نہیں جانتیں اماں! وہ کتنا گھنا ہے۔“ اس سمجھ میں نہیں آیا کیسے انہیں زین کی فرمانبرداری کی اصلیت سے واقف کرے۔

”تو تو جیسے برا بھولا ہے ناں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا ہادی! تو کس پہ چلا گیا ہے۔ کہاں بیچ آیا ہے شرم اپنی۔“ اماں آج بڑے غضب ناک موڈ میں تھیں۔

”افوہ اماں!“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”آپ جتنا مرضی مجھے برا بھلا کہہ لیں لیکن میں اس طرح جلد بازی میں بنا سوچے سمجھے اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے زین کا رشتہ آپ کر سکتی ہیں مگر میرا نہیں۔ میں ابھی تیار نہیں ہوں۔“

وہ خاصی بد تمیزی کا مظاہرہ کر کے باہر آگیا۔ اماں کے تاثرات پر اس نے جان بوجھ کر نگاہ نہیں ڈالی کہ کہیں وہ کمزور پڑ کر ان کے سامنے ہار ہی نہ مان لے۔ ابھی تو اسے اپنی محبت کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کی ایک کوشش اور کرنی تھی۔

”کیا آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟“ یہ آواز اسے بالکل پاس سے سنائی دی تھی یا پھر اس کے کان بجے تھے مگر بے حد گڑبڑا کر اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے وہ پاس بیٹھی تعبیر کو چونکا گئی۔

”سونا! کیا ہوا؟“ تعبیر نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پھر

سے کتاب پر نظریں جمادیں۔

”تم اتنی ڈسٹرب کیوں ہو؟“ تعبیر نے فکر سے سوال کیا مگر اس کا دل کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا ”کیا یہ اس وقت بھی مجھے یاد کر رہا ہو گا۔“

وہ پچھلے دو دن سے شعوری، لاشعوری طور پر اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے کئی کام بڑے تھے، کتنی باتیں بھولی تھیں۔ کتنی چیزیں ٹولی تھیں اور نجانے کتنی ہی بار وہ تعبیر کو اپنی اس غائب دماغی کے باعث اپنی جانب متوجہ کر چکی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس نے کچھ کہا نہیں تھا مگر اب وہ بھی تشویش کا شکار ہو گئی تھی۔

”کیا بات ہے سونا! کافی پریشان لگ رہی ہو۔“ وہ کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سونے ایک نظر اسے دیکھا پھر کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں میں پریشان نہیں ہوں۔ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔“

”چلو پریشان نہ سہی مگر کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور تعبیر نے اپنی بات پر زور دیا۔

وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی کر سکتی تھی کہ اس وقت وہ اندرونی طور پر بہت زیادہ الجھی ہوئی تھی۔ شاید وہ تعبیر کو مطمئن کرنے کے بجائے مزید مشکوک کر دیتی۔ اس لیے اس نے لیٹتے ہوئے چادر تان لی۔

”مجھے نیند آرہی ہے تعبیر! اسٹ آف کرو پلینز۔“

تعبیر ہکا بکا سی رہ گئی۔ ”تمہیں اتنی جلدی نیند تو نہیں آتی سونا!“

ہی گھور رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”تم زین کو جانتی ہو۔“ دل کی بڑھتی بے قراری سے گہرا کر اس نے تعبیر سے دل کا حال کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تعبیر تو یہ سننے ہی اچھل پڑی۔

”زین۔۔۔ یہ کون ہے۔“ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونا کی اس گم صم کیفیت کے پیچھے وجہ کوئی لڑکا بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے سوال پر سونے نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ”کہیں تم نے اس کی باتوں پر یقین تو نہیں کر لیا؟“ کسی خدشے کے پیش نظر تعبیر نے بے تاب سے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس نے نظریں چرا لیں۔

”میں یقین نہیں کرنا چاہتی لیکن میرے ذہن سے نکل بھی نہیں رہا وہ۔ میں اسے سوچنا نہیں چاہتی تعبیر! مگر میں اسے اپنے ذہن سے جھٹک بھی نہیں پا رہی۔ میں کیا کروں؟“ بے بسی کے احساس نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔

”باگل ہو تم۔“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تعبیر نے ڈیٹ کر کہا۔ ”اس بات کو اتنا سر پر سوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر لڑکی کو زندگی میں ایسی صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ راہ چلتا کوئی بھی ہم سے ایسی بات کرے تو کیا ہم اس کے لیے اپنی نیندیں اڑالیں گے۔ یہ تو سراسر بے وقوفی ہوئی۔“

”وہ راہ چلتا نہیں ہے۔“ تعبیر کی اس بات پر وہ اسے ٹوکے بنانہ رہ سکی۔ تعبیر نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ جھل سی ہو گئی۔

”مگر وہ شخص واقعی سیریس ہے تو زبانی کلامی اظہار کے بجائے عملی قدم اٹھائے گا اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو سمجھ لینا کہ وہ واقعی کوئی راہ چلتا ہی تھا جو پل بھر کو تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا۔“

تعبیر نے گہری سنجیدگی سے اپنی بات کہہ کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔ سونا کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت ابھر آئی تھی۔

”اب سو جاؤ۔ مجھے امید ہے تمہیں اچھی نیند آئے گی۔“ وہ اس کا رخسار تھپتھا کر اٹھ گئی تھی۔

”کہاں مرا ہوا تھا تو۔۔۔ تیرا موبائل بھی آف تھا۔“ وہ زین سے ملنے اس کے گھر جا رہا تھا کہ وہ راستے میں ہی مل گیا۔

”یار! بتایا تو تھا تجھے۔ وہی گھریلو پھنڈے۔۔۔ بھائی لوگ شفٹ کر رہے ہیں۔“

زین کے بھائی اپنے اپنے حصے الگ کرنے کے بعد اب اس گھر سے شفٹ ہو رہے تھے جو زین کی خواہش پر اس کے حصے میں آیا تھا۔

”صبح بھائی کو چھوڑ کے“ ہادی چونک گیا۔

”کیوں؟ وہ نہیں جا رہے؟“ وہ دونوں ٹپکتے ہوئے اسٹور کی سمت جانے لگے۔

”نہیں۔ انہوں نے مستقل لاہور شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ بھابھی کا میکا بھی وہیں ہے اور فی الحال بچوں کے ایگزامز ہو رہے ہیں تو یہاں ٹھہرے رہنا ان کی مجبوری ہے۔“ اس نے بات کرتے ہوئے ہادی کی طرف دیکھا جو اکتائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ یہ تو نے بو تھی کیوں سُبائی ہوئی ہے۔ کہیں رومی نے پھر جھنڈی تو نہیں دکھا دی۔“

”ہری جھنڈی تو اب میں اسے دکھانے والا ہوں۔“ اس نے ہونٹ بھیچے تھے۔

”چلو دیر آید درست آید۔ تجھے عقل تو آئی۔“

زین نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی تھی۔

اچکائے۔ ”نیت صاف، منزل آسان۔“

”کیوں میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے؟“ زین کی ایسی باتیں ہمیشہ اسے غصہ دلا دیا کرتی تھیں۔

”رومی کے لیے نہ سہی۔ اپنی ماں کی آنکھوں میں تو دھول جھونکی ہے ناتو نے۔“ زین نے جتانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا چہرہ بچھ سا گیا۔

”یار! میری زندگی کسی فلم یا ڈرامے کی طرح آسان کیوں نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ بے بسی سے بھرا تھا۔

”بچہ سے یہ کس نے کہہ دیا میرے بھولے بادشاہ! کہ فلموں میں سب آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جب تک گولیاں نہ چلیں، ٹھانڈا ٹھانڈا کی آوازیں نہ ہوں۔ دس پندرہ بندے پھر کائے نہ جائیں تب تک تو ہیرو اور ہیروئن بھی نہیں ملتے۔“

”لیکن اینڈ تو بھی ہوتا ہے نا۔“

”تیری لواستوری کا اینڈ بھی یہی ہو گا۔ میری یہ بات لکھ کر رکھ لے۔“ زین نے لکھی آمیز انداز میں اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے۔

”میں رومی سے ملنے جا رہا ہوں۔“ سامنے آئے پتھر کو ٹھوکر مار کر اس نے دور اڑایا تھا۔

”ہری جھنڈی دکھانے؟“ زین نے بے ساختہ پوچھا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

”یوں سمجھ! آخری بار ملنے جا رہا ہوں۔“

”چل یار۔۔۔ تجھے نواز حلوائی کی دکان سے ٹھنڈی میٹھی لسی پلاؤں۔ جلتے جلتے دل کو خاصا سکون ملے گا۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں تو تجھے صرف یہ بتانے آیا تھا کہ اماں نے تجھے بلوایا ہے۔ سونا کی امی تجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”کیا۔۔۔ تو نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔“

زین اس کی بات پر اتنا پر جوش ہوا کہ بیچ سڑک میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر دریافت کرنے لگا۔ ہادی نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر پیچھے آتی گدھا گاڑی کو۔

”سائیڈ ہو جا“ اس سے پہلے کہ تیرا یہ شریف و مسکین بھائی غصے میں دولتیاں جھاڑ کر سونا کے گھر کے

بجائے اسپتال پہنچا دے۔“ زین منہ بنا کر ایک طرف ہوا۔

”اپنی منحوس زبان سے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی نکال لیا کر۔ خوا مخواہ تیرے ساتھ یہاں تک آگیا۔ میں جا رہا ہوں۔“

”واپس جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کیا مطلب۔۔۔ اس حال میں اس کے سامنے جاؤں گا تو وہ تو چندہ مانگنے والا سمجھ کر دروازہ میرے منہ پر ہی دے ماریں گی۔“ زین نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”مجھے تو ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہا ہے۔ خیر تیری مرضی۔ میں رومی سے ملنے جا رہا ہوں۔ شام میں ملتا ہوں۔“ دیکھتا ہوں آپ روہوتا ہے یا رہجھکتا۔“ آخری بات کرتے ہوئے وہ زیر لب مسکرایا۔

”تو چپ رہے تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔“ زین تپ گیا اور اس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی تھی۔

وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں ہاتھوں پر نظریں جمائے اپنی زندگی میں آنے والی اس اچانک تبدیلی کو سوچ رہی تھی۔ کل تک اس کا دل عجیب ہی خدشوں اور واہموں کے بیچ گھرا ہوا تھا اور اب اس قدر پرسکون اور مطمئن ہو گیا تھا جیسے بیٹھے بٹھائے دنیا بھر کی دولت پالی ہو۔ ابھی تین دن پہلے ہی امی نے ان کے کمرے میں آکر یہ حیرت انگیز خبر سنائی تھی۔

”سیکنہ! اپنے منہ بولے بیٹے کے لیے سونا کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ویسے تو یہ بات انہوں نے مجھ سے بہت دن پہلے کی تھی لیکن میں متروک تھی۔ اگر بات

ہادی کی ہوتی تو میں سوچ بھی لیتی کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور چند مہینوں میں ہی میں اسے اچھی طرح پرکھ چکی ہوں مگر ایک ایسا لڑکا جس سے نہ ملی ہوں۔ نہ میں نے اس کا گھر دیکھا ہے اور نہ ہی مجھے یہ پتا ہے کہ اس کا خاندان کیسا ہے، میں کیسے ہامی بھر لیتی تھیں نے سیکنہ

سے بھی یہی سب کہا۔ اسی لیے دو دن پہلے زین کی بھابھی آئی تھیں۔ کافی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی خاتون لگیں مجھے تو۔۔۔ اور باقی تسلی آج زین سے مل کر پوری ہو گئی۔ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا ہے اور کچھ عرصہ پہلے ہی بہت اچھی پوسٹ پر اس کی جاب لگی ہے۔ اپنا گھر ہے اور ساس نندوں کا بھی کوئی جھنجھٹ نہیں۔ اب تو میں شکر کر رہی ہوں کہ بنا سوچے سمجھے میں نے انکار نہیں کر دیا۔“

امی کہہ رہی تھیں اور تعبیر مسکراتے ہوئے ساکت و جامد بیٹھی سونا کو دیکھ رہی تھی۔

”تو ہامی بھری آپ نے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں! سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔ ابھی سونا کی مرضی تو جان لوں۔“ انہوں نے سونا کی طرف دیکھا تھا جو سر جھکائے انگلیاں مسلنے لگی تھی۔

”میں جانتی ہوں سونا! تمہارے لیے یہ سب بہت جلدی اور اچانک ہو گا۔ مگر جو اللہ کو منظور۔ زین کی بھابھی کہہ رہی تھیں ۴ نہیں لاہور شفٹ ہوتا ہے اس لیے وہ جانے سے پہلے منگنی کی رسم کرنا چاہتی ہیں۔ میں ان سے کہہ دوں گی۔ منگنی وہ جب بھی کریں مگر شادی تب ہی ہوگی جب تعبیر کی شادی ہوگی۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے امی!“ تعبیر اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ ”بے شک وہ شادی کی ڈیٹ مانگیں۔ آپ دے دیجئے گا۔“ امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئیں۔ تعبیر سونا کو شرارتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اماں! میں چاہتا ہوں۔ آپ تعبیر کی امی سے رشتے کی بات کر لیں۔“

اماں اس وقت کچن میں تھیں۔ اب وہ کافی حد تک کام کاج کرنے لگی تھیں۔ اس وقت مٹر چھیلنے چھیلنے ان کے ہاتھ رکے اور انہوں نے پر سوچ نظروں سے اسے دیکھا۔ جو دروازے میں کافی دو ٹوک انداز لیے

کھڑا تھا۔

”لیکن اس دن تو تو نے مجھے صاف منع کر دیا تھا!“

”میں نے صاف منع نہیں کیا تھا۔ میں نے بس سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا اور اب میں سوچ چکا ہوں۔“

وہ انہیں اپنی رضا مندی دے کر وہاں سے چلا آیا مگر آتے ہوئے اس نے اماں کے ہونٹوں پر بے اختیار لٹ آنے والی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ وہ خود بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

اس نے کبھی اتنی آسانی سے رومی سے دستبردار ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر آج اس کے اس فیصلے کے پیچھے سب سے بڑی وجہ خود رومی ہی تھی۔

اس دن ہادی رومی سے ملنے بھابھی کے گھر گیا تھا کیونکہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے وہیں مقیم تھی۔ اب یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اسے بیرونی گیٹ کھلا ملا۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف آیا تھا مگر اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اسے ہم جانا پڑا۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا یہ ہادی آخر مجھ سے چاہتا کیا ہے۔ اگر اس کی ماں بیمار ہے تو کیا میں کوئی نرس ہوں۔ میں نے ان کی تیمارداری کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟“

رومی کی غصے بھری آواز اس کے حواس جامد کر گئی۔ وہ اماں کا ذکر اتنے تنفر سے کر رہی تھی جیسے وہ اس کی خالہ نہیں اس کی کوئی دشمن ہو۔

”میں نے صرف ہادی سے پیار کیا ہے۔ میں صرف اس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں جیسے آپ گزار رہی ہیں حامد بھائی کے ساتھ۔ صرف اور صرف ایک دوسرے کے سنگ اور ہادی تو ابھی سے مجھ سے اپنی اماں کی خدمتیں کروانا چاہ رہا ہے۔ ملازمہ بنانا چاہتا ہے مجھے ان کی۔ میں نے کبھی سسرالی بکھیڑوں میں پڑنے کا نہیں سوچا اور پھر خالہ جیسی عورت جنہیں جھگڑنے کے لیے کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں

White Beauty

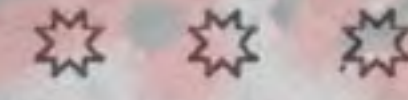
والٹ بیلوٹی



Free
Hair Remover Cream & Lotion

اسے بے چینی نہیں تھی۔ کیونکہ آج جو بھی انکشافات اس پر ہوئے تھے وہ اتنے غیر متوقع بھی نہیں تھے مگر بقول زین یہ اس کی محبت کا حد سے بڑھا ہوا اندھا پن ہی تھا کہ اسے کبھی کچھ نظر نہیں آیا مگر آج جب آنکھیں کھلیں تو اسے صدمہ نہیں ہو رہا تھا۔ غصہ آرہا تھا اپنے آپ پر اپنے یوقوف بننے پر۔ دل چاہ رہا تھا سب کچھ تھس تھس کر کے رکھ دے اور پھر اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ محبت کے نام پر اپنی پوری زندگی رومی جیسی خود غرض لڑکی کے لیے تباہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اب اپنی ماں کے لیے اس کے نفرت انگیز خیالات جاننے کے بعد وہ اس کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جو بھی تھا جیسا بھی تھا مگر اپنی ماں کے لیے اس کی محبت دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر تھی اور وہ انہیں کسی کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔



”اوئے میرے یار! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔“ زین اس اچانک کا پلٹ پر حیران و پریشان سا اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”یس یار! سوچا تجھ جیسے خبیث انسان سے صرف دوستی ہی کافی نہیں رشتے داری بھی بنانی پڑے گی۔ سو تیرا ہم زلف بننے کا آئیڈیا سوچھ گیا۔“

زین چند لمحے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”کر لے ہوشیاری مگر مجھ سے نہیں چھپا سکتا۔“

”اچھا کیا چھپا رہا ہوں میں؟“ ہادی نے اسے گھورا۔

”یہی کہ انگور کھٹے نکلے۔ خیر! جانے دے۔ میں تجھ سے تیرے ناکام عشق کی وجہ نہیں پوچھوں گا۔ تو بتا آگے کیا پلان ہے؟“

”مجھے تعبیر سے ایک بار بات کرنی ہے۔“ اس نے بتایا تو وہ چونک گیا۔

ہوتی۔۔۔ اور میں تو ان کے خاص نشانے پر ہوں گی۔ آپ کی بہن جو کھری۔“

”تم تو بالکل پاگل ہو رومی!“ بھابھی نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر کا تھا۔

”وہ تمہیں اپنی ماں کی ملازمہ نہیں بنانا چاہتا۔ وہ تو انہیں راضی کرنے کے لیے تمہیں تھوڑا سا جھکنے کو کہہ رہا ہے اور اتنا تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اگر میں حامد کے ساتھ اپنی الگ راجدھانی بنائے بیٹھی ہوں تو یہ سب آسانی سے نہیں ہوا۔ اس کے لیے مجھے کافی پارٹ بیلنے پڑے ہیں۔ جیسا اکھڑ آج ہادی دکھائی دیتا ہے اس سے کہیں زیادہ حامد تھا۔ مگر دیکھ لو! آج مجھ سے پوچھے بغیر ماں سے ملنے تک نہیں جاتا اور تمہیں تو صرف اپنا مطلب حاصل کرنا ہے۔ ایک بار تم ہادی کی بیوی بن جاؤ پھر اسے لے کر الگ ہونے میں سال بھر بھی مت لینا۔ مگر ابھی تو تمہیں لچک دکھانی ہوگی۔ تھوڑا خوشامد سے کام لینا ہو گا۔ کہتے ہیں ناں مطلب پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔“

اس کے تن من میں اشتعال کی ایک تیز لہر اٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا ابھی اندر جا کر ان دونوں کو ان کی اوقات دکھا دے۔

”آپ نہیں جانتیں آپ! ہادی حامد بھائی کی طرح نہیں ہے۔ یاد نہیں ہے آپ کو اس دن اپنی ماں کے لیے اس نے کیسے پل بھر میں مجھے ہلکا کر دیا تھا۔“ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

”یہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں رومی! اور یہ ہادی بھی کوئی دودھ کا دھلا نہیں ہے۔ ماں کی محبت کا بخار بھی اسے کبھی کبھار ہی چڑھتا ہے بس۔ ان سے چوری چھپے تم سے ملتا ہے پیار جتا تا ہے تحائف دیتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اسے مٹھی میں کرنے کے لیے تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ تم بس وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں!“

انہوں نے قطعی لہجے میں کہا تھا۔ وہ یہ سب سننے کے بعد اٹنے قدموں ہوا پیر لوٹ آیا۔

”ٹھیک ہے ضرور کر مگر خدا کے لیے وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کے سامنے سچائی کا علمبردار بننے مت کھڑے ہو جانا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے سامنے اپنی پہلی محبت کا قصہ چھیڑنے کی۔“ زین نے بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔ پتا نہیں وہ سمجھایا نہیں، مگر اثبات میں سر ضرور ہلا دیا تھا۔

”مجھے آپ کا اس طرح ملاقات کے لیے اصرار کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں منع بھی کر سکتی ہوں۔“

وہ چھت کے ایک ستون سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے کچھ حیران سے لمحے میں پوچھ رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا مگر موسم کافی خوشگوار تھا۔ آسمان پر سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ ٹکڑیوں کی صورت تیرتے ہوئے بادلوں کا کوئی ٹکڑا جب سورج کے سامنے آتا تو شام کا سماں لگنے لگتا۔ دھیمی دھیمی سبک رفتار ہوانے تیش کار ہا سا احساس بھی ختم کر دیتا تھا۔

”سوچا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ آپ اپنے ذہن کو ادھر ادھر بھٹکانے کے بجائے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنا سوچیں گی کہ اگر میں آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں تو یقیناً ”کوئی اہم بات ہوگی۔“

سر ہلاتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ ”آپ کو میری سمجھ داری کا اتنا یقین کیوں تھا۔ میں بیوقوفی کا مظاہرہ بھی تو کر سکتی تھی۔“

اس کی بات پر ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ کافی پر اعتماد لڑکی تھی۔ حالانکہ ان کے بیچ جو رشتہ بننے جا رہا تھا اس حوالے سے تعبیر کے انداز میں تھوڑی جھجک تو ہونی چاہیے تھی مگر وہ اس سے وہ بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔ جبکہ خود وہ بہت نروس ہونے لگا تھا۔ ”دیکھیے تعبیر! ہمارے درمیان کبھی لمبی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہم زیادہ ملے بھی نہیں ہیں مگر اس کے

باوجود میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ ایک بہت اچھی لڑکی ہیں اور اسی لیے میں ایک بات آپ کے سامنے کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ رک رک کر بولا تھا۔ تعبیر کچھ سیدھی ہو کر ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اماں نے یہ رشتہ میری مرضی سے کیا ہے اور۔۔۔ میں اس سے خوش بھی ہوں مگر۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ میں آپ سے پیار نہیں کرتا۔“

اس نے ڈرتے ڈرتے بالآخر کہہ ہی ڈالا۔ ”بس اتنی سی بات۔۔۔ یہی کہنا تھا آپ کو؟“ وہ اس سے تصدیق چاہ رہی تھی۔ ہادی ہکا بکا سا رہ گیا۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ اسے اتنی سی بات بھی قرار دے سکتی ہے۔

”آپ کو سن کر افسوس نہیں ہوا؟“ وہ عجیب سے انداز میں پوچھنے لگا۔

”اگر میرے لیے یہ بات افسوس کرنے والی ہے تو پھر۔۔۔ متاسف تو آپ کو بھی ہونا چاہیے۔“

”کیا مطلب۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔“ ہادی مزید الجھ گیا۔

”مطلب یہ کہ۔۔۔ میں بھی آپ سے پیار نہیں کرتی۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”کیونکہ میرے لیے یہ کوئی بڑا ایشو نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود کہا کہ ہمارے بیچ ڈھنگ سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تو ظاہر ہے۔۔۔ ایسے فریق جس میں کوئی باہمی ربط نہ رہا ہو۔ جن میں کبھی دوستی نہ رہی ہو۔ جن کے درمیان سلام دعا سے ہٹ کر کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اچانک ہی ایک نئے رشتے میں بندھ جانے کے بعد یکدم سے ان کے درمیان پیار آ بھی نہیں سکتا۔ یہ کوئی جادو ہے نہ اختیاری جذبہ۔ نئے رشتے کی بنیاد، یقین، خلوص اور اعتماد پر ہونی چاہیے۔ پیار تو ہوتے ہوتے ہو ہی جاتا ہے۔“ اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔ ہادی یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے مگر پھر بھی آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔“

ہادی اس لمحے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس وہ اس گلابی شام کا سب سے دلکش منظر تھی۔

”آپ اس رشتے سے خوش ہیں؟“

”آپ کو شک ہے؟“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”نہیں، میرے پوچھنے کا مطلب ہے آپ مجھے جانتی نہیں تو۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ہمیں یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے اور

اس عرصے میں زیادہ نہیں، تھوڑا بہت تو آپ کو جان ہی گئی ہوں ہاں! مجھنے کا دعوا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہمارے بیچ کبھی لمبی بات چیت نہیں ہوئی۔ آپ کو شاید

اس بات سے فرق پڑتا ہو مگر میں ذاتی طور پر انڈر اسٹینڈنگ کے نام پر بغیر کسی مضبوط رشتے کے ایک لڑکے اور لڑکی کے ملنے ملانے کو سخت معیوب سمجھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں مگر میں ذرا الگ مزاج رکھتی ہوں۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہوئی۔

ہادی کو یکایک اپنی قسمت پر رشک سا آنے لگا تھا۔

”بے فکر رہیے میں دوبارہ کبھی آپ کو اس طرح ملنے کے لیے نہیں بلاؤں گا۔ تاوقتیکہ ہماری شادی کی ڈیٹ نہ فکس ہو جائے۔“

ہلکے پھلکے لمحے میں اسے یقین وہابی کراتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔ تعبیر مسکراہٹ چھپانے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

زین نے اس سے کہا تھا کہ تعبیر کے سامنے اپنی سچائی کا ڈھول سینے مت بیٹھ جانا۔ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں۔ ان کے لیے کوئی ایسا شخص قابل قبول نہیں ہوتا جو ان کی ذات کی نفی کرتے ہوئے اپنے بچے

کچھ جذبے بھی بجائے ان کے نام کرنے کے اپنی ناکام محبت کے مقبرے پر چڑھا دے۔ گو کہ اس نے تعبیر سے صرف آدھا بیچ بولا تھا مگر پھر بھی تعبیر نے اسے جتنا ہلکا پھلکا لیا تھا وہ اس کے لیے باعث حیرت

تھا۔ وہ اتنی سلجھی ہوئی، معاملہ فہم اور کھلے ذہن و دل کی لڑکی ہوگی۔ یہ اس نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

”میں آپ سے ایک اور بات بھی کہنا چاہ رہا ہوں۔۔۔ کہہ دوں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اجازت چاہنے لگا۔

”بالکل کہیے۔۔۔ میں آپ ہی کی باتیں سننے کے لیے یہاں آئی تھی۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”آنے والے وقت میں اگر کبھی میں آپ سے اپنی محبت کا اظہار کروں تو آپ یہ مت سمجھئے گا کہ پہلی بار

میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ نہ یہ جھوٹ ہے اور تب نہ وہ جھوٹ ہوگا۔ جب آپ پہلی ملاقات

میں ہی کسی کے ذہن و دل پر اس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنی کئی ہوئی باتیں ہی بھولنے لگے تو پھر کوئی آپ کے ساتھ رہے اور اسے آپ سے محبت نہ کر سکے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔۔۔ مجھے بھی یقین

ہے کہ بہت جلد مجھے آپ سے پیار ہو جائے گا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تعبیر لا جواب ہو گئی تھی۔ پہلی بار گھبرا کر اس نے ہادی سے نظریں چرا لیں اور پھر اپنی کیفیت چھپانے کے لیے رخ ہی موڑ گئی۔ ہادی کے چہرے پر ایک کھلی ہوئی مسکراہٹ در آئی۔

شام اپنی تمام تر خوبیوں سمیت ملگجے اندھیرے میں مدغم ہونے لگی تھی۔ مگر ہادی کے لیے زندگی کا ایک نیا دروا کر گئی تھی۔ اس پل سامنے کھڑے اس حسین وجود پر اپنا حق ملکیت محسوس کرتے ہوئے اس نے بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا تھا اور پھر۔۔۔ اماں کا اگر وہ ان کی خواہش کو رد کر دیتا تو شاید آج وہ اس طمانیت اور

شراری کو محسوس نہیں کر پاتا جس نے اس کے دل کا احاطہ کر لیا تھا۔

اب اسے قدر کرنی تھی اس موتی کی جو بن مانگے ہی اس کی جھولی میں آگرا تھا۔

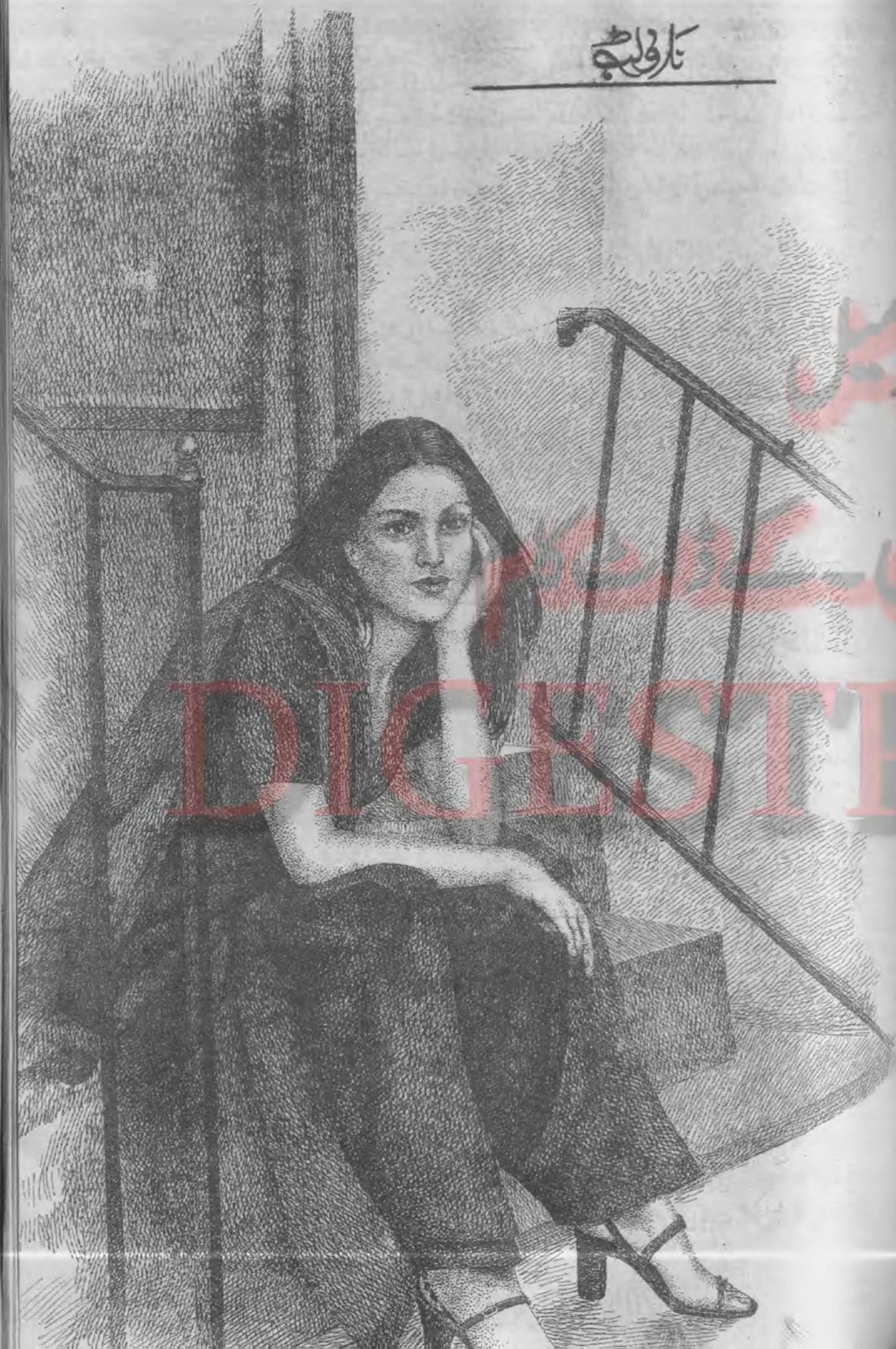


کرتی سٹرو

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میٹھا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پر شکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مہر نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں، زینبی اور ایم کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی میگزین کار کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میٹھا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پر شکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میٹھا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مہر نے میٹھا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میٹھا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پر شکوہ خانم میٹھا کو گھر ہی میں بڑھانے لگیں۔ انہیں میٹھا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پر اسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میلہ لگا تو مہر، ایم اور زینبی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ میٹھا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور زینبی نے اسے روک دیا۔

میٹھا نے تہیہ کر لیا کہ خواہ سب سے چھپ کر سہمی، میلے میں ضرور جائے گی۔ میٹھا نے پر شکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپ لیا تاکہ



کوئی اسے دیکھے بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بندے پہن لیے۔

میشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہو گئی۔ اسے مارنایا ایک نوجوان ملا۔ میشانے اسے گھرتک ساتھ چلنے کا کہا، مگر اسے اپنا نام پتا نہیں بتایا۔ وہ مار کو اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ میشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک بند کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مار نے وہ بند اسنبھال کر رکھ لیا۔ میشانے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔

مہرنے کارا کو دعوت پر بلایا کیونکہ وہ اس کے بیٹے مار سے اپنی کسی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ مار دعوت پر آیا تو میشا بیماری کے باعث اس سے مل نہیں سکی۔

زینی نے وہ بند اجواس رات میشانے پہنا ہوا تھا اپنے دوپٹے میں بروج کے طور پر لگایا تو مار اسے وہ ہی لڑکی سمجھا جو اسے فیسٹول میں ملی تھی۔

کارا نے خاندان اور قرب جوار کی تمام لڑکیوں کو اپنے گھرمیں لے کر مار شادی کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ پر شکوہ خام کا گھر انہ بھی مدعو تھا۔ مگر وہ لوگ میشا کو ساتھ نہیں لے گئیں۔

میشا گھر میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک وہاں رومان آگیا۔ اس نے اپنا تعارف پری زاو کی حیثیت سے کرایا۔ رومان نے پارلی میں جانے کے لیے میشا کے لباس کا انتظام بھی کر دیا۔ زینی نے وہ بند الاپن میں پھینک دیا تھا۔ رومان نے وہ اٹھا کر میشا کے دوپٹے میں لگا دیا اور اسے دعوت میں لے گیا۔ میشا دعوت میں پہنچی تو مار اسے دیکھ کر چونک گیا۔

قسط 5

”اب دیکھنا۔ کل کیا کرتی ہے زینی۔ میں نے اسے خوب چابی بھری ہے۔“

میشا مزے لے لے کر رومان کو اپنا تازہ ترین کارنامہ بتا رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ داد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم نے جھوٹ بولا۔“

”ہاں بولا۔“ ڈھٹائی تو ویسے بھی ختم تھی اس پر۔

”تمہیں پتا ہے یہ کتنی بری بات ہے۔“ رومان نے اسے شرم دلانا چاہی۔ جو ظاہر ہے کہ ایک ناکام کوشش ٹھہری۔

”اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ تم نے تو جیسے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔“

”ہاں۔ بولا ہے بہت بار۔ مگر جھوٹ جھوٹ میں بھی فرق ہوتا ہے میشا۔ بے ضرر جھوٹ سے کسی کو نقصان نہیں ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کو نقصان پہنچانے والا جھوٹ ہر حال میں غلط ہوتا ہے۔ سمجھیں۔“

”اچھا اب تمہاری نصیحتیں شروع۔ آئے بڑے

کھیں کے۔“ میشانے منہ بنایا اور فلسفہ جھاڑنے کی سعی کی۔ ”تم نے سنا نہیں۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔“

”اور اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ یہ تمہارے لیے محبت ہے یا جنگ۔“

رومان کے سوال نے لمحے بھر کے لیے اسے گنگ کر دیا۔ الفاظ کھو گئے تھے یا شاید خیال۔ پھر اپنی خفت چھپانے کے لیے سر جھٹک کر کہتی جانے کے لیے مڑی۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم خود سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ آئے مجھے سمجھانے والے۔ ہونہ۔۔۔ اور زینی۔۔۔ وہ اتنی بری ہے۔ اتنا کچھ کیا ہے میں نے اس کے ساتھ کہ بدلے میں میں اس کے ساتھ کتنا بھی برا کروں وہ کم ہے۔“

”میشا۔ سنو۔“ رومان نے پکارا۔ وہ ان سنی کر گئی۔ مگر اس نے پھر بھی بات مکمل کرنا اپنا فرض جانا۔

”میشا۔۔۔ پلیز۔۔۔ محبت اور جنگ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کی غلطی مت کرو۔“



میشا نے اس کی نصیحت اور دوستانہ سرزنش کا خاک اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی بات پہ زینی کا رد عمل جاننے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”لاؤ۔۔۔ تمہارے کپڑے پر پریس کرو۔ تمہیں جانا ہو گا۔ مار آتا ہی ہو گا۔“

”مجھے نہیں جانا کہیں اور نہ وہ آنے والا ہے۔“

وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں کہہ کر بیڈ پہ لیٹی لیٹی ٹانگیں جھلانے لگی۔

”میرے لیے اسٹرابری شیک بنا کے لاؤ۔ ٹھنڈا ٹھنڈا۔ شاید میرا غصہ کم ہو۔“

”تمہارا غصہ کم ہی تو نہیں کرنا مجھے۔ ابھی تو اس آگ کو مزید بھڑکانا ہے۔ یہ گرمی تمہاری کارا آئی ہے نکالو گی تو میرا کام بنے گا۔“

میشا نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سوچا اور کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے مت جاؤ۔۔۔ مگر سوچ لو۔۔۔ کل ہی ہے وہ فنکشن۔ اس لحاظ سے آج کا دن بہت اہم ہے۔“

”وہ بھی سمجھتے ہیں ناں کہ میں کل کے فنکشن میں اپنے سر پہ مار کے نام کا آپل اوڑھنے کی خاطر اپنی ہر طرح سے انسسلٹ کروا سکتی ہوں تو مجھے یہ ہر حال میں غلط ثابت کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم کرو یہ غلط ثابت۔ وہ کسی اور کو مار کی پسند ثابت کر دیں گی۔“

”تم اپنی بکو اس بند رکھو۔ منحوس قسم کے اندازے مت لگاؤ۔ مار مجھ سے محبت کرتا ہے وہ کسی اور کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ ویسے بھی یہاں اور کوئی ہے بھی کون جو زینی کے مقابلے پہ آئے۔“

پھر سیل فون پہ اس کا نام جگمگاتے دیکھ کے نخوت سے ناک چڑھانے لگی۔

”اب فون پہ فون کر رہا ہے۔ نہیں کروں گی بات تو

خود ہی ہوش ٹھکانے آجائیں گے اس کے۔“

میشا یہ سنتے ہی فکر مند سی ہو گئی۔ رومان کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگیں۔

(ارے رومان کتنا ہے کسی لڑکے کو کوئی لڑکی جتنا بھی انور کرتی ہے وہ اتنا اس کی جانب اثریکٹ ہوتا ہے کوئی اس کو جتنا دور بھگاتی ہے وہ اتنا قریب آتا ہے تو زینی کے اس طرح انور کرنے سے کہیں مار اس سے مزید۔ نہیں نہیں۔ کوہ گھبرا اٹھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں شیک لاتی ہوں۔ اور تمہیں نہیں جانا تو نہ سہی۔ مجھے تو وہاں بہت سے کام ہیں اور میں ذرا جا کے نظر بھی رکھتی ہوں کہ کون تمہاری خالی کی ہوئی جگہ کو بھرنے والا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ زینی لیٹے لیٹے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”بھئی! ظاہر ہے۔ میدان خالی ہو تو کوئی بھی قبضہ جمالیتا ہے۔ اور کارا آئی تو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی مار کا دھیان کسی اپنی پسند کی لڑکی کی جانب لگانا چاہیں گی۔“

وہ اس کو ہراساں کرنے کا سامان پیدا کر کے کمرے سے نکل گئی۔

اس بار فون کی گھنٹی بجی تو زینی نے نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کی۔ البتہ لہجہ ذرا لیے دیے ہی تھا۔

”ہاں مار! بس آ رہی ہوں میں۔ مجھے تم سے ایک فائل بات بھی کرنی ہے۔“



رومان اپنے گنتی کے چند پرانے سے کپڑے اور کچھ پسندیدہ کتابیں لینے سمارا کے گھر میں داخل ہوا تھا۔

سامنے سمارا کو خلاف معمول مسکراتے دیکھ کے گڑبڑا سا گیا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں دراصل۔۔۔“

”اتنے ناراض ہو گئے کہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑنے کا طے کر لیا۔“

وہ لگاؤ سے بولی تو رومان مرتے مرتے بچا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے تو نہیں۔۔۔ وہ آئے آپ نے خود

بیوٹی بکس کا تیار کردہ سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✿ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✿ نئے بال اگاتا ہے
- ✿ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- ✿ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✿ یکساں مفید
- ✿ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری
کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں
یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک
بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں والے منی آڈر بھیج
کر جڑی بوٹیوں سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس
حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

بات بھی نہیں منوا سکتے۔

”کوئی وجہ بھی تو ہو۔ کیا میں ان سے جا کے یہ کہہ
دوں کہ آپ یہ تقریب اس لیے ملتوی کر دیں کیونکہ
زینی کو ڈر ہے ہم اس کے بجائے کسی اور کو لڑکی کو نہ
پسند کر لیں۔“

”کیا؟ میں کسی اور لڑکی سے کیوں ڈروں گی۔ تم نے
مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ کل جتنی بھی لڑکیاں آرہی
ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی میرے برابر کی نہیں
ہے۔ میرا ان سے کیا مقابلہ۔ تم نے یہ کہہ کر میری
انسٹلٹ کی ہے۔“

اس کی مسلسل ناراضی اور چیخ و پکار سے اب ماڑ
کو کوفت ہونے لگی تھی۔

”تم ہر بات کو ایسٹو کیوں بنالیتی ہو؟“

”میں نہیں۔ تم بنالیتے ہو۔“

وہ اسی وقت وہاں سے چل پڑی اور ماڑ نے بھی
روکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

☆☆☆

”سماں کا داغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ اندر ہی اندر
مہربے حد مطمئن تھی کہ اب رومان مکمل طور پر اس کی
مٹھی میں آنے والا ہے۔

”جی۔۔۔ داغ بھی۔۔۔ اور نیت بھی۔“

”تم فکر مت کرو۔ اور کوئی ضرورت نہیں ہے اس
کے پاس دوبارہ جانے کی۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کے
ہمارے ساتھ رہو۔“

”مگر میں کیسے۔۔۔ میرا مطلب ہے یہ مناسب
نہیں۔“ وہ بھی اوپر اوپر سے تکلف جھاڑنے لگا ورنہ
میشا کے کچھ اور قریب ہونے کا تصور اسے شاد کر رہا
تھا۔

”تو کیا سماں کی پیشکش قبول کرنا مناسب ہو گا؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بدک اٹھا۔

”میں بھی نہیں چاہتی کہ تم اپنی زندگی برباد کرو مجھے
تم ہمیشہ ہمیشہ سے اپنے لگے ہو اور اگر ساتھ رہنے میں
جھجک رہے ہو تو انیکسی میں رہ لو۔“

ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں
کھولیں۔

وہ اس کے بے حد نزدیک کھڑی محبت سے اس کے
چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”تب سے۔ جب سے تم نے میرے دل میں جگہ
بنالی ہے۔“

”سماں آئی؟“ وہ دہشت زدہ سا نظر آنے لگا۔

”اوں ہوں۔ کتنی بار کہا ہے آئی نہ کہا کرو۔“

”وہ۔۔۔ میم۔۔۔ میم۔۔۔ یہ آپ۔۔۔“

”نہیں! اب میں تمہاری میم نہیں ہوں۔ نہ تم
میرے معمولی ملازم ہو۔ اب تم میری ہر چیز کے مالک
ہو رومان۔“

”مالک۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ ہر چیز کا؟“ اس کی آنکھیں اس
سے زیادہ ابلنے سے انکار کر چکی تھیں۔

”ہاں ہر چیز۔ کیونکہ میں تم سے بہت جلدی شادی
کرنے والی ہوں۔“

سماں نے مسکرا کے انکشاف کیا۔ کچھ اس انداز میں
جیسے وہ اسے کروڑوں کی لائبریری لگنے کی نوید سن رہی ہو۔

”کیا شادی؟“ وہ کچھ ایسے ہراساں ہوا جیسے کسی
نے اسے سزائے موت سنادی ہو۔

”نہیں۔۔۔“ وہ اٹنے قدموں سرپٹ بھاگنے لگا۔

”رومان۔۔۔ رو رومان۔۔۔“

☆☆☆

”تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“ زینی نے ماڑ
کے سامنے اپنی خفگی جتانی چاہی۔

”اور تم نے مجھے۔۔۔“ ماڑ نے بھی صاف گوئی سے
کہہ دیا۔ وہ خود ناز و نعم میں پلا تھا۔ اسے کہاں عادت
تھی دوسروں کے ناز اٹھانے کی۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ چلائی۔ البتہ ماڑ نے یہی
الفاظ اپنے مخصوص نرم لہجے میں دہرائے۔

”اور میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم نے میری بات نہیں مانی یہی تو کہا تھا کہ یہ
فنکشن کینسل کراؤ۔ تم اپنی مام سے اتنی چھوٹی سی

خوبی تو کہا تھا۔“

”غصے میں منہ سے کچھ نکل گیا تو تم سچ سمجھ
ٹھے۔ غصہ بھی تو اپنوں پہ ہی نکلتا ہے۔“

اس نے رومان کے شانے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالا۔
”دراصل وہ مریم نے کہا کہ میں وہاں ان کی
سی میں تو۔۔۔ میں۔“

”ہوں۔ مجھے پتا ہے۔ تمہاری غلطی نہیں ہوگی۔
تم بہت اچھے ہو۔ میری سب باتیں مانتے ہو۔ آؤ ہم
مل کے کھانا کھاتے ہیں۔“

”آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں۔ میں خود لگالوں گا
یڈ۔۔۔ جیم۔“

وہ اس کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر داخل ہوا۔
”جیم بریڈ کیوں کھاؤ گے تم میں نے تمہارے لیے
بڑے مزے کی چیز بنائی ہے۔“

”جی؟“

”اور ہاں۔ میں نے تمہارے لیے ایک بہت خوب
صورت شرٹ بھی لی ہے۔ تم بہت اچھی لگے گی۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت کیوں نہیں تھی۔ مجھے تمہیں ایسے
پرانے کپڑوں میں دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔“

”کیا فائدہ سارا دن کبھی آپ کے۔ کبھی فیکٹری کے
تو کبھی مریم کے کاموں میں الجھا رہوں گا۔ نئے کپڑوں
کا تو حشر ہو کر رہ جائے گا۔“

”تم کل سے مہر کے ہاں نہیں جاؤ گے۔ نہ اس کا
کوئی کام کرو گے۔“

”مگر اس سے تو میرا مقصد ادھورا۔ میرا مطلب
ہے۔ میرا کام ادھورا رہ جائے گا اور جب تک کام پورا
نہ ہوا وہ مجھے پیسے نہیں دیں گی۔“

”نہ دے۔ مجھے پیسے کی نہیں تمہاری فکر ہے۔“

”وہ کب سے؟“

بے ساختہ رومان کے لبوں سے پھسلا۔ اس نے
سماں کے متوقع رد عمل سے گھبرا کے آنکھیں بند کر
جیسے بلی کو دیکھ کے کبوتر آنکھیں میچ لیتا ہے۔ مگر اگلے
ہی لمحے اسے اپنے رخسار پر سماں کے ٹھنڈے لہجے

”میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا۔ شکریہ۔“

☆ ☆ ☆

مار کے کمرے سے وہ اتنے خراب تیور لیے نکلی تھی کہ باہر ہال میں کارا سے اس کا سامنا نہ ہی ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر قسمت کو بھی ایسے اتفاقات کرانے کا شوق ہوتا ہے جو بھس میں چنگاری ڈالنے کے مترادف ہوں۔ کارا نے اسے آتے دیکھ کے ایک البم بڑھائی۔ بنا اس کے چہرے کے بننے بگڑتے زاویوں کی پروا کیے۔ ”زینی! ذرا ہٹانا تو۔۔۔ یہ کھرا سیکم۔“

”آپ مجھ سے پوچھنے کی فارسیلی میں کیوں پڑ رہی ہیں کارا آئی! زینی نے بد تمیزی سے اس کی بات کالی۔ وہ ششدر رہ گئی۔

”یہ کیسے بات کر رہی ہو تم؟“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہر بات میں آپ ایسے ہی کرتی ہیں۔ چاہے بات میری ہو یا مار کی۔ آپ پوچھتی ضرور ہیں مگر بعد میں فیصلہ آپ کا اپنا ہی ہوتا ہے تو جب ہونا وہی ہے جو آپ چاہتی ہیں تو پوچھنے کی زحمت بھی کیوں کرتی ہیں۔“

”تم میرے ساتھ بد تمیزی کر رہی ہو زینی۔“

”میں صرف آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ مجھ میں اتنی سیلف ریسپیکٹ ہے کہ میں اپنی انسلٹ ہوتے دیکھ کے آواز اٹھا سکوں۔“

وہ اپنی ہیل ٹک ٹک بجاتی وہاں سے نکل گئی۔ اور کارا کو اپنے کھولتے ہوئے خون کو اعتدال میں لانے میں کافی وقت لگا۔

☆ ☆ ☆

کارا نے مار کو بتانے میں اور مار نے سخت طیش کے عالم میں اسے فون کرنے میں ذرا وقت نہ لگایا۔

یشا اپنے شرارتی لبوں میں مسکراہٹ دبائے ہوئے خاموشی سے ان کاموں میں لگی رہی جو کارا نے اس کے سر دیکھے تھے۔

”تم نے مار کے ساتھ مس بی ہو کیا؟“

”اوہ۔۔۔ بہت جلدی بتا دیا انہوں نے۔ ابھی تو میں

گھر تک پہنچی بھی نہیں۔“ اس نے تنک کے کہا۔

”میں مار کے دل میں تمہارے لیے جگہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم نے ان کی نظر میں اپنا سارا امیج ہی خراب کر دیا۔“

”ان کی نظر میں میرا امیج ٹھیک کب تھا؟ وہ سمجھتی ہیں کہ میں اتنی گری پڑی ہوں کہ تمہاری خاطر ان کی سب باتیں بھی برداشت کروں گی اور کسی ملازمہ کی طرح ان کے گھر کے معمولی کام بھی کروں گی۔“

”یہ بے کار کی بحث ہے۔ فی الحال میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم نے مار کے ساتھ جو بد تمیزی کی ہے اس کے لیے ان سے معافی مانگو۔“

”کیا؟ معافی اور میں؟ سوچنا بھی مت۔“ زینی نے ٹھک سے فون رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

مار کی جھنجلاہٹ زینی کے فون بند کر دینے سے عروج پہ جا پہنچی۔

”عجیب اگر اور طنطنہ ہے۔“

وہ جھیل کے پاس کھڑا اس کی ساکت سطح پہ اپنی ساکت نگاہیں جما کر کھڑا تھا۔ اسے رہ رہ کے اپنی اس سے وہ پہلی ملاقات یاد آرہی تھی۔ وہ ملاقات۔ جس میں وہ اسے سب سے اچھوتی لگی تھی اور وہ اب اس اچھوتے پن کو تلاشتا پھر رہا ہے مگر وہ بات اسے ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتی۔

”پہلی ملاقات میں میں نے تمہاری صورت دیکھے بغیر ہی تمہیں دل دے دیا تھا۔ کاش کہ میں تمہاری صورت دیکھتا یا نہ دیکھتا مگر تمہارے دل کے اندر ضرور جھانک لیتا۔ تم جتنی خوبصورت ہو کاش تمہارا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔“

وہ چپکے سے اپنے دل میں اس سے گلے کر رہا تھا جب عقب سے یشا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔

”موسم ٹھیک نہیں ہے، آپ کو گھر واپس جانا چاہیے۔“

”تو تم اتنے خراب موسم میں باہر کیوں ہو؟“ وہ پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میں بھی گھر ہی جا رہی ہوں۔“

”تم مار کی ہیلپ کے لیے یہاں روز اپنا ٹائم نکال کر آتی ہو۔ مار کو چاہیے تھا کسی سے کہہ کر تمہیں گھر ڈراپ کروا دیا کریں۔“

”وہ روز ایسا ہی کرتی ہیں۔ آج وہ کسی ڈرائیور کو کہنا بھول گئی تھیں۔ ان کا موڈ بھی بہت آف تھا۔“

”ہاں! ان کا موڈ زینی نے۔۔۔ وہ کتے کتے رک گیا۔ مگر یشا نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

”ہاں! زینی کو ان کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ٹھیک ہے اس کی نیچر ہی ایسی ہے مگر پھر بھی کارا آئی بڑی ہیں۔“

اس کے دل میں چھپے ہلکے سے گلے کو کچھ اور توانا کرنے کے بعد اس نے قدم آگے بڑھائے۔

”میں چلتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔“

”تم کیسے جاؤ گی؟“ اسے فکر لاحق ہوئی۔

”جھیل کے راستے کشتی سے۔“

”مگر ابھی تو تم مجھے جھیل کے پاس کھڑے ہونے سے بھی منع کر رہی تھیں کہ موسم ٹھیک نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ مجھے عادت ہے۔“

وہ ہلکا سا مسکرائی تو مار نے اپنی گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔

”تم کہو تو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

ایک لمحے کے لیے یشا کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ آنکھوں میں تارے سے چمک اٹھے مگر اگلے ہی پل رومان کی تنبیہ کانوں میں گونجی۔

”جتنا اس سے دور بھاگو گی۔ وہ اتنا ہی تمہاری جانب کھینچا چلا آئے گا۔“

یہ یاد کرتے ہی اس نے بڑی سختی سے اپنے دل کو جھڑک کر اس کے اصل مقام پہ بٹھایا اور چہرے پہ بے اعتنائی سی سجا کے کہنے لگی۔

”نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پلیز! تکلف نہیں کرو۔ میں بھی اس جانب ہی

جا رہا ہوں۔“

مار نے دوبارہ اصرار کیا اس کی جان عذاب میں آگئی۔ دل تھا کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا اور دماغ تھا جو رومان کے مشورے پہ عمل کر کے اسے آزمانا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے دل پہ پتھر رکھ کے لہجہ کچھ اور سخت بناتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔ میں کشتی سے ہی جانا پسند کرتی ہوں۔“

اور قدم آگے بڑھا دیے۔ مگر عجیب مرے انداز میں۔۔۔ اس کی پشت اب مار کی جانب تھی۔ ورنہ وہ اس کے چہرے پہ صاف نظر آتے پچھتاوے اور افسوس کے تاثرات بھانپ لیتا۔ ست قدموں سے کشتی کی جانب بڑھتے اور پھر بیٹھتے ہوئے وہ مسلسل خود کو کوس رہی تھی کہ دماغ کی ماننے کی ضرورت کیا تھی بھلا۔

”اف۔۔۔ یہ کیا کیا میں نے۔۔۔ رومان کی باتوں میں آ گئی اور مار کو انکار کر دیا۔ مار کو؟ اور اس نے دوبارہ کہہ دیا۔ اب اسے کیا ضرورت ہے تیسری بار آفر کرنے کی۔ اب پتا نہیں کبھی دوبارہ اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ بھگتو یشا۔ اب بھگتو۔“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے چپو ابھی پانی میں اتارے ہی تھے کہ مار کی آواز پہ چونکی۔

”یشا۔۔۔ رو۔“

اس نے نظر اٹھا کے سامنے دیکھا۔ حیران ہوئی۔ مار اسی جانب بھاگتا آ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا میں تمہارے ساتھ جاسکتا ہوں۔ اس نے؟“ اس نے اجازت طلب ضرور کی۔ مگر یشا کا جواب سننے سے پہلے وہ اس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ یشا نے اپنی بے ساختہ خوشی کو چہرے پہ امنڈ آنے سے بڑے جتن کر کے روکا تھا۔

وہ اکثر اسی راستے سے آتی تھی۔ مگر آج سے پہلے یہ جھیل اور یہ مناظر اسے اتنے حسین کبھی نہیں لگے تھے۔

”تم اپنی۔۔۔ اوہ سوری۔۔۔ آپ اپنی۔۔۔“

”تم مجھے مار کہہ سکتی ہو۔“

اس کی جھک دیکھ کے مار نے فراخ دلی سے کہا۔

”تم اپنی گاڑی میں کیوں نہیں گئے؟“

”ایسے ہی مجھے جھیل پسند ہے۔“

”اوہ۔۔۔ وہ مجھ گئی۔ سنا کچھ اور چاہتی تھی۔“

”اور کشتی کا سفر کرنا بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔“

”ہوں۔۔۔ زبردستی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا

کے وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

(تمہیں میرے ساتھ جانا پسند ہے یہ کہہ دو گے تو

کیا جاتا ہے تمہارا)

اچانک مار اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے پاس

آ بیٹھا۔

”ویسے سچ بتاؤں۔ اصل وجہ کچھ اور ہے۔ میں

کچھ کہنے آیا تھا تمہارے پاس۔“

میشا پھر سے جی اٹھی۔ ”کس وجہ سے؟“

اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ سب جگنو

انکھیلیاں کرتے اڑ رہے تھے جو رومان کی منگھلی سے

آزاد ہوئے تھے۔

”وہ مجھے تم سے۔“ وہ ہچکچا کے چپ ہوا۔

”بولو ناں۔“ میشا کی بے نالی عروج پہ تھی۔

”تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟“

”بالکل بھی نہیں۔ کو تو۔۔۔“

”در اصل۔۔۔ زینی۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض ہے۔

ہمارے درمیان کچھ کٹنی ہو گئی تھی۔ میں اسے ابھی

فون نہیں کرنا چاہتا۔ جانتا ہوں وہ بات نہیں کرے

گی۔ اس سے مجھے انسٹل فیل ہوگی اور بات بڑھ

جائے گی۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کی

ناراضی طول پکڑے۔“

”تو۔۔۔ میشا کا چہرہ اتر چکا تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں

پوچھ رہی تھی۔

”اگر تم اسے بتاؤ کہ۔۔۔ میں اس سے اتنے برے

لہجے میں بات کرنے پہ شرمندہ ہوں۔ اور اسے منانا

چاہتا ہوں۔ تو کیا۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے۔“

میشا نے پتھر ائے چہرے کے ساتھ سامنے دیکھ کر

کشتی روکی اور اترتے ہوئے کہا۔

”میں کوشش کروں گی۔“

وہ روتے کر لاتے ہوئے کمرے کے چکر کاٹ رہی

تھی۔

”میں اس کی اور زینی کی صلح کرا دوں۔ جھوٹ کہتا

ہے رومان۔۔۔ مار بھی میری طرف نظر نہیں کرے

گا۔ میں زینی کی خوب صورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

کبھی بھی نہیں چاہے کچھ بھی کر لوں۔“

پھر وہ پیش کے عالم میں اٹھی۔

”میں ذرا اس سے پوچھوں تو سہی۔ اس کی بتائی

کوئی بھی بات کام نہیں کر رہی۔ نکلی۔“

اس کا رخ سیدھا انیکسی کی جانب تھا جہاں اب

رومان کے ڈیرے تھے۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا مار کہ زینی مہر سے

الگ نہیں ہو سکتی اور وہی ہوا۔“

”مام۔۔۔ اس کے اور میرے درمیان کوئی میں انڈر

اسٹینڈنگ تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپ سیٹ تھی۔“

مار اگرچہ زینی سے خفا تھا پھر بھی اس کی جانب سے

صفائی دینے لگا۔

”اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اب جب بھی کبھی وہ اپ

سیٹ ہوگی میرے ساتھ مس بی ہو کرے گی؟“

”ایسا نہیں ہے مام۔ زینی بہت اچھی لڑکی ہے بس

غصے کی تھوڑی تیز ہے۔“

”جسے اپنی زبان اور اپنے غصے پہ کنٹرول نہ ہو۔ وہ

کبھی اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ ابھی تمہیں

صرف اس کی خوب صورتی نظر آرہی ہے مگر شادی

کے لیے لڑکی میں اور بہت کچھ ہونا چاہیے۔“

”آپ بھول رہی ہیں۔ میں نے اسے اس کا چہرہ

دیکھے بغیر پسند کیا تھا۔ خوب صورتی کی بنا پہ شادی کرنے

کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

مار کی مسلسل حجت سے بالآخر کاراز بیچ ہوا تھی۔

”میں تمہیں صاف بتا رہی ہوں کہ تمہاری شادی

اس سے کرنے کا اس وقت تک سوچوں گی بھی نہیں

جب تک وہ کل کے فنکشن میں سب کے سامنے مجھ

سے معافی نہیں مانگے گی۔“

”کیا؟ معافی؟“ مار پریشان ہوا تھا۔

ابھی تو اسے منانے کا مرحلہ بھی سر نہیں کیا تھا اوپر

سے یہ نیا مطالبہ۔

”جھوٹے ہو تم۔ تمہاری ساری باتیں بھی جھوٹی

ہیں۔ تم نے جو کہا میں نے کیا۔ مگر مار اب بھی زینی سے

ہی محبت کرتا ہے۔ کوئی رزلٹ نہیں نکلا تمہاری باتوں

کا۔“

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور رومان ہونٹوں پہ

ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں بے پناہ محبت

لیے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ محبت جسے محسوس کرنے

سے میشا ابھی قاصر تھی۔ مگر مسکراہٹ سے چڑ ضرور

گئی۔

”کمال ہے میں رو رہی ہوں اور تمہاری

مسکراہٹیں ہی قابو میں نہیں آرہیں۔ کیا دیکھ رہے

ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں۔ تم سچ کہتی ہو۔ تم ہو کیوٹ۔“

تعریف سن کے میشا رونا بھول بھال گئی اور

ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”ہے ناں؟ ہوں تو۔۔۔“

رومان کی مسکراہٹ ہو گئی چو گئی ہو گئی۔

”مگر مار کو نظر کیوں نہیں آتا؟“ اس نے پیر پٹخ کے

کہا۔

”آتی ہو نظر۔ تب ہی تو اس نے تمہارا نام پوچھا۔

تم پہ توجہ دی۔ یہ سب میری باتوں پہ عمل کرنے کا

رزلٹ ہی تو ہے اور جب اس نے تمہیں ڈراپ

کرنے کا کہا تو میرے کہنے پہ تم نے انکار کیا اس وجہ

سے تو وہ تمہارے پیچھے کھینچا چلا آیا۔“

”ہاں آیا۔ مگر میں نے بتایا تو ہے کہ بعد میں کیا ہوا؟

کیا فائدہ ہوا تمہاری باتوں پہ عمل کرنے کا؟“

”فائدہ اس لیے نہیں ہوا میشا! کیونکہ تم نے میری

باتوں پہ عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور حرکتیں

بھی کیں۔“ اب وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”کیسی حرکتیں؟“

”تم نے جھوٹ بولا۔ گندی والی سائشیں اور

سیاستیں کھیلنے کی کوشش کی۔ دو لوگوں کے دل ایک

دوسرے کے خلاف کرنے چاہے۔ اس لیے تمہارا کام

بنتے بنتے رہ گیا۔“

میشا نے شرمندگی اور تاسف سے سر جھکا لیا۔

رومان کو اس پہ بے حد پیار آیا۔ اور وہ نرمی سے اس

کے سر کو تھپک کر بولا۔

”اگر تم واقعی دل سے شرمندہ ہو تو ابھی کچھ

نہیں بگڑا۔ کل کے فنکشن میں تم ایک اور کوشش

کر سکتی ہو۔“

”وہ کیا؟“

”اب تمہیں ایک اور بات گرہ سے باندھنی ہے۔

تمہیں مار کے سامنے خود کو بالکل ان پریڈکٹ ایل

(توقع کے خلاف) ثابت کرنا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”اگر وہ تمہیں بھولی بھالی سمجھتا ہے تو اچانک اس

کے سامنے کوئی گہری بات کر جاؤ۔“

”کتنی گہری؟“

وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھولے ایسے سوال پہ

سوال کر رہی تھی کہ وہ بالآخر چڑ گیا۔

”کنوئیں جتنی اور غور سے سنو۔ اس کے سامنے

ویسی بن کے کبھی مت آؤ جیسی زینی ہے۔ زینی سے

بالکل مختلف بلکہ الٹ۔ ذرا ہٹ کے۔ اتنا الگ کہ وہ

چونک جائے۔“

جیسے رومان میشا کی کلاس لے رہا تھا ویسے ہی مہر زینی

کو سبق پڑھا رہی تھی۔

”وقت بڑنے یہ انسان گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے۔ اگر ماں کو خوش کرنے کے لیے تم کارا کی تھوڑی بہت خوشامد کرو۔ ایک سوری کہہ لو تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

”اور کسی کو پڑے نہ پڑے۔ زینی کو پڑتا ہے۔“ زینی نے نخوت سے اپنے ابرو ٹیکھے کرتے ہوئے کہا۔

”مہرنے اسے لتاڑ کے رکھ دیا۔“ اپنے آپ کو کوئی توپ چیز سمجھنا چھوڑ دو۔ تمہارے پاس ہے کیا۔ اس شکل و صورت کے علاوہ۔“

”ماما۔۔۔ اس نے سخت برا مانا۔“

”سچ ہے یہ۔ اور کیا ہے تمہارے پاس جس پر تم اترا سکو۔ یہ سزا ہوا بوسیدہ کھنڈر مکان۔ ایک بوڑھی دادی۔ جو مرتے مرتے یہ کھنڈر بھی ہم سے چھین کے کسی اور کے نام کر جائے گی۔ اور وہ ہر روز گھانے میں جاتا فارم۔ ایسے میں اگر ماں جیسا لڑکا قسمت سے شہسب مل ہی گیا ہے تو اسے اللہ کا احسان جانو۔ اور یہ نخرے چھوڑ دو ورنہ وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”وہ میرے ہاتھ میں ہے ہی کب؟ اس کی سب ڈوریں تو اس کی ماں کے ہاتھ میں ہیں۔“

”گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔ کارا کو بھی تم ایسا ہی کاٹنا سمجھو۔ اور برداشت کرو۔ میری مانو تو ابھی بات زیادہ نہیں بگڑی۔ اس سے ملو اور کچھ بھی کر کے منالو تاکہ وہ شام کے فنکشن میں تمہیں اپنانے کا اعلان کر دے۔“

”مہر کے سمجھانے بھانے کا زینی پر خاطر خواہ اثر نظر آ رہا تھا۔ وہ تقریباً ”رضامند لگ رہی تھی۔ مہرنے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی۔“

”یہ لو پکڑو فون۔ کرو اسے اور ابھی ملنے جاؤ۔“ اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ ماں کے ساتھ تھی۔

”تو تم نے اپنی ناراضی ختم کر لی۔“

”ماں مسکرایا۔ اور وہ اتر آئی۔“

”کیا کروں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”میں بھی۔ کل رات مجھ پر بہت بھاری گزری

۔ تمہاری ناراضی نے مجھے بہت بے چین رکھا۔“

”اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے تو میری بات مان لینے میں کیا حرج تھا۔“

زینی نے اسے اپنے سامنے ڈھیر ہوتے دیکھا تو ایک بار اور کوشش کرنا چاہی۔

”زینی۔۔۔ تم مجھ سے کچھ بھی ایسا کرنے کو کہو۔ جس کا تعلق صرف مجھ سے ہے تو میں فوراً مان لوں مگر جس معاملے میں مام شامل ہیں اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک ایسا فنکشن جسے مام نے ارتج کیا ہے اور جس کے دعوت نامے بہت سے لوگوں کو جا چکے ہیں اسے صرف ایک دن پہلے۔ میں بغیر کسی وجہ کے کیسے کینسل کر دیتا۔“

زینی نے اس بار بھی دال گلتے نہ دیکھی تو جبرا مسکرا دی۔

”میں سمجھ گئی ہوں۔ اسی لیے تو بات کو بڑھانے کے بجائے تم سے ملنے آگئی ہوں اور میں کارا آئی کو سوری کہنے پر بھی تیار ہوں۔“

”واقعی؟“ ماں کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

”ہاں۔ صرف اور صرف تمہارے لیے۔ چلیں؟“

”کہاں؟“

”تمہارے گھر۔ کارا آئی سے سوری کہنے۔“

زینی کی بات پر ماں کو احساس ہوا۔ مرحلہ ابھی آسان نہیں ہوا۔

”مگر ابھی تو۔۔۔ میرا مطلب ہے شام کو تم فنکشن میں تو آئی رہی ہو۔۔۔ وہیں سوری کہہ دینا۔“

”کیا؟ سوری کہنے کے لیے وقت کچھ نامناسب نہیں ہو گا؟ میں اتنے مہمانوں میں کیسے سوری کہوں گی؟“

”زینی! دراصل۔۔۔ دراصل مام کی شرط ہے کہ تم سب لوگوں کے سامنے انہیں سوری کہو گی۔“

زینی ششدر رہ گئی۔

”سب لوگوں کے سامنے۔“

جب سے میثا کو پتا چلا کہ زینی اور ماں کی ناراضی ختم

ہو گئی ہے اور وہ دونوں پھر ملنے گئے ہیں تو اس کی بے تابی عروج پر پہنچ گئی۔ رومان کے پڑھائے سارے سبق بھگ سے ذہن سے اڑ گئے اور وہ شرمندگی کا احساس جو اس نے جھوٹ بولنے پر دلایا تھا وہ بھی زائل ہو گیا۔

اب اس کا ذہن تیزی سے کوئی اور راستہ نکال رہا تھا۔

”پلیز کارا آئی! کچھ تو لیں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

اس نے نڈھال پڑی کارا کو جس پیش کیا۔

”مجھ سے ماں کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی ڈرا سی لڑکی نے اسے پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔“

”زینی کی تو عادت ہے۔ ایسے ہی پاگل کر کے رکھ دیتی ہے لڑکوں کو۔ پھر انہیں اس کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔“

میثا کی بات پر کارا تو بری طرح چونکی ہی۔۔۔

سیڑھیاں اترتا ماں بھی وہیں ٹھٹھک کے رک گیا۔

”مطلب۔۔۔ ماں سے پہلے وہ کسی اور کو۔“

”زیادہ نہیں۔ بس دو تین۔“

میثا نے بھول پن سے پلکیں پٹ پٹائیں۔

”دو تین!“

”جی کارا آئی۔۔۔ ایک سال میں بس صرف دو تین۔ اس سے زیادہ نہیں۔۔۔ بری لڑکی نہیں ہے زینی۔“

کارا کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑی ہی۔۔۔ ماں بھی واپس پلٹ گیا۔

زینی بڑی تپ کے گھر لوٹی تھی۔ ماں نے مطالبہ ہی ایسا کیا تھا کہ جو اس کے لیے بالکل بھی قابل قبول نہیں تھا۔

”سمجھتا کیا ہے خود کو۔۔۔ میں اس کی مام سے سوری کہنے پر مان کیا گئی۔ اب مجھے اتنے مہمانوں کے سامنے شرمندہ کرانا چاہتا ہے اور وہ کارا آئی۔۔۔ ایسی ایسی شرطیں رکھ رہی ہیں۔ ہونہ۔۔۔ میں نے بھی ان کا بیٹا ان سے چھین کے نہ دکھایا تو میرا نام بھی زینی نہیں ہے۔“

اس کی مسلسل بددعا ہٹ پہ ایکی نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

”تم اس سے لڑنے لگی تھیں یا اسے منانے؟“

”اب وہ منائے گا مجھے۔۔۔ میں تو اسے فون نہیں کرنے والی۔ وہ سمجھے گا اتنی ہی مر رہی ہوں نا میں اسے پانے کے لیے یا اس کے علاوہ میرے پاس کوئی۔“

کہتے کہتے وہ رکی پھر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”آئیڈیا۔۔۔ اب میں اس پر یہی ظاہر کروں گی کہ وہ اکیلا نہیں ہے میری زندگی میں بلکہ اس جیسے تو چار پانچ لائن میں لگے ہوئے ہیں میری ایک نظر کے منتظر پھر اسے احساس ہو گا کہ میں کیا چیز ہوں۔“

عین اسی وقت ماں کا فون آگیا۔

ایکی نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا اور فروٹ سلاڈ کے پیالے میں کم ہو گئی۔

”ہیلو۔۔۔“ زینی نے لٹھ مار لہجے میں کہا۔

”زینی! میں تم سے جو پوچھوں اس کا صحیح صحیح جواب دینا۔“

”جلدی بولو ماں! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”میں بہت الجھن میں ہوں۔ دل کہتا ہے یہ بات غلط ہو گی۔ تم ایسی ہو ہی نہیں سکتیں۔۔۔ مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں تب یقین آئے گا دل کو۔“

ماں کی بے چینی اور اضطراب اس کے ہر لفظ سے جھلک رہا تھا۔

”او فوہ۔۔۔ جلدی کہو ناں ماں۔۔۔ سعد میرا ویٹ کر رہا ہو گا۔“

”کون سعد؟“ وہ چونکا۔

”میرا دوست۔“ زینی کے لہجے میں یکایک شیرینی بھری۔

”ابھی تک تو صرف دوست ہی ہے مگر وہ کافی عرصے سے مجھے پسند کرتا ہے۔ وہ تو میں نے ہی کبھی پازو رپائنس نہیں دیا۔ کس کس کی محبت کا جواب محبت

سے دوں۔۔۔ صارم ہے، ڈینی ہے، زوہیب ہے۔
اچھے تو سب ہی ہیں مگر شادی تو مجھے کسی ایک سے ہی
کرنا ہے۔ ہیلو، ہیلو! تم نے کچھ پوچھنا تھا مجھ سے۔
وہ پکارتی رہ گئی مگر دوسری جانب سے فون بند ہو چکا
تھا۔ مار جو پوچھنا چاہتا تھا اس کا جواب اسے مل گیا
تھا۔

”ہونہ۔۔۔ دیکھا ایی! کیسے جل گیا۔۔۔ اب پتا چلا
اسے۔“

☆ ☆ ☆

کارا کا دل خوشی سے جھوم اٹھا مگر اوپری دل سے مار
سے ہمدردی بھی دکھانی تھی۔
”میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا۔“
”مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دل اب بھی نہیں مانتا
کہ وہ۔“ اسے پھر سے کشمکش کا شکار دیکھ کے کارا نے
جلدی سے کہا۔

”مار! اس عمر میں دل ایسے دھوکے کھاتا ہی ہے۔
اب تم زیادہ مت سوچو، نکلو اس موڈ سے۔ شام کو بہت
سے مہمان آنے والے ہیں۔“

پھر میٹھا کو نیپکنز کا ڈھیر مال کی طرف لے جاتے دیکھ
کے روکنے لگی۔

”میٹھا! میں نے شام کی پارٹی کے لیے تمہارا ڈریس
بنوایا ہے ریکا سے کہہ کر منگوالو۔“

پل بھر کے لیے میٹھا کا دل بلیوں اچھلا۔۔۔ مگر پھر فوراً
بے نیازی ظاہر کرنے لگی۔

”تھینک یو کارا آئی۔۔۔ لیکن اس کی کوئی
ضرورت نہیں ہے۔“

”ضرورت کیوں نہیں ہے جو بھی ہے۔ تم ہو تو اس
فیلی کا ایک حصہ۔۔۔ اور تمہاری گرینی میری آئی
ہیں۔ مجھے اتنا خیال تو کرنا ہے تمہارا۔۔۔ ویسے بھی میں
نہیں چاہتی پارٹی میں آئے لوگ تمہیں اس طرح کے
کپڑوں میں دیکھ کے کچھ کہیں اور تمہیں برا لگے۔“

”مجھے برا نہیں لگتا آئی! کیونکہ میں نہیں سمجھتی
لباس ہی انسان کی پہچان ہوتا ہے بلکہ مجھے یہ برا لگتا ہے

کہ مجھے اچھا لگنے کے لیے کسی سے مانگ کے کچھ پہننا
پڑے۔۔۔ میں جیسی ہوں ویسی رہنا پسند کرتی ہوں۔“
بظاہر سرسری انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک
دزدیدہ نظر مارا۔ ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ رومان کتنا سچ
کہتا تھا۔۔۔ اور ہاں رومان نے سچ کہا تھا۔
وہ واقعی چونکا ہوا لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

زینی مسلسل فون کو گھورے جا رہی تھی جو کب
سے خاموش پڑا تھا۔

”نہیں آئے گا اب اس کا فون۔“

ایمی نے مزید خون جلایا۔
”تم چپ رہو منحوس شکل، منحوس باتیں۔“
”منحوس تم خود ہو۔۔۔ اپنی بات تم نے خود بگاڑی
ہے کیا ضرورت تھی مار سے یہ سب کہنے کی۔“
”تمہیں کیا۔ تم جاؤ جا کے ٹھونسو کچھ۔“

زینی اس وقت سب سے بے زار لگ رہی تھی
ایمی سے تو حد سے زیادہ جبکہ ایمی آج اتنا ہی ستانے
کے موڈ میں تھی۔

”تمہیں شکر کرنا چاہیے کہ مار کسی اور کے دھوکے
میں ہی سہی۔۔۔ مگر تم پہ توجہ تو دے رہا ہے اور تم اس پہ
بھی خرے دکھا رہی ہو۔“

زینی بری طرح جوگی۔

”کیا مطلب؟ کسی اور کے دھوکے میں؟ وہ صرف
اور صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔“

”میں سب جانتی ہوں زینی۔“ وہ خباثت سے
مسکرائی۔

کچھ دیر کے لیے تو زینی گنگ سی ہو گئی۔ پھر غرا
اٹھی۔

”منہ بند رکھو اپنا۔۔۔ خبردار جو یہ بات تم نے دوبارہ
کسی سے کہی۔۔۔ اصل میں تم مجھ سے جھپٹ رہی
ہو۔۔۔ مار جیسا کہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں کارا
فیلی کا حصہ بننے جا رہی ہوں میری ساری زندگی
شہزادیوں کی طرح گزرنے والی ہے اور تم۔۔۔ تم ساری

عمر اسی کھنڈر میں گزارنے والی ہو۔۔۔ رومان جیسے پھٹیچر
کے ساتھ۔“

”زینی۔“ ایمی کے دل پہ گھونسا پڑا۔۔۔ رومان کے
ساتھ زندگی اس بوسیدہ مکان میں گزارنے کے خیال
سے نہیں بلکہ اپنی ہی سگی بن کے لہجے، نظروں، الفاظ
غرض ہر ہر انداز سے جھلکتی حقارت اور نفرت دیکھ
کے۔

”یہی سچ ہے ایمی! اور تم ہو بھی اسی قابل۔“
ایمی روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور زینی نے
دوبارہ اپنی منتظر نظریں فون پہ جمادیں۔

☆ ☆ ☆

میٹھا گلڈان میں پھول سجاتے ہوئے ہوئے ہولے ہولے
گنگنا رہی تھی۔

”تم ہر وقت اتنی خوش کیسے رہ لیتی ہو؟“
مار نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں خوشیاں خود ہی مجھے تلاشتی رہتی ہیں اور
پھر آکے میرے گلے لگ جاتی ہیں۔“
مار کو اس پہ رشک سا آگیا۔

”تم بہت تلی ہو۔“
اور پھر پاس سے گزرتے ایک ملازم کو روکا۔

”ایک کافی۔۔۔ تم کافی پیو گی میٹھا؟“
”ہاں مگر کوئلہ کافی۔۔۔ دل چاہ رہا ہے۔“

”اوکے۔۔۔ ایک کوئلہ کافی۔۔۔ ایک بلیک کافی۔“
ملازم کے آگے بڑھ جانے کے بعد اس نے دوبارہ
میٹھا سے سوال کیا۔

”تم نے نام کو انکار کیوں کیا؟ وہ پیار سے تمہیں وہ
ڈریس دے رہی تھیں گفت لینے سے منع نہیں کرتے۔“

”میں گفت بہت شوق سے لیتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے
مجھے تحفے لینا اور دینا بھی۔۔۔ مگر میں وہی تحفے لیتی ہوں
جیسے جواب میں دے بھی سکوں۔ کارا آئی اپنی حیثیت
کے مطابق دے رہی تھیں۔ میں وہ لیتی تو جواب میں
ان کو ویسا ہی تحفہ کیسے دیتی بھلا۔۔۔“

”تم دیکھنے میں بہت معصوم لگتی ہو۔۔۔ مگر باتیں
اپنی عمر سے بڑی کرتی ہو۔“

وہ مسکرا اٹھا تھا اس کا فلسفہ سن کر۔
”کیا سمجھ داری کی باتیں کرنے والے معصوم نہیں
ہوتے۔“
”تمہاری عمر کیا ہے؟“

”ستاسی۔“ میٹھا نے بے حد سنجیدگی سے جواب
دیا۔

”کیا؟ ستاسی۔۔۔؟“
”ہاں انیس میری اور اڑسٹھ گرینی کی۔۔۔ انہوں
نے اپنے اڑسٹھ سالوں کی ساری سمجھ مجھے دے دی
ہے۔“

اس نے سفید جھوٹ بولا۔ ورنہ پر شکوہ خانم بے
چاری کی حسرت ہی رہی ساری عمر۔۔۔ کہ وہ اس کو کچھ
ایسا گھول کے پلا دیں جس سے وہ تھوڑی سی ذمے دار
اور سمجھ دار ہو جائے۔ وہ تو بس رٹے رٹائے جملے بول
رہی تھی۔ رومان کے کہنے کے مطابق۔

”کاش تمہاری گرینی اس میں سے تھوڑی بہت
زینی کو بھی دے دیتیں۔“

مار نے سر دھڑکائی۔ دل پھر سے بو جھل ہو گیا۔
میٹھا نے زینی کے ذکر پہ دانستہ بے نیازی ظاہر کی اور
پھول ترتیب دیتی رہی۔

ملازم نے دونوں کے سامنے کافی پیش کی۔
”تمہاری کوئلہ کافی میٹھا۔“

مار نے اسے ہاتھ جھاڑ کے وہاں سے اٹھتے دیکھا تو
توجہ دلائی۔

”نہیں۔۔۔ مجھے نہیں پنی اب۔“
”مگر تمہارا دل چاہ رہا تھا۔“

”اب نہیں چاہ رہا۔ جس چیز بہت دل آیا ہو
اسے چھوڑ دینا یا اس سے بچ کر نکلنے کا بھی اپنا ہی ایک
مزا ہے۔“

وہ مار کو الجھن میں ڈال کے چلی گئی۔
وہ کھوئے کھوئے انداز میں اپنے سامنے رکھے
دونوں طرح کی کافی کے پیالوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے

کولڈ کافی اٹھالی اور بلیک کافی اسی طرح سامنے پڑی دھواں چھوڑتی رہی۔ وہ بلیک کافی جسے پینے کا مار کا بہت دل چاہ رہا تھا۔

ایمی کے دل پہ رومان کی باتوں سے بہت چوٹ لگی تھی۔

وہ باغیچے میں موتیا کے جھنڈ کے پاس بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ رومان کی نظر پڑی تو اس کے پاس چلا آیا۔

”ایمی... کیا ہوا؟“

پکارنے سے بھی اس نے سر نہ اٹھایا تو پوچھ بیٹھا۔

”بھوک لگی ہے کیا؟“

بس اتنا پوچھنا غضب ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑی۔

”تم بھی دوسروں کی طرح یہ سمجھتے ہو کہ میں اس دنیا میں صرف کھانے کے لیے آئی ہوں۔ بھوک اور پیاس کے علاوہ مجھے کوئی فیلنگز ہو ہی نہیں سکتیں۔“

اس کی لہورنگ آنکھیں۔ ہچکیوں کی زد میں آیا وجود رومان پگھل کے رہ گیا۔ اور قدموں کے بل اس کے پاس زمین پہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں نے ایسا کب کہا ایمی۔“

”مگر زینی نے کہا... اس نے کہا مجھے کوئی پھٹیخہ سا غریب مسکین سا لڑکا ہی سوٹ کرے گا۔ کیونکہ میری یہی اوقات ہے اور مجھے اس سے زیادہ اونچے خواب دیکھنے ہی نہیں چاہئیں۔“

”کوئی کسی کو خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ تم خواب دیکھو ایمی... جو تمہارا دل چاہے تم ویسے خواب دیکھو۔ کسی کو حق نہیں ہے تمہاری آنکھوں سے خواب چھیننے کا۔“

”لیکن صرف خواب دیکھنے سے کیا ہوتا ہے کون سامیرے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں ہو سکتے؟“

”کوئی مجھ سے محبت کیوں کرے گا۔ کیا ہے مجھ میں؟“

”جس کو تم سے محبت ہوگی۔ وہ خود ہی تم میں کچھ نہ کچھ ڈھونڈ لے گا... اور دیکھ لینا ایمی... اس دنیا میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہو گا جو صرف تمہارے لیے ہے اور جس کو صرف تم سے محبت ہوگی اور تمہیں صرف اس کے ہی خواب دیکھنے چاہئیں۔“

نجانے وہ اتنے جگنو کہاں سے لاتا تھا۔ سدا اس کی مٹھی جگنوؤں سے بھری رہتی تھی کسی کو اس کے تھماتا۔ کسی کو امید کے کسی کو خواب کے جو جگنو بیچ جاتے۔ ان کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں سمو کے پھرتا رہتا۔

مار ادا اس سی نظروں سے لان کا جائزہ لے رہا تھا جہاں رات کی تقریب کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اس کا دل نجانے کس دھند میں گمنا ہوا تھا۔ ایک عجیب سا ملال اس پہ طاری تھا۔

کچھ کھودینے کا... یا شاید نہ پانے کا... ”تم ادا اس ہو؟“ میشا اس کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔

”ہاں... کچھ کچھ۔“

”کیونکہ زینی نہیں آرہی اس لیے؟“ میشا کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا رشک اور حسد جھلکنے لگا۔

”نہیں۔“ مار کا جواب خلاف توقع تھا۔

”تو پھر؟“

”پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے جس کی مجھے تلاش ہے وہ میں پا کے پھر سے کھودیتا ہوں۔ بار بار۔“

”ہو سکتا ہے جسے تم پاتے ہو وہ اصل میں وہ ہو ہی نال... جس کی تمہیں تلاش ہے اسے تم نے اصل میں بھی پایا ہی نہ ہو۔“

میشا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو تم... کبھی کبھی میں

بھی اسی الجھن میں پڑ جاتا ہوں۔ مجھے شک سا ہوتا ہے کہ۔“

کہتے کہتے وہ رکاوٹیں بدل دی۔

”تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہو میں؟“

”ٹھیک ہوں میں ایسے ہی۔“

”بہت سے لوگ آرہے ہیں۔“

”مگر وہ سب میرے لیے تھوڑا ہی آرہے ہیں اور کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟“

”نہیں تو... لگ رہی ہو بہت۔“

وہ مبہم سا مسکرایا... مگر وہ اس پہ بھی خوش ہو گئی۔

”کیا لگ رہی ہوں! کیوٹ ناں؟“

مار کھو سا گیا... بے ساختہ ذہن کے پردے پہ جھیل کے پانیوں پہ لرزتا وہ عکس جھلما گیا۔

”میں بہت کیوٹ ہوں ناں؟“

وہ مزید غور سے اسے دیکھنے لگا جو اپنی دھن میں کہتی جا رہی تھی۔

”ویسے بھی اتنا تیار ہونے کا کیا فائدہ... ایک تو یہ پارٹی میرے لیے نہیں ہو رہی اور دوسرا کیا پتا ہوتی بھی ہے یا نہیں؟“

”کیا مطلب؟ کیوں نہیں ہوگی؟“

مار نے چونک کے پوچھا تو وہ سٹ پٹ گئی اس کی کئی ہر بات کا کوئی مطلب بھی ہو... یہ ضروری تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ایسے ہی بے دھیانی میں ہانک لگاتی تھی... سب عادت اور حسب معمول۔

”کیا پتا کسی بھی وجہ سے کینسل ہو جائے۔“

اس نے بات بنا کے ٹالا۔

”اوہ... سوئیڈ۔“

کارا اندر کسی سے فون پہ بات کرتے ہوئے خاصی سوگوار سی لگ رہی تھی۔

مار نے اندر داخل ہوتے ہوئے بغور دیکھا۔

”ہاں۔ یہ تو ہے... ظاہر ہے ایسے میں تقریب کیسے ہو سکتی ہے۔“

اس کے کہنے پہ مار ایک بار پھر سے کھو سا گیا۔

جھیل کے پانیوں پہ سفر کرتی ایک گم گشتہ آواز فاصلے

اس نے فون رکھتے ہوئے مار کو اطلاع دی۔

”تمہارے فادر کے کزن کی وائف کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔“

”اوہ...“

”ہمیں جانا ہو گا مار۔“

”اور وہ پارٹی...؟“

”اوہ ہاں... وہ تو کینسل ہی سمجھو... مگر سب کو انفارم بھی کرنا ہو گا۔ ایسا کرتی ہوں میں تعزیت کے لیے جاتی ہوں۔ تم یہ سب سنبھال لو۔“

مار حیران پریشان سا کھڑا تھا۔ اسے میشا کی بات یاد آ رہی تھی۔

”کیا پتا کسی بھی وجہ سے پارٹی کینسل ہو سکتی ہے۔“

وہ اگلے قدموں باہر پلٹا ایسے ابھی اسی وقت میشا سے ملنا تھا مگر وہ اب وہاں نہیں تھی اور وہ جانتا تھا۔ میشا اسے کہاں ملے گی۔ وہ اسی وقت جھیل کے کنارے جا پہنچا۔ اندازہ درست نکلا وہ چہرے پہ زمانے بھر کی کوفت اور بے زاری سجائے پانی میں پیر ڈالے بیٹھی تھی۔

”تو... کتنی بور بور باتیں کی ہیں میں نے۔ رومان نے بھی کیسی عجیب عجیب فضول باتوں کے رٹے لگوائے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی بوڑھی روح گھس گئی ہو اور فائدہ کیا ہوا وہ وہاں پارٹی انجوائے کریں گے اور میں میں یہاں اکیلی... زینی نہیں تو کوئی اور لڑکی آجائے گی۔ مار کی زندگی میں۔“

اس کی بڑبڑاہٹ اس وقت تھی۔ جب اس نے عقب سے مار کی پکار سنی۔

”میشا...؟ میشا نے پلٹ کر دیکھا۔

”تم کیا ہو میشا! کوئی جادو کرنی؟“

مار کے پوچھنے پہ اس نے ترنت جواب دیا۔

”کوئی نہیں جی... جادو گرنیاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں۔“

اس کے کہنے پہ مار ایک بار پھر سے کھو سا گیا۔

جھیل کے پانیوں پہ سفر کرتی ایک گم گشتہ آواز فاصلے

طے کرتی پھر سے اس کی سماعتوں تک آن پہنچی۔
”جادوگریاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں؟“

وہ ابھی اس پہلی کو سلجھانے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ میثا نے سوال داغ دیا۔
”تم یہاں جھیل پہ کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو اس وقت اپنے گھر پہ ہونا چاہیے تھا۔“

”تمہاری بات سچ ثابت ہوئی۔۔۔ پارٹی واقعی کینسل ہو گئی ہے۔“
میثا کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔
مارنے اپنا ہاتھ آگے کیا۔

”اچھا ہے اس بہانے میں آج یہاں کاچہ چپہ دیکھ لوں گا۔ تم مجھے دکھاؤ گی یہ واوی؟“
میثا نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

رومان اپنے بازو کو تکیے بنائے تنکوں کے بستر پہ لیٹا ایسے مسکرا رہا تھا جیسے ریٹیم پہ محو استراحت ہو۔ یہ مسکان میثا کے تصور کی دین تھی۔ اسے رہ رہ کے وہ گھڑیاں یاد آ رہی تھیں جب اس نے میثا کو دکھانے یا دوسرے لفظوں میں متاثر کرنے کے لیے جگنو پکڑ کے مٹھی میں قید کیے تھے۔
”آنکھیں بند کرو۔“

اس نے کہا تھا اور میثا نے فٹ انکار کر دیا تھا۔
”کوئی نہیں جی۔ گرینی نے مجھے بہت سمجھ داری کی باتیں بتائی ہیں کہ کبھی اکیلے میں کسی جوان لڑکے کے سامنے آنکھیں بند مت کرنا۔ دیکھو ناں۔ رات کا وقت ہے۔ جھل ہے۔ ہم اکیلے ہیں اوپر سے میں کیوٹ اور تم بد تمیز بھی ہو۔ میری آنکھیں بند دیکھ کے تم نے مجھے پیار کر لیا تو؟“
یہ بات یاد آتے ہی رومان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اس نے پیار سے سرگوشی کی۔
”جھل۔“

”تم نے تو بہت سی خوب صورت جگہیں دکھادیں

اب میری باری ہے۔ اتنی حسین جگہ دکھانے والا ہوں تمہیں اور ہاں ابھی مڑ کے مت دیکھنا۔“
مارنے اس کا ہاتھ پکڑ کے گاڑی سے اتارا۔ میثا کا چہرہ تھمرا رہا تھا۔

”جی؟ کون سی جگہ ہے؟“
”نہلے اپنی آنکھیں بند کرو۔“
”آنکھیں بند کروں۔“ میثا مار کی فرمائش پہ کچھ کم صدم ہو گئی۔

”مگر گرینی کہتی ہیں کہ۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔
”کیا کہتی ہیں گرینی؟ آنکھیں بند کرنے سے منع کرتی ہیں وہ کیوں؟“
مار اس منطق پہ حیران تھا۔
”وہ کہتی ہیں اگر میں نے آنکھیں بند کیں تو تم کہتے کہتے رک کر اس نے شرما کے نگاہ نیچی کر لی۔“

”لولو ناں۔ کیا میں؟“
”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

میثا نے یہ کہہ کر ہولے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے سے ہیجان ظاہر ہو رہا تھا۔ پلکیں کپکپانے لگیں۔ لبوں کی پنکھڑیاں لرزنے لگیں۔ پھر مار کے ہاتھ اس کے شانوں پہ ٹھہرے۔ میثا نے آنکھیں کچھ اور زور سے میچ لیں۔ دل جیسے پسلیوں پہ دستک دینے لگا۔

دھڑ۔۔۔ دھڑ۔۔۔ دھڑ۔
شانوں پہ ٹھہرے مار کے ہاتھوں نے اسے اسے بڑی نرمی اور آہستگی سے موڑا۔
”اب آنکھیں کھولو۔“ مار کے مدھر نرم لہجے پہ میثا کا دھڑ دھڑا تال کپکپا تا وجود ساکت سا ہو گیا۔
”کھولو میثا۔۔۔“

”بس؟ کھول دوں آنکھیں؟“
اس کے لہجے میں مایوسی سی آ گئی۔
”ہاں۔۔۔“ مار کے جواب پہ اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے اس کے چہرے پہ نظر جمادی۔
”اول ہوں۔ مجھے نہیں وہاں سامنے دیکھو لٹا حسین منظر ہے۔“

مار نے اس کا چہرہ انگلی کی پور سے چھو کر سامنے آہٹار کی جانب کیا۔
”ہوں۔۔۔ میثا کے انداز سے بے دلی ظاہر تھی۔“
”کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگا؟“
”اچھا ہے۔“

”اوہ۔۔۔ تمہارے لیے تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔۔۔ پتا نہیں کتنی بار دیکھ چکی ہوگی۔۔۔ یہی سوچ رہی ہوں ناں۔“
”نہیں۔۔۔ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔“
”کیا؟“
”یہی۔۔۔ یہی کہ۔۔۔ کہ گرینی نے کتنا جھوٹ بولا مجھ سے۔“
اس نے ہونٹ لٹکا لیے۔

زینی کو جیسے ہی تقریب کے ملتوی ہونے کی خبر ملی اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور فوراً ”کارا“ مینشن چلی آئی۔
”فنکشن میں تو میں کبھی بھی کارا آنٹی کو سوری نہ کہتی۔۔۔ مگر یہ موقع اچھا ہے وہ تو ہیں نہیں۔۔۔ میں مار سے یہی کہوں گی کہ میں اس کی بات مان کے یہاں آئی ہوں۔ صاف مگر جاؤں گی کہ مجھے کیا پتا فنکشن نہیں ہو رہا۔“

دل ہی دل میں اپنی تدبیروں پہ شاد ہوتی زینی نے ایک ملازمہ کو روک کر پوچھا۔
”مار کہاں ہے؟“
”وہ تو بہت دیر سے گھر پہ نہیں ہیں۔“
”کارا آنٹی کے ساتھ گیا ہے؟“ اسے فکر لاحق ہوئی۔

”نہیں! میڈم کے جانے سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔ زینی نے شک بھرے انداز میں پھر سے پوچھا۔
”کس کے ساتھ؟“
”پتا نہیں۔“
مگر ملازمہ کے جواب سے بھی اسے تسلی نہیں

ہوئی۔ وہ وہیں بے چینی سے چکر کاٹنے لگی۔

مار میثا کی کسی بات پہ کھل کے ہنس رہا تھا اور وہ ایسے نہ چاہتے ہوئے بھی مسحور سی ہو کے تنک رہی تھی۔
”میں کبھی اتنا نہیں ہنسا میثا تم بہت مزے کی باتیں کرتی ہو۔“

”میں جو کرتی ہوں۔ دل سے کرتی ہوں۔“
”عرصے بعد مجھے تمہارے جیسی دوست ملی ہے۔“
اب کافی دیر کے بعد میثا کو رومان کی ہدایتوں پہ عمل کرنا یاد آیا۔

”مگر دوستی کبھی بھی ایک طرفہ نہیں ہوتی۔ ہاں محبت ضرور یک طرفہ ہو سکتی ہے جیسے تمہیں زینی سے ہے۔“

اس نے سرسری سا کہتے ہوئے آگے قدم بڑھائے اور مار کے ذہن میں اس کی بات کا بس پہلا حصہ اٹک گیا۔

”دوستی ایک طرفہ کیسے ہے؟“
”وہ ایسے کہ تم مجھے اپنی دوست کہہ رہے ہو۔۔۔ میں نہیں۔ جب تک میں تمہیں اپنا دوست نہ کہہ دوں دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔“

”میثا۔۔۔ حیران پریشان مار نے اسے روکنا چاہا۔
”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اجنبی بنی چلتی جا رہی تھی۔

”ہاں تو میں چھوڑ آتا ہوں ناں۔“
وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بازو سے تھام کر اسے گاڑی کی جانب لے گیا جیسے اس کے انکار کا ڈر ہو۔

پھر راستے میں دوبارہ گفتگو کا سلسلہ وہاں سے جوڑا۔
”کیا تم واقعی اس دوستی کو یک طرفہ سمجھتی ہو؟“
”ہاں۔ ابھی تک تو۔۔۔“

”اور تم نے یہ بھی کہا کہ زینی سے میری محبت بھی یک طرفہ ہے؟“

”ہاں۔۔۔ وہ تو خیر ہے ہی۔“
اس کی حالت دیکھ کے میثا کو اتنا مزا آ رہا تھا کہ اپنی مسکراہٹ اس سے چھپانے کے لیے منہ ہی پھیر لیا۔
”کیا تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے؟“ وہ پریشان ہوا تھا۔
”ہاں۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کیا؟“
اب میثا نے اس کے چہرے کے تاثرات جانچنا چاہے۔

وہاں ہنوز الجھن سی تھی۔
”پتا نہیں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید نہیں۔“
پھر اس کے لہجے میں ایک اعتماد سا جھلکا۔
”مگر مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ میری تم سے دوستی یک طرفہ نہیں ہے یا نہیں ہوئی چاہیے۔ تم کیا کہتی ہو؟“
”ہوں۔۔۔ سوچوں گی۔“ کتنی دقت ہو رہی تھی اسے اپنے اندر کی خوشی چھپانے میں۔
”ابھی بھی سوچنے کی ضرورت ہے؟“
”ہاں۔۔۔ کم از کم ایک رات۔“

میثا نہ خود کو زیادہ امتحان میں ڈالنا چاہتی تھی نہ اسے اس لیے بس ایک رات کی مہلت یہ اکتفا کیا۔
”ٹھیک ہے۔ پھر صبح میں تمہارا انتظار کروں گا۔“
اس نے سیف کا بیچ کے بالکل سامنے گاڑی روکی۔
میثا بیٹھیوں پہ قدم جما جما کے اوپر جانے لگی۔ مگر جیسے ہی مائری گاڑی گلی کا موڑ مڑی۔۔۔ وہ انیکسی کی جانب بھاگ گئی۔
”پہلے رومان کو تو بتا کے آؤں۔“

مائری کے ہونٹوں سے سارے راستے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی۔۔۔ میثا کی سنگت میں گزارے لمحات اسے تنہا کے پروں جیسا ہلکا پھلکا کر رہے تھے۔ مگر گھر کے اندر قدم دھرتے ہی وہ حیران رہ گیا۔
زینی اس کی منتظر تھی۔
”زینی۔۔۔ تم۔“
”مجھ سے رہا نہیں گیا مائری! میں نے سوچا بلا وجہ کی ضد میں تمہیں کھونہ دوں میں۔۔۔ اس لیے تمہاری

بات مانتے ہوئے کارا آئی سے سوری کہنے آئی تھی۔ مگر پتا چلا وہ تو ہیں ہی نہیں ورنہ میں تو صرف تمہارے لیے آئی تھی۔ تمہارا کہنا کیسے ٹال سکتی تھی میں۔“
”کیوں نہیں ٹال سکتی تھیں۔“
”کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے مائری۔“
مائری ہلکا سا مسکرایا۔

”یعنی وہ غلط کہتی تھی کہ میری تم سے محبت یک طرفہ ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکی۔
”کچھ نہیں۔ چلو میں تمہیں واپس گھر چھوڑ آؤں۔“

اور راستے میں زینی نے کچھ اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کے دل سے باقی کے سارے گلے بھی دھو ڈالے۔

☆ ☆ ☆
”میں اتنی خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں۔۔۔ اتنی خوش کہ مجھ سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔“
وہ دونوں بازو کھولے گول گول گھومتے ہوئے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھتی جا رہی تھی۔
اور رومان اس کی آنکھوں میں جگمگ کرتے تاروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔
”تو اس نے کہہ دیا کہ وہ تم سے شادی کرے گا؟“ وہ رومان کے سوال پہ گھومتے گھومتے رک گئی۔
”نہیں! یہ تو نہیں کہا۔“
”تم سے محبت کرتا ہے۔ یہ تو کہا ہی ہو گا۔“
”نہیں۔۔۔ یہ بھی نہیں۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔
”تو؟“

”اس نے پورے چار گھنٹے میرے ساتھ گزارے۔ رومان۔۔۔ پورے چار گھنٹے۔۔۔ اور ابھی وہ اور بھی کچھ وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔۔۔ مجھ سے دوستی کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا۔“
”اور تم اس پہ خوش ہو گئیں؟“

”ہاں! مگر اس خوشی میں بھی میں آئے سے باہر نہیں ہوئی۔ مجھے تمہاری ساری باتیں یاد تھیں۔ میں نے اس پر بالکل بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے اس کا ساتھ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ وہ مجھ سے کل پھر ملنا چاہتا ہے۔“

”تم نے تو فوراً ہاں کر دی ہو گی۔“ رومان کے لہجے سے نادانستہ جھلک بڑا۔

”نہیں! قسم سے۔۔۔ مگر منع بھی نہیں کیا یہ کہا کہ میں صبح فون کر کے بتاؤں گی۔“

”اور تم اسے صبح بالکل فون نہیں کرو گی۔“ رومان نے تنبیہ کی۔

”مگر وہ میرے فون کا۔۔۔ میرے جواب کا انتظار کر رہا ہو گا۔“

”کرنے دو۔۔۔ لینے دو اسے انتظار اور بے چینی کا مزا۔“
ایسے کہتا ہوا وہ میثا کو حد سے زیادہ کھور لگا۔
”کوئی نہیں جی۔ وہ مزا نہیں۔ تکلیف ہوتی ہے۔“

”محبت میں تکلیف ہی تو مزادیتی ہے۔“
”اوہو ووو۔۔۔ آئے بڑے۔“ میثا نے اسے منہ پڑایا۔

”تمہیں کیسے پتا تم نے کی ہے محبت۔ تم نے کیا ہے کبھی انتظار؟ تمہیں ملا ہے تکلیف میں مزا؟“

میثا کے سوال کے جواب میں رومان کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا درد اور ہونٹوں پہ ایک بھیگی بھیگی سی مسکان تھی۔

”میں تو کروں گی اسے فون۔“ وہ اپنی ضد پہ اڑی تھی۔

”یہ مناسب وقت نہیں ہے میثا۔“ رومان نے اسے سمجھانا چاہا۔

مگر اس پہ اثر ہو تب ناں۔

”جی نہیں۔۔۔ یہی ہے مناسب وقت۔ کیا تب کہوں اسے جب وہ مجھ سے مایوس ہو کر کسی اور کی طرف۔۔۔“

”تو بے انسان ہے یا تھالی کا بیٹنگن۔“
رومان نے اس کی بات کاٹ کر اکتاہٹ سے کہا۔

میثا کو غصہ آ گیا۔

”کیا بولا تم نے؟“

”ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ ایک لڑکی کے ذرا ادھر ادھر ہونے سے فوراً دوسری جانب لڑھک جاتا ہے۔“

”خبردار۔۔۔ مائری کو کچھ نہ کہنا۔“

”کہوں گا۔ سوچو زینی اس سے ناراض ہے۔ وہ بجائے اسے منانے کے اس سے اپنی غلط فہمی کو دور کرنے کے۔ تمہارے ساتھ چار گھنٹے گھومتا پھرتا رہا۔“

”ہاں تو کیا اس فضول لڑکی کے لیے جوگ لے لیتا؟ اور بات سنو میں تو اب صبح تک کا انتظار بھی نہیں کرنے والی۔ ابھی اسے فون کر کے بتانے والی ہوں کہ میرے دل میں بھی اس کے لیے وہی فیملنگز ہیں جو اس کے دل میں میرے لیے ہیں۔“

”یعنی تم یہ بتانا چاہتی ہو اسے کہ۔۔۔“

گاڑی کے ہارن پہ دونوں بات کرتے کرتے رک گئے۔

گیٹ کے نزدیک مائری زینی کو اپنی گاڑی سے اتار رہا تھا۔ دونوں کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



قیمت --- 550/- روپے

منگوانے کا پتہ

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔



سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور ریحیل۔ ریحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داوڑ کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے وہاں میجر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داوڑ کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولید والے دن حیا سے یہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنکی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکا لرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبد اللہ حیا اور ڈی جے کی دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق بتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے تاہم سین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ

منکرہ احمد



اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست مقتسم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو پیش پہنچاتا ہے تو وہاں ”اے آر پی“ لکھا ہوتا ہے۔ حیا، جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے پر اے آر پی لکھا ہوتا ہے۔ ایک بچہ حیا کا پرس چھین کر اسی بنگلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حیا اس کے پیچھے پیچھے اس بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک جبری شادی پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا کچھ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت چھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آ جاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مری سے ملتے ہیں، تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مہوش کی شادی والے دن پٹکی حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبہ دیتا ہے، جو ایک پہلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی، ڈولی اس دنیا میں نہیں ہو گا۔ وہ چھ حرنی کوڈ کھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے، جہان سے بھی کہتی ہے، پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبہ کھلوانے کے لیے حیا، مقتسم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہراقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر who لکھ دیتا ہے۔ حیا، عثمان شبیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشہ اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پہیلیوں پر رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشہ اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے میجر احمد کے۔ میجر احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پٹکی ہے اور ڈبے پر پہیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور رو حیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ رو حیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی تمکنی ہو جاتی ہے۔ عائشہ اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا، پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

قسط 8

پاشا کے لیے یہ حملہ قطعاً ”غیر متوقع تھا۔ گو کہ رد عمل کے طور پر اس نے چہرہ فوراً پیچھے کیا تھا“ اس کے باوجود کافی اس کے رخسار کو جھلسا گئی تھی۔

”چھبک، چھبک“ (جلدی، جلدی) ہالے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں باہر بھاگی تھیں۔

کافی گرم تھی اور اس نے پاشا کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

وہ بلبلا کر چہرہ ہاتھوں سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے گاہک اور ویٹرز اس کی جانب لپکے تھے۔ یہ وہ آخری منظر تھا جو حیا نے باہر نکلنے سے پہلے دیکھا تھا۔

”وہ نہیں آ رہا، جلدی چلو!“ گلی میں لوگوں کے رش میں سے رستہ بناتے ہوئے تیز قدموں سے دوڑتے ہالے بار بار گردن موڑ کر دیکھتی تھی۔

”برگر کنگ سامنے ہی ہے، جلدی سے اس میں چلے جاتے ہیں اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلے۔“

”مگر تمہیں اس پہ کافی لٹنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ہالے جھنجھلائی۔

(کچھ پرانے حساب اتارنے تھے۔)

”تم خود ہی تو میرے کپ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔“

”میرا مطلب تھا کہ کپ چھوڑو اور باہر نکلو۔“

وہ مزید بحث کیے بنا ہاتھ سے ہالے کو ساتھ کھینچتی برگر کنگ کا گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں ایسے اندھا دھند طریقے سے دوڑتی آئیں اور استقبال کاؤنٹر پہ آکر دم لیا کہ وہاں موجود لڑکا قدرے بوکھلا گیا۔

”کیا ہوا؟ جہان نہیں ہے ادھر۔“ وہ سمجھا وہ دوبارہ جہان کے لیے آئی ہیں۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!“ حیا نے پھولے تنفس کے درمیان ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تمہارے بچن میں کوئی دروازہ ہے جو پچھلی گلی میں کھلتا ہو؟“

”بچن میں نہیں، مگر پینٹری میں بیک ڈور ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔“ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ

دونوں کسی سے بچنا چاہ رہی ہیں، سو بنا کوئی مزید سوال کیے وہ انہیں اپنی رہنمائی میں پینٹری میں لے آیا۔

پینٹری مستطیل سی تھی اور اس میں اسٹورج شلف اور بڑے بڑے فریزر رکھے تھے۔ کچھ دوسرا کاتھ کباڑ بھی تھا۔

”وہ رہا دروازہ۔“ اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا اور ایک مشکوک نظر ان پہ ڈالتا واپس پلٹ گیا۔

ہالے نے پینٹری سے بچن میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور پھر قدرے تذبذب سے پچھلی گلی کے دروازے کو دیکھا۔

”ابھی باہر نکلنے کا فائدہ؟ گور سل تو ڈرہ بجے آئے گی، تب تک یہیں بیٹھتے ہیں۔“ وہ ایک کونے سے دو

پلاسٹک کی کرسیاں اٹھا لائی اور کمرے کے وسط میں فرش پہ آنے سامنے رکھیں۔

”ویسے اب میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ٹھیک ہی کیا، استقلال جلدی میں اکثر ایسے ڈرنک لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے جو عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔“

”تب ہی میں نے کافی الٹی، تاکہ وہ فوراً ہمارے پیچھے نہ آ سکے۔“

وہ کرسی پہ نہیں بیٹھی بلکہ دروازے کے قریب چلی آئی تھی۔ دروازے کے ساتھ ایک چوکور کھڑکی نما روشن دان تھا۔ وہ بہت اونچا نہیں تھا، بلکہ حیا کے چہرے کے بالکل برابر آتا تھا۔ اس نے روشن دان کی شیشے کی سلائیڈ ایک طرف کی تو ٹھنڈی ہوا اور پچھلی گلی کی آوازیں اندر آنے لگیں۔

وہ استقلال اسٹریٹ کی بغلی گلی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کی دونوں جانب ایسی ہی گلیاں تھیں جو ذرا تنگ اور چھوٹی مگر دونوں اطراف سے عمارتوں سے گھری تھیں۔

”اب تم مجھے بتاؤ، یہ منگنی کا کیا قصہ ہے؟“ ذرا سکون کا سانس ملا تو ہالے کو ادھوری بات یاد آگئی۔ وہ پر جوش سی کرسی پہ آگے ہو کر بیٹھی۔

حیا نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ جو بتاؤ اور پریشانی وہ تھوڑی دیر قبل محسوس کر رہی تھیں، وہ پینٹری کی فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

”بتاتی ہوں۔“ وہ کرسی پہ آ بیٹھی اور گور سل مشعل آنے تک وہ سارا قصہ سنا چکی تھی۔ بس میں بھی سارا راستہ وہ دونوں یہی باتیں کرتی رہیں۔

”اگر وہ جانتا تھا تو اس نے پہلے اظہار کیوں نہیں کیا؟“

”اب کر دیا، یہی بہت ہے۔ وہ بہت پریکٹیکل اور کم گوسا آدمی ہے۔ اس سے وابستہ توقعات میں نے اب کم کر دی ہیں۔“ اس نے شانے اچکا کر کہا تھا۔

کمرے میں آکر ہالے تو سونے چلی گئی۔ ٹالی اور چیری بھی تب تک سو چکی تھیں۔ جبکہ اس نے پہلے تو

اپنی میز کی دراز میں اس ڈبیا کی تصدیق کی جس میں موبائل شاپ کے لڑکے نے جی پی ایس ٹریسر ڈال کر دیا تھا۔ وہ دراز میں ہی رکھی تھی جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی پھر پاشا کو کیسے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے اس کی کسی اور شے میں بھی ٹریسر ہو یا پھر وہ محض اتفاق ہو لیکن اس کے اتفاقات تو کم ہی ہوتے تھے اتنا تو اسے یقین تھا۔

جو بھی ہے وہ ہر شے کو ذہن سے جھٹک کر اپنا پزل باکس نکال کر دے قدموں باہر آگئی۔ بالکونی کی بتی اسے دیکھتے ہی جل اٹھی۔ وہ وہیں پہلے زینے پہ بیٹھ گئی اور پزل باکس چہرے کے سامنے کیا۔

چاروں پسلیاں ایک چوکور کی صورت میں باکس کی چاروں اطراف پہ لکھی تھیں۔ چوکور اسکوائر، تا قسم اسکوائر۔

دھڑکتے دل اور غم ہتھیلیوں کے ساتھ وہ سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ Taksim کا آخری حرف ایم جیسے ہی جگہ پہ آیا۔ کلک کی آواز کے ساتھ باکس کی دراز اسپرنگ کی طرح جاہر نکلی۔

وہ بنا پلک جھپکے بے یقینی سے باکس کے اندر دیکھ رہی تھی۔ اس نے میجر احمد کا پزل حل کر لیا تھا۔ وہ باکس کھول چکی تھی۔

دراز میں ایک سفید مستطیل کاغذ رکھا تھا۔ وہ کاغذ

پوری دراز پہ فٹ آ رہا تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے پکڑ کر کاغذ باہر نکالا۔ بالکونی کی مدھم روشنی میں وہ کاغذ پہ لکھی تحریر بنا کسی وقت کے پڑھ سکتی تھی۔

Two full stops under the key
(چابی کے نیچے دو فل اسٹاپس)

اس نے بے یقینی سے وہ سطر پڑھی جو کاغذ کے اوپری حصے پہ لکھی تھی۔ کیا یہ کوئی مذاق تھا؟ اپریل فول؟ اس کاغذ کے ٹکڑے کے لیے اس نے اتنی محنت کی؟

کاغذ کے چاروں کونوں میں چھوٹا چھوٹا سا چھ (6) کا ہندسہ بھی لکھا تھا۔ اس نے کاغذ پلٹا۔ اس کی

پشت پہ بالکل وسط میں ایک بار کوڈ چھپا تھا۔ موٹی پتلی ایک اچھ کی لکیریں اور ان کے نیچے ایک سیریل نمبر، ٹیمپوز، لوشن اور ان گنت دوسری اسیا کے لفافوں اور ڈبوں کے کونوں میں اکثر ایسے ہی بار کوڈ چھپے ہوتے تھے۔ اس بار کوڈ کا وہ کیا کرے گی؟

مگر نہیں باکس میں کچھ اور بھی تھا۔ دراز کی زمین سے ایک لوہے کی لمبی اور عجیب وضع کی چابی چکی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے چابی کو کھینچا تو وہ جو گوند کے محض ایک قطرے سے چپکائی گئی تھی اکھڑ کر حیا کے ہاتھ میں آگئی۔ حیا نے دیکھا چابی کے نیچے موجود لکڑی پہ دو موٹے موٹے نقطے لگے تھے اور ان کے درمیان لکھا تھا۔ Emanet

پھر کوئی پزل؟ پھر پسلیاں؟ چابی تلے دو فل اسٹاپ؟ وہ دونوں نقطے اسے مل گئے مگر اب وہ ان کا کیا کرے؟ کاش! وہ یہ سب اٹھا کر میجر احمد کے منہ پہ دے مار سکتی۔

یہ چابی کس شے کی تھی؟ کسی کمرے، کسی گاڑی، کسی گھر کی؟ اگر پہاڑ کھودنے پہ یہ مرا ہوا چوہا ہی نکلتا تھا تو بہتر تھا وہ اسے توڑ کر ہی نکال لیتی اچھا مذاق تھا۔

اس نے خفگی سے دراز بند کی تو وہ پھر باہر نکل آئی۔ اس نے دوبارہ دراز کو اندر دھکیلا اور اسے پکڑے پکڑے سلائیڈز اوپر نیچے کیں۔ کوڈ بار کا سہ حرفی لفظ بگڑ گیا۔ باکس پھر سے لاک ہو گیا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو دراز باہر نہیں آئی۔

واپس بستر پہ لیٹتے ہوئے وہ بے حد کڑھ رہی تھی۔ ایک چابی سے کوئی اور پزل باکس کھلے گا اس سے کوئی اور اس سے کوئی اور.... کیا وہ ساری زندگی مقفل تالے ہی کھولتی رہے گی؟ اچھا مذاق تھا۔

پھر وہ ذہن سے یہ سوچیں جھٹک کر پاشا کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک مطمئن مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

بہت اچھا کیا اس نے کافی الٹ کر۔ وہ اسی قابل تھا۔

حقیقت میں اپنے روبرو پاشا کو دیکھتے ہوئے اسے تصاویر سے بہتر لگا تھا۔ اس کا قد کافی اونچا تھا۔ چھ فٹ سے بھی اوپر اور لباس بھی مناسب تھا۔ آنکھوں پہ بغیر فریم کی گلاسز لگائے اور ذرا ذرا سی بڑھی شیو۔

وہ روبرو دیکھنے میں بس ایسا تھا کہ مقابل اس کی عزت کرے۔ مگر اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہینڈ سم تو وہ اسے کبھی نہیں لگا تھا نہ ہی اس کی شخصیت میں کوئی سحر تھا۔ (جس کی باتیں ہمارے کرتی تھی) وہ دیکھنے میں بس ایک درمیانے درجے کا آدمی لگتا تھا یا شاید استقلال اسٹریٹ میں چل قدمی کرنے کے لیے اس نے خود کو ایک عام آدمی کی طرح ڈریس اپ کر کے کیمو فلاں کر رکھا تھا۔ شاید یہی بات ہو۔

وہ ان ہی سوچوں میں گھری کب نیند کے سمندر میں ڈوب گئی اسے علم ہی نہ ہوسکا۔

اس نے چابی کی ہول میں گھمائی اور پھر الماری کا پٹ کھولا۔ سامنے والے خانے میں جہاں چند کاغذات کے اوپر اس نے جلی ہوئی اطراف والا پزل باکس رکھا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کے ذہن نے محسوس میں کڑیوں سے کڑیاں ملائیں اگلے ہی پل وہ پٹ بند کر کے باہر آیا تھا۔

”ہمارے گل!“ سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔

ہمارے کافی دنوں سے اس آواز کی منتظر تھی مگر عبدالرحمن کو اپنی مصروفیت میں الماری کھولنے کا موقع شاید آج ملا تھا۔ اس لیے اب آواز سن کر وہ جوتی وی کے سامنے بیٹھی تھی، تابعداری سے اٹھی اور سر جھٹکے مودب انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

تیسری منزل کے دہانے پہ پہنچ کر اس نے جھکا سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی ہوٹل

سے آیا تھا، سوٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، کوٹ کے بغیر تھا۔ اسے متوجہ پا کر عبدالرحمن نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ ”کیا ہمارے گل مجھے بتانا پسند کریں گی کہ وہ پزل باکس کہاں ہے؟“

”میں پسند کروں گی۔“ ہمارے نے سادگی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں نے وہ حیا کو واپس کر دیا۔“

وہ چند لمحے کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مگر ہمارے جانتی تھی کہ اسے دھچکا لگا ہے۔ ”کس کی اجازت سے؟“

”وہ تمہاری چیز نہیں تھی عبدالرحمن! جس کی تھی میں نے اسے دے دی۔“

وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے سامنے ایک بچے کے بل فرس پہ بیٹھا اور سیدھا ہمارے کی آنکھوں میں دیکھا۔

”کیا تم نے مجھ سے رازداری کا وعدہ نہیں کیا تھا؟“ ”میں رحمن کے بندے کو خوش کرنے کے لیے رحمن کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”جو جتنا اچھا جھوٹ بولتا ہے ہمارے! یہ دنیا اسی کی ہوتی ہے۔“

”لیکن پھر اس کی آخرت نہیں ہوتی یہ عائشے گل کہتی ہے۔“

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

”پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

”نہیں! ہم واقعی جزیرے پہ کسی سے تمہارے بارے میں بات نہیں کرتے۔“

”وہ نہیں، ایک اور وعدہ بھی تھا ہمارے درمیان ہمارا لٹل سیکرٹ۔“

ہمارے کے کندھوں پہ ایک دم بہت بھاری بوجھ سا آگرا۔ اس نے اواسی سے عبدالرحمن کو دیکھا جو

منتظر سا سے ہی دیکھ رہا تھا۔ بہت پہلے عبدالرحمن نے اس سے عہد لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو وہ اسے جنازہ بھی دے گی اور اس کی میت کو اون بھی کرے گی۔

”تم سچ بولنے والی بہارے گل پہ اعتبار کر سکتے ہو۔ پورا اولاد لارہ بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے مگر ہمارے گل تمہیں بھی نہیں چھوڑے گی۔“

”اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کرو۔ تم کہو کون عبدالرحمن کہاں کا عبدالرحمن؟“

”تم ایسی باتیں مت کیا کرو مجھے دکھ ہوتا ہے۔“

”اور اس بارے میں بھی عائشہ گل کی کوئی کماوت ضرور ہوگی۔ وہ ذرا سا مسکرایا۔“

”اس کو چھوڑو وہ تو بہت کچھ کہتی رہتی ہے۔ میں دوسرے کان سے نکال دیتی ہوں۔“ اس نے ناک پہ سے مکھی اڑا کر گویا عبدالرحمن کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ ”وہ تو مجھ سے اتنی خفا ہوئی تھی کہ میں نے تم سے شادی کی بات کیوں کی۔“ لحظے بھر کو رک کر ہمارے ذرا تشویش سے بولی۔ ”تم مجھ سے شادی کرو گے نا عبدالرحمن؟“ ساتھ ہی اس نے گردن موڑ کر ارد گرد دیکھ بھی لیا۔ عائشہ قریب میں کہیں نہیں تھی۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”مگر میں تمہاری نئی دوست میں دلچسپی رکھتا ہوں۔“

”وہ تم سے شادی کیوں کرے گی؟ وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہینڈ سم ہے۔“

ہمارے کوچے بہت غصہ آیا تھا۔

”اور تمہاری دوست کو عبدالرحمن جیسا کوئی بد صورت نہیں لگتا ہوگا؟“

”یہ سچ ہے۔ اسے تم بالکل پسند نہیں ہو مگر مجھے تم سے زیادہ کوئی ہینڈ سم نہیں لگتا۔“

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”سنو! وہ حیا کے پزل باکس پہ جو پہلی کھدی تھی وہ کس نے لکھی تھی؟“ وہ جانے جاتے ذرا چونک کر واپس پلٹا۔

”مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ میں نے تو ابھی تک اس باکس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔“

”نہیں! دراصل میرے باکس کی پہلی اور حیا کی پہلی بالکل ایک سی لکھی تھیں تب ہی حیا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میری پہلی کس نے لکھی ہے؟“

وہ واقعتاً چونکا تھا۔ اس نے یہ محسوس کیوں نہیں کیا؟ وہ یہ بات نظر انداز کیوں کر گیا؟

”پھر تم نے کیا کہا؟ بلکہ ٹھہرو! تم نے کہا ہو گا کہ عبدالرحمن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔“

ہمارے کامنہ کھل گیا۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“

”ہمارے گل! میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے تمہیں جانتا ہوں۔“ وہ کہہ کر رک کا نہیں۔ ہمارے نے آزردگی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اس سے خفا تھا وہ جانتی تھی مگر عائشہ کہتی تھی بندہ خفا ہو جائے خیر ہے بس رحمن خفا نہ ہو۔

”ف!“ اس نے سر جھٹکا۔ ”عائشہ گل کی کماوتیں!!“

آڈیٹوریم اسٹوڈنٹس سے کچا کچھ بھرا تھا۔ باسکٹ بال کا میچ جاری تھا۔ کورٹ میں لڑکے نارنجی گیند اچھالتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ تماشاویوں کی نگاہیں بھی گیند پہ لگی تھیں۔ مخصوص شور ہنگامہ اور رش۔

حیا ان سب سے بے نیاز اپنا بیگ تھامے کرسیوں کی قطاروں کے درمیان رستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ امتحان قریب تھے اور ان دنوں وہ اتنی مصروف رہی تھی کہ معصوم سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ابھی لطیف نے بتایا کہ وہ آڈیٹوریم میں ہے تو وہ یہاں

رہی تھی۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو لگتا ہے مجھے آپ کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے؟“

”مجھے لگتا تو خیر یہی ہے کہ آپ کو اور پاشا کو میرے

آئی۔ ویسے بھی اب وہ فلسطینی لڑکوں سے بات چیت میں ذرا احتیاط کرتی تھی۔

نہیں وہ تو ویسے ہی ڈینٹ اور بھائیوں جیسے تھے مگر وہ وہی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اسکارف لیتی ہے سو اس کے نام کے ساتھ کوئی غلط بات جڑی تو بدنام اس کا اسکارف ہو گا۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ وہ معصوم یا حسین وغیرہ سے تنہائی میں نہ ملے بلکہ کسی ایسی جگہ پہ ملے جہاں سب سامنے ہی ہوں۔

وہ تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ نگاہیں کھیل پہ مرکوز کیے کرسی پر آگے ہو کر بیٹھا وہ میچ کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے بائیں طرف دو کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی اپنے اور اس کے درمیان چھوڑ کر بیٹھ گئی اور بیگ سے پزل باکس نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ چونکا۔

”میں نے اسے کھول لیا۔ اس کا کوڈ“ قائم تھا۔ کیا تم آگے میری مدد کر سکتے ہو؟“

”اوہ سلام! تھہرو میں دیکھتا ہوں۔“ معصوم نے دراز کھولی اور کانڈیہ لکھی تحریر پڑھی پھر اسے پلٹا۔

”بار کوڈ؟ بار کوڈ تو اشیاء کے پیکٹس پہ لگا ہوتا ہے اسے کوئی مشین ہی ڈی ٹیکٹ کرتی ہے۔ یہ بار کوڈ بھی کسی مشین کے لیے ہے تاکہ وہ اسے پہچانے مگر کدھر؟ ہوں۔ شاید اس سطر سے کوئی مدد ملے۔“ وہ پھر سے کانڈیٹ کر سطر پڑھنے لگا پھر نفی میں سر ہلا کر دراز سے چالی اٹھالی۔

”بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ سطر اس چالی تلے لکھے دو نقطوں اور اس لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔“

”اور یہ لفظ کسی تالے کی طرف اشارہ کر رہا ہے“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”یہ امانت ہے نا ہمارا والا امانت ترک میں بھی اس کو یہی کہتے ہیں۔ اس نے بے اختیار گہری سانس اندر کھینچی۔

ایک تو ترک اور اردو کی مماثلت!

”مجھے یہ لگتا ہے حیا! کہ اس نے تمہاری کوئی امانت کہیں لاک لگا کر رکھی ہے اور اس کی چابی تمہیں دی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی عظیم الشان سا محل ہو یا کوئی برانڈ نیو گاڑی۔“ وہ اپنی بات پہ خود ہی دھیرے سے ہنسا۔

”مجھے ایسا کچھ بھی نہیں لگتا۔“

”ہو سکتا ہے اس باکس میں کوئی نا دیدہ لکھائی ہو اور آج دکھانے سے۔“

”میں کوشش کر چکی ہوں۔ اس ایک لفظ امانت کے سوا اس میں کچھ نہیں لکھا ہے۔“ اس نے باکس میں ساری چیزیں واپس ڈالیں اور اسے بند کر کے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ معصوم مزید اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا اب جو بھی کرنا تھا اسے خود کرنا تھا۔

”امتحانوں کے بعد کچھ سوچوں گی۔ ابھی تو اس قصے کو بند ہی کر دیتے ہیں۔“ جواباً معصوم نے مسکرا کر شانے اچکا دیے۔

وہ آڈیٹوریم سے نکل رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ اماں اس وقت تو فون نہیں کرتی تھیں پھر؟ اس نے بیگ سے موبائل نکال کر دیکھا۔ یہ وہی پاکستان کا نمبر تھا جس سے پہلے بھی میجر احمد نے فون کیا تھا۔

”ہیلو!“ کرسیوں کی قطار سے راستہ بناتے وہ ذرا اونچا بولی تھی۔ ارد گرد کے شور میں میجر احمد کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ حیا؟“ وہی نرم خوبصورت ٹھہرا ہوا انداز۔ اب وہ اس سے چڑنی نہیں تھی بلکہ ذرا احتیاط سے بات کر رہی لیتی تھی۔

”وعلیکم السلام! میری خیریت تو آپ کو بتا لگتی ہی رہتی ہوگی۔“ وہ باہر کارڈور میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنسا۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو لگتا ہے مجھے آپ کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے؟“

”مجھے لگتا تو خیر یہی ہے کہ آپ کو اور پاشا کو میرے

علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔

”غصے میں ہیں خیریت؟“

”کوئی مذاق کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ؟ میں کتنی پسلیاں بوجھوں؟“ اس نے زچ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنا بیگ اتار کر سبائے کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پر رکھا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔ بعض چیزیں اتنی حساس ہوتی ہیں کہ انہیں بہت راز داری سے کسی کے حوالے کرنا پڑتا ہے، تاکہ وہ غلط شخص کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ویسے ایک گھنٹے کا کام تھا، آپ نے ہی اتنے دن لگا دیے۔“

خیر! آپ کا پزل تو میں حل کر ہی لوں گی، مگر کیا گارنٹی ہے کہ آخر میں مجھے ”اپریل فول“ کے الفاظ نہیں ملیں گے؟“ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ استنبول کی دھوپ ارد گرد سبزہ زار کو سنہری پن عطا کر رہی تھی۔

انتا غیر سنجیدہ سمجھتی ہیں آپ مجھے؟“

”کیوں؟ کیا آپ وہی نہیں ہیں جو خواجہ سراج بن کر مجھ سے ملے تھے؟ کبھی شرمندگی نہیں ہوئی آپ کو اس بات پر؟“

”شرمندگی کیسی؟ میں خواجہ سراج بن کر آپ سے ملا ہی تھا، خواجہ سراج بن کر کوئی محفل تو نہیں لگائی تھی۔“ وہ شاید برامان گیا تھا۔

”مگر خواجہ سراج بننا بذات خود بہت عجیب ہے۔“

”کیوں؟ کیا خواجہ سراج انسان نہیں ہوتے؟ کیا وہ جانور ہوتے ہیں؟ میں نے ان کا حلیہ اپنایا تھا، مگر آپ کے لیے نہیں۔ میں تو اپنے کام سے وہ سب بنا تھا۔ بس اسی دوران۔ آپ مل گئیں۔“

”آپ اپنے کام خواجہ سراج بن کر نکلاتے ہیں؟“ وہ دم بخود رہ گئی۔ پہلی دفعہ کوئی سوال اس نے بچوں کی سی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”بھی میرے آفس آئیے گا۔ میں آپ کو اپنے کام کی تفصیل بتاؤں گا۔“

”آپ کے آفس میں کبھی نہیں آ رہی، مگر وہ امانت“

وہ کیسے ڈھونڈوں میں؟“

”جو لکھا ہے اس پر غور کریں۔ وہ ڈولی کی امانت ہے اور وہ اسی کو ملنی چاہیے، جو اپنی صلاحیتوں سے خود کو اس کے قابل ثابت کر سکے۔ کیا آپ اتنی باصلاحیت ہیں؟“

”ٹرائی بی!“ اس نے جتا کر کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ سبائے کی دھوپ ابھی تک سیڑھیوں پر اس کے قدموں میں گر رہی تھی۔

کلینک کی انتظار گاہ میں ٹھنڈی سی خنکی چھائی تھی۔ وہ کاؤچ پر خاموش سی بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ ہالے کے توسط سے اس نے ایک ڈراما بوجسٹ سے وقت لیا تھا، اس کے بال بظاہر ٹھیک نظر آتے تھے، اور عائشہ کے دیے گئے لوشن کام کر رہے تھے مگر ہاتھ لگانے پر وہ پہلے سے ذرا روکھے لگتے اور سر کی جلد جو خراب ہوئی وہ الگ۔

حیا نے اپنا پرس ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹریسروالی ڈبیا ڈورم میں ہی تھی، اب وہ اسے استنبول میں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھی۔

تب ہی اس کے ساتھ والی نشست پر ایک سیاہ عبایا والی لڑکی آ بیٹھی۔ بیٹھتے ہی اس نے چند گہرے سانس لے کر نفس بحال کیا، پھر ٹشو سے نقاب کے اندر چہرہ پتھپھانے لگی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پیدل آئی ہے اور بہت تھک گئی ہے۔

حیا لاشعوری طور پر نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں آج کل وہ عبایا اور حجاب والی لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھا کرتی تھی۔ استنبول میں ایسی لڑکیاں بہت کم ہی نظر آتی تھیں، البتہ اسکارف اور لانگ اسکرٹس والی مل جاتیں۔ اکثریت ایسی

لڑکیوں کی ہوتی جن میں سے ایک اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ مختصر اسکرٹ بنا آستین کے بلاؤز اور خوب صورت بال۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی گھٹنے پہ پھیلا میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔ استنبول کی

علامتی لڑکی۔ اس کے اسکرٹ کارنگ نارنجی تھا، بالکل ان دو کراؤن فش جیسا جوان دونوں کاؤچز کے درمیان رکھی میز پر سجے ایکوریم میں تیر رہی تھیں۔ ننھی ننھی سی نارنجی پھلیاں جن کی زندگی، جن کی سانس اور جن کی آواز سب بانی تھا۔

عبایا والی لڑکی اب پرس کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ حیا ابھی تک اسے یوں ہی دیکھ رہی تھی۔ دفعتا اس نے پرس سے ایک اور جج جوس کی بوتل نکالی اور اس کا ڈھکن اتارا، پھر ذرا رکی اور حیا کی طرف بڑھائی۔

”نو تھینک یو۔“ وہ ذرا سنبھل کر سیدھی ہوئی۔

وہ لڑکی مسکرا کر بوتل میں اسٹرا ڈالنے لگی۔ سیاہ نقاب میں اس کی سرمئی آنکھیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔

”آپ ہمیشہ یہ عبایا کرتی ہیں؟“ وہ رہ نہیں سکی اور پوچھ ہی بیٹھی۔

”ہوں۔“ نقاب تلے ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ کو گھٹن نہیں ہوتی اس میں؟“

”میرا دل اللہ نے اس کے لیے کھول دیا ہے، سو گھٹن کیسی۔ اور ویسے بھی مسلمان لڑکی تو بہت مضبوط ہوتی ہے۔“ اس نے بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے تو نقاب کا سوچ کر ہی گھٹن ہوتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے، یہ سب صرف آپ کے ذہن میں ہو۔“

”آپ کے ذہن میں بھی ایسی باتیں آتی ہوں گی نا۔“ وہ اس کی طرف رخ موڑے غیر ارادی طور پر بحث کرنے لگی تھی۔

”کیا بہت بڑھے لکھے ماڈرن قسم کے لوگوں کے درمیان بیٹھے آپ کو احساس کمتری نہیں ہوتا؟“ ساتھ ہی ایک نگاہ اس نے ایکوریم کے پار بیٹھی ترک لڑکی پر ڈالی جو ابھی تک اپنے میگزین میں مگن تھی۔ ”بہت ماڈرن قسم کے لوگ تو میرے جیسے ہی

ہوتے ہیں نا۔ میری شریعت تو دنیا کی سب سے ماڈرن (جدید) شریعت ہے۔ احساس کمتری تو انہیں ہونا چاہیے، جو جاہلیت کے زمانے کا تبرج کرتے ہیں۔ تبرج سمجھتی ہو؟“

اسے اندازہ تھا، پھر بھی اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تبرج۔۔۔ اول۔۔۔ کیسے سمجھاؤں؟“ اس لڑکی نے لمحے بھر کو سوچا۔ ”تم نے دینی کے وہ اونچے اونچے ماورز تو دیکھے ہوں گے۔ برج العرب، برج الخلیفہ؟“

”ہاں تصاویر میں۔“

”بس! اسی برج سے یہ تبرج نکلا ہے۔ کسی شے کو اتنا نمایاں اور خوب صورت بنانا کہ دور سے نظر آئے۔ وہ صدیوں پہلے یوسف علیہ السلام کے مصر کی عورتیں تھیں، جو تبرج کرتی تھیں۔ وہ ابو جہل کے عرب کی عورتیں تھیں، جو زیب و زینت کر کے مردوں کے درمیان سے گزرتی تھیں۔ اگر استنبول کی لڑکیاں ان زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی پیروی کرتی ہیں تو وہ ماڈرن تو نہ ہوئیں نا۔ ماڈرن تو میں ہوں، تم ہو، پھر کیسی شرمندگی۔“ اس نے رمان سے کہتے ہوئے شانے اچکائے۔

”اللہ اللہ یہ اعتماد؟“ وہ دم بخود رہ گئی۔ (ترکوں کا اثر تھا۔ وہ بھی اللہ اللہ کہنے لگی تھی۔)

”تمہیں لگتا ہے تم کبھی نقاب نہیں پہن سکتیں؟“ وہ اب ٹشو سے پیشانی پر آئے پسینے کے قطرے پتھپھار رہی تھی۔

”شاید نہیں، میری دوستوں اور فرسٹ کزنز میں سے کوئی نقاب نہیں لیتا۔“ اسے شہلا یاد تھی، مگر وہ اس کے سیکنڈ کزن کی بیوی تھی۔

”تو تم یہ رواج ڈالنے والی پہلی لڑکی بن جاؤ۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ جواب میں اس لڑکی نے مسکرا کر ذرا سے شانے اچکائے۔

”جو غار ثور کے آخری سورخ پہ اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے اور ساری رات سانپ سے ڈسے جانے کے باوجود اف نہیں کرتا، اس کی اس ایک رات کی نیکیاں عمر بن

خطاب کی زندگی بھر کی نیکیوں کے برابر ہوتی ہیں۔ مگر ہر شخص ابو بکر نہیں بن سکتا۔ ابو بکر صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ پہلوں میں پہل کرنے والا۔“

اس کی باری پکاری گئی تو وہ چونکی۔ پھر سلام کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب اس لڑکی سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس کا ذہن صاف تھا، ان کراؤن فش کے نارنجی پن کی طرح، شفاف اور صاف، مگر وہ جانتی تھی کہ وہ بھی اپنا چہرہ نہیں لپیٹ سکتی۔ اس تصور سے ہی اس کا دم گھٹتا تھا۔

ایکویریم کے پانی میں اسی طرح بلبلے بن اور مٹ رہے تھے۔ دونوں مچھلیاں بنا کھکے ایک دوسرے سے پیچھے دائرے میں دوڑ رہی تھیں۔ دائرہ جس میں آغاز اور اختتام کی تفریق مٹ جاتی ہے۔

استقلال جدیدی میں معمول کی چل پہل تھی۔ ٹھنڈی سی دھوپ گلی کی دونوں اطراف میں ابھی قدیم عمارتوں پہ گر رہی تھی گویا سنہری برف ہو۔ وہ جہان کے ساتھ ساتھ چلتی گلی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر اتفاق ہوا تھا کہ اس نے سیاہ اسکارف اور سیاہ اسکرٹ کے ساتھ گرے بلاؤز پہن رکھا تھا اور جہان نے سیاہ جینز پہ گرے آدھی آستین والی نی شرت۔ آج جب وہ ادھر آئی تھی تو اس نے خواہش کی تھی کہ وہ استقلال اسٹریٹ کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اسے اس گلی کا انت دیکھنا تھا۔ اب وہ اسی لیے چلتے جارہے تھے۔

”کچھ پیو گی؟“ جہان نے رک کر پوچھا، پھر جواب کا انتظار کیے بنا ایک کیفے میں چلا گیا۔ جب باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو ڈسپوزیبل گلاس تھے اور بغل میں رول شدہ اخبار۔

”شکریہ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھا۔ جھاگ سے بھرا پینا کولا ڈا۔ ناریل اور اناس کی رسیلی خوشبو اور دور تا قسم اسکوائر سے اٹھتی ٹیوپس کی مہک۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سانس اندر

کھینچی۔ جہان سکندر کا استنبول بہت خوب صورت تھا۔

”ہوں“ اچھا ہے۔“ وہ خود ہی تبصرہ کرتا گھونٹ بھر رہا تھا۔ حیا نے اس کے گلاس پکڑے ہاتھ کو دیکھا۔ اس نے وہ پلائینم بینڈ نہیں پہن رکھا تھا۔ یہ ان کی منگنی کے بعد پہلی ملاقات تھی اور اس میں اتنی انا تو تھی کہ اسے خود سے کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑنا تھا۔

”تم اس روز دو دفعہ آئی تھیں؟ بیک ڈور کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟“ وہ سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔ یقیناً اس کے در کرنے سے پوری رپورٹ دی ہوگی، مگر جواب اس کے پاس تیار تھا۔ عائشہ گل نے بے شک کہا تھا کہ سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا، مگر اس وقت عائشہ کون سا دیکھ رہی تھی۔

”کوئی جاننے والا نظر آگیا تھا۔ ہالے اور میں نے اس سے ٹکرانے سے بہتر سمجھا کہ دوسری گلی میں چلے جائیں، ویسے بھی شٹل کے آنے تک ہمیں انتظار تو کرنا تھا نا۔“

”اگر کبھی پچھلی گلی میں کوئی جاننے والا ملے اور تمہیں استقلال میں آنا پڑے تو بے شک برگرننگ کے اسی دروازے کو استعمال کر لینا۔ اس کے پچھلی طرف گھنٹی لگی ہے۔“ گلاس خالی کر کے جہان نے کچرے دان میں اچھال دیا۔ حیا کا ابھی آدھا گلاس باقی تھا۔

”تم بتاؤ! تمہیں لندن کب جانا ہے۔“ وہ کافی بلند آواز میں بول رہی تھی۔ قریب سے گزرتے تاریخی سرخ ٹرام میں سوار سیاحوں کا گروہ اونچی اونچی سیٹھیاں بجا رہا تھا۔ جس کے باعث کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

”اگلے ماہ کا سوچ رہے ہیں۔ تب تک تم بھی فارغ ہوگی۔ باقی ایسی ہی اسٹوڈنٹس کہاں جا رہے ہیں؟“

”کچھ ترکی میں ہی گھومیں پھریں گے، اور کچھ قطر، پیرس، دہلی وغیرہ جا رہے ہیں۔“

”تو تم ہمارے ساتھ لندن چلو نا۔ پھر جولائی میں

واپس آکر کینیڈا کرنا اور پاکستان چلی جانا۔“

”میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیوک ادا میں رہنا چاہتی ہوں۔“ گوکہ جہان کے ساتھ لندن جانے کا خیال کافی پرکشش تھا، مگر اس نے فوراً ہائی بھرنا مناسب نہ سمجھا۔

”اوہ! ڈونٹ ٹیل می کہ تم ابھی تک وہی رپورٹ لکھ رہی ہو۔“

جہان نے ہاتھ ہلا کر گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ حیا نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ ہالے کی دوست چھانے کے لیے تیار تھی، مگر جہان کے منع کرنے پہ اس نے وہ رپورٹ بند کر دی تھی۔ آج صبح ہی جب وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی تو اسے لگا اسے یہ سب کسی بااعتماد شخص سے شیئر کرنا چاہیے اور میجر احمد سے بڑھ کر کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ تب ہی صبح اس نے میجر احمد کو ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ بات کرنا چاہتی ہے، مگر کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

”نہیں! میں نے اسے ذہن سے نکال دیا ہے۔“

”گڈ گرل!“ وہ ایک دم اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا، یوں کہ حیا کا سامنے کا منظر چھپ گیا۔ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

”بعض دفعہ جو ہم دیکھتے ہیں وہ ہو نہیں رہا ہوتا اور جو ہو رہا ہوتا ہے وہ ہم دیکھ نہیں رہے ہوتے۔“

کہتے ہوئے اس نے رول شدہ اخبار کھولا اور پھر اسے لپٹنے لگا، یہاں تک کہ کون آکس کریم کی سنہری کون کی طرح اس نے اخبار کو رول کر دیا۔ پھر اس نے حیا کا گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیا نے نا سمجھی سے گلاس اسے پکڑ لیا۔

”ایک چیز ہوتی ہے، نظر کا دھوکا، لوگ وہ نہیں ہوتے، جو وہ نظر آتے ہیں اور جو وہ ہوتے ہیں، اسے وہ چھپا کر رکھتے ہیں۔“ اس نے گلاس کون کے منہ میں اندیل دیا۔ جوس دھار کی صورت اخبار کی کون میں کرنے لگا۔ جہان نے خالی گلاس حیا کو تھمایا اور اخبار کی کون کو مزید لپٹنا شروع کیا۔ پھر اس کا منہ بند کر دیا اور مخالف سمت سے اخبار کھولنے لگا۔ تمہیں کھلتی

گئیں اور پورا اخبار سیدھا مکھل کر سامنے آگیا۔

”نہیں! وہ مسکراتے ہوئے تالی بجانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی ٹرک تھی۔ اس نے یقیناً کمال مہارت سے جوس کہیں آس پاس گرا دیا تھا یا پھر کچھ اور کیا ہوگا، بہر حال اس کا انداز متاثر کن تھا۔

وہ دونوں پھر سے ساتھ چلنے لگے تھے۔ جہان نے اخبار اب دورویہ تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

دفعتنا حیا کا فون بجا۔ اس نے رس سے موبائل نکال کر دیکھا۔ میجر احمد کی کال آرہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی اور فون رکھ دیا۔ جہان اتنا مہذب تو تھا کہ کوئی سوال نہ کرتا، مگر وہ خود بتانا چاہتی تھی۔

”میجر احمد کی کال تھی، کچھ کام تھا ان سے۔“ وہ چلتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ یہ سراسر جوا تھا۔ جہان کے موبڈ کا کچھ بھروسہ نہ تھا، مگر وہ اس پہ بھروسہ کرنا چاہتی تھی۔

”میجر احمد کون؟“ اس نے نا سمجھی سے حیا کو دیکھا۔

”پاکستان میں ہوتے ہیں، سائبر کرائم سیل میں انٹیلی جنس آفیسر ہیں۔ تمہارے ابا کو بھی جانتے ہیں۔“ وہ ذرا رکی۔ ”میں ان سے بات کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا نا؟“

”آف کورس نہیں!“ اس نے شانے اچکا دیے۔

”کون کتنا قابل اعتبار ہے، یہ فیصلہ تم خود کر سکتی ہو، کیونکہ میرے نزدیک تو سب لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔“

”جی بے یقینی بھی اچھی نہیں ہوتی جہان!“

”ریسی؟ جیسے تمہیں یقین ہے کہ تمہارا جوس میں نے کہیں گرا دیا تھا؟“ وہ پھر سے اس کے مقابل آکھڑا ہوا اور گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو جانے کیوں ابھی تک وہ پکڑے کھڑی تھی۔

”یقیناً تم نے ایسا کیا ہوگا۔“ اس نے گلاس جہان کو تھمایا۔ تب تک وہ اخبار کو دوبارہ کون کی شکل میں لپیٹ چکا تھا۔ گلاس لے کر اس نے اخبار کی کون کا کھلا منہ گلاس میں الٹا۔ پینا کولا ڈا ایک دھار کی صورت

گلاس میں گرنے لگا۔

وہ بے یقینی سے ساکت کھڑی دیکھ رہی تھی۔
”یہ تم نے کیسے کیا؟ میں نے... میں نے خود دیکھا تھا کہ اخبار سوکھا تھا۔ پھر یہ جوس کہاں سے آیا؟“
”اگر جادو گر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟ کبھی فرصت میں بتاؤں گا کہ یہ کیسے ہوا۔ البتہ اگر تم میری جگہ پہ کھڑی ہو کر دیکھتیں تو جان پاتیں کہ میں نے یہ کیسے کیا ہے۔ جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھتا اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”تم عجیب ہو جہاں!“ اس نے تحیر سے سر جھٹکا۔
”ان دونوں چیزوں کو ٹریش میں پھینک دو، میری پیاس مر گئی ہے۔“
وہ ہنس پڑا۔ ”نہیں! تمہاری پیاس ڈر گئی ہے۔“
پھر شعبہ باز نے دونوں چیزیں ایک قریبی کچرے دان میں اچھال دیں۔

دور سامنے گلی کے اختتام پہ ایک اونچا ٹاور تھا۔ جس نے گلی کا دہانہ بالکل ہلاک کر رکھا تھا جیسے زمین سے اگ آیا ہو۔ وہ یوں تھا جیسے پاکستان میں اونچی گول سی اینٹوں کی بھٹی ہوئی ہے، ویسا ہی سلنڈر نما ٹاور جس کا گنبد کون کی شکل کا تھا۔

”یہ رہا وہ انت... Galata ٹاور (غلطہ ٹاور) جسے جانے کا تمہیں تجسس تھا۔“ اس نے ٹاور کی طرف اشارہ کیا۔

”اور انت جانے کا سب سے بڑا نقصان پتا ہے کیا ہوتا ہے جہاں؟“

جہاں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
”انسان کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔“ اس نے گہری سانس لی اور پلٹ گئی۔ وہ شانے اچکا کر اس کے پیچھے ہولیا۔

☆☆☆

”ترکی والوں کو سلام۔“ واپسی پہ گورسل میں بیٹھے جب اس نے میجر احمد کو کال بیک کی اور جواباً ”احمد نے

کال کٹ کر خود سے فون کیا تو اس کا ہیلو سنتے ہی وہ جیسے کسی خوشگوار حیرت کے زیر اثر بولا تھا۔

”زندگی میں پہلی دفعہ آپ نے میجر احمد کو خود یاد کیا ہے، مگر جب آپ نے کال نہیں اٹھائی تو میں سمجھا کہ وہ ٹیکسٹ آپ نے غلطی سے کیا ہو گا۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ میں اس وقت جہان کے ساتھ تھی۔ سوچا بعد میں تفصیلی بات کروں گی۔“
”اچھا۔“ وہ جیسے چپ ہو گیا۔ شاید اسے جہان کا ذکر ناگوار گزرا تھا۔

”میں نے جہان کو آپ کے بارے میں بتایا، مگر وہ آپ کو نہیں جانتا تھا۔“

”کیوں؟ آپ نے کیوں بتایا؟“ وہ بہت حیران ہوا۔
”شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔“ وہ ذرا جتا کر بولی۔ جانتی تھی کہ اس کا استحقاق سے شوہر کی بات کرنا احمد کو کتنا برا لگتا تھا۔
”شوہروں کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ احتیاط کیجیے گا“ آپ پھنس ہی نہ جائیں۔“

”غلط کام تو نہیں کر رہی کہ پھنسن۔ بہر حال! ہم کام کی بات کریں؟“ اس کا لہجہ بے لچک ہو گیا۔ ساتھ ہی جو کچھ بیوک ادا میں وہ جان پائی تھی اس نے وہ احمد کو بتا دیا۔

”میں وہ رپورٹ شائع کرنا چاہتی تھی، مگر جہان نے منع کر دیا۔“ روانی میں وہ کہہ گئی، پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔

”وہ تو منع کرے گا“ اس کا بہت کچھ داؤہ جو لگے گا۔ خیر! آپ بالکل وہ رپورٹ شائع کروائیں، مگر حیا! اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ جہان والی بات نظر انداز کر گئی۔ وہ ذاتی عناد کے باعث کہہ رہا تھا یقیناً۔“

”ایک رپورٹ سے اے آر پی جیسے بندے کا کیا بگڑے گا؟ مافیا کے ایک ایک آدمی کے پیچھے پوری کی پوری نیٹ ورکنگ ہوتی ہے۔ عبدالرحمن جیسے ”شہرت زدہ“ مہرے تو صرف بل کا کام کرتے ہیں۔ ایسے کہ اپنے دامن پہ کوئی چھینٹا نہ پڑے۔ سوان کے

خلاف نہ ثبوت ہوتے ہیں نہ کبھی فائلز کھلتی ہیں۔“
”مگر میں نے سنا ہے کہ اس کے عالمی دہشت گرد تنظیموں سے بھی۔“

”کس سے سنا ہے؟“ وہ بات کٹ کر بولا۔
”لیڈی کبریٰ سے۔ اوالا میں۔“

”بہر حال! یہ دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔ آپ ان معاملوں میں مت پڑیں۔“

”تو پھر یہ پاشا میرے پیچھے کیوں پڑا ہے آخر؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”مجھے تو لگتا ہے حیا! کہ اس نے آپ کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اب صرف آپ اس کے پیچھے پڑی ہیں۔“

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”ویسے ضروری نہیں تھا کہ آپ جہان سکندر کو میرے بارے میں بتائیں۔ انسان کو کچھ باتیں اپنے تک بھی رکھنی چاہئیں۔“

بس باسفورس برج پر سے گزر رہی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر مل تلے بہتا سمندر دیکھ سکتی تھی۔ وہاں حسب معمول ایک فیری تیر رہا تھا۔

”میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے اور آپ کے اس رابطے کو کبھی بھی غلط طریقے سے استعمال کر کے مجھے رسوا کر سکے۔“

”اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا حیا! جنت کے پتے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔“

اسی لمحے دور نیچے سمندر کے کناروں پہ بگلوں کا ایک غول پھڑپھڑاتا ہوا اڑا تھا۔ وہ نگاہیں ان کے پھورے سفید پروں پہ مرکوز کیے، بالکل ٹھہری گئی تھی۔

”آپ جنت کے پتے کسے کہتے ہیں؟“
احمد نے گہری سانس لی اور کہنے لگا۔

”آپ جانتی ہیں جب آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں رہا کرتے تھے اس جنت میں جہاں نہ بھوک تھی نہ پیاس نہ دھوپ اور نہ ہی برہنگی۔ تب اللہ نے انہیں ایک ترغیب دلاتے درخت کے قریب جانے

سے روکا تھا، تاکہ وہ دونوں مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔“
وہ سانس لینے کو رکا۔

بس اب پل کے آخری حصے پہ تھی۔ بگلوں کا غول فیری کے اوپر سے پھر پھڑپھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ سمندر پیچھے کو جا رہا تھا۔

”اس وقت شیطان نے ان دونوں کو ترغیب دلائی کہ اگر وہ اس ہمیشگی کے درخت کو چھو لیں تو فرشتے بن جائیں گے یا پھر ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں کبھی نہ پرانی ہونے والی بادشاہت ملے گی۔“

پل پیچھے رہ گیا۔ گورسل اب پرانے شہر (اناطولیہ یا ایشیائی حصے) میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز یکسوئی سے سن رہی تھی۔

”سو انہوں نے درخت کو چکھ لیا۔ حد پار کر لی۔ تو ان کو فوراً بے لباس کر دیا گیا۔ اس پہلی رسوائی میں جو سب سے پہلی شے جس سے انسان نے خود کو ڈھکا تھا وہ جنت کے پتے تھے، ورق الجنت۔“

پرانے شہر کی سڑک پہ کوئی ٹریفک جام تھا۔ گورسل بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ سڑک کنارے چلتے لوگ اور دکانوں پہ لگا ریش اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بس سن رہی تھی۔

”آپ جانتی ہیں، ابلیس نے انسان کو کس شے کی ترغیب دلا کر اللہ کی حد پار کروائی تھی؟ فرشتے بننے کی اور ہمیشہ رہنے کی۔ جانتی ہیں حیا! فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟“

اس نے نفی میں گردن ہلائی، گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔

”فرشتے خوب صورت ہوتے ہیں۔“ وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”اور ہمیشہ کی بادشاہت کے ملتی ہے؟ کون ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے؟ وہ جسے لوگ بھول نہ سکیں جو انہیں مسحور کر دے، ان کے دلوں پہ قبضہ کر لے۔“

خوب صورتی اور امر ہونے کی چاہ یہ دونوں چیزیں انسان کو دھوکے میں ڈال کر ممنوعہ حد پار کراتی ہیں اور پھل کھانے کا وقت نہیں ملتا۔ انسان چکھتے ہی بھری دنیا میں رسوا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ خود کو ڈھکے تو

اسے ڈھکنے والے جنت کے پتے ہوتے ہیں۔ لوگ اسے کپڑے کا ٹکڑا کہیں یا کچھ اور میرے نزدیک یہ ورق الجنتہ ہیں۔“

پرانے شہر کی قدیم اونچی عمارتوں پر سے دھوپ رنگ گئی تھی اور اب چھاؤں کی نیلاہٹ ان پہ چھا رہی تھی۔ وہ سانس روکے موبائل کان سے لگائے دم سادھے بیٹھی سن رہی تھی۔

”جنت کے پتے صرف اسی کو ملتے ہیں جس نے ترغیب کو چکھنے کی کوشش کی ہوتی ہے اور ان کا سفر ان کو خود پہ لگالینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا، کیونکہ ان کو تھامنے سے پہلے انسان جنت میں ہوتا ہے۔ تھامنے کے بعد وہ دنیا میں آتا دیا جاتا ہے، بخشش مل جاتی ہے مگر دنیا شروع ہو جاتی ہے اور پھر۔“

وہ جیسے دھیرے سے مسکرایا۔

”دنیا والوں نے جنت تو نہیں دیکھی ہوتی نا! سوان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ سو وہ ان کے ساتھ سلوک بھی وہی کرتے ہیں جو کسی شے کی اصل جانے بغیر اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آپ دنیا میں اترنے کے بعد دنیا والوں کے رویے سے پریشان مت ہوئے گا۔“

وہ خاموش ہوا تو کوئی طلسم ٹوٹا۔ سحر کا ایک بلبہ جو اس کے گرد تن چکا تھا پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ”تھینکس میجر احمد!“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ ”آپ اچھے انسان ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔“ ”شکریہ! میں اب فون رکھتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔“ اس نے فون کان سے ہٹایا۔ اس کا کان سن ہو چکا تھا۔

قدیم شہر کی عمارتوں سے اس کو ابھی تک میجر احمد کی باتوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

”انا طولین سٹی میں ایک سیمینار ہے، چلو گی؟“ ہالے نے ڈورم کے دروازے سے جھانک کر اسے مخاطب کیا۔ وہ جوانی کرسی پہ بیٹھی میز پہ پھیلی کتابوں میں منہمک تھی، چونک کر پلٹی۔

”ابھی تو ممکن نہیں ہے، میرے پورے دو چھپٹوز رہ گئے ہیں۔“ حیانے صفحے آگے پلٹ کر دیکھا اور پھر نفی میں گردن ہلائی۔

”کار میں پڑھ لینا۔ کتاب ساتھ لے چلو۔“ ”اتنا ضروری کیا ہے؟“

”تم بچھتاؤ گی نہیں۔ لکھ کر رکھ لو۔“ ہالے مصر تھی، سو اس نے کتاب ساتھ رکھ لی۔ بزل باکس بھی بیگ میں ڈال لیا اور بھنی مونگ پھلی کا پیکٹ جو کل ہی دیا اسٹور سے لائی تھی ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”کپڑے ٹھیک ہیں؟“ اس نے گردن جھکا کر صبح کے پنہ لباس کو دیکھا۔ گرے اسکرٹ کے ساتھ لائم گرین بلاؤز اور اوپر گرے اسکارف جو ابھی ابھی پن اپ گیا تھا۔

”ہاں! ٹھیک ہیں، چلو۔“ ہالے نے پرس اور چابی سنبھالی۔ یہ اس کا خوش قسمت دن تھا کہ آج اس کے پاس کار تھی۔

وہ سیمینار ہوٹل کے جس ہال میں تھا، وہ ہال سب سے اوپر والے فلور پہ بنا تھا۔ اس کی دو متوازی دیواریں گلاس کی بنی تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ لڑکیاں، عورتیں اور بے حد معمر خواتین خالص نسوانی ماحول تھا۔

ان دونوں کوششے کی دیوار کے ساتھ جگہ ملی۔ حیا کی کرسی قطار کی پہلی کرسی تھی، سواب اس کے دائیں طرف گلاس والی بھی اور بائیں جانب ہالے۔ درمیان میں اس نے مونگ پھلی کا پیکٹ کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہی ڈی جے کے ساتھ بیچ گلاس میں کھانے کی عادت۔ روسٹرم کے عقب میں دیوار اس خوب صورت بینر سے ڈھکی گئی جس پہ انگریزی میں چھپا تھا۔

Face veil mandatory or recommended (چہرے کا حجاب واجب یا مستحب؟)

اس نے دو انگلیوں اور انگوٹھے کو پیکٹ میں ڈال کر چند دانے نکالے اور منہ میں رکھے۔ وہ اسکارف کر لے، یہ اس کے تقویٰ کی انتہا تھی۔ سواب چہرے

کا نقاب واجب تھا یا مستحب، کیا فرق پڑتا تھا؟ سیمینار انگریزی میں تھا۔ سو ڈائس سنبھالے کھڑی میروں اسکارف والی عربی خاتون انگریزی میں ہی کہہ رہی تھیں۔

”واجب وہ چیز ہوتی جو کریں تو ثواب نہ کریں تو گناہ ہے، جبکہ مستحب وہ کام ہے جو کریں تو ثواب مگر نہ کرنے پہ گناہ نہیں ہے۔ اب اس بات پہ تو سب راضی ہیں کہ لڑکیوں کا سر اور جسم ڈھکنا واجب، لیکن کیا چہرہ بھی ڈھکنا لازمی ہے؟“

حیا کے دائیں جانب گلاس والی پہ ایک دم سے کوئی پرندہ آکر آیا تھا۔ وہ چونکی۔ وہ بھی سی چڑیا تھی جو شیشے سے ٹکرا کر نیچے گر گئی تھی۔

”جب میں کہتی ہوں کہ چہرہ ڈھکنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے تو اس کی وجہ وہ حدیث ہے کہ جب حضرت اسماء بنت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کا لباس ذرا باریک تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اسما! جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو سوائے اس اور اس کے (چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے) کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ کھلا رہنے پہ گناہ نہیں ہوتا۔“

گری ہوئی چڑیا اب سنبھل کر فرش پہ پھدک رہی تھی۔ چند ایک بار اس نے شیشے کی دیوار پر پنچے مار کر چڑھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔

”اور پھر جب حج کے موقع پہ ایک لڑکی جو اونٹ پہ بیٹھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بچے کے حج کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے فضل لا شعوری طور پہ اس لڑکی کے چہرے کو دیکھ رہے تھے تو آپ نے ہاتھ پیچھے کر کے فضل کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا، جبکہ اس لڑکی کو چہرہ ڈھکنے کا نہیں کہا۔ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ازواج مطہرات اور صحابیات جو حجاب اوڑھتی تھیں، وہ مستحب کے درجے کا تھا۔ واجب کا نہیں۔ سو جو آیت سورہ نور میں ہے کہ ”وہ اپنی

نہنیں چھپائیں، سوائے اس کے کہ جو خود ظاہر ہو جائے تو اس ”وہ جو خود ظاہر ہو جائے“ میں سرمہ، انگوٹھی وغیرہ کے ساتھ چہرہ بھی شامل ہے۔“

چڑیا پھر پھڑپھڑاتی ہوئی کب کی اڑ چکی تھی۔ وہ مونگ پھلی چباتے ہوئے سر اثبات میں ہلاتی مقررہ کوسن رہی تھی۔ وہ مزید چند دلائل دے کر اپنی کرسی پہ واپس جا چکی تھیں اور تب تک وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ اسے ان کی ساری بات ٹھیک لگی تھی۔

”میں ڈاکٹر فریجہ سے اختلاف کی جسارت کروں گی۔“ ڈائس پہ آنے والی گرے اسکارف والی مقررہ اپنی بات شروع کر چکی تھیں۔ وہ دراصل بحث تھی۔ حیا اور ہالے باری باری پیکٹ میں انگلیاں ڈال کر مونگ پھلی نکالتے ہوئے پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھیں۔

”رہی اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث، اس کی تشریح تو محرم رشتوں کے لحاظ سے بھی کی جاسکتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں اور اسی حدیث سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ بہنوئی سے چہرے کا پردہ نہیں ہوتا اور حضرت فضل والا واقعہ حج کے موقع کا تھا اور حج پہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حتیٰ سے نقاب یا دستانے پہننے سے منع فرمایا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقاب کرنا اس زمانے میں ایک کامن پریکٹس تھی۔“

دو فاتحائیں تیزی سے اڑتی آئیں اور شیشے کی دیوار سے ٹکرائیں۔ حیانے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ اب ٹکرا کر نیچے جا گری تھیں اور اگلے ہی پل اٹھ کر اڑ گئیں۔

”عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب گریبانوں کو ڈھانپ لینے کا حکم نازل ہوا تھا تو مدینے کی عورتوں نے وہ حکم سنتے ہی اپنی اوڑھنیاں حصوں میں پھاڑیں اور سر سے پاؤں تک خود کو ان سے ڈھانپ لیا۔ یہاں ڈھانپنے سے مراد چہرہ ڈھانپنا بھی ہے۔ سو ”وہ جو خود ظاہر ہو جائے۔“ میں انگوٹھی، سرمہ، جوتی تو آتی ہے، مگر چہرہ نہیں۔ پھر جب ابن عباسؓ سے آیت حجاب کی

تفسیر پوچھی گئی تھی تو آپ نے اپنی چادر سر پہ لپیٹ کر بکل مار کے دکھائی یوں کہ بس ایک آنکھ واضح تھی۔ آیت حجاب میں اللہ نے ”اے ایمان والو!“ کہہ کر حکم دیا ہے اور جب اللہ تعالیٰ مومن کو اس کے ایمان کا واسطہ دے کر حکم دیتا ہے تو وہ حکم بے حد اہم ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف سر اور جسم ڈھکنا واجب نہیں بلکہ چہرہ ڈھکنا بھی واجب ہے۔“

وہ گردن ذرا سی پھیرے شیشے کی دیوار کو دیکھ رہی تھی، جہاں تھوڑی سی دیر میں بہت سے پرندے ٹکرائے تھے۔ تایا فرقان کہتے تھے کہ پرندے یوں اس لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ پچھلے سال جب یہاں سے گزرے تھے تو وہ عمارت وہاں نہیں تھی۔ اب وہ راستے پہ اپنی رو میں اڑتے جا رہے ہوتے ہیں تو ٹکر لگنے پہ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ ہلاک ہے۔ معلوم نہیں تایا کی فلاسفی کتنی درست تھی مگر وہ ہوٹل نیا تعمیر شدہ ہی تھا۔ شاید وہ واقعی پرندوں کی گزرگاہ کے درمیان بن گیا تھا۔

”مستحب اور واجب“ بحث بہت پرانی ہے۔ ڈائرس پہ اب ایک سیاہ عیالیا اور سیاہ اسکارف والی دراز قد شہر رنگ آنکھوں والی خاتون آچکی تھیں۔ خوب صورت شفاف چہرہ نرم سی مسکراہٹ۔ سب بہت توجہ سے انہیں سن رہے تھے۔

”آپ نے مستحب والوں کے دلائل سنے، آپ کو لگا ہو گا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے پھر واجب والوں کا بیان سنا، تو لگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ دونوں ٹھیک کہہ سکتے ہیں؟ تو وہی لطیفہ ہو جائے گا کہ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔“

ہال میں بے اختیار قہقہہ بلند ہوا۔ شیشے کی دیواریں بھی مسکرائیں۔

”ایسا ہے کہ میں ان دونوں میں سے کسی گروہ کی حمایت یا مخالفت کرنے کے لیے نہیں آئی۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔“

وہ لمحے بھر کو رکیں۔ پورا ہال بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”ہم عموماً دنیا اور آخرت کی مثال کسی کالج ایگزام سے دیتے ہیں، رائٹ؟ تو وہی مثال لے لیتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کے کسی بھی اسکول یا کالج کا جب پیپر سیٹ کیا جاتا ہے تو اس میں چند سوال بہت آسان رکھے جاتے ہیں۔ جو کوئی اوسط درجے کا طالب علم بھی حل کر کے 33% سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہو سکتا ہے۔ پھر چند سوال ذرا مشکل ہوتے ہیں جو صرف اچھے طلبہ حل کر کے ستر اسی فیصد نمبر لے جاتے ہی اور آخر میں ہر پیپر میں کچھ سوال بہت پیچ دار۔ اور مشکل رکھے جاتے ہیں۔ وہ سوال پوزیشن ہولڈرز کا فیصلہ کرتے ہیں، اسی لیے عموماً پوزیشن ہولڈرز کے آپس میں چند نمبر زیادہ سنبھیلنے کے ذرا سے تناسب کا فرق ہوتا ہے۔ یہ سوال ”مستحب“ ہوتے ہیں۔ ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ مستحب وہ ہوتا ہے کہ جب پانچ میں سے چار سوال حل کرنے ہوں، تو چاروں میں سے کوئی غلط ہونے کے ڈر سے پانچواں بھی اٹیمپٹ کر دیا جائے، ایکسٹرا سوال جبکہ وہ مستحب نہیں ہوتا۔“

وہ اب کرسی پہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی غور سے سن رہی تھی۔ استنبول کی خوب صورت عورتوں کی خوب صورت باتوں کا بھی ایک اپنا سحر تھا۔

”اب ہوتا یہ ہے کہ“ شفاف چہرے والی ڈاکٹر شائستہ کہہ رہی تھیں۔ ”کہ اس مسئلے پہ واجب والے، مستحب والوں پہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ اپنی مرضی کا دین چاہتے ہیں اور خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ جبکہ مستحب والے انہیں کہتے ہیں کہ آپ شدت پسند ہو رہے ہیں۔ الزامات کی اس جنگ میں لڑکیوں کے پاس بہانہ آ جاتا ہے کہ انہیں حجاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی ٹھیک ہیں کیونکہ یہ تو ثابت ہی نہیں ہے کہ اسلام میں چہرے کا پردہ ہے بھی یا نہیں۔ جبکہ یہ غلط تاثر ہے۔ بحث نقاب کے ”ہونے“ یا ”نہ ہونے“ کی نہیں ہے، بلکہ بحث اس کے واجب یا مستحب ہونے کی ہے۔ آسان الفاظ میں کہتی ہوں اس پہ سب راضی ہیں کہ نقاب کرنے پہ ثواب ہے، جبکہ اختلافی نقطہ یہ ہے کہ کیا نقاب نہ

کرنے پہ گناہ بھی ہے یا نہیں؟“

اس نے اسکا لڑکے چہرے کو دیکھتے انگلیاں پکٹ میں ڈالیں تو پوروں نے خالی پلاسٹک کو چھوا۔ مونگ پھلی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے انگلیاں نہیں نکالیں، وہ ویسے ہی پوری یکسوئی سے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں سوچتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم اختلافی نقطہ یعنی ”گناہ ہے یا نہیں۔“ چھوڑ دیں اور صرف ”متفق نقطے“ پہ غور کریں تو اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ ”گناہ کو چھوڑ دیں۔“ کامن پوائنٹ دیکھیں کہ نقاب کرنا ایک نیکی ہے۔ بہت بڑی نیکی۔ تو کیا جو چیز مستحب ہوتی ہے اسے فالتو سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے؟ جیسے مستحب والے کرتے ہیں۔ وہ نقاب کو غیر واجب قرار دے کر اس کی ترویج و تبلیغ کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف 33 فی صد والے جواب دے کر کسی فالتو سوال کے بغیر ہی ہم پاس ہو جائیں گے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا 33 فی صد کا جواب نامہ بھی درست لکھا گیا ہے؟“

ان کے سوال پہ ہال میں خاموشی چھائی رہی۔ مرعوب سی خاموشی۔

”ادھر ہم سب عورتیں اور لڑکیاں ہی موجود ہیں۔ ایک بات کہوں آپ سے؟ ہم میں یہ چند باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ساری نہیں تو کچھ تو ضرور ہی۔ ہم جلد جھلس ہو جاتی ہیں، کسی کے پیچھے اس کی برائی بھی کر لیتی ہیں۔ منہ سے جھوٹ بھی پھسل جاتا ہے۔ نمازیں ہم پوری پڑھتی نہیں۔ جو پڑھیں ان میں بھی دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ ان کا بھی پتا نہیں کتنا پانچواں، نوواں یا دسواں حصہ لکھا جاتا ہو گا۔ رمضان کے روزے رکھ لیں تو چھوٹے روزوں کی قضا دینا بھول جاتے ہیں۔ یہ تھا وہ 33 فی صد پرچہ۔ یہ کتنا اچھا ہم حل کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں کسی ایکسٹرا عمل کی ضرورت نہیں؟ مائی ڈیر لڈیز! جنت صرف خواہش کرنے سے نہیں مل جاتی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آدم کی اولاد میں ہر ایک

ہزار میں سے 999 جہنم میں ڈالے جائیں گے اور صرف ایک جنت میں داخل کیا جائے گا؟ یہ میں نہیں کہہ رہی، یہ بخاری کی حدیث ہے۔ کیا ہم اس اعمال نامے کے ساتھ اس ”ایک“ میں شامل ہو سکتے ہیں؟“ وہ بالکل ساکت بیٹھی، بنا بلیک جھپکے مقررہ کو دیکھ رہی تھی۔ ”جہنم“ کے لفظ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چلا دی تھی۔

ہر اقلیطس کی دائمی آگ، بھڑکتا آتش دان، دہکتے انگارے۔

”آج ہم بحث کرتے ہیں کہ نقاب واجب ہے یا نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کل کو قیامت کے دن جب ہم ایک ایک نیکی کی تلاش میں ہوں گے تب ہم شاید رو کر کہیں کہ آخر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ حجاب واجب تھا یا مستحب تھا تو نیک عمل۔۔۔ تھا تو ثواب ہی نا، تو ہم نے کیا نہیں کیا؟“ انہوں نے رک کر ایک گہری سانس اوپر کو کھینچی۔ ”یقین کریں! میں واجب والوں اور مستحب والوں، کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کر رہی۔ میں بس ایک بات کہہ رہی ہوں کہ حجاب کرنا نیکی ہے، سوچا ہے آپ اسے واجب سمجھ کر کریں یا مستحب سمجھ کر۔ اسے کریں ضرور اور اسے پھیلائیں بھی ضرور۔ ہمارے جھوٹ، خیانتیں اور دھوکے ہمارے لیے جو آگ تیار کر رہے ہیں اس سے دور ہونے کے لیے جو کرنا پڑے کریں اور ایک آخری بات۔۔۔ وہ پھر سانس لینے کو رکیں۔ ہال میں اسی طرح مکمل خاموشی تھی۔

”آپ حجاب کے جس بھی درجے پہ ہوں، صرف اسکارف لیں یا عیالیا بھی لیں یا ساتھ میں نقاب بھی کریں، جو بھی کریں اس پہ قائم ہو جائیں۔ اس سے نیچے بھی نہ جائیں اور پھر اس کے لیے لڑنا پڑے تو لڑیں۔ مرنا پڑے تو مریں، مگر اس پہ سمجھوتا بھی نہ کریں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حجاب واجب ہے یا مستحب، میں بس یہ جانتی ہوں کہ یہ اللہ کو پسند ہے تو پھر یہ مجھے بھی پسند ہونا چاہیے۔“ وہ اسٹیج سے اتریں تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

گرے اسکارف والی اور میرون اسکارف والی دونوں خواتین متفق انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر تالی بجا رہی تھیں۔

وہ بالکل چپ خاموش سی بیٹھی تھی۔ دل و دماغ جیسے بالکل خالی ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ سیاہ عبایا والی ڈاکٹر شائستہ ہمدانی دروازے کی طرف بڑھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ان کی جانب لپکی۔

”میم!“ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان تک آئی۔

”یس؟“ وہ پلٹیں۔ ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ میں اپنا فون پکڑے تیز تیز کچھ ٹائپ کر رہی تھیں۔

”وہ۔۔۔ میں بھی۔۔۔ میں بھی کرنا چاہتی ہوں نقاب۔۔۔ مگر۔۔۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات سمجھائے۔ ”مگر۔۔۔ میں کیسے کروں؟“

”بہت آسان!“ ڈاکٹر شائستہ نے موبائل بیگ میں ڈالا اور پھر آگے بڑھ کر اس کے اسکارف کا سامنے کو گرا دایاں تکیوں پر اٹھایا۔ اسے پہلے بائیں گال کے ساتھ اسکارف کے ہالے میں اڑسا پھر کچھ حصہ دائیں گال کے اس طرف اڑسا یوں کہ اس کے چہرے کو ایک نفیس سے نقاب نے ڈھانپ دیا۔

”بس۔۔۔ اتنی سی بات تھی!“ مسکرا کر کندھوں کو ذرا سی جنبش دے کر وہ موبائل نکالنے کے لیے پرس کھنگالتے ہوئے پلٹ گئیں۔

اتنی سی بات تھی؟ وہ اپنی جگہ منجمد سی کھڑی رہ گئی۔

بس؟ اتنی سی بات تھی؟ اس کا سانس گھٹا نہ دل تنگ ہوا نہ ہی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھایا۔ سب ویسا ہی تھا۔ بس اتنی سی بات تھی؟

انا طولیہ کے بازار میں چمچل قدمی کرتے ہوئے سارے نشست سے کھڑکی کے باہر دیکھتے سب انجی کے کیمپس میں واپس بس سے اترتے ہر جگہ اس نے لوگوں کو دیواروں کو مناظر کو کھوجنے کی سعی کی۔ کیا کوئی فرق پڑا تھا؟ مگر اسے احساس ہوا کہ سب ویسا ہی تھا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ڈاکٹر شائستہ کا پہنایا گیا نقاب اتار

سکتی، سو وہ استنبول میں اسی نقاب کے ساتھ لمحے بتاتی رہی۔ پر کہیں کوئی ٹھٹھن، کوئی تنگی نہ تھی۔ انسان دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے نہ کہ رخسار، ناک، ٹھوڑی یا پیشانی سے، سوان کے ڈھکے ہونے کے باوجود منظر وہی رہتا ہے، پھر کیسی پریشانی؟

لیکن پھر بھی اسے عجیب سی خفت ہو رہی تھی۔ باوجود اس کے ہالے کا انداز ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا۔ ڈورم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے حسین اور معصوم اترتے دکھائی دیے۔ حسین بس لمحے بھر کو ٹھٹھکا تھا، پھر دونوں مسکرا کر سلام کرتے نیچے اتر گئے۔ سب پہلے جیسا تھا۔

”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکالیا کریں، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور وہ ستانی نہ جائیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

وہ اپنی کرسی پر بیٹھی کتاب چھکی، ذہنی طور پر ابھی تک اسی ہال میں تھی، جہاں بیٹھے کی دیواروں سے رندے ٹکرا جایا کرتے تھے۔ جب واپسی کے وقت پس منظر میں کسی نے یہ آیت چلا دی تھی تو وہ اس کے ٹرائس سے باہر ہی نہ آسکی۔ اسے لگا وہ کبھی اس کے اثر سے نہیں نکل سکے گی۔ لمحے بھر میں اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ آج تک حجاب یا نقاب کیوں نہیں پہن سکی تھی۔ باوجود اس کے کہ تائیا، ابا اور رو حیل بھی اسے بہت تاکید کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں کر سکی۔ اس لیے کیونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنی کہی۔ کبھی اللہ کی بات سنائی ہی نہیں۔ جبر کی طرح اپنی بات مسلط کرنی چاہی اور اکثر باپ بھائی یہی تو کرتے ہیں۔ اپنی ہی کہتے رہتے ہیں، پھر شکایت کرتے ہیں کہ بچیاں مانتی کیوں نہیں ہیں؟ کبھی اللہ کی سنوا کر تو دیکھتے، پھر علم ہوتا کہ مسلمان لڑکی چھوٹی ہو یا بڑی، نرم نہنی ہو یا سخت، کانچ، دل اس کا ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ دل جو اللہ کی سن کر جھک ہی جاتا ہے۔ پھر کسی وعظ، تقریر یا درس کی ضرورت نہیں رہتی۔

ایک آیت۔۔۔ ایک آیت زندگی بدل دیتی ہے۔ بس ایک آیت۔

بیوک اوا کے ساحل پہ لہریں پتھروں سے سرخ رہی تھیں۔ ان کا شور اس اونچے سفید قصر عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا، راہ داریاں تاریک تھیں۔ صرف دوسری منزل کی اسٹڈی میں نیم روشنی سی چھائی تھی۔ اندر ایک مدھم سا بلبل جل رہا تھا یا پھر میز پر کھلا پڑا عبد الرحمن کا لیپ ٹاپ۔ البتہ وہ اسکرین کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ریو الونگ چیئر کی پشت پر سر گرائے سوچتی نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی دونوں سونے کی انگوٹھیاں اور موٹے فریم کے گلاسز میز پر لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھے تھے۔

بے خیالی میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ اسے دیکھا اور پھر ذرا کوفت سے واپس میز پر پھینک دیا۔ اس سگریٹ نوشی سے اسے چھٹکارا لے لینا چاہیے تھا اب تک۔ بلکہ اور بھی بہت چیزوں سے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور انگلیوں سے کنپٹیوں کو دھیرے دھیرے مسلنے لگا۔ اس کے سر میں کافی دیر سے درد تھا، شاید بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ۔

اول ہوں!“ اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے اور وہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ سے نہیں ہار سکتا۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔ ویسے بھی سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ ہر شے حسبِ منشا جارہی تھی۔ جو تاش کے پتوں کا گھر اس نے بنارکھا تھا، وہ اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ کامیابی بہت نزدیک تھی۔ جو وہ چاہتا تھا، سب ویسے ہی ہو رہا تھا۔ مگر اب اسے زیادہ توانائی اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ پچھل دفعہ کھیل آخری مرحلے میں بگڑ گیا تھا۔ ہر شے دھب سے اس پر آگری تھی اور وہ بھی اس دوست کے ”تھیل“ دوست“ دھوکا دے، اس سے بڑھ کر

تکلیف دہ شے کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ پل کے لیے وہ اذیت ناک دن اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائے تھے۔ اپنے قابل سے قابل دوستوں اور جاننے والوں کو چھوڑ کر وہ اس قابل نفرت آدمی کے پاس گیا تھا مدد کے لیے اور اس نے جو کیا وہ بہت برا تھا۔

عبدالرحمن نے تلخی سے سر جھٹکا۔ اس وقت کم از کم وہ اس واقعے اور اس شخص کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ اللہ ضرور اسے موقع دے گا کہ وہ اس سے اپنا انتقام لے اور وہ کبھی وہ موقع ضائع نہیں کرے گا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی، مگر اس وقت اسے وہ سب بھلا کر ان مواقع پر توجہ مرکوز رکھنی تھی جو اس کے سامنے تھے۔ عبدالرحمن نے کبھی موقعوں کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اس نے موقع ہمیشہ خود پیدا کیے تھے اور پھر اپنے کام نکلوائے تھے۔ اب بھی وہ یہی کر رہا تھا۔

مگر اس سب سے پہلے اسے اس چھوٹے سے مسئلے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو چار پانچ ماہ قبل اس نے خود کھرا کیا تھا۔ گوکہ ہر چیز ویسے نہیں ہوتی جیسے اس نے سوچا تھا۔ بڑی غلطی ہوئی اس سے ہاشم پر اعتبار کر کے، مگر پھر بھی اس سب کا اختتام ویسے ہی ہوگا، جیسے اس نے سوچا تھا۔ جیسے اس نے پلان کیا تھا، جیسے دیمت فردوس نے مشورہ دیا تھا۔

ایک اتفاقیہ موقع اسے مزید پیداکرنا تھا۔ اس نے میز پر رکھا اپنا فون اٹھایا اور فون بک کھولی۔ وہ نمبرز بھی لوگوں کے اصل نام سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ یہ نمبرز بھی اس نے ایسی ایسی اسٹوڈنٹ کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ اس نمبر پر میسج لکھنے لگا۔

چھبیس مئی سے سب انجی میں امتحانات کا موسم چھا گیا۔ اس شخص موسم کو نوجون تک جاری رہنا تھا۔ تا قسم کا جھٹم۔ استقلال جدیسی کے چکر، جواہر کی شاپنگ اور پزل باکس کی پہیلیاں، اسے سب بھول گیا

تھا۔ اولاً میں رکنے کے باعث ہونے والا نقصان تو وہ پورا کر چکی تھی، مگر یہاں صرف پاس نہیں ہونا تھا، بلکہ ڈسٹنکشن لینا تھی۔ اس کا رزلٹ برا ہوا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی ناکامی ہوگی اور رزلٹ اچھا آیا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کی کامیابی ہوگی۔ وہ حیا سلیمان کو بھلا کر صرف اور صرف ”پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس“ رہ گئی تھی۔

اکتیس مئی کی صبح استنبول پہ کسی قہری طرح نازل ہوئی تھی۔ وہ رات دیر تک بڑھنے کے بعد بحر کے قریب سونی تھی کہ آج چھٹی تھی، مگر صبح ہی صبح ہالے کسی آندھی طوفان کی طرح ڈورم میں بھاگتی آئی تھی۔ ”حیا... حیا... اٹھو!“ وہ ہالے کے زور زور سے پکارنے پہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہوا؟“ نیچے اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی ہالے کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ لحاف پھینک کر تیزی سے نیچے اتری۔

”حیا...“ ہالے کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔ حیا نے بے اختیار اس کے ہاتھ پکڑے جو سرد ہو رہے تھے۔

”ہالے؟“ ”حیا... فریڈم فلوٹیل... جو غزہ جا رہا تھا... اسے روک دیا گیا ہے اسرائیل نے اس پہ اٹیک کر دیا ہے۔ پتا نہیں کتنے فلسطینی اور ترک مارے جا چکے ہیں۔“

”اللہ!“ اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ ”مگر... مگر وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ ان حری جہازوں میں تو خوراک بھی دوایاں تھیں۔“

”وہ کہتے ہیں کہ ان میں اسلحہ تھا اور دہشت گرد بھی۔ پھر انہیں پوچھنے والا کون ہے؟“

”خدا یا! معصوم وغیرہ کتنے پریشان ہوں گے۔ ان کے تو دوست بھی تھے مسافر بردار جہاز میں۔“ اسے بے اختیار یاد آیا۔

”ہمیں ان کے پاس جانا چاہیے چلو جلدی کرو۔“

اس نے جلدی جلدی بال جوڑے میں لپیٹے اور پھر لباس بدل کر اسکارف لپیٹ کر اور نقاب نفاست سے سیٹ کر کے وہ ہالے کے ساتھ باہر آگئی۔ کامن روم کے راستے میں اس نے موبائل چیک کیا تو ادھر رات کے کسی ایک پہر ترک موبائل نمبر سے پیغام آیا ہوا تھا۔

”میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے،“

”اے آر پی۔“ ”جسم میں جائے اے آر پی۔“ وہ اس وقت اس پریشانی میں اے آر پی کا سرپرائز کے بارے میں کہاں سوچتی۔

کامن روم میں پانچوں فلسطینی لڑکے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میز پہ لیپ ٹاپس کھلے پڑے تھے اور موبائل ہاتھوں میں لیے وہ سب اپ ڈیٹس کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے دیکھے تو وہ افسوس کے سارے الفاظ بھول گئی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ اور ہالے خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

”آئی ایم سوسوری معصوم!“ اس کے کہنے پہ معصوم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہلکی سی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور دوبارہ اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی تکلیف محسوس کر سکتی تھی، بلکہ نہیں وہ کیسے محسوس کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ خود کو ان کی جگہ پہ رکھے۔ وہ تصور کرے کہ (اس نے لمحے بھر کو آنکھیں میچ کر سوچا) اگر خدا خواستہ اسلام آباد میں جنگ جاری ہو، پورا شہر اپنے گھروں میں محصور ہو، اس کے گھر والے بیمار اور زخمی ہوں اور پھر وہ ادھر ترکی سے ایک فلوٹیل پہ انہیں دوایاں اور خوراک بھیجے، مگر وہ فلوٹیل کراچی کے ساحل پہ روک لیا جائے، اس میں سوار کچھ لوگوں کو مار دیا جائے اور اس کے گھر والے تڑپتے رہیں۔ ہاں! اس نے تکلیف سے آنکھیں کھولیں۔ اب وہ محسوس کر سکتی تھی۔ جب تک اپنے ملک اور اپنے گھر پہ بات نہ آئے، کسی دوسرے کا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔

کامن روم کا دروازہ کھول کر ٹالی اندر داخل ہوئی۔

حیا اور ہالے نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ ٹالی چلتی ہوئی سامنے آئی۔ وہ لڑکوں کو دیکھ رہی تھی مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”معصوم! کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟“ معصوم اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا، اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

”حسین...!“ وہ حسین کے قریب صوفے پہ بیٹھی، اس کا بیٹھنا گویا کسی کرنٹ کا جھٹکا تھا۔ حسین تیزی سے اٹھا۔ ساتھ ہی چاروں لڑکے اٹھے اور وہ سب اکٹھے باہر نکل گئے۔

ٹالی لب کاٹتے ہوئے انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دن اس کی اور فلسطینیوں کی مثالی دوستی کا آخری دن تھا۔

ان کے نکلنے ہی دوسری طرف سے لطیف کمرے میں داخل ہوا۔ آہٹ پہ ٹالی اور ان دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ لطیف نے جینز پہ سفیدی شرٹ پہن رکھی تھی، جس پہ کالے مارکر سے نمایاں کر کے لکھا تھا۔

”شیم آن یو اسرائیل!“

ٹالی نے وہ تحریر پڑھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہالے زیر لب مسکرائی اور حیا کو دیکھا۔ وہ بھی جواباً ”مسکرائی۔“

”ٹالی... ٹرسٹ می، یہ صرف...“ لطیف ہاتھ اٹھا کر بہت دھیمے انداز میں اب ٹالی کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی یہ تحریر صرف اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی فوج کے لیے تھی۔ اسے ٹالی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس سے ناراض تھا۔ ٹالی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے مجھنے والے انداز میں سنتی رہی۔ لطیف کیتھولک تھا، ڈچ تھا۔ وہ یہ سب کہہ سکتا تھا، مگر فلسطینیوں کی بات اور تھی۔ جو انہوں نے کیا ہالے اور حیا کو وہ بالکل درست لگتا تھا۔

وہ ماتم کا دن تھا۔ گوکہ یونیورسٹی میں سارے کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے، مگر دروازے پہ چھایا

سوگ اور اذیت دل کو کاٹتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، کس سے انصاف مانگیں۔

”ہٹلر گتا تھا میں چاہتا تو تمام یہودیوں کو مار دیتا، مگر میں نے بہت سوں کو چھوڑ دیا، تاکہ دنیا جان سکے کہ میں نے ان کے بھائی بندوں کو کیوں مارا تھا۔“

اور اس جیسی دوسری بہت سی ”کہاوٹیں“ اسٹوڈنٹس اپنی اپنی شرٹس پہ لکھ کر پہنے گھوم رہے تھے۔ وہ اور ہالے بھی سارا دن سنالے میں ڈوبی راہ داریوں میں بے مقصد چلتی رہی تھیں۔

پاکستان میں اپنے لاؤنچ میں بیٹھے ریموٹ پکڑے ٹی وی پہ فریڈم فلوٹیل کی خبر دیکھنا اور افسوس کر کے چینل بدل دینا اور بات بھی مگر ترکی میں رہ کر اس ساری اذیت و تکلیف کا حصہ بننا دوسری بات تھی۔

وہ اپنے کمر پر سن طلعت حسین کا شو کبھی بھی نہیں دیکھتی تھی، مگر یہ بات کہ وہ بھی ان سیکڑوں لوگوں کے ساتھ قید تھے، بہت دل دکھانے والا تھا۔ وہ چھ جہاز تھے، تین کارگو اور تین مسافر بردار۔ یہ سب مختلف جگہوں سے آکر مرمر میں ایک مقام پہ اکٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے یہ پورا فلوٹیل غزہ کی جانب گامزن ہوا تھا، تاکہ غزہ کے محصورین کو امداد پہنچا سکے۔ جب فلوٹیل غزہ کے قریب پہنچا تو اسرائیلی فوج نے جہازوں پر حملہ کر دیا۔ کتنے ہی لوگ شہید کر دیے اور باقی سب قید۔

دوپہر میں وہ اور ہالے باہر سبائچی کے کیفے کے فوارے کے ساتھ کرسیوں پہ بیٹھی، چارٹس اور پلے کارڈز بنا رہی تھیں۔

انہوں نے سنا تھا کہ پورا استنبول سڑکوں پہ نکل آیا ہے۔ (سبائچی شہر میں نہیں، بلکہ دور مضافات میں واقع تھی) سوان کا ارادہ بھی آج جا کر اس احتجاج میں شامل ہونے کا تھا۔

مئی کے آخر کی دھوپ فوارے کے پانی سے ابل رہی تھی۔ وہ کہنیاں میز پہ نکائے سر جھکائے پوسٹر میں رنگ کر رہی تھی۔ اسکارف کے ایک پلو سے نفاست سے کیا گیا نقاب اس کے چہرے کا حصہ بن گیا تھا۔ صرف بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نظر آتیں جو پہلے سے

زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ انسان ایک ہی دریا میں دو مرتبہ نہیں اتر سکتا۔ وہ بھی اب وہی حیا سلیمان نہیں رہی تھی جو چار ماہ قبل ترکی آئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نامحسوس طریقے سے بدلتی جا رہی تھی۔ ایک ٹائیپ کو اس کا ذہن صبح آئے پیغام کی جانب بھٹک گیا۔

”کون سا سربراہ؟ کیا سربراہ؟ خیر! عبدالرحمن کی ہر بات ہی سربراہ ہوتی تھی۔ اب تو اس نے حیران ہونا بھی ترک کر دیا تھا۔

پلے کارڈز اور پوسٹرز لپیٹ کر جب وہ کامن روم میں آئی تو سینڈرا چیری اور سارہ کتابیں گود میں رکھ لی وی دیکھ رہی تھیں۔ پالے میز پر رکھے اپنے بیگ میں کچھ چیزیں ڈال رہی تھی اور فلسطینی لڑکے بھی افراتفری کے عالم میں آ جا رہے تھے۔ سب کو احتجاج کے لیے استنبول جانا تھا۔

”کیا تم لوگ آؤ گے سارہ؟“ اس نے ٹی وی میں مگن تینوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

”نہیں۔۔۔“ سارہ نے اسکرین پر نگاہیں جمائے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ چیری اور سینڈرا نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ وہ اسی طرح کھڑی مگر مکران کے چہرے دیکھے گئی۔

ہالے اور فلسطینیوں کے ساتھ سامان پیک کروانے اور احتجاجی شرٹس پہن کر اس کا ررواں میں شامل ہونے کے لیے بہت سے ترک اسٹوڈنٹس بھی آگئے تھے۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو گرمی، سردی، ہر موسم میں منی اسکرٹس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ وہ لڑکے جن کا دین مذہب سے کوئی دور دور کا واسطہ بھی نہ تھا، کانوں میں بالی اور قابل اعتراض تصاویر والی شرٹس اور جینز پہننے والے لڑکے اب سب ایک ہو گئے تھے۔ مگر وہ لڑکیاں چیری، سارہ، سینڈرا، ٹالی، وہ جن کے ساتھ حیا اور ڈی جے رات کو گھنٹوں باتیں کرتی تھیں، جو ساتھ کھاتی پیتی، سوتی جاگتی، ہنستی بولتی تھیں، اب وہی لڑکیاں اجنبی بنی بیٹھی تھیں۔

”یہ لوگ کیوں نہیں چل رہے؟“ سب واضح تھا، پھر بھی اس نے الجھن بھرے انداز میں ہالے سے دھیرے سے پوچھا۔ ہالے نے سارہ والی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں حیا!“ وہ بالکل جپ کھڑی رہ گئی۔ ان چار ماہ میں انہیں ترک، پاکستانی، فلسطینی، نارویجن، ڈچ، چائینز، اسرائیلی اور ایسی ہی درجنوں تفریقات میں بانٹا گیا تھا، مگر آج قومیت کے سارے فرق مٹ گئے تھے۔ یہودی، عیسائی، بدھسٹ، سب ایک طرف ہو گئے تھے اور مسلمان اسٹوڈنٹس ایک طرف۔

اور وہ بھی کن سرابوں کے پیچھے دوڑا کرتی تھی؟ اسے بھی کن لوگوں کا لباس، کن کارہن سن اچھا لگتا تھا؟

انجم باجی اور جاوید بھائی سمیت وہ سب جب تا قسم پہ پہنچے تو وہ پانچ منٹ کے لیے معذرت کر کے تیزی سے استقلال اسٹریٹ کی طرف چلی آئی۔ اسے جہان کو بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ جتنے زیادہ مسلمان ہوں، اتنا بہتر تھا۔ برگر کنگ پہ معمول کی گماگھی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ کی میزوں سے ہٹ کر اندر جانے والے دروازے میں داخل ہو گئی۔ کچن میں ایک ترک لڑکی اور ایک نیالڑکا کام کر رہے تھے۔ دونوں شیفت تھے۔

”سلام! جہان کہاں ہے؟“ اس نے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے لڑکے کو مخاطب کیا۔

”وہ ابھی تو یہیں تھا۔ گوشت کاٹ رہا تھا۔ اب شاید۔۔۔“ لڑکے نے مڑ کر ایک دوسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ ”شاید ڈریسنگ روم میں ہو یا پھر ہاتھ روم میں۔“

اسی پل ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا۔ حیا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ جہان اندر داخل ہو رہا تھا، یوں کہ سر جھکائے وہ آنکھوں کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔

اٹھائی۔ اس کی آنکھیں بھیگی اور سرخ سی ہو رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرایا اور سلیب کی طرف آیا۔

”السلام علیکم! تم کب آئیں؟“ وہ اس سے نظر ملائے بغیر گردن جھکا کر ٹرے سے گوشت کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

”بھی۔۔۔ تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ہاں! بس پاز کائے سے آنکھوں میں تھوڑی جلن ہو رہی تھی تو ابھی منہ دھوئے گیا تھا۔“ اتنی لمبی وضاحت؟ وہ بھی جہان دے؟ اور پیانے۔ اس نے ارد گرد دیکھا، پاز تو کہیں نہیں تھی۔

”تم بتاؤ! کیسے آئیں؟“

”وہ۔۔۔ ہم اسٹریٹ پروٹسٹ کے لیے جا رہے ہیں، فریڈم فلوٹیلہ حملے کے خلاف۔ تم چلو گے؟“

”نہیں تھا؟“

”اسلحہ؟ نہیں جہان! ان میں دوا اور خوراک تھی۔“ اس نے اچھے سے جہان کو دیکھا۔ کیا وہ اتنا بے خبر تھا؟

”یہ تو تم کہہ رہی ہو۔۔۔ اسلحہ نہ ہوتا تو اسرائیلی کیوں روکتے اسے؟“ وہ لاپرواہی سے کہتے ہوئے گوشت کے قتلے کھٹکھٹ کاٹ رہا تھا۔

”جہان! کیا تمہیں لگتا ہے کہ ان کو کسی وجہ کی ضرورت ہے؟“

”یہ ان کی آپس کی جنگ ہے حیا! یہ فلسطینی بھی اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ یہ جہاد وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ سب دہشت گردی کی قسمیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فلوٹیلہ کو واقعی ناجائز روکا گیا ہو، مگر ہمیں فلسطینیوں سے زیادہ فلسطینی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“

”جہان! یہ کیسے ہمارا مسئلہ نہیں ہے، ہمارے راجن کو ہماری ضرورت ہے۔“

”ہمارا راجن ہمارے پیدا ہونے سے پہلے بھی

تھا اور ہمارے مرنے کے بعد بھی رہے گا۔ اسے ہماری قطعاً ضرورت نہیں ہے اور پلیز! تم اس محمد بن قاسم ایراکے رومانس سے نکل آؤ۔“

وہ بہت بے زاری سے گردن جھکائے کام کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ کیسا جہاد ہے کہ بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر بندوق اٹھائے نکل پڑو۔ جہاد تو وہ ہوتا ہے جو ایک آدمی اپنے گھروالوں کے لیے مشقت کر کے روزی کماتا ہے، جو میں کرتا ہوں، جو اس ریسٹورنٹ میں میرے ورکرز کرتے ہیں۔“

”جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ۔۔۔ بہر حال میں تم سے متفق نہیں ہوں۔۔۔ اور اگر تم غلط ہو کر اتنے پر اعتماد ہو سکتے ہو تو میں صحیح ہو کر پر اعتماد کیوں نہ ہوں؟“ وہ تلخی سے کہہ کر پلٹ گئی۔

جہان نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا، پھر سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

مسلمان اسٹوڈنٹس کا دوسرے ترک باسیوں کے ساتھ اسٹریٹ پروٹسٹ جاری تھا۔ پلے کارڈز اور بینرز اٹھائے وہ لعنے بلند کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک شخص زور سے پکارتا تھا ”ڈاؤن وو!“ تو باقی لوگ ہم آواز ہو کر ”اسرائیل!“ چلاتے۔ ہر طرف ”Down with Israel“ کے نعروں کی گونج تھی۔ پاکستان میں ایسے مظاہروں میں عموماً ”مردوں، عورتوں کے درمیان تفریق سی ہوتی تھی، مگر ترکی میں دونوں صنف اکٹھے ہی ریلی میں چل رہے تھے۔ یوں بہت بچ بچ کر چلنا پڑتا، لیکن اس کا ذہن ابھی تک جہان میں اٹکا تھا۔

ہر ایک کے سیاسی تجزیات الگ ہوتے ہیں سب کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، پھر اسے کیوں بار بار رونا۔۔۔ آ رہا ہے اور وہ کیوں بار بار اپنے آنسو بمشکل روک رہی ہے؟

وہ اسرائیلی ایمبیسی کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ معصم کا وعدہ پورا نہ ہو سکا، مگر ان کا احتجاج شان

روک رہی ہے؟

وہ اسرائیلی ایمبیسی کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ معصم کا وعدہ پورا نہ ہو سکا، مگر ان کا احتجاج شان

دار رہا۔ اگلے روز اس کا پیر تھا۔ وہ بے دلی سے تھوڑا بہت بڑھ کر جلدی سو گئی اور پھر صبح منہ اندھیرے اٹھ کر کتابیں لیے جھیل پہ آگئی۔

ہر سونیا سا اندھیرا اچھایا تھا۔ جون شروع ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گرمی صرف دن میں ہوا کرتی تھی۔ وہ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پہ کتاب رکھ لی۔ ہوا کے باعث شال سر سے پھسل کر گردن کی پشت پہ جا ٹھہری۔ دور دور تک کوئی نہ تھا وہاں اکیلی تھی۔

رونا تو اسے رات سے ہی آ رہا تھا، مگر اب اس میں شدت آگئی تھی۔ وہ سر جھکائے بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ گھر آیا، اماں، رو حیل سب بہت یاد آرہے تھے۔ دفعتا اس کا فون بجا۔ اس نے گھاس پہ رکھا موبائل اٹھایا۔

”جہان کلنگ اس وقت؟ خیریت؟ وہ حیران ہوئی۔

”جہان! کیا ہوا؟“ وہ زکام زدہ آواز میں ذرا پریشانی سے بولی۔

”تم جاگ رہی ہو؟ آج تمہارا پیر ہے نا۔“
”ہاں! میں جھیل پہ ہوں، تم کہاں ہو؟“
”ایک کام سے قریب میں آیا تھا، بس تم رکو! میں آ رہا ہوں۔“

جیانے موبائل بند کیا اور تھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنا غیر متوقع رویے رکھنے والا شخص نہیں دیکھا تھا۔

”ہیلو!“ چند ہی منٹ بعد وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ جینز اور چاکلیٹ کلرٹی شرٹ میں وہ بہت تروتازہ لگ رہا تھا۔
”تم اتنی صبح کیسے؟“

”یہاں مجھے قریب میں پہنچنا تھا، سات بجے تک۔ سوچا جلدی آجاؤں تاکہ پہلے تم سے مل لوں۔ مجھے لگا، تم کل ذرا ناراض ہو گئی تھیں۔“ وہ اسی کے انداز میں اکڑوں بیٹھا اب جھیل کے پانی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا

تھا۔ وہ بھی پانی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

”نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ چند لمحوں خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”جیا! ایک بات کہوں؟ کبھی بھی اپنے قرابت داروں سے ان کے پولیٹیکل ویوز کے باعث ناراض نہیں ہوتے۔“ وہ بہت نرمی سے دھیمے انداز میں سمجھا رہا تھا۔ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

”ہر شخص کے رویے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا تاکہ جب تک آپ کسی دوسرے کی جگہ پہ کھڑے ہو کر نہیں دیکھتے، آپ کی سمجھ میں پوری بات نہیں آسکتی۔ ہر کہانی کی ایک دوسری سائیڈ ضرور ہوتی ہے۔“ اس نے چہرہ موڑ کر حیا کو دیکھا۔ ”اب بتاؤ کیوں رو رہی تھیں؟“

”نیوں ہی۔“ وہ فوراً نگاہ چرا کر پانی کو دیکھنے لگی۔
”بس گھریاؤ آ رہا تھا۔“

”صبر کرو، انسان کو ہمیشہ اتنی ہی تکلیف ملتی ہے جتنی وہ سہ سکے۔“

”اور اگر وہ نہ سہنا چاہے؟ آخر کیوں انسان کو سہنا پڑتا ہے سب کچھ؟ زندگی آسان کیوں نہیں ہوتی جہان؟“ اس کی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔ وہ ابھی تک پانی کو دیکھ رہی تھی جو چمک رہا تھا۔ جیسے نیلے آسمان پہ چاندی کے تھال کی طرح کے چاند سے قطرہ قطرہ چاندی پھل کر جھیل کی سطح پہ گر رہی تھی۔

”ابھی تمہاری اسٹوڈنٹ لائف ہے، اسے جتنا انجوائے کر سکتی ہو، کرو۔ کیونکہ اس کے بعد زندگی اپنا نقاب اتار پھینکتی ہے اور چیزیں بہت مشکل ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی تمہاری زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تم کرو گی مجھ سے شادی؟“

لمحوں بھر کو چاندی کی تہہ جھیل کی سطح سے پھیل کر سارے سبزہ زار پہ چڑھتی گئی۔ وہ ہر شے کو چاندی بنا گئی اور وہ دونوں بھی چاندی کے مجسمے بنے رہ گئے، چپکے ہوئے سلور مجسمے۔

”ہماری شادی ہو نہیں چکی؟“

”وہ تو ہمارے بیٹوں نے کی تھی۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم مجھے جانتی ہو۔ میں کوئی ہر وقت ہنستا مسکراتا آدمی نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں، میں بعض دفعہ بہت سخت ہو جاتا ہوں اور تب تمہیں میں بہت برا لگتا ہوں۔ مجھے پتا ہے، مگر میں ایسا ہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ ساری زندگی رہ لو گی؟“ وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ جیانے دھیرے سے شانے اچکائے۔
”استنبول میں ہر حالات میں رہنے کے لیے تیار ہوں میں۔“

”اللہ نہ کرے جو ہم یہاں رہیں۔“ وہ ایک دم بالکل غیر ارادی طور پہ چونک کر بولا۔ چاندی کے دوسرے مجسمے نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”کیوں؟“

”نیوں ہی کہہ رہا تھا۔“ پہلے مجسمے نے گردن موڑ لی۔

”تمہیں پھپھو نے کب بتایا کہ ہم۔۔۔؟“ وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

”وہ کیوں بتائیں؟ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا اور آٹھ سال کے بچے کا حافظہ اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے پتا تھا۔“
”میں سمجھی تھی کہ تمہیں نہیں پتا۔“ بے اختیار اس نے زبان دانستوں تلے دبائی۔ زبان بھی چاندی بن چکی تھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، میں ہر کسی سے معذرت کرنے آجاتا ہوں یا۔ ہر لڑکی کو ڈرنے کے لیے لے جاتا ہوں؟“ وہ ذرا خفگی سے اس معذرت کا حوالہ دینے لگا۔ جب اس نے اس کا جنر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔

”تم میری بیوی ہو اور میرے لیے بہت خاص ہو۔ بس میرے کچھ مسئلے ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں تو ہم اپنی زندگی شروع کریں گے۔“

چاندی کی تہہ اب سبزہ زار کے دہانوں سے پھیلتی دُورم بلا کس پہ چھائی جا رہی تھی۔ پوری دنیا زمین

آسمان سب چاندی بنا جا رہا تھا۔

”جیا! ہمارے بہت مسئلے رہے ہیں، مگر میری ماں۔۔۔ ہم انہیں ٹھیک کر لیں گے۔“ وہ زخمی انداز سے مسکرایا۔ ”ہم ہمیشہ سے ساتھ مل کر اپنے مسئلے ٹھیک کرتے آئے ہیں۔ ہم نے بہت اذیتیں کالی ہیں۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر میری ماں بہت مضبوط عورت ہے، بہت نڈر، بہت بہادر۔ انہوں نے ساری زندگی

بوتیکس کے لیے کپڑے سی کر مجھے کسی قابل بنایا ہے۔ وہ اب بھی یہ کام کرتی ہیں، مگر انہوں نے تمہیں نہیں بتایا ہو گا۔ وہ اپنے مسئلے کسی سے بیان نہیں کرتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اتنی ہی مضبوط اور بہادر بن جاؤ۔“ وجہ مجسمہ اٹھ کھڑا ہوا تو چاندی کا خول چٹکا۔ سبزہ زار پہ چڑھے ورق میں دراڑیں پڑ گئیں۔

”میں چلتا ہوں، تم اچھا سا ایگزام دو اور اگر لندن جانے کا موڈ ہو تو بتانا۔“ ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ آگتا، وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

وہ بھیگی آنکھوں اور نیم مسکان کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔

چاندی کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر جھیل کے پانی میں گم ہو رہے تھے۔ چاند اب سرخ نارنجی روشنی کے نقطوں سے ڈر کر بادلوں کی اوٹ میں تیرنے لگا تھا۔ فسون ختم ہو چکا تھا، حقیقی دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

چھ جون کو جب تک اسرائیل نے سارے قیدی رہا کر دیے تب تک سبائی اور استنبول میں غم و غصے کی فضا چھائی رہی۔ قیدیوں کی رہائی کے لیے مظاہرے، طیب اردگان کے سخت بیانات اور فلسطینی اسٹوڈنٹس کا تناؤ اور بھی بہت کچھ ہوا جو ہماری کہانی کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ ہر حال، ماوی مرمر اور فریڈم فلوٹیلہ کی پریشانی ختم ہوئی تو سب ایگزامز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ امتحان بھی اسی لمبے اسکرٹ، فل سیلویلاؤز اور

اسکارف سے کیے گئے نقاب میں دیتی تھی اور اب اسے اپنے اسی چہرے کی عادت ہوئی جا رہی تھی۔ کندھے پہ بیگ لٹکائے اور سینے سے فائل لگا کر بازو لپیٹے وہ سر اٹھا کر بہت اعتماد سے جب سب انجی کی راہداری میں چلتی تو اسے ٹالی اور اس کی دوستوں کی آوازوں کی پروا نہ ہوتی۔

ٹالی ابھی بھی ایسے استہزایہ انداز میں "Arap baci" کہتی تھی۔ (عرب باجی، یہ اردو والا باجی ہی تھا کہ ترکوں کا "C" جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔) البتہ ٹالی اور فلسطینی لڑکیوں کے درمیان فریڈم فلوٹلا کی کھینچی گئی لکیر ہنوز قائم تھی گو کہ ڈی جے اپنی دلی خواہش کی تکمیل دیکھنے کے لیے زندہ نہیں تھی۔

نوجوان کو امتحان ختم ہوئے تو الوداعی دعوتوں کا آغاز ہو گیا۔ پچاس ممالک کے ایکیجنج اسٹوڈنٹس میں سے کچھ آخری مہینے میں دوسرے ممالک جا رہے تھے جبکہ کچھ ترکی میں ہی رہ رہے تھے۔ وہ عائشہ کے پاس بیوک ادا جانا چاہتی تھی مگر وہاں عبدالرحمن تھا اور ابھی کافی تو اسے یاد ہوگی۔ وہ بدلہ بھی لے گا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ بس چند دن ہیں پھر وہ پاکستان چلی جائے گی تو نہ وہاں عبدالرحمن ہوگا نہ آوازے کئے والی ٹالی۔ وہاں اس کے حجاب کی عزت ہوگی۔ پہلی دفعہ اسے تیا فرقان کے نظریات برے نہیں لگے تھے۔ وہ ٹھیک ہی ارم پہ روک ٹوک کرتے تھے۔ ابا اور تیا کتنے خوش ہوں گے اس کے حجاب پہ۔ مگر نہیں اسے ان کی خوشی سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ کسی کی ستائش کے لیے تو یہ سب نہیں کر رہی۔

"ستائش کے لیے اگر کوئی حجاب لے تو جلد ہی چھوڑ دے کیونکہ یہ وہ کام ہے جس میں ریا ہو ہی نہیں سکتی۔" عائشہ نے اس کی بات پہ ہنس کر کہا تھا۔ وہ اتنے دنوں بعد آج بیوک ادا آئی تھی اور اب وہ تینوں ساحل کے کنارے ایک اوپن ایر کیفے میں بیٹھی تھیں۔

اس سے قبل وہ ان دونوں بہنوں کے ساتھ حلیمہ

آئی کی طرف بھی ہو آئی تھی۔ آئی عثمان انکل اور سفیر کے ساتھ کہیں نکل رہی تھیں۔ بس دروازے پہ ہی کھڑے کھڑے سلام دعا ہو سکی۔ عثمان انکل ویسے ہی تھے بھاری بھر کم اور خوش مزاج۔ ڈی جے کا افسوس کرنے لگے تو عادتاً بولتے ہی چلے گئے اور ہمارے گل برے برے منہ بنا کر سنے لگی۔ ایک وہی تھی جو اپنے تاثرات نہیں چھپایا کرتی تھی سفیر سے البتہ ہمارے اور عائشہ دونوں بور نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتی تھیں اور اب حیا کی سفیر سے سرسری سی ملاقات بھی ہو گئی تھی۔ وہ تیس چوبیس برس کا خوش مزاج سالک تھا جیسا کہ یورپ میں مقیم پاکستانی لڑکے ہوتے ہیں۔

اس کی شادی اس کے والدین پاکستان میں زبردستی کرنے کے خواہاں تھے اور یہ قصہ ہمارے اتنی دفعہ دہرا چکی تھی کہ وہ حیا کے لیے اہمیت کھو چکا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ہوئے گرینڈ میں کام کرتے تھے اور اس دس منٹ کی ملاقات میں بھی چند ایک بار سفیر کے لبوں سے "عبدالرحمن بھائی" ضرور نکلا تھا۔ وہی ستائش فخر سے نام لینے کا انداز جوان دونوں بہنوں کا بھی خاصہ تھا۔ پتا نہیں ان سب کو عبدالرحمن میں کیا نظر آتا تھا۔

جانے سے قبل اس نے ایک دفعہ سوچا کہ عثمان شہر سے بوجھ لے کر جہاز میں انہوں نے اگلی نشست پہ بیٹھی ترک عورت کو کیا کہا تھا کہ وہ خفگی سے واپس مڑ گئی تھی مگر پھر اس نے جانے دیا۔ بعض باتیں ادھوری ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔

"اور ریا کاری کی ایک پہچان ہوتی ہے حیا!" عائشہ کہہ رہی تھی۔ "بعض دفعہ بندے کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ دکھاوا کر رہا ہے مگر ایسے کام کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اللہ اس پہ کبھی ثابت قدمی عطا نہیں کرتا۔" ساحل کے کنارے پر سیاہوں کا خلاصہ تھیں۔ بیوک ادا، استنبول والوں کا "مری" تھا۔ موسم گرما شروع ہوتے ہی سیاہوں کا رش لگ جاتا تھا۔

بھورے، سرمئی پروں والے سمندری بگلے بھی ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔ ہمارے کے ہاتھ میں روٹی تھی اور وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بگلوں کی طرف اچھال رہی تھی۔ ایک ٹکڑا بھی زمین پہ نہ گرتا، بگلے فضا میں ہی اسے چونچ میں دبا لیتے۔

"ثابت قدمی واقعی مشکل ہوتی ہے عائشہ! میری ساتھی اسٹوڈنٹس اکثر مجھ پہ آوازیں کس کر پوچھتی ہیں کہ میں نے اس بڑے سے اسکارف کے اندر کیا چھپا رکھا ہے؟"

"تم آگے سے کہا کرو خود کش بم چھپا رکھا ہے۔" ہمارے نے اس کی طرف گردن جھکا کر رازداری سے کہا تھا مگر اس کی بہن نے سن لیا۔

"بری بات ہمارے! عائشہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "جب اچھی لڑکیاں کوئی فضول بات سنتی ہیں تو اسے بہت باوقار طریقے سے نظر انداز کر دیتی ہیں۔" ہمارے نے اتنی ہی خفگی سے سر جھٹکا اور روٹی کے ٹکڑے توڑنے لگی۔

"خیر ہے ہمارے! بس جولائی میں میں واپس چلی جاؤں گی اور وہاں نہ ترک حکومت کی سختی ہوگی نہ اسرائیلی طعنے میں ادھر پوری آزادی کے ساتھ حجاب لے سکیں گی۔"

"ضرور مگر خندق کی جنگ میں ایک بنو قریظہ مل ہی جاتا ہے حیا!"

"مطلب؟" اس نے نا سمجھی سے ابرو اٹھائی۔ جواباً عائشہ اپنے خاص انداز میں مسکرائی جیسے اس کے پاس دکھانے کے لیے کوئی خاص جواہر ہو۔

"تم نے کبھی سوچا ہے حیا کہ آیت حجاب سورہ احزاب میں ہی کیوں آئی ہے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے ایک نیا سوال کیا۔

اس نے ذہن پر زور دیا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "شاید اس لیے کہ یہ حکم غزوہ احزاب کے قریب ہی اتر ا تھا۔"

"یہ تو سب کو نظر آتا ہے حیا!" میں تمہیں وہ

سمجھاؤں جو سب کو نظر نہیں آتا؟ یقین کرو یہ گتھی تمہارے پزل باکس کی پہیلیوں سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوگی۔"

حیا لا شعوری طور پہ کرسی پہ ذرا آگے ہوئی۔ ہمارے برے برے منہ بناتی روٹی کے ٹکڑے اچھال رہی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی کہ عائشہ سن لیتی اور سب کے سامنے وہ ہمیشہ علستے کی وفادار رہتی تھی لیکن اس نے ایک قدیم لوک کہانی میں پڑھا تھا کہ مرمرا کے بگلے ان کی باتیں بھی سن لیتے ہیں سو اس نے دل ہی دل میں ان پھر پھڑاتے بگلوں کو مخاطب کیا تھا۔

(عبدالرحمن ٹھیک کہتا ہے میری بہن کو لیکچر دینے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ کیا تم نے سنا میں نے کیا کہا؟) "اللہ چاہتا تو کسی اور سورہ میں یہ حکم نازل کر دیتا یا اس سورہ احزاب کا نام کچھ اور رکھ دیتا مگر یہی نام کیوں؟"

ایک چھوٹے بگلے نے فضا میں ہی ہمارے کا پھینکا ٹکڑا اچکا اور پر پھر پھڑاتے ہوئے اڑ گیا۔ ہمارے نے گردن اٹھا کر اسے اوپر اڑتے دیکھا۔ کیا اس نے سنا تھا جو وہ اس سے کہہ رہی تھی؟

"تمہیں پتا ہے احزاب کہتے ہیں گروہوں کو اور "غزوہ احزاب" دراصل غزوہ خندق کا دوسرا نام ہے مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سارا واقعہ جانتی ہو کہ کس طرح مسلمانوں نے خندق کھودی مگر پھر بھی میں تمہیں یہ دوبارہ سنانا چاہتی ہوں۔"

(میری بہن حیا کو بور کر رہی ہے اگر عبدالرحمن ادھر ہوتا تو یہی کہتا کیا تم نے اب سنا؟) مگر بگلے بس روٹی چونچوں میں دبا کر اڑ جاتے۔

"تمہیں پتا ہے مدینہ میں یہود کے ساتھ مومنین کا معاہدہ تھا کہ مدینہ پہ حملہ ہوا تو مل کر دفاع کریں گے مگر یہود تو پھر یہود ہوتے ہیں۔ بنو قریظہ یہود کے گروہ نے اہل مکہ سمیت کئی گروہوں کو جاجا کر اکسلیا کہ مدینہ پہ حملہ کر دیں وہ ان کے ساتھ ہیں۔ یوں جب سارے گروہوں نے لشکر کی صورت مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا

تو بنو قریظہ! آپ کا اعتماد توڑ کر ”گروہوں“ کے ساتھ جا ملا۔ ”عائشہ سانس لینے کو رکی۔ ہمارے یگوں کو بھول کر رولی توڑنا چھوڑ کر عائشہ کو دیکھ رہی تھی۔

”تب مسلمانوں نے اپنے اور دشمن کے ”گروہوں“ کے درمیان ایک بہت لمبی بہت گہری خندق کھودی تھی۔ سردی اور بھوک کی تکلیف واحد تکلیف نہیں تھی۔ اصل اذیت کسی حلیف کے دھوکا دینے کی ہوتی ہے۔ باہر والے تو دشمن ہوتے ہیں مگر جب کوئی اپنا بیچ جنگ میں چھوڑ کر چلا جائے وہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی لیے جب یہ ”گروہ“ محاصرے سے تنگ آکر ایک عرصے بعد واپس چلے گئے اور بنو قریظہ خوف کے مارے اپنے قلعوں میں چھپ گئے تو ان کو سزا یہ ملی کہ بنو قریظہ کے ایک ایک مرد کو چن چن کر مارا گیا کہ یہ اللہ کا حکم تھا۔ جانتی ہو میں نے تمہیں اتنی لمبی کہانی کیوں سنائی؟“

”کیوں؟“ حیا کے بجائے ہمارے کے لبوں سے پھسلا۔ وہ اب ساری خفگی بھلائے عائشہ کی طرف پوری گھومی بیٹھی تھی۔

”کیونکہ حجاب پہننا جنگ خندق کو دعوت دینا ہے۔ گروہوں کی جنگ میں حجابی لڑکی کو دل پہ پھر باندھ کر اپنے گرد خندق کھودنی پڑتی ہے اتنی گہری کہ کوئی پائے کی جرات نہ کر سکے۔ اور پھر اسے اس خندق کے پار محصور رہنا پڑتا ہے۔ اس جنگ میں اصل دشمن اہل مکہ نہیں ہوتے بلکہ اصل تکلیف بنو قریظہ سے ملتی ہے۔ یہ جنگ ہوتی ہی بنو قریظہ سے ہے اور خندق کی جنگ کبھی بھی بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔“

عائشہ خاموش ہوئی تو کوئی سحر سا ٹوٹا۔ حیا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔

”تم صحیح کہہ رہی ہو مگر شکر ہے میری فیملی حجاب کی بہت بڑی حامی ہے۔ میرا ان سے ساری زندگی نقطہ اختلاف ہی یہ رہا ہے۔“

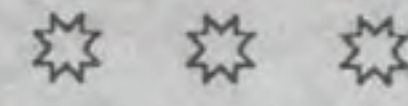
”ہو سکتا ہے تمہاری اس جنگ میں کوئی بنو قریظہ نہ ہو۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ عائشہ نے مسکرا کر دعا دی تھی۔

”مگر عائشہ! ہمارے کچھ کہتے کہتے الجھ کر رک گئی ان دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ قدرے مبہم سے تاثرات کے ساتھ کچھ سوچ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہمارے؟“

”کچھ نہیں۔“ ہمارے سنبھل کر مسکرائی۔ اسے حیا کے سامنے عائشہ کا ہمیشہ وفادار رہنا تھا لیکن بعد میں تنہائی میں وہ اسے بتائے گی کہ اس نے ابھی پوری پہیلی حل نہیں کی وہ احزاب کی پزل میں کچھ مس کر گئی تھی۔ وہ اصل نتیجہ نہیں جان سکی تھی اور وہ تو کتنے سامنے کی بات تھی۔ ہمارے نے ذرا سا غور کیا تو اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے دل ہی دل میں وہ بات بگوں سے دہرائی۔

(کیا تم نے اب سنا؟ کیا تم نے سنا؟) قریب ہی ساحل پہ پھدکتے بگلے نے ریت میں کچھ ڈھونڈنے کے لیے گردن جھکائی تھی۔ کیا یہ اثبات کا اشارہ تھا؟ ہمارے گل سمجھ نہیں سکی۔



امتحانات کا موسم ختم ہوا تو الوداعی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسٹوڈنٹس نے اب آخری مہینے کی سیاحت کے لیے روانہ ہونا تھا سو ساجی میں ایک دفعہ پھر سے وہی ماحول چھا گیا جو اسپرنگ بریک سے پہلے چھایا تھا۔ روانگی کی تیاریاں پیکنگ آخری شاہنجز نقشے گائیڈ بکس صرف وہی تھی جس نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اس رات ان کے ڈورم میں پوٹ لک Potluck ڈنر تھا۔ سب ایکچینج اسٹوڈنٹس اپنے ممالک کی ڈشز تیار کر کے لا رہے تھے۔ دسی کھانوں میں بریانی کے علاوہ اسے صرف چکن کڑا ہی بنائی آتی تھی سو انجم باجی کے اپارٹمنٹ پہ ان کے ساتھ مل کر اس نے وہی بنائی۔ نمک مرچ البتہ ذرا تیز ہو گیا تھا۔

”چلو خیر ہے کم بنی ہے تو کم ہی کھائیں گے سب۔“ انجم باجی نے اسے تسلی دی۔ ابھی وہ دونوں ان کے

کمرے میں بڑے آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھیں۔ حیا اپنا سیاہ اسکارف ٹھوڑی تیلے پن اپ کر رہی تھی جبکہ انجم باجی آئی شیڈ لگا رہی تھیں۔ انہوں نے سلک کا نارمل سا جوڑا پہن رکھا تھا۔ جوڑا اچھا تھا مگر قمیص کافی چھوٹی اور شلوار کھلی تھی یا تو انجم باجی ذرا آؤٹ ڈیٹڈ تھیں یا انڈیا میں ابھی تک پٹیلہ شلوار اور چھوٹی قمیص کا فیشن چل رہا تھا (پاکستان سے تو وہ عرصہ ہوا غائب ہو چکا تھا) اس نے سوچا مگر کہا نہیں۔

”تم آج تو نقاب مت کرو آج تو پارٹی ہے۔“ اسے نقاب اڑتے دیکھ کر انجم باجی ذرا بے چینی سے بولی تھیں۔ وہ ذرا چونکی پھر دھیرے سے مسکرائی۔

”پارٹی تو ہے انجم باجی! مگر لوگ تو وہی ہیں جن سے سارا دن نقاب کرتی ہوں۔ اب اتارنا تو کتنا برا لگے گا۔“

اس نے بے حد رسان سے سمجھایا۔ تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اپنے دسی لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں نا حجاب پہ آپ کو ویسے اذیت نہیں دیتے جیسے ٹالی جیسے لوگ دیتے ہیں۔“

شکر ہے انجم باجی نے دوبارہ اعتراض نہیں کیا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ بھی تو ان کے پرانے فیشن پہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے پیشانی سے اسکارف تھیک کرتے ہوئے سوچا تھا۔

آج اس نے سیاہ سلک بلاؤز اور اسکرٹ کے ساتھ سیاہ اسکارف لیا تھا۔ پورا لباس سیاہ تھا بس آستین پہ کلاسیوں کے گرد سفید موتیوں کی دھری لڑی لگی تھی۔ جو دم ہم سی چمکتی تھی۔

ڈورم بلاک کے کامن روم میں روشنیوں کا سماں تھا۔ کرسیوں کے پھول ویسے ہی بنے تھے جیسے حسین کی سالگرہ کے دن بنائے گئے تھے۔ (آہ اس کا جنجر بریڈ ہاؤس اور ڈی جے!) یورپین لڑکیاں بہت دل سے تیار ہوئی تھیں۔ شوڈر لیس ملبوسات جو گھنٹوں پر سے اوپر آتے تھے جیسے وہ کوئی ہروم ٹائٹ ہو۔ ایسے میں وہ سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں خاموش

سی بیٹھی تھی۔ فلسطینی لڑکے اور ہالے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے سو نہیں آسکے تھے۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ دل میں عجیب سی ویرانی چھائی تھی جیسے وہ کسی غلط جگہ پہ آگئی ہو۔

اگر وہ پہلے والی حیا ہوتی تو ایسے تیار ہوتی کہ کوئی اسے نظر انداز نہ کر پاتا۔ وہ موقع کی مناسبت سے ساڑھی اونچا جوڑا اور ہائی ہیملز پہنتی اور اس نے سر جھٹکا زمانہ جاہلیت کی کشش ثقل آخر مرتی کیوں نہیں ہے؟ وہ کیوں بار بار کھینچتی رہتی ہے؟ حالانکہ وہ قطعاً واپس اس دور میں نہیں لوٹنا چاہتی تھی وہ تو اس پہاڑی پہ قدم بہ قدم اوپر چڑھنا چاہتی تھی پھر اب وہ نیچے کیوں دیکھ رہی تھی؟ نیچے تو کھالی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اسٹوڈنٹس ہنستے مسکراتے باتیں کرتے پینیں لیے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ٹالی اپنی ڈش اٹھائے لے آئی تھی۔ پتا نہیں گوشت اور گاجر کا کیا ملغویہ تھا جس کا وہ ایک بہت مشکل سا عبرانی نام لے رہی تھی۔ اس نے بہت خوش دلی سے حیا کے آگے ڈش کی تو حیا نے شکریہ کہتے ہوئے ذرا سا پلیٹ میں ڈالا۔ ٹالی مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ حیا نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے کانٹے میں گوشت کا ٹکڑا پھنسا یا پھر ایک دم ٹھہر گئی۔

وہ تو نقاب میں بیٹھی تھی۔ نقاب کے ساتھ وہ کیسے کھا سکتی تھی اسے کیوں بھول گیا کہ وہ نقاب کے ساتھ نہیں کھا سکتی؟

اس نے بے بسی سے ارد گرد دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر وہاں بہت سے لڑکے تھے۔ وہ نقاب نہیں اتار سکتی تھی کم از کم ٹالی کے اس ملغویے کے لیے تو نہیں۔

اس نے بے دلی سے کائنا پلیٹ میں گرا دیا۔ دل کی ویرانی بڑھ گئی تھی۔ اتنے سارے ایک جیسے لوگوں میں ایک ہی مختلف سی لڑکی پتا نہیں کہاں سے آگئی تھی۔ وہ ان سب میں بالکل مس فٹ تھی۔ اجنبی ایلین۔ کسی اور دنیا سے تعلق رکھنے والی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔ آگے پاکستان میں بھی تو دعوتیں اور تقریبات

ہوں گی۔ وہ تو ادھر بھی مس فٹ لگے گی۔ یوں اس لبادے میں خود کو لپیٹے، الگ تھلگ، خاموش سی، لوگ تو اسے پاگل کہیں گے۔ اسے اجنبی کہیں گے۔ اسے لوگوں کی باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا، مگر خود اس کو سارا منظر بہت اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں ”اوڈون آؤٹ“ وہ وہی بن چکی تھی۔

گھٹن پر ہٹ گئی تھی۔ اسے لگا اگر وہ کچھ دیر مزید بیٹھی تو رو دے گی۔ اسے یہاں سے کہیں بہت دور چلے جانا چاہیے، کسی جنگل میں، جہاں وہ اجنبی نہ ہو۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ راستے میں ٹالی، دیو لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، اسے آتے دیکھ کر وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”حیا! تم نے اپنے اسکارف میں کیا چھپا رکھا ہے؟“

دور ناب گھماتے ہوئے حیا نے پلٹ کر دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔
”خود کش بم! کیا دکھاؤں؟“ اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

ٹالی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بغیر ہار نکل آئی۔

اپنے دُورم میں آکر اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور پھر دروازے سے کمر نکالے آنکھیں بند کیے، تیز تیز سانس لینے لگی۔ چند ثانیے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمر خالی تھا۔ چاروں ڈبل اسٹوری بیتکس نفاست سے بنے پڑے تھے۔

وہ اسی طرح دروازے سے لگی زمین پر بیٹھتی گئی۔ اسکارف کی پن نوچ کر اتاری اور اسے اپنی میز کی طرف اچھالا۔ وہ کرسی پر جاگرا، ایک پلوٹکتا ہوا زمین کو چھونے لگا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے نہیں اٹھی۔ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھ گئی۔

وہ تو کبھی محفلوں کی جان ہوتی تھی۔ اتنی سحر انگیز کہ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اب؟ اب وہ کیسے ایک دم سے اجنبی بن گئی تھی؟

بپ کی آواز کے ساتھ پاکٹ میں رکھا فون بجا۔ اس نے فون نکال کر ڈیڈ بانی آنکھوں سے دیکھا۔ میجر احمد کا میسج آیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ بس تین الفاظ۔ شاید اس کے دل نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ بہت ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی سی ہے اس وقت یہ کوئی جی پی ایس ٹریکنگ نہیں تھی، وہ وجدان کا تعلق تھا۔ خیال کا رشتہ۔

وہ جواباً ”ٹائپ کرنے لگی۔“

”مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے۔ میجر احمد!“

پیغام چلا گیا۔ ”آنسو اسی طرح اس کے چہرے پر لڑھکتے رہے۔ اسے پرانی زندگی یاد نہیں آرہی تھی۔ اسے نئی زندگی مشکل لگ رہی تھی۔ اجزاء کی جنگ کی یہ خندق تو بہت گہری بہت تاریک تھی۔ اس میں تو دم گھٹتا تھا۔ وہ کیسے اس پر قائم رہائے گی؟“

احمد کا جواب آیا تو اسکرین جگمگا اٹھی۔ اس نے پیغام کھولا۔

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اسلام شروع میں اجنبی تھا۔ غنقریب یہ پھر اجنبی ہو جائے گا۔“

اور سلام ہو ان اجنبیوں پر!“

اسکرین پر ٹپ ٹپ اس کے آنسو گرنے لگے۔ اوہ اللہ! اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا۔

وہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ یہی اجنبی پن تو اسلام تھا۔ ایسی ہی تو ہوتی ہیں اچھی لڑکیاں۔ عام لڑکیوں سے

الگ، منفرد، مختلف۔ وہ دنیا میں گم، بے فکری سے قہقہے لگاتی، کپڑوں، کچھوتوں اور ڈراموں میں مگن لڑکیوں جیسی تو نہیں ہوتیں۔ اجنبیت ہی ان کی شناخت ہوتی ہے۔ وہ ساحل کی کچھڑ پر چمکنے والا الگ ساموتی ہوتی ہیں۔ اجنبی موتی۔

وہ دھیرے سے مسکرائی اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ وہ ایک مضبوط لڑکی ہے، اسے اتنی جلدی ہار نہیں مانی۔ وہ اسی اجنبی طریقے سے اس دنیا

میں سر اٹھا کر سب کے درمیان جیسے گی اور وہ دنیا والوں کو یہ کر کے دکھائے گی۔ آئندہ۔ وہ کوئی پارٹی چھوڑ کر نہیں آئے گی، وہ پورے اعتماد سے ان میں بیٹھے گی۔

وہ اٹھی اور اپنا اسکارف اٹھایا۔ پھر فون پر عائشہ کا نمبر ملانے لگی۔ اجنبی لڑکیوں کو اپنے جیسی ایلینز سے زیادہ سے زیادہ ان ٹیچ رہنا چاہیے تاکہ جب خندق کھودتے کوئی اپنے دل پر رکھا ایک پتھر دکھائے تو آپ اسے اپنے دو پتھر دکھا سکیں۔

”اسلام علیکم حیا! دوسری جانب ہمارے چمکی تھی۔“

”میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔“

”اچھا تم کیا سوچ رہی تھیں؟“ وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کا جوڑا کھولنے لگی۔ نرم، ریشمی بال کھل کر کمر پر گرتے چلے گئے۔ وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت تھی جتنی پہلے تھی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارا باکس کھلایا نہیں؟“

”ارے ہاں، وہ کھل گیا۔ مگر اس میں صرف ایک چابی تھی۔“

”کھل گیا؟ تم نے پہلی بوجھ لی؟“ ہمارے ایک دم سے بہت پر جوش ہو گئی۔

”ہاں میں نے بوجھ لی۔“

”تو اس باکس کی ”کی“ کیا تھی؟ کون سا لفظ تھا؟“

ہمارے کو بہت بے چینی تھی۔ اس نے بھی حیا کے باکس پر زور آزمائی کی تھی مگر سب اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

”اس کی Key تاقسم ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ عائشہ اور ہمارے باکس کے کوڈ کو عموماً ”کی“ کہا کرتی تھیں۔ مقفل باکس کی چابی۔

بالوں میں برش چلاتی، وہ ایک دم بالکل شرگئی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا کوند سا لپکا تھا۔

”کی؟“ اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ ”ہمارے! میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔ ابھی کچھ کام آن پڑا ہے۔“ اس نے جلدی سے فون بند کیا، اور اپنے

دراز سے پزل باکس نکالا۔ بہت تیزی سے اس نے سلائڈز اوپر نیچے کیں تاقسم کا لفظ سامنے آیا تو مقفل باکس کھل پڑا۔ مقفل باکس کی کنجی تاقسم تھی۔ اندر رتھے کاغذ پر لکھی تحریر واضح تھی۔

چابی کے نیچے دو فل اشاپس۔

چابی! اوہ خدایا۔ اسے پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آیا۔ بچی نے کہا تھا، توڑ کر کھولنے پر یہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس نے وہ تحریر توڑ کر کھولنے والے کے لیے لکھی تھی تاکہ وہ سمجھے کہ ”چابی“ سے مراد وہ لوہے کی چابی ہے جبکہ پہلی بوجھ کر کھولنے والے کو علم ہو گا کہ

چابی سے مراد ”تاقسم“ ہے۔

تاقسم کے نیچے دو فل اشاپس لگانے سے کیا بنتا تھا؟ وہ سوچنا چاہتی تھی، مگر لڑکیاں واپس آ گئیں تو اس کی

یکسوئی متاثر ہونے لگی۔ اس نے باکس لیا، اسکارف لپیٹا اور اسٹڈی روم میں آ گئی۔ وہاں ان کے دُورم بلاک کی دو ترک اسٹوڈنٹس بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کرسی پر آ بیٹھی اور ایک کاغذ پر لکھا ”تاقسم“

پھر اس کے نیچے کئی جگہوں پر نقطے لگا کر دیکھے، مگر کچھ نہیں بن رہا تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا تب بھی کچھ نہیں بنا۔

”سنو۔“ اس نے ان دونوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

”تاقسم کے نیچے آئی مین، تاقسم اسکوائر کے نیچے اگر ہم فل اشاپس لگائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟“

ایک لڑکی الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ دوسری نے بہت بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ”لگانے سے اگر تمہارا مطلب ٹریول کرنا ہے تو پھر سسلی!“

”کیا؟“ حیا کو سمجھ نہیں آیا۔

”تاقسم کے نیچے اگر تم میٹرو لائن پر دو پورے اشاپ ٹریول کرو، تو سسلی کا اشاپ آئے گا نا۔!“

وہ بالکل سناٹے میں رہ گئی۔

”اوہو، وہ تاقسم لفظ کی بات کر رہی ہے، اصلی والے اسکوائر کی نہیں۔“ دوسری لڑکی نے اپنی ساتھی کو ٹوکا تھا۔ جواباً اس لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے حیا کو

دیکھا۔ وہ بدقت مسکرائی۔

”نہیں میں اصلی والے تاقسم اسکو اڑکی ہی بات کر رہی تھی۔“ وہ کرسی پہ واپس گھوم گئی اور وہ تحریر پڑھی۔

چابی تلے دو فل اسٹاپس۔ یعنی تاقسم کے نیچے دو (پورے اسٹاپس) فل اسٹاپس سے مراد نقطے نہیں بلکہ میٹرو کے اسٹاپ تھے اور لوہے کی چابی تلے وہ نقطے اس نے توڑ کر کھولنے والے کے لیے بطور دھوکے کے لگائے تھے۔

”سلی!“ اس نے زیر لب دہرایا۔ سلی میں اس کی امانت تھی۔ ڈوبی کی امانت جسے میجر احمد نے چھپایا تھا۔ اسے اب کل صبح تاقسم کے نیچے پورے دو اسٹاپس تک سفر کرنا تھا۔

میجر احمد کا پزل آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح بہت سنہری، نرم گرم سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ تاقسم جانے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی کیلے بال ڈرائر سے سکھا رہی تھی۔ وہ کبھی بھی نم بالوں کو اسکارف میں نہیں باندھتی تھی۔ اسکارف پہننے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گندا میلا رہا جائے۔ وہ اب بھی اپنے بالوں کی خوب صورتی کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا کہ پہلے۔ جب تک بال خشک ہوئے ہالے ایک پیکٹ اٹھائے اندر چلی آئی۔

”فلسطینی اسٹوڈنٹس صبح سویرے قطر جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ وہ مجھے یہ تمہارا گفٹ دے گئے تھے۔ تب تم سو رہی تھیں۔ انہوں نے سب کو گفٹس دیے ہیں۔“

”اچھا، دکھاؤ۔“ وہ برش رکھ کر بہت اشتیاق سے پیکٹ کھولنے لگی۔ اندر اس کے خفے پہ ایک سادہ موٹے کارڈ پہ لکھا تھا۔

”لطیف نے بتایا تھا کہ کل ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ اپنے نقاب کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکی تھیں۔ اس لیے ہم یہ لے آئے۔ اس میں آپ کو کبھی

بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ منجانب فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس!“

اس کے نیچے ایک سیاہ سلک کالبادہ رکھا تھا۔ اس نے وہ اٹھایا تو وہ نرم، ریشمی سا کپڑا انگلیوں سے پھسلنے لگا۔ سیاہ، لمبا، عیبایا، جو ”حریر“ کا بنا تھا۔ وہ عام ریشم نہیں تھا بلکہ ذرا مختلف تھا۔ اس میں بہت ہلکی سی چمک تھی جتنی چائنا سلک کے ڈوپے میں ہوتی ہے۔ آستین پہ کلاسیوں کے گرد موٹے موٹے سبز پتھر لگے تھے کسی لیس کی طرح وہ بادام کے سائز کے تھے اور بالکل زمرود کی طرح لگے تھے۔ سوائے سبز اسٹونز کی لیس کے، سارا عیبایا سادہ تھا۔ اس کی اسٹول البتہ ریشم کے بجائے کسی نرم کپڑے کی تھی اور ساتھ میں ایک علیحدہ نقاب بھی تھا۔ اسے کارڈ پہ لکھی تحریر کا مطلب سمجھ آگیا۔ اس علیحدہ نقاب کو (جس میں آنکھوں کا خلا بنا تھا) پیشانی پہ رکھ کر سر کے پیچھے پن اپ کرنا تھا۔ یوں نقاب کی سائیڈ کھلی ہوئی اور وہ اس سے کھا سکتی۔

”یہ تو بہت مہنگا لگ رہا ہے، تمہیں پتا ہے یہ انہوں نے ضرور جواہر سے لیا ہو گا۔ وہاں ایک شاپ سے سعودیہ کے امپورٹڈ عیبایا ملتے ہیں، یہ وہی ہے اور تمہارے پاکستانی روپوں میں یہ دس پندرہ ہزار سے کم کا نہیں ہو گا۔“ ہالے ستائش سے اس خوب صورت عیبایا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں گرمی نہیں لگتی۔ پتا نہیں کیا میکانزم ہے، مگر اس کو تم گرم سے گرم ماحول میں بھی پہنو تو تمہیں ٹھن یا گرمی نہیں لگی گی۔“

”واقعی!“ وہ بہت متاثر سی عیبایا کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا خوب صورت اور باوقار تھا کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ اس نے اپنے لباس پہ ہی اس کو پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بٹن بند کرنے لگی۔ عیبایا اس کے قدموں تک گرنا تھا۔ جیسے کسی رائیل پرنس کا ریشمی لبادہ ہو۔ ایک بہت شاہانہ سی جھلک تھی اس میں۔

”بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ کہیں جا رہی ہو

تم؟“ ہالے کو کچھ یاد آیا ”اگر مارکیٹ جا رہی ہو تو مجھے کچھ منگوانا تھا۔“ وہ جلدی سے ایک کانڈیہ کچھ چیزیں لکھنے لگی۔

”ہاں، ٹھیک ہے لے آؤں گی۔“ اس نے عیبایا کی اسٹول چرے کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”بس مجھے سلی سے ایک امانت اٹھانی ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

ہالے نے جو میز پہ کانڈر رکھے لکھ رہی تھی نا سمجھی سے سر اٹھایا۔

”امانت؟ کیا کسی نے تمہارے لیے رکھوائی ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ ”چابی ہے تمہارے پاس؟“ ہالے نے عادتاً ”پوچھا وہ ہمیشہ باہر جانے سے قبل پوچھ لیا کرتی تھی کہ کون سی شے رکھی اور کون سی نہیں، مگر وہ ٹھنک کر رک گئی۔“

”کس چیز کی چابی؟“

”امانت کی چابی۔ اس کے بغیر تو نہیں کھلے گی نا۔“ ہالے! ”اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔“ تم۔۔۔ تم امانت کسے کہتی ہو؟“

”امانت لا کرز کو۔ تم ان ہی کی بات کر رہی ہو نا؟ ہم لیفٹ لگیج Left luggage لا کرز کو لگیج امانت بولتے ہیں نا۔“

”اوہ۔۔۔ لیفٹ لگیج لا کرز!“ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ”وہ لا کرز جہاں لوگ سامان محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں کہ بعد میں اٹھالیں گے؟“ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ چابی کسی لیفٹ لگیج لا کرز کی بھی ہو سکتی ہے۔

”ہالے۔۔۔ ہالے۔“ وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔ ”تمہیں پتا ہے سلی میں امانت لا کرز کہاں ہوں گے؟“ اس کی بات پہ ہالے متذبذب سی سوچنے لگی۔

”سچ کہوں تو میں نے کبھی اسٹنول میں کوئی پیکٹ لا کر لڑائی نہیں کیا، مگر عموماً ”ریلوے اسٹیشنز“ پہ لا کرز

ہوتے ہیں۔“ تم سلی کے اسٹاپ پہ دیکھنا، وہاں شاید کوئی مل جائے۔“

تاقسم کے نیچے دو پورے میٹرو اسٹاپس۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی امانت لا کر تھا۔ اس نے ذہن میں اس پہلی کوڈی کو ڈکھایا۔

☆ ☆ ☆

سلی کے میٹرو اسٹاپ پہ معمول کی گماگماہی تھی۔ وہ پرس کندھے سے لٹکائے، بہت پر اعتماد طریقے سے چلتی ٹکٹ کاؤنٹر تک آئی۔

”اسلام علیکم۔ مجھے کچھ سامان ڈمپ کرنا ہے لگیج امانت کس طرف ہے؟“ اس نے سرسری سے انداز میں لا کرز کا پوچھا۔ اس لیے کہ وہ مشتبہ نہ لگے، اس نے یہ نہ بتانا ہی بہتر سمجھا کہ کسی نے اس کے لیے امانت رکھوائی ہے۔

”میڈم! یہاں اس اسٹاپ میں تو کوئی لا کر نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟ یہاں کوئی لا کر نہیں ہے؟“ اس نے اچنبھے سے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

”جب سے میں یہاں کام کر رہا ہوں، تب سے تو اس اسٹاپ پہ کوئی لا کر نہیں ہے۔ شاید پہلے ہوتے ہوں۔ آپ کو پتا ہے نائن الیون کے بعد یورپ کے بہت سے ریلوے اسٹیشن سے لا کرز ختم کر دیے گئے تھے۔“ معمر ترک کلرک نے تفصیلاً بتایا۔

”اچھا!“ اس کا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ تاقسم سے میٹرو میں سوار ہونے کے بعد وہ پہلے اسٹیشن پہ نہیں اتری پھر دوسرے، یعنی سلی پہ اتر گئی۔ تاقسم سے میٹرو لائن کا آغاز ہوتا تھا، میٹرو ایک ہی سمت میں جاتی تھی، سو دو پورے اسٹاپس کا اختتام سلی پہ ہی ہوتا تھا۔

”آپ کو سامان رکھوانا ہے تو میرے پاس رکھوا دیں پھر بعد میں لے لیجئے گا۔“ وہ جانے لگی تو کلرک نے بہت خلوص سے پیش کش کی۔

”نہیں خیر ہے۔ میں اٹھالوں گی۔“ اس نے ”شعوری طور پہ پرس کو ذرا مضبوط پکڑ لیا۔“ بس مجھے

جواہر سے ذرا سی شاپنگ کرنی ہے، میں مینیج کر لوں گی۔“ اس کی آواز میں واضح مایوسی تھی۔

”اچھا آپ جواہر جا رہی ہیں؟ تو پھر آپ سامان وہیں رکھوا دیجیے گا۔ بلکہ۔۔۔ وہ ذرا سار کا۔“ جواہر میں امانت لا کر زہوتے ہیں۔ وہ انٹر نٹس کے قریب ہی بنے ہیں۔

”واقعی؟“ وہ جھٹکے سے واپس پلٹی تھی۔ ”امانت لا کر زہوتے ہیں؟“

”ارے میم! وہ زمانے گئے، جب لا کر زہوتے سے کھلا کرتے تھے۔ سلطنت ترکیہ اب بہت ترقی کر چکا ہے۔“ ترک بوڑھے نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا۔

”ہمارے امانت لا کر زہوتے سے کھلتے ہیں۔“

”آف کورس!“ حیا نے گہری سانس لی اور مسکرائی۔ ”اللہ ترقی یافتہ سلطنت ترکیہ کو سلامت رکھے! بار کوڈ!“ اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

بالآخر اسے سارے بریڈ کریمز ملتے جارہے تھے۔ نسلی کے اسٹاپ سے ایک ڈائریکٹ ایگزٹ تھی جو جواہر مال میں کھلتی تھی۔ وہ مال میں آئی اور تیزی سے ان لا کر زہوتے کی طرف لپکی جو داخلی حصے کے قریب ہی بنے تھے۔ ایک دیوار پہ پھیلے نارنجی لا کر زہوتے جیسے پگن کیمینٹس ہوں۔ سب پہ ایک ایک نمبر لکھا تھا۔ اس نے پرس سے چابی اور بار کوڈ سلپ نکالی اور پورے اعتماد سے چلتی لا کر زہوتے کے قریب آئی۔ وہاں کھڑا گاڑو بے اختیار اسے دیکھنے لگا۔

حیا نے وہاں لا کر زہوتے کی مشین کا طریقہ دیکھا۔ اسے پہلے لا کر نمبر ٹائپ کرنا تھا۔ وہاں بنے کی پیڈ پہ اس نے 6 کا ہندسہ دبایا۔ یہی ہندسہ اس کی بار کوڈ کی رسید کے چار کونوں میں لکھا تھا۔ یہی لا کر نمبر ہو سکتا تھا۔

مشین کی سیاہ اسکرین پہ چھ لکھا آیا، پھر اس نے بار کوڈ مانگا۔ حیا نے بار کوڈ والی طرف سے کاغذ شناخت کے لیے مشین کے سامنے کیا۔ ٹوں ٹوں کی آواز آئی اور اسکرین پہ سرخ عبارت ابھری۔ بار کوڈ غلط تھا۔

اس نے بے یقینی سے رسید کو دیکھا اور پھر مشین کو، شاید کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ گاڑو اب پوری گردن موڑ

کر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے جلدی سے مشین ری سیٹ کی اور 6 پہ انگلی رکھی، پھر بار کوڈ سامنے کیا سرخ عبارت پھر سے ابھری۔ کچھ غلط تھا۔

گاڑو کی نظریں اور بے بسی بھری پریشانی۔ وہ کیکپاتی انگلیوں سے تیسری دفعہ مشین ری سیٹ کرنے لگی تو رسید ہاتھ سے پھسل کر فرش پہ جا گری۔ وہ تیزی سے اسے اٹھانے کے لیے جھکی۔

رسید کا کاغذ الٹا کر اٹھا، یوں کہ الفاظ سر کے بل اٹنے نظر آرہے تھے۔ چاروں کونوں میں لکھا 6 اب الٹا ہو کر 9 لگ رہا تھا۔ کاغذ اٹھا کر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ 9 نمبر لا کر اوپر والی قطار میں سب سے آخری تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے مشین کے کی پیڈ پہ 9 پر انگلی رکھی، پھر بار کوڈ سامنے کیا۔ ہپ کی آواز آئی اور سبز رنگ کی عبارت ابھری۔ 9 نمبر لا کر کھل گیا تھا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھی اور 9 نمبر لا کر کا دروازہ کھولا (جیسے پگن کیمینٹ کو کھولتے ہیں) اندر ایک چوکور سی تجوری رکھی تھی جو پیچھے کہیں سے چپکی تھی۔ (یہ وہ تجوری تھی جس کی دھات کی تھوں میں شیشے کی تہہ ہوتی ہے، اور اگر اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو اندرونی شیشہ ٹوٹ کر تجوری کو جام کر دیتا ہے۔) اس نے تجوری کے کی ہول میں وہ چابی ڈال کر گھمائی۔ تجوری کھل گئی۔ حیا نے جلدی سے اسے کھولا۔ اندر ایک چھوٹی سی سیاہ خمیلیں ڈلی رکھی تھی جیسے انگوٹھی کی ڈلی ہوتی ہے۔ اس نے وہ ڈلی مٹھی میں دبائی اور اس احتیاط سے اپنے کھلے بیگ کے اندر گرادیا کہ پیچھے کھڑا گاڑو نہ دیکھ سکے۔

دو منٹ بعد وہ مال کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ترکی اور ترکی کے ایڈونچر۔ کبھی وہ ان پہ ایک کتاب ضرور لکھے گی، اس نے مفکرانے ہوئے سوچا تھا۔ فی الحال اسے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ آرام سے وہ ڈلی کھول سکے۔

دفعتا! اس کا موبائل بجایا۔

”آپ کا سربراہ برگر کنگ کی پینٹری میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اے آر پی۔“ دو سطور کا وہ مختصر سا پیغام اس کو سن کر گیا۔ کہیں عبدالرحمن، جہان کے پاس تو نہیں چلا گیا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے جہان کا ٹوٹا پھوٹا ریستورنٹ گھوما تھا۔ وہ نہیں۔

وہ واپس زیر زمین میٹرو کی طرف بھاگی تھی۔ برگر کنگ میں معمول کا شور اور رش تھا۔ وہ قریباً دوڑتی ہوئی کچن میں آئی تھی۔

”جہان کہاں ہے؟“ اس کے حواس باختہ انداز پہ وہاں شیفت لڑکے نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ ”وہ پینٹری میں ہے، مگر ٹھہریں، آپ ادھر نہ جائیں۔“ وہ پینٹری کی طرف بڑھی تو وہ لڑکا سامنے آ گیا۔

”مگر۔۔۔“

”میم پلیز، اس کا کوئی مہمان آیا ہے، وہ اندر ہے، اس نے کہا ہے۔ کسی کو اندر نہ آنے دوں، ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔“

”کچھ نہیں ہوگا، مجھے دیکھنے دو۔“

”پلیز مجھے سمسٹر کی فیس دینی ہے، آپ ادھر مت جائیں، وہ مجھے واقعی جان سے مار دے گا۔ اگر۔۔۔ اگر آپ کو اندر جانا ہی ہے تو آپ پچھلی گلی سے چلی جائیں، پچھلے دروازے کی گھنٹی بجادیجئے گا اور۔۔۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ باہر نکل چکی تھی۔

دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اسے پچھلی گلی سے پینٹری کے دروازے تک پہنچتے۔ اگر عبدالرحمن ادھر آیا تو وہ اسے جان سے مار دے گی، اس نے سوچ لیا تھا۔

پینٹری کا روشن دان کھلا تھا۔ وہ حیا کے چہرے برابر آتا تھا۔ اس سے اندر کا منظر اور آوازیں صاف سنائی دے رہا تھا۔ وہ جو گھنٹی بجانے ہی لگی تھی، بے اختیار رک گئی۔

جہان، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، حیا کی طرف پشت کیے کھڑا کہہ رہا تھا۔

”آواز نیچی رکھو۔ یہ تمہارا اولار نہیں ہے جہاں

میں تمہاری ساری بکواس چپ کر کے سنتا رہوں گا۔ یہ میری جگہ ہے!“

اس کے مخاطب نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ سرمئی برساتی، آنکھوں پہ عینک اور وہ ناقابل فراموش چہرہ جس پہ چند روز قبل اس نے کافی المٹی تھی۔ وہ پاشا کا چہرہ بھی نہیں بھول سکتی تھی۔

”ہا! تمہاری جگہ! مت بھولو کہ یہ جگہ میں نے تمہیں دی تھی جب تمہیں بیوک ادا سے فرار ہو کر چھپنے کی جگہ چاہیے تھی، مگر تم دنیا کے سب سے بڑے احسان فراموش ہو جہان!“

وہ دیوار سے لگی، پتھر کا مجسمہ بنی رہ گئی۔ استقلال اسٹریٹ کا شور غائب ہو گیا۔

”میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے۔“ وہ جواباً ”کمال بے نیازی سے شانے اچکا کر بولا تھا۔

”اور میرے کام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ اڑتالیس گھنٹے میں ہو جائے گا؟“

”نہیں۔“ جہان اسی رکھائی سے بولا تھا۔ ”کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں اور دوسری یہ کہ تم اپنے لالچ کے ہاتھوں بے صبر ہونے کے بجائے تھوڑا انتظار کرو تو بہتر ہوگا۔“

”لالچ؟“ پاشا نے بے یقینی سے دہرایا۔ ”میرا سب کچھ داؤ پہ لگا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں لالچی ہوں؟“

جہان نے لا پرواہی سے شانے اچکائے۔

”تمہارے اپنے جرائم کی سزا ہے، میرا کیا قصور؟“

”اور تمہیں تمہارے جرائم کی سزا کب ملے گی جہان سکندر؟“ وہ لب بھینچے اتنی سختی سے بول رہا تھا کہ جڑے کی رگیں تن گئی تھیں۔ ”یاد رکھنا، جس دن میں نے زبان کھولی، اس دن تم سیدھے پھانسی چڑھو گے۔“

جہان بے اختیار ہنس پڑا۔

”اور تمہیں لگتا ہے کہ میں پھانسی چڑھ کر تمہیں اولار میں عیش کرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گا؟ ایسی فیری ٹیل تم ہی گھڑ سکتے ہو پاشا بے!“

بے ترک میں صاحب یا مسٹر کے لیے استعمال ہوتا

تھا۔

پاشا بہت تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”تم ایک دفعہ پہلے بھی مجھے دھوکا دے چکے ہو، میں اس دفعہ تمہارا اعتبار نہیں کروں گا۔“

”تو نہ کرو!“ اس نے بے نیازی سے کندھوں کو جنبش دی۔ ”جنم میں جاؤ میری طرف سے۔“
پاشا چند لمحے بہت ضبط کیے اسے دیکھتا رہا، پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نگاہ روشن دان سے جھانکتے چہرے بڑی سیاح لہاؤے میں سے صرف اس کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آرہی تھیں جن میں سارے زمانے کی بے یقینی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہان! اسے اندر نہیں بلاؤ گے؟“

وہ جو چہرے پہ ڈھیروں بے زاری لیے کھڑا تھا، کرنٹ کھا کر پلٹا۔ حیا اسی طرح ساکت سی روشن دان کے بار کھڑی تھی۔

”کیا؟“ جہان نے بے یقینی سے دہرایا، اسے شاید لگ رہا تھا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ پاشا زیر لب مسکرایا۔

”تمہاری بیوی، سباجی یونیورسٹی کی ایجنسنگ اسٹوڈنٹ، ڈورم نمبر بھی بتاؤں؟ حیران مت ہو جہان! تم نے پاشا بے کو انڈرا سٹیٹ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ کچھ دن پہلے ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ کیوں مادام؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ اس نے آگے بڑھ کر پینٹری کا دروازہ کھولا اور اسے جیسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

”ملاقات؟“ جہان کے چہرے کا رنگ اڑچکا تھا۔ اس نے ششدر نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔ وہ اتنی ہی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی، بے اعتباری، فریب۔ جھوٹ۔

”حیا... یہ۔ تم اس کو جانتی ہو؟“ وہ متحیر سا تھا، جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ وہ اس سب سے بے خبر تھا۔ ”یہ... یہ سچ کہہ رہا ہے؟“

اس نے بمشکل اثبات میں گردن ہلائی، وہ ان ہی بے اعتبار نگاہوں سے پلک جھپکے بنا جہان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کون تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔
”اب بتاؤ، جہان! میرا کام اڑتالیس گھنٹوں میں ہو جائے گا یا نہیں؟“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ جہان نے اسے دیکھا، پھر اس کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور اپنے ساٹھی کو گریبان سے پکڑ لیا۔

”میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہارا کام کروں گا، اڑتالیس گھنٹوں سے بھی پہلے، لیکن اگر تم نے میری بیوی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا، تو استنبول کے کتوں کو کھانے کے لیے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔“

ایک جھٹکے سے اس نے پاشا کا گریبان چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں وہ خون اتر اٹھا کہ حیا دو قدم پیچھے ہٹی، اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ پاشا کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

”مجھے تمہاری بیوی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، نہ میں نے پہلے اسے کچھ کہا، نہ اب کہوں گا۔ مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔“

”ہو جائے گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ!“ وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

پاشا نے اپنی برساتی کا کار ٹھیک کیا اور پھر بنا کسی کو دیکھے باہر نکل گیا۔ حیا ابھی تک بغیر پلک جھپکے جہان کو دیکھتی دروازے میں کھڑی تھی۔

”تم اسے کیسے جانتی ہو، میں سمجھ نہیں پا رہا۔“ وہ اس کے قریب آیا تو وہ بے اختیار دو قدم مزید پیچھے ہٹی۔ وہ رک گیا۔

”میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا سنا، مگر تم نے ادھوری باتیں سنی ہیں۔ میرا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حیا... تم، تمہیں مجھ پہ اعتبار ہے نا، میری بات سنو!“ وہ بے بسی سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے اب جہان سکندر کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا تھا۔

وہ ایک دم مڑی اور اسکوائر کی جانب واپس بھاگی۔ وہ

اسے پکار رہا تھا، پریشانی سے بے بسی سے، مگر وہ کچھ بھی سنے بغیر دوڑتی جا رہی تھی۔

”میری لینڈ لیدی نے خوب ہنگامہ کیا۔ میں آج کل اس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ یہاں کوئی عبدالرحمن پاشا نہیں ہے۔ یونہی کسی نے اپنے بارے میں افواہیں پھیلوائی ہوں گی۔“

”جھوٹ... جھوٹ تھا۔ سب فریب تھا۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے جاب کو بھگور رہے تھے۔ ایک لمحہ بس، ایک لمحہ لگتا ہے اعتبار ٹوٹنے میں اور سب ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اسے مسلسل فون کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ سباجی واپس پہنچنے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اسے جہان کی بات سن لینی چاہیے ایک دفعہ اسے وضاحت دینے کا موقع دینا چاہیے، مگر وہ خوف، بے اعتباری کے دکھ سے برا تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ پاشا نے اسے ہرے کے طور پہ استعمال کیا۔ ایک بلیک میلنگ، ہتھیار کے طور پہ۔ یہ سب جرم کی دنیا کے ساٹھی تھے۔ کرمینلز۔ اسے ان کے درمیان نہیں رہنا تھا اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

پہلی دفعہ اسے استنبول سے بہت ڈر لگا تھا۔ اسے جلد از جلد واپس پاکستان پہنچنا تھا۔ اس کا گھر دنیا میں ان کی واحد محفوظ پناہ گاہ تھی۔

ہالے اس سے پوچھ رہی تھی، مگر وہ کچھ بھی بتائے بغیر مسلسل بے آواز روتی، سامان پیک کر رہی تھی۔ نہ بیوک ادا، نہ لندن، اسے اپنا آخری مہینہ پاکستان میں گزارنا تھا۔ پھر جولائی میں دو دن کے لیے وہ آکر کلیئرنس کروالے گی۔

فلائٹ رات کی ملی، اور تب تک ہر مرحلے پہ ہالے نے اس کی بہت مدد کی۔ سباجی کو وہ ایسے چھوڑے گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ سب کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ لڑکا بھی کبھی نہیں ملا جو ڈی جے کے گڈ مارٹنگ کا جواب دیا کرتا تھا۔ ادھوری یادیں۔ پورے دکھ۔

اس نے ابا کو مختصر سا بتا کر فون آف کر دیا تھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ اسے بس جلد از جلد وہاں

سے نکلنا تھا۔ ایرپورٹ پہ بھی وہ بہت پریشان اور چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔ جب آفیسر نے اسے لیپ ٹاپ ہینڈ کیمری میں رکھنے کو کہا تو وہ اڑ گئی۔
”مجھے اتنا بھاری ہینڈ کیمری نہیں اٹھانا بس۔“ یہ اس کا ڈی جے کو ایک آخری خراج تھا۔

جب فلائٹ نے استنبول سے ٹیک آف کر لیا اور مرمراں کے قدموں تلے آگیا تو اس کے دل کو ذرا سکون ملا۔ بالآخر۔ وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ بس، بہت ہو گیا ایڈو سنر، بہت ہو گئے پزل۔

”پزل؟“ وہ چونکی اور پھر جلدی سے پرس کھولا۔ مخملیں، سیاہ ڈبی اندر محفوظ پڑی تھی۔ وہ سارا دن اتنی پریشان رہی کہ اسے بھول ہی گئی۔ جانے اس میں کیا تھا؟

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈبی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

تمہاری اپنی لکھی ہو



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، اردو بازار، کراچی

گھوم پھر کر اسی کوچے کی طرف آئیں گے
 دل سے نکلے بھی اگر ہم تو کہاں جائیں گے
 ہم کو معلوم تھا، یہ وقت بھی آ جائے گا
 ہاں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ پچھتائیں گے
 یہ بھی طے ہے کہ جو لبوئیں گے وہ کاٹیں گے یہاں
 اور یہ بھی کہ جو کھوئیں گے، وہیں پائیں گے
 کبھی فرصت سے ملو تو تمہیں تفصیل کے ساتھ
 امتیازِ ہوس و عشق بھی سمجھائیں گے
 کہہ چکے ہم، ہمیں اتنا ہی فقط کہنا تھا
 آپ فرمائیے، کچھ آپ بھی فرمائیں گے
 ایک دن خود کو نظر آئیں گے ہم بھی اجمل
 ایک دن اپنی ہی آواز سے ٹکرائیں گے
 اجمل سراج

محبت اک روگ،

خواب بُننے کی رُت گزر گئی
 وہ سیلابی عمر بیت گئی
 تو کھلا

محبت زندگی کی جھلستی دھوپ میں
 تپتے سورج کی مانند ہوتی ہے
 محبت فقط رائیگانی ہوتی ہے
 محبت اک روگ ہے ایسا
 جو دلوں کی بستیاں تاراج کر کے
 سوائے دُکھ کے کچھ نہیں دیتا
 پوری زندگی کے ہوا
 اور کچھ ہمیں لیتا...!

نوشین اقبال نوشی

ایک میری رہی کمی مجھ میں
 اور کوئی نہیں کمی مجھ میں
 گھر بناتے ہی میں نے دیکھی ہے
 ایک عورت ڈری ڈری مجھ میں
 تیرے جانے کے بعد ایسا ہوا
 ناجیتی خامشی رہی مجھ میں
 تیرے بارے میں لوٹنے والے
 اب وہ دیوانگی نہیں مجھ میں
 کوئی احساس جاگتا ہی نہیں
 برف کیسی ہے آجھی مجھ میں
 اک قیامت ہی بپا کر ڈالیں
 تیری یادیں کبھی کبھی مجھ میں
 سانس تو اک ڈھکوسلہ ہے ندّا
 زندگی کب کی مرچکی مجھ میں
 ولی ندّا

جرم گرم میں نے کیا ہے تو بتایا جائے
 ایسے چپ چاپ نہ سوئی پہ چڑھایا جائے
 یہ عداوت کی فضا اس کیسے آئی ہے
 کیوں نہ اک دیپ محبت کا جلایا جائے
 میں نے بھی آبلہ پاٹی کا کرب جھیلا ہے
 میرے بھی نام پہ اک محل بنایا جائے
 دل کی نگری میں تو انبار لگے ہیں غم کے
 تم بتاؤ کیسے اشکوں میں بہایا جائے
 روپرے گی میرے اندر کی اداسی لوگو
 دل کے ایوان کو ایسا نہ سجایا جائے
 نازیہ کنول نازی

رپورٹ

ایک امریکی اخبار کی انتظامیہ نے اپنے ایک رپورٹر کو سمندر کے سفر پر بھیجا۔ جس دن جہاز جاپان کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اسی دن بڑے زور کا طوفان آ گیا۔ جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اخبار کا ایڈیٹر بڑا پر جوش تھا کیونکہ صرف اسی اخبار کا رپورٹر موقع پر موجود تھا۔ ایڈیٹر کو رپورٹ کا شدت سے انتظار تھا۔ بالآخر رات گئے رپورٹر کا پیغام موصول ہوا۔ ”میں بالکل خیریت سے ہوں سر! آپ فکر مند نہ ہوں۔۔۔“

سعدیہ ثاقب۔ ڈیفنس

علاج

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے سرور کی شکایت کی تو سہیلی نے مشورہ دیا۔ ”جب میرے سر میں درد ہوتا ہے تو میرا شوہر بڑے پیار سے میرا سر دیتا ہے اور اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے درد غائب ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم بھی یہ نسخہ آزما کر دیکھو۔۔۔“

”ہاں ہاں ضرور۔۔۔ تمہارا شوہر کب تک گھر آئے گا؟“ عورت نے اشتیاق سے پوچھا۔

سمیرا علی۔ لاہور

حسب توفیق

ایک نوجوان ایک منگے اور فیشن ایبل علاقے کے بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوا اور سیلز گرل سے بولا۔

”میں اپنی منگیت کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ خریدنا چاہتا ہوں۔“

”یہ سیلینگ گاؤں لے جائیں۔ چار ہزار روپے کا ہے۔“ سیلز گرل نے مشورہ دیا۔

”نہیں نہیں یہ تو بہت مہنگا ہے۔“ نوجوان بولا۔

”تو پھر یہ میک اپ کٹ لے جائیں ڈھائی ہزار روپے کی ہے۔“

”یہ بھی مہنگی ہے۔ اس سے کم قیمت کوئی چیز دکھائیں۔“

”یہ پرفیوم لے جائیں سات سو روپے کا ہے۔“ سیلز گرل بولی۔

یہ بھی میری گنجائش سے زیادہ ہے۔ اس سے بھی سستی کوئی چیز دکھائیے۔“ نوجوان نے فرمائش کی۔

”پھر آپ ایسا کریں۔ یہاں سے کوئی چیز خریدنے کے بجائے گونے والے موچی سے اپنی منگیت کے جوتوں میں نئی ایڑیاں لگوا دیں۔“

سیلز گرل نے شیریں لہجے میں مشورہ دیا۔

مسز ارشد آسی اتوالہ

پرانی فرم

نئی ملازمت کا ایک امیدوار اپنی پرانی فرم کی بے انتہا تعریفیں کر رہا تھا۔

”پرانی فرم اپنے ملازمین کو بچوں کی تعلیم کا الگ خرچ دیا کرتی تھی۔ فلیٹ کا کرایہ، میڈیکل کے اخراجات اور چھ ماہ کا بونس بھی دیا کرتی تھی۔“

”پھر آپ نے وہ نوکری کیوں چھوڑ دی؟“ منیجر نے پوچھا۔

”میں نہیں چھوڑی جناب!“ امیدوار نے افسرہ لہجے میں کہا۔ ”وہ فرم ہی دیوالیہ ہو گئی تھی۔“

نزمین لودھی۔ سرگودھا

تسلی

ملبوسات کی دکان پر سیلز گرل ایک خاتون کو مختلف قسم کے ملبوسات دکھا دکھا کر تھک گئی۔ خاتون کے سامنے کپڑوں کا انبار لگ گیا مگر انہیں کوئی لباس پسند نہ آیا۔ آخر میں سیلز گرل تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے، آپ کو کوئی ڈریس پسند نہیں آیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ خاتون نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ”تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تو ویسے بھی فریج خریدنے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔“

شائستہ جاوید۔ ایف بی ایریا

خطرے کا نشان

سیلاب کے دنوں میں ایک فلڈ آفیسر نے کہا۔

”دریائے چناب میں پانی کا زبردست ریلہ آیا ہے اور پانی خطرے کے نشان سے دو فٹ اوپر آ گیا ہے۔“

لوگوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اب کیا ہو گا؟“

آفیسر نے اطمینان سے جواب دیا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم نے انتظام کر لیا ہے۔ خطرے کا نشان پانی سے چار فٹ اونچا کر دیا ہے۔“

یلیحہ طاہر۔ جہراں

مناسب مشورہ

ایک مقدمے میں استغاثہ کے بیانات سننے کے بعد جج نے ملزم کے وکیل سے کہا۔

”اگر آپ چاہیں تو ملزم کو الگ لے جا کر اسے مزید کارروائی کے سلسلے میں مناسب ترین مشورہ دے سکتے ہیں۔“

یہ سن کر وکیل ملزم کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ اکیلا واپس آیا تو جج نے اس سے پوچھا۔

”ملزم کہاں ہے؟“ وکیل نے جواب دیا۔

”وہ تو بھاگ گیا۔ میں اسے مناسب ترین مشورہ ہی دے سکتا تھا۔“

نمرہ رزاق۔ ڈیفنس

سرکاری ملازم

ایک سرکاری ملازم ناشتا کرنے کے لیے میز پر بیٹھا تو گھنٹہ بھر تک اخبار ہی پڑھتا رہا، پھر اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر اس نے آواز دی۔

”چائے لاؤ۔“

”چائے تو میں لے آتی ہوں۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”لیکن کیا آپ آج دفتر نہیں جائیں گے؟“

”دفتر۔“ وہ چونک کر بولا۔ ”یا اللہ! میں تو اپنے دفتر میں چائے منگوا رہا تھا یہ گھر کیسے پہنچ گیا۔“

غزالہ شہباز۔ ہجرت کالونی

غیر شادی شدہ؟

نیویارک کے ایک ہوٹل میں ہوٹل کا سراغ رساں ایک کمرے میں داخل ہوا، جہاں ایک نوجوان جوڑا مقیم تھا۔ اس نے جوڑے پر الزام لگایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور ان کا ہوٹل ایسے جوڑوں کو قیام کی اجازت نہیں دیتا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ لڑکی غصے سے چلائی۔

”تم مجھے غیر شادی شدہ کہہ رہے ہو؟ اگر میرا شوہر یہاں موجود ہوتا تو تمہارے دانت توڑ دیتا۔“

کول عدنان۔ گلستان جوہر

فی الحال

دوسری عالمی جنگ میں جب لندن میں بمباری ہو رہی تھی تو ہوائی حملے سے بچاؤ کی ایک پناہ گاہ سول ڈیفنس وارڈن نے چلا کر پوچھا۔ ”اس پناہ گاہ میں ایسی

(حياة الصحابة، جلد سوم)

وقت ضائع کرنا،

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”مجھے
اس آدمی پر بہت غصہ آتا ہے جو مجھے فارغ نظر آتا
ہے نہ آخرت کے کسی عمل میں لگا ہوا ہے اور نہ دنیا
کے کسی کام میں“

اللہ کی راہ میں خرچ کرتا،

ایک دن ایک سائل ان کے پاس آیا۔ اس وقت ان کے پاس ان میں سے کوئی ٹچیر نہیں تھی۔ صرف تین دینار تھے۔ اس سائل نے جب مانگا تو انہوں نے ایک دینار سے دے دیا۔ پھر دوسرا آیا تو ایک

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
 ”سب سے بہترین عمل یہ ہے کہ تم غربا اور مساکین
 کو کھانا کھاؤ اور ہر شخص، خواہ وہ شتاساتہ ہو، اسے
 سلام کرو“ (بخاری 2-6)

صبر و قناعت ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ۔
ایک انصاری بہت ضرورت مند اور غریب تھا ۔ اس
کے گھر والوں کے پاس کچھ نہیں تھا ۔ وہ گھر سے باہر چلا
گیا ۔ اس کی بیوی نے اپنے دل میں کہا ۔ اگر میں غلی جلاؤں
اور تندور میں کھجور کی ہٹنیاں ڈال کر آگ جلاؤں تو میرے
پڑوسی غلی کی آواز سنیں گے اور دھواں دیکھیں گے ۔ اس
سے وہ یہ نہیں گے کہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ ہے اور
ہمارے پاس فقر و فاقہ نہیں ہے ۔

سو اس نے اٹھ کر تندور میں آگ جلائی اور چکی چلانے لگی۔ اتنے میں اس کا خاوند آ گیا۔ اس نے باہر سے چکی کی آواز سنی، پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیوی نے دروازہ کھولا۔ خاوند نے پوچھا۔

”تم کیا پیس لے رہی ہو؟“

بیوی نے ساری کارگزاری سُنادی۔ جب وہ دولہ
اندر گئے تو دیکھا، چکی خود بہ خود چل رہی ہے اور اس کے
اندر سے آٹا نکل رہا ہے۔ بیوی برتنوں میں آٹا بھرنے
لگی تو گھر کے سارے برتن آٹے سے بھر گئے۔ پھر اس نے
باہر جا کر تندور کو دیکھا تو وہ روٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔
خاوند نے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا واقعہ کہہ
سنايا۔

گا۔ میں نے ایک حمام میں پانچ برس نوکری کی مگر اس تمام عرصے میں ایک دفعہ بھی غسل نہیں کیا۔۔۔۔۔“

نوبہ کاشف۔ باغبان پورہ

کوشش

ایک بے وقوف اسکیم والی بوتل کا ڈھکن بار بار کھول کر بند کر رہا تھا۔ کسی دوست نے پوچھا۔
”کس کا ہوا؟“

بے وقوف ”یار! کیا کروں جب بھی ڈھکن کھول کر دیکھتا ہوں تو اس کے نیچے لکھا نظر آتا ہے ”کوشش جاری رکھیں۔“

(فاطمہ طاہرہ - کلفٹن)

مشغلہ

ایک سیٹھ صاحب سے انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔

”آپ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“

”پینٹنگ کرتا ہوں۔“ سیٹھ صاحب نے جواب

۱

”بہت خوب! ذرا ہمیں بھی اپنے شاہکار دکھائیں۔“
اینگرنے کہا۔

سیٹھ صاحب خوش ہو کر بولے۔ ”یہ آپ دیواریں دیکھ رہے ہیں نا! یہ میں نے ہی پینٹ کی ہیں“

بنت فیض۔ ملتان



کوئی عورت تو نہیں جو ماں بننے والی ہو۔“ تھوڑی دیر
خاموشی چھائی رہی پھر کہیں سے ایک عورت کی آواز
ابھری۔

”فی الحال کچھ بتانا مشکل ہے جناب! ابھی ہمیں یہاں پناہ لیے ہوئے چند منٹ ہی تو ہوئے ہیں۔“

نئی بکری

ایک سیاح افریقہ کے چڑیا گھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیر اور بکری ایک ہی پنجرے میں بند ہیں۔ گائیڈ نے کہا۔

”جناب! یہ باہمی اخوت کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔
ہمارے ہاں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے
ہیں۔“

سیاح پر جوش لہجے میں بولا۔ ”میں اس کے بارے میں اپنے وطن جا کر لکھوں گا۔ مگر اس کامیابی کا راز کیا ہے؟“

”بس روزانہ ایک نئی بکری پنجرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔“ گائیڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

صالحہ اقصیٰ - میرپور آزاد کشمیر

ایمان داری

ایک مجبور شخص نے ایک آدمی سے کہا۔
 ”میں سخت بھوکا ہوں۔ اگر آپ مجھے کھانا کھلا دیں
 تو میں اس کے بدلے میں آپ کا کوئی ایک کام کروں
 گا۔“

آدمی نے کہا۔ ”اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تم ایمان دار ہو تو میں تم سے مرغی خانے میں اینڈے جمع کرنے کا کام لوں۔ مگر تم شکل و صورت سے ایمان دار نہیں لگتے۔“

مجبور شخص نے کہا۔ ”میں آپ کے اطمینان کے لیے بتا دوں۔ شاید ہی کوئی مجھ سے زیادہ ایمان دار ہو

مردم شناس

کئی سال پیش ایک عالم اور مردم شناس عرب دوست نے بہت اہم تبصرہ کیا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ انسانی کردار اور اعمال کے مشاہدہ کی بنیاد پر بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ آپ بد شکل انسان ہیں عقل و فہم کا فقدان پائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس فرد کو اپنی رحمت سے نواز کر عقل و فہم دیتا ہے اس کو کم از کم خوش شکل بھی بناتا ہے۔

ایک خوبصورت بھول بد بودار نہیں ہوتا اسی طرح اللہ تعالیٰ عیاض، مکار اور ناقابل بھروسہ فرد میں ضرور ظاہری عیب دے دیتا ہے تاکہ دوسرے لوگ ہوشیار رہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ بات مد نظر رکھ کر لوگوں کا مشاہدہ کیا اور اس بیان کی صداقت کا قائل ہو گیا۔ حکمران سیاستدانوں اور دوسرے لوگوں سے جب میرا سابقہ پڑتا ہے تو خود یہ بات خیال میں آجاتی ہے۔ (سحر ہونے تک - ڈاکٹر عبدالقدیر خان)

اقوال زریں

ہم درحقیقت جو کچھ سیکھتے ہیں مکتب حیات میں سیکھتے ہیں۔ درس گاہیں اور کتابیں ہمیں کچھ نہیں سکھاتیں۔

ماہر کھوکھلے قہقہے کے مقابلے میں ایک مسکراہٹ زیادہ قیمتی ہے۔

ماہر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، وہ کہہ نہیں پاتے لیکن ہمیں وہ سب کچھ سننا پڑتا ہے جو ہم سننا نہیں چاہتے۔

ماہر جو قومیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں ان کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔

ماہر زندگی کی غنائتوں کو ہمیشہ ہنس کر سہو، یہ نہ ہو کہ لوگ تمہارے انسویں کا مذاق اڑائیں۔

ماہر خرابی ہمارے اندر ہوتی ہے نہ کہ ہمارے ستاروں میں۔

ماہر جو رشتہ ٹوٹ جائے وہ زندگی کی شاخ سے گرے پڑے جیسا ہوتا ہے۔ نیچے گر گیا اور سوکھ گیا بھر کم ہی ہرا ہوتا ہے۔

ملیحہ طاہر - جھیراں

دینار اسے دے دیا۔ پھر تیسرا آیا تو ایک دینار اسے دے دیا۔ جب تینوں دے دیے تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا: آپ نے ہمارے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ پھر وہ دوپہر کو آرام کرنے لیٹ گئے۔ جب ظہر کی اذان ہوئی تو میں نے اٹھایا۔ وہ وضو کر کے مسجد چلے گئے۔ چونکہ ان کا روزہ تھا۔ اس لیے مجھے ان پر ترس آ گیا۔ پھر میں نے قرض لے کر ان کے لیے رات کا کھانا تیار کیا۔ اور شام کو ان کے لیے چراغ بھی جلایا۔ پھر چراغ ٹھیک کرنے ان کے بستر کے پاس گئی۔ بستر اٹھایا تو اس کے نیچے سونے کے دینار رکھے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے تین دینار کی سخاوت کی ہے۔ (میں نے سوچا) عشا کی نماز کے بعد وہ گھر آئے تو دسترخوان اور چراغ دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے۔

”معلوم ہوتا ہے، یہ سب اللہ کے ہاں سے آیا ہے“ کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں تھا اس لیے نہ کھانا ہوگا، نہ چراغ (میں نے کھڑے ہو کر انہیں کھانا

کھلایا۔ پھر میں نے کہا۔

”اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اتنے سارے دیناریوں ہی چھوڑ گئے۔ ان کے گم ہونے کا خطرہ تھا۔ مجھے بتایا بھی نہیں کہ میں اٹھا کر رکھ لیتی“

پوچھا: ”کون سے دینار۔ میں تو کچھ بھی نہیں چھوڑ کر گیا“

میں نے بستر اٹھا کر وہ دینار دکھائے۔ وہ دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی (کہ اللہ نے اپنے غیبی خزانے سے عطا فرمائے ہیں) یہ دیکھ کر میں بھی متاثر ہوئی اور میں نے کھڑے ہو کر دینار کاٹ ڈالا۔ (دینار اس دھاکے یا زنجیر کو کہتے ہیں جسے عیسائی کمر میں باندھتے ہیں) اور مسلمان ہو گئی۔

حضرت ابن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے اس باندی کو جس کی مسجد میں دیکھا کہ وہ عورتوں کو قرآن، فرائض اور سنتیں سکھا رہی تھی اور دین کی باتیں سمجھا رہی تھی۔

(حیاء الصباہ - جلد سوم)

کامیابی

○ اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا چاہیے۔ (شیکیپیٹر)

○ میں نے شجر علم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر لکھا ہے کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔ (ڈسٹریبل)

○ ہماری سب سے بڑی خوبی کبھی نہ گرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ گرنے کے بعد اٹھنے میں ہے اور یہی کامیابی کا راز ہے۔ (گولڈ اسمتھ)

○ شکست نہ کھانے والا ارادہ، پریشان نہ ہونے والا خیال اور ختم نہ ہونے والی جدوجہد کامیابی کے ضامن ہیں۔ (بروک)

○ بھروسے میں بڑی طاقت ہے اور وہ ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ ناممکنات کی ہنسی اڑاتا ہے اور پکار کر کہتا ہے یہ ہونا چاہیے۔ (ارم کمال - فیصل آباد)

نیک مزاجی

قاضی تاجی صاحب کی موجودگی میں خلیفہ مامون نے ایک دفعہ ایک غلام کو آواز دی۔ مگر کوئی نہیں بولا۔ پھر پکارا کہ ایک ترک غلام حاضر ہو اور آگے ہی بڑبڑانے لگا کہ

”کیا غلام کھاتے پیتے نہیں۔ جب ذرا کسی ضرورت کے لیے باہر گئے تو آپ غلام غلام چلانے لگتے ہیں۔ آخر غلام کی بھی ایک حد ہوتی ہے“

یہ سن کر مامون نے سر جھکا لیا اور کچھ دیر کے بعد قاضی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”نیک مزاجی میں یہ بڑی آفت ہے کہ نوکر اور غلام شر۔ برا اور بد خو ہو جاتے ہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کو نیک خو کرنے کے لیے میں بد مزاج بن جاؤں“

عائشہ - سند محمد خان

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا رعب و دبدبہ، قریش کے تمام قبائل معرکہ بدر میں مسلمانوں کے بالمقابل آئے لیکن بنو عدی یعنی حضرت عمر کے قبیلے

میں ایک گافل سے طوطا اور طوطی گز رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ گافل کی حالت بہت خستہ ہے۔ پھر پوچھے مر جھلٹے ہوئے ہیں۔ صرف چند قلعہ نما حویلیاں کھڑی نظر آ رہی ہیں۔ طوطے کی نظر ایک سوکھے ہوئے درخت پر پڑی۔ اس پر ایک اٹو بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے نے کہا۔

”اس اٹو کی وجہ سے گافل پر نخواست ہے“ اٹو نے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً ان کے پاس

میں ایک شخص بھی شریک نہیں ہوا۔ یہ امر جہاں تک قیاس کیا جاسکتا ہے صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب و دبدبہ کے باعث تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

○ وہ گناہ جس کا تمہیں رنج ہو، ایسی نیکی سے بہتر ہے جس سے تم میں غرور پیدا ہو جائے۔

○ بڑا دوست آگ کی طرح ہوتا ہے۔ اگر جلے گا تو آپ کو بھی جلادے گا اور اگر بجھ جائے گا تو پھر آپ کے ہاتھ کالے کر دے گا۔

○ آزمائے ہوئے کو آزمانا بے وقوفی ہے۔

○ سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو کرنے والے کی نظر میں چھوٹا ہو۔

○ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔

○ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بری چیز جھوٹ بولنے والی زبان ہے۔

○ نوال افضل گھمن۔ گجرات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

○ جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔

○ جس سے تمہیں نفرت ہے اس سے ڈرتے رہو۔

○ جو شخص بُرائی سے واقف نہیں وہ بُرائی میں مبتلا ہوگا۔

نمرہ، اقرا - کراچی

ظلم و نا انصافی

ایک گافل سے طوطا اور طوطی گز رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ گافل کی حالت بہت خستہ ہے۔ پھر پوچھے مر جھلٹے ہوئے ہیں۔ صرف چند قلعہ نما حویلیاں کھڑی نظر آ رہی ہیں۔ طوطے کی نظر ایک سوکھے ہوئے درخت پر پڑی۔ اس پر ایک اٹو بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے نے کہا۔

”اس اٹو کی وجہ سے گافل پر نخواست ہے“ اٹو نے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً ان کے پاس

میں ایک گافل سے طوطا اور طوطی گز رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ گافل کی حالت بہت خستہ ہے۔ پھر پوچھے مر جھلٹے ہوئے ہیں۔ صرف چند قلعہ نما حویلیاں کھڑی نظر آ رہی ہیں۔ طوطے کی نظر ایک سوکھے ہوئے درخت پر پڑی۔ اس پر ایک اٹو بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے نے کہا۔

”اس اٹو کی وجہ سے گافل پر نخواست ہے“ اٹو نے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً ان کے پاس

پہنچا اور کہہ سار۔

”یہ طوطی میری بیوی ہے“

طوطی نے کہا ”کچھ عقل سے کام لو، یہ میری بیوی ہے۔ اس کا رنگ آواز غرض کوئی بھی چیز تم سے نہیں ملتی“

اٹو نے کہا ”چلو گاؤں والوں سے اس کا انصاف کروالیتے ہیں۔ گاؤں کے چوہدری نے فیصلہ اٹو کے حق میں دے دیا۔ اٹو نے لوگوں کی طرف دیکھا، وہ صرف سر ہلا رہے تھے۔ انہوں نے اس ظلم اور نا انصافی پر کوئی احتجاج نہ کیا۔

طوطا رو تباہیت چلا گیا تو اٹو اس کے پیچھے طوطی کو لے کر گیا اور اس سے کہا۔

”اپنی بیوی کو ساتھ لے جا۔ نحوست میری وجہ سے نہیں اس ظلم اور نا انصافی کی وجہ ہے جس کا سب ساتھ دے رہے ہیں۔“
عالتشہ، گوجرہ

اللہ کا ساتھ

جب بزرگروں کے ذمہ نے میں ایران مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو ایرانی جیران تھے کہ یہ جاہل، اجڑا اور گنوار عرب ان سے جب بھی ہماری لڑائی ہوتی، ہم ان کو ملیا میٹ کر دیتے اور ان پر قابض ہو جاتے۔ مذقوں محکوم رکھتے۔ اب کیا ہو گیا؟
بزرگروں کے ایک بوڑھے مشیر نے کہا ”اس دفعہ عرب اکیلے نہیں تھے۔ ان کا خدا ان کے ساتھ تھا۔“
تحریم، گوجرہ

انمول موتی

✽ خاموشی بغیر تخت کے بادشاہی ہے۔
✽ دُعا مانگتے رہو کیونکہ دُعا گناہوں کے دُعا کے داغ ایسے مٹاتی ہے جیسے راہ آب اپنے نشانات۔
✽ روز و شب بامقصد طریقے سے گزارو ورنہ ایسے گر جاؤ گے جیسے سوکھے ہوئے پتے۔
✽ اپنا علم کسی دوسرے کو مت سناؤ کیونکہ اس سے دشمن خوش دوست پریشان اور اللہ تعالیٰ

زم زم

زم زم کا چہترہ چار ہزار سال قدیم ہے۔ تیرہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ لمبا ہے۔ تینتیس میٹر گہرا ہے۔ ایک پاؤں قطر موٹرا آٹھ ہزار لیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے اس میں سے چوبیس گھنٹے پانی پمپ کرتی رہتی ہے۔ اس میں آج تک کافی نہیں لگی۔ اور نہ ہی پانی کا ذائقہ بدلا۔ پورا دن پانی پمپ کرنے کے صرف گیارہ منٹ بعد ہی پانی اپنے اصل لیول پر آ جاتا ہے اور اسی قدرت کی بنا پر آج تک زم زم خشک نہیں ہوا۔
سبحان اللہ۔

شگرف اعجاز۔ کراچی

اصول دُعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک جگہ سے گزر رہا تھا جہاں ایک آدمی بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگ رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔
”اے پروردگار! اگر اس کی حاجت پورا کرنا میرے اختیار میں ہو تو میں ضرور پورا کر دیتا۔“
اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی۔ ”میں تجھ سے زیادہ اس پر رحم کھاتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھ سے دُعا مانگ رہا ہے لیکن اس کا دل اپنی بھڑکے ہوئی کے ریلوے میں متوجہ ہے اور میں ایسے بندے کی دُعا قبول نہیں کرتا جو دُعا تو مجھ سے مانگ رہا ہو لیکن اس کا دل میرے علاوہ کسی اور چیز میں متوجہ ہو۔“

موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اس دُعا مانگنے والے آدمی کو بتائی تو اس نے اپنا دل ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا تو اس کی حاجت پوری کر دی گئی۔
مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ



مرحبا جوشاندہ
مزلہ، زکام اور فلو کی چھٹی
مرحبا جوشاندہ اب سیرپ میں بھی دستیاب ہے۔

گلستاکی کیون میں دل لکھا

نوشین اقبال نوشی گاؤں بدرمرجان ثریا

آنکھیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا
دل کو تکیہ ہی چاہت ہے بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے پچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا
عظمیٰ کراچی

غنیمت ہے کہ ہنس کے بات کر لیں
ہمیں مت چھیڑیے ہم سر پھرے ہیں
نوال افضل گھمن
منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رحمی کے ساتھ
چہرے بدل بدل کر مل رہے ہیں مجھے لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ

رشیدہ بتول کراچی

میں اور التجائے کرم کروں آپ سے
یہ بھیک اسے دیجیے جس کا خدا نہ ہو
رقیہ افتخار خان خوشاب
تیرے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر چلے ہم تیرا انتظار کرتے ہوئے
اسے خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

ثمرہ احمدیہ پتوکی

مل جانے کی خواہش بھی، پچھڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی، عداوت بھی عجیب تھی
اک ہم تھے کہ خوش فہمی حالات میں گم تھے
لیکن اسے حاجت مری اب ہے کہ نہ جب تھی

خانیوال

کیوں نہ آئے یقین دعاؤں پر
گرتے گرتے سنبھل گیا ہوں میں
آئینہ بھی گواہی دیتا ہے
تیرے پیکر میں ڈھل گیا ہوں میں

میانوالی

کیسی کیسی نقل مکانی، کیسی ہجرت، کیسی قربانی!
اس کی بات نہ کیجیے صاحب وہ سب کھیل تماشا ہے
غلام صغریٰ لاٹھو نواب شاہ
زبان خاموش ہو جائے تو چہرہ بات کرتا ہے
محبت کے مراحل میں عجیب موسم گزرتا ہے
نیمہ اکرم لیاری کراچی

یہاں اب ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے
کھلی فضا نہ پرندے دکھائی دیتے ہیں
عجب جس کا منظر دکھائی دیتا ہے
سیدہ خانبخاری حیدر آباد

کیا سانحہ گزرا ہے مراد دل نہیں لگتا
یہ شہر بھی اب سیر کے قابل نہیں لگتا
پتھرے گا کھال غم کا سفینہ مرے لوگو
تاخذ نظر کوئی بھی ساحل نہیں لگتا

ارم کمال فیصل آباد

حرف حرف دٹ کر بھی آگہی نہیں ملتی
آگ نام رکھنے سے روشنی نہیں ملتی
آدمی سے انسان تک آگے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ملتی

عروج انجم ہمد فقیریاں

فہم وادراک سے بالا ہے یہ انداز وفا
تم کو اندیشہ رسوائی بھی ہے اور محبت بھی
ملائی کوثر بسم اللہ پورہ

مجھے حیرت ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچتا
میں اپنی ذات سے جب بھی نہیں تفریق کرتا ہوں

راشدہ مریم جلال پورہ

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں
نوشین اقبال نوشی گاؤں بدرمرجان
میرے نصیب شوق میں لکھا تھا یہ مقام
ہر سو تیرے خیال کی دنیا ہے تو نہیں

مدیحہ جاوید سرگودھا

مینیر اب بھی مان لے تو مقدر کی حقیقت کو
جو ہے وہ بھی ضروری ہے جو گزرا وہ بھی ضروری تھا
مدیحہ احمد گلشن اقبال
میرے واسطے یہ کم نہیں کسی انجن میں کبھی کبھی
میرا نام آئے تو کہہ اٹھے یہ نام تو ہے سنا ہوا
اقراو اکرم سیالکوٹ

عکس جاناں کی خیر ہو مولا

خواب آنکھوں سمیت کوٹا ہے

نمرہ رزاق ڈیفنس

دھڑکن کی ڈگڈگی پر کب سے ہے مجھ کو قص
دل تھک کے گر جائے، تماشا تو ختم ہو
عروسہ شہوار کالا گوجران
میرے پرکھے ہوئے دیکھے بھالے ہیں دکھ
عمر گھڑی میں، میں نے جو ڈالے ہیں دکھ
جس طرح ہوا اٹا نہ یہی زیست کا
میں نے یوں زندگی بھر سنبھالے ہیں دکھ

نسیم سحر گلشن اقبال

احساس نہ اخلاق، محبت نہ تعلق
اس دور کے انسان ہیں کہ پتھر کے محسوس

نسرین صلاح الدین میٹروول

دل کو اتنی فریب میں رکھا ہے عمر بھر
اس امتحاں کے بعد کوئی امتحاں نہیں

رشیدہ بتول بلدیہ ٹاؤن

کیا دبدبہ نادر، کیا شوکت تیموری
ہو جلتے ہیں سب دفتر غرق نے ناب آخر

الماس تنویر ہری پور ہزارہ

کیا غضب ہے ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

صائمہ عمران سر جاتی ٹاؤن

ہم اہل سخن کی قیمت ہے اقبال زبانی داؤد و ش
کل محفل میں جو ہم کو ملی، وہ داد نہ تھی مزدوری تھی
رباب مرتضیٰ ملتان

میری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
کبھی تیرگی کبھی روشنی، کبھی جلا ہوا کبھی بجھا ہوا

نیرہ نوید لاہور

مجھے جو بھی دشمن جاں ملا، بڑا پختہ کار جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی، نہ کسی کا تیر خطا ہوا

ربیعہ ظہیر اعوان کوئٹہ

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسم بہار رہا

شائستہ جاوید ایف بی ایریا

جو کہتا ہوں وہی بولنے کا عادی ہوں
میں اپنے شہر کا سب سے بڑا منادی ہوں

ملیحہ طاہر جھبیراں

اس میں قسمت کی خطا ہے نہ ذمہ کا قصور
غم تو انسان کے جینے کی سزا ہوتے ہیں

نمرہ اقسدا کراچی

میرے دیکھے ہوئے پسینے کہیں لہریں نہ لے جائیں
گھر وندے ریت کے تعمیر کر کے چھوڑ دیتا ہوں
عدیم اب تک وہی بچپن، وہی تحریب کاری ہے
قفس کو توڑ دیتا ہوں، پرندے چھوڑ دیتا ہوں

رفعت اخلاص کراچی

موت آئے تو دن بھر میں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے



شاعری سچ بولتی ہے

کرن مشیر

میرے سامنے ڈائریوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔
ان کو ورق ورق پلٹتے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساتھ
ساتھ زندگی کے بھی ورق پلٹ رہی ہوں۔ میرا انتخاب
آپ کو اچھا لگے یا بُرا، اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔
سب سے پہلے "شعاع" کے لیے ابن النشا کے
لفظوں میں کچھ کہنا چاہوں گی۔

دیکھ ہماری دید کے کارن کیسا قابل دید ہوا
ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تالیش میں خورشید ہوا

ہمارے ادبی افق پر اتنے روشن ستارے جھمکا
رہے ہیں کہ ان کی تعریف لفظوں میں ممکن ہی نہیں۔
پڑھیے ذرا محسن نقوی کیا کہہ رہے ہیں۔
کاش کوئی ہم سے بھی پوچھے
رات گئے گئے تک کیوں جاگتے ہو

کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو

امجد اسلام امجد لفظوں کے جادوگر جب بھی کچھ
کہتے ہیں سحر سا باندھ دیتے ہیں۔

میرے چارہ گر
میرے درد کی تجھے کیا خبر
تو میرے سفر کا شریک ہے

نہیں ہم سفر
میرے چارہ گر، میرے چارہ گر
میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے، اسے کاٹتے

میرا سارا وقت نکل گیا
نہیں جس پہ کوئی نشان یا
میرے سامنے ہے وہ درہ گزر
میرے چارہ گر
میرے درد کی تجھے کیا خبر

نصیر ترائی کے سادہ سے لفظ زندگی ہی سے زندگی
کے نشیب و فراز کا عکس ہمیں دکھاتے ہیں۔
یادوں میں اک یاد، کوئی دل شکن سی یاد
وہ یاد اب کہاں ہے کہ فرصت نہیں رہی

رنگوں میں ایک رنگ، تری سادگی کا رنگ
ایسی ہوا چلی کہ وہ رنگت نہیں رہی

باتوں میں ایک بات، تری چاہت کی بات
ادب یہ اتفاق کہ چاہت نہیں رہی

شاعری کی بات ہوا اور میں متور جمیل کا تذکرہ نہ
کر دوں، یہ نہیں ہو سکتا۔
عجب خواہش ہے شہر والوں چھپ چھپ کر کتاب لکھوں
تمہارا، اپنی زندگی کی کتاب کا انتخاب لکھوں

تم ہی نے میرے اجازتوں پہ خواہشوں کے دیے جلانے
تم ہی نے چاہا تھا کہ خشک ہونٹوں سے چاہوں کتاب لکھوں

میں تنہا لڑکی دیا رشتہ میں جلاؤں سچ کے دیکے کہاں تک
سیاہ کاروں کی سلطنت میں کس طرح آفتاب لکھوں

نجم الثاقب کہتے ہیں۔
اس کو تو پچھرنے کے ڈھنگ بھی نہیں آتے
مجھ سے دودھ گر بھی قہقہوں میں رہتا ہے
ایک ایسے انسان سے مجھ کو نسبتیں ہیں جو
دوستی نہیں کرتا، دوستوں میں رہتا ہے
اقبال ساجد کا انداز ملاحظہ ہو۔

نکل شب دل آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا
محسن بھوپالی زندگی کے بارے میں کچھ خاص کہہ رہے ہیں۔
تیرے ہر رویے میں بدگمانیاں کیسی
جب تلک ہے دنیا میں اعتبار دنیا کر
جس نے زندگی دی ہے وہ بھی سوچتا ہوگا
زندگی کے بارے میں اس قدر نہ سوچا کر

ارے ریکے ذرا یونہی چلتے چلتے شاعری کے درمیان
کچھ تعارف کی رسم بھی نبھ جائے۔ میرا نام کرن مشیر ہے۔
روشنیوں کے شہر کراچی سے تعلق ہے۔ ایک ہوم سائنس
ڈاکٹر ہوں۔ اردو ادب میں گریجویٹیشن کے بعد ماسٹرز
کا ارادہ ہے۔ میرا خیال ہے اتنا تعارف کافی ہے۔
بات ہو رہی تھی زندگی کے بارے میں۔ اس لحاظ
سے یہ قطع بھی خوب ہے۔ یقیناً آپ بھی متفق ہوں گے۔
جامِ عشرت کا ایک گھونٹ پیئیں
تلخی، آرزو کی مینا ہے
زندگی حادثوں کی دنیا میں
راہ بھولی ہوئی حسینہ ہے

کافی عرصے سے بہتیں متفرق اشعار نہیں لکھ رہیں
میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں لکھوں۔ لیجیے حاضر ہیں۔
دعا کے روشن چراغ اپنی تھیلیوں پر جلانے ہم نے
خدا سے لیکن سوال کرنا نہ اس کو۔ آیا نہ مجھ کو آیا
(سعید طاہق)
جو ہو فیصلہ وہ سنائیے، اسے حشر پر تہ اٹھائیے
جو کرے گی آپ ستم و ماں، وہ ابھی بھی وہ ہیں ہی
(نصیر ترائی)

یوں تو بے نیازانہ عمر کا جسے لیکن
اس گھڑی نہ چپ رہیے جب گیارہ موزی ہو
(خالد معین)

چلتے چلتے ایک آخری نظم کو بھی برداشت کر لیں۔
اس نظم کے تخلیق کار اللہ جانے کون ہیں۔
وہ فقیہہ خود مطلب
جب سے بند کر بیٹھا
شہر سے کا دروازہ
شام کے اُترتے ہی
تجھ کو ڈھونڈتا ہوں میں
نوٹنا بدن لے کر

ایک اپنی ذاتی کاوش آپ کی تذکرہ ناپا ہوں گی۔
میری زندگی اک لہر کی مانند ہے

جوں میں بدل جاتی ہے
کبھی خوشی مل جاتی ہے بہت
کبھی غم مل جاتی ہے بہت
کبھی وقت دوڑتا ہے لہر کی طرح
کبھی صبح ہونے کا انتظار کرتی ہے رات
کبھی تو دن گزرتا ہے مشکل ہے
کبھی تو رات آنکھوں میں گزر جاتی ہے
یہی حال ہے میری زندگی کا
اور ایسے ہی میری زندگی ختم ہو جائے گی

اس انتخاب کو میں نے بہت محنت سے سجا لیا ہے
آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اس دعا کے ساتھ
اجازت چاہوں گی کہ آپ سب کو اللہ تعالیٰ اپنی
حفظ و امان میں رکھے اور کبھی بھی کہیں کسی کے
ساتھ کچھ بھی بُرا نہ ہو۔ آمین۔





GIRLS CADET COLLEGE ABBOTTABAD PAKISTAN

PAKISTAN FIRST UNIQUE INSTITUTE OF GIRLS

Applications are invited for admission in the stated Below classes on prescribe Admission form which can be obtained from the College Office or Admission Office Rawalpindi

گرنز کیڈٹ کالج ایبٹ آباد پاکستان

پاکستان میں خواتین کا پہلا کیڈٹ کالج

Registration Overseas Students:

USA 70.00 USD

UK 55.00 GBP

Saudia 200.00 SAR

Kuwait 17.00 KWD

SUBMISSION OF ADMISSION

LAST DATE: 30-Nov-2012



Ideal Massing

داخلے جاری ہیں

صرف لڑکیوں کیلئے

پراسپیکٹس کالج دفتر ایبٹ آباد / رجسٹریشن آفس راولپنڈی سے حاصل کریں

Class: VI To IX & 1st Year INTAKE 2013

بہترین تعلیم اور ہائی سٹینڈرڈ بورڈنگ

6th, 7th, 8th, 9th, 1st Year کیلئے پراسپیکٹس مبلغ -/1500 روپے۔

ڈرافٹ اپے آرڈر بنام پرنسپل کالج ایبٹ آباد پاکستان بھیج کر حاصل کریں

Principal: 0324-5119050

Mansehra Road Near UBL

Zonal Office Abbottabad

0992-332236, 0992-332237

E-mail: zujaja71@yahoo.com

Registrar Office:

O-930 Murree Road, Rawalpindi. 051-576108

0300-9809176 / 0321-5102531

director_girlscadetcollege@yahoo.com

Media Expert

ADMISSIONS OPEN



ترکیب :

آٹا اور سوچی ملا کر اس میں تقریباً "تین کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے ملائیں اور نیم گرم پانی سے سخت گوندھ لیں اور ململ کے کیلے کپڑے سے ڈھک کر بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پیڑے بنا کر پتلی روٹی کی طرح پیل لیں اور کسی کٹریا گلاس سے ایک سائز کی نکلیاں کاٹ لیں۔ گرم تیل میں ڈالیں اور درمیان سے چمچے کی مدد سے دبائیں۔ اس طرح وہ پھول جائیں گی۔ اہلی کے رس میں چار پیالی پانی کے ساتھ تمام اجزا ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پکائیں۔ کالا نمک پکانے کے بعد ڈالیں۔

پھولی ہوئی پوریوں میں انگلی سے سوراخ کر کے تھوڑے سے کابلی چنے ڈالیں اور کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

پالک پنیر

ایک کلو
چار چائے کے چمچے
ایک پاؤ

اجزا :

پالک
نمکی کا آٹا
پنیر

موم کے پکوان

خالہ جیلانی

گول گپے

ڈھائی پیالی
آدھی پیالی
ایک پیالی
ایک پیالی
چار کھانے کے چمچے
آدھا چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چٹنی
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

اجزا :

آٹا
سوچی
اہلی کارس
کابلی چنے
گڑ
سونٹھ
سفید زیرہ
کالا نمک
نمک
تیل

شعاع سلاکھ

ادارہ

نماز کے بعد قرآن مجید اور اللہ اللہ کرتی ہوں، سوتی نہیں ہوں گھر میں پھرتی رہتی ہوں۔ سورج نکلنے پر ابو جی اپنے لیے چائے بناتے ہیں۔ ا کے بعد گھر والوں کا ناشتا شروع ہوتا ہے۔ ناشتے کے بعد آصفہ برتن دھوتی ہے۔ عاصمہ صفائی کا کام کرتی ہے۔ کبھی میں بھی کروا دیتی ہوں۔ دودھ گرم کر لیتی ہوں اور کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیتی ہوں۔ امی سلائی کا کام کرتی ہیں۔ میں کٹنگ اور ڈیزائننگ میں مدد کرواتا ہوں۔

ہم لوگ اپنی زمینوں پر رہتے ہیں۔ ہمارے کھیتوں میں تقریباً گھر کے ساتھ ہی آم، آڑو، امرود، جامن، مالٹا اور لیموں وغیرہ کے درخت ہیں۔ سبزیاں بھی ہیں ہم لوگ کوئی کوئی پھل یا سبزی لینے باہر جاتے ہیں۔

ہمارا ماحول بہت اچھا ہے ملازم باہر کام کر رہا ہو تو ہم لوگ باہر نہیں نکلتے۔ سبزہ دیکھ کر موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ بارہ بجے تک کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔ ٹھیک بارہ بجے دوپہر کے لیے روٹیاں پکاتی ہوں۔ سالن تیار ہوتا ہے سب جو گھر میں ہو عمل کر کھانا کھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر ریست کرتے ہیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر اگر کوئی کام ہو تو کر لیا ورنہ فارغ۔ تین یا چار بجے چائے بنائی جاتی ہے۔

ہم بہنوں نے کام کے لیے باری مقرر کی ہے چائے کے بعد جس کی باری ہو وہ برتن دھوتی ہے۔ دوسری بہن سبزی تیار کرتی ہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر سالن تیار کیا جاتا ہے تیسری بہن آٹا گوندھتی ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر میں روٹیاں پکاتی ہوں۔ سب اکٹھے کھانا کھا کر کمریوں یا صحن کا رخ کرتے ہیں باتیں کرتے ہیں۔

عامرہ..... خانیوال

1- عمر رفتہ کو آواز دی۔ یاد آیا چھٹی یا ساتویں میں تھی جب پہلی بار شعاع پڑھا۔ گویا پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ خالہ لوگ رسالے پڑھا کرتی تھیں ان سے مانگ کر لایا کرتی اور امی اور پھوپھو سے چوری چوری پڑھا کرتی۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جب ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ دیا اور لالٹین کی روشنی میں سخت گرمیوں میں کمرے میں گھس کر ایک ہاتھ میں رسالہ دوسرے ہاتھ سے پسینہ صاف کرتے ہوئے شعاع اور خواتین پڑھا کرتیں۔ (میں اور خالہ) ہلکی سی آہٹ پر رسالہ نیچے اور سوتے بن جاتیں۔ آخر کار امی اور پھوپھو کو پتا چل گیا خوب خوب ”عزت افزائی“ ہوئی مگر یہ آغاز تھا۔

ایک گرمیوں میں خالہ سے چھ سات رسالے مانگ کر لائے۔ ابھی پڑھنے نہ تھے کہ امی کو پتا چل گیا۔ پھر کیا تھا میرے اور خالہ کے آنسوؤں کی پروانہ کرتے ہوئے امی اور پھوپھو نے رسالے پھاڑ پھاڑ کر تو می میں پھینک کر آگ لگا دی۔ گویا ہمارے ارمان جل گئے۔ رو دھو کر صبر کیا۔ بہن بھائی سب دھمکیاں دیا کرتے جب رسالہ پڑھتے دیکھتے تو فوراً ”کہتے کہ ابھی ابو کو بتاتے ہیں یا امی یا پھوپھو کو بتاتے ہیں پھر ان کی منت سماجت کی جاتی۔

میٹرک کے بعد ہاسٹل میں ذرا آزادی سے پڑھنے لگی۔ اب ایم اے کے بعد گھر میں کوئی روک ٹوک یا پابندی نہیں ہے۔

2- صبح کا آغاز سردیوں میں آصفہ کے جھنجھوڑ کر اٹھانے پر ہوتا ہے۔ گرمیوں میں خود ہی اٹھ جاتی ہوں

ترکیب :

ایک بڑے پیالے میں قیمہ ڈال کر تمام اجزاء شامل کریں اور خوب اچھی طرح مکس کر کے دو مرتبہ گرائنڈ کر لیں۔ زیادہ بہتر ہو گا کہ قیمہ والی مشین سے دو مرتبہ گزار لیں۔ پھر آدھے گھنٹے بعد تھوڑی مقدار لے کر تیخ پر چڑھائیں۔ ہاتھ سے دیا کر لمبائی میں کباب کا شیپ دیں۔ شملہ مرچ کا ایک ٹکڑا تیخ پر چڑھائیں پھر دوبارہ تھوڑا سا قیمہ تیخ پر چڑھائیں۔ آگے پیچھے شملہ مرچ کا ایک ایک ٹکڑا لگاتے جائیں۔ کونکوں پہ سینک لیں۔ پتیخ میں ایک دو مرتبہ گھلے ہوئے مکھن کا برش کریں۔ تیار ہو جائیں تو چپانی یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

ملائی پان پورا

اجزاء :

چار کھانے کے چمچے
چار کھانے کے چمچے
ایک کپ
چار کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
تین عدد
بیس عدد
تینے کے لیے
میدہ
گاڑھی کریم
دودھ
چینی
الپچی پاؤڈر
کیوڑہ
چاندی کے ورق
کاجو/بادام
گھی

ایک پیالے میں دودھ، کریم اور میدے کو اچھی طرح مکس کر کے کچھ دیر کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔ چینی میں تھوڑا سا پانی ملا کر شیرہ بنالیں اور ہلکا سا پکالیں فرانک پان میں تھوڑا سا گھی گرم کر کے دودھ والا آمیزہ ڈالیں۔ پین کیک کی طرح سنہری ہو جائے تو کسی فلیٹ پلیٹ میں نکال لیں۔ سارے پین کیک ایک ساتھ رکھیں۔ ہر ایک پر تھوڑی تھوڑی کریم لگاتے جائیں۔ کاجو یا بادام اور تھوڑا سا الپچی پاؤڈر بھی چھڑکیں۔ پھر انہیں سکون شیپ میں موڑ دیں۔ اوپر سے شیرہ ڈال دیں۔ چاندی کے ورق لگائیں اور بادام اور کیوڑہ چھڑک کر پیش کریں۔

پیاز
اورک
ہری مرچ
پسی سرخ مرچ
نمک
تیل
چار عدد
ایک بڑا ٹکڑا
تین عدد
ایک چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

پالک کو اچھی طرح دھو کر باریک کاٹ لیں اور نمک اور دو کپ پانی ڈال کر دس منٹ تک پکائیں پھر پانی الگ کر کے پیس لیں۔ پیس کے چوکور ٹکڑے ڈال کر خوب مکس کریں پھر مکئی کا آٹا ڈال کر تھوڑی دیر تک پکائیں تاکہ وہ گاڑھا ہو جائے۔

فرانک پان میں تیل گرم کر کے اورک اور پیاز باریک کاٹ کر مل لیں پھر سرخ مرچ ڈال کر پیچھے ملائیں اور اسے پالک پیروالے آمیزے پر بکھار کی طرح ڈال کر مکس کر لیں اور تقریباً ”پانچ منٹ تک پکائیں۔ ہری مرچ باریک کاٹ کر اوپر چھڑک دیں۔ چاہیں تو دو چائے کے چمچے کریم بھی ڈال سکتی ہیں۔ مزے دار پالک پیس تیار ہے۔

چکن ماندوی کباب

اجزاء :

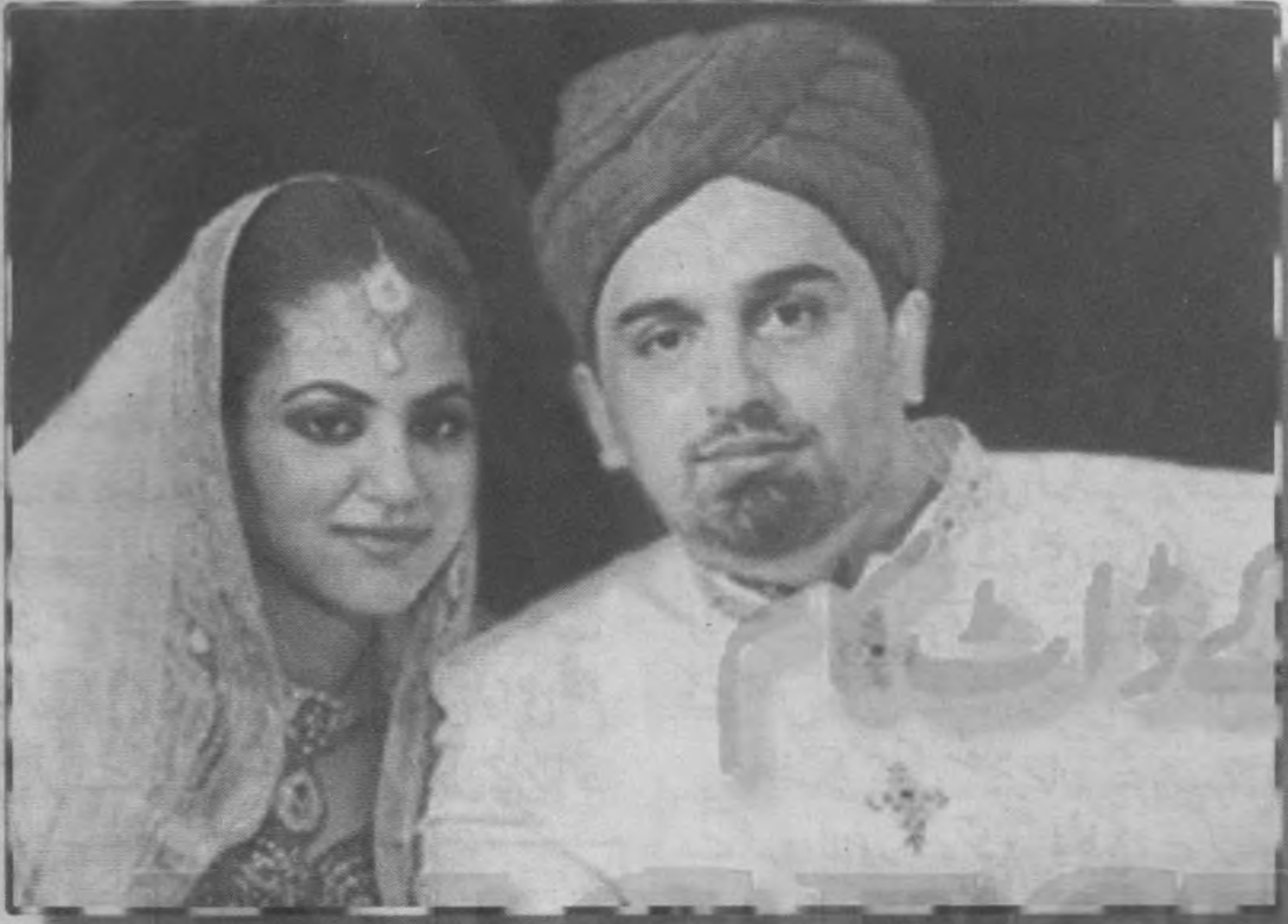
چکن قیمہ
مکھن
پیاز
شملہ مرچ
لسن اورک پیسٹ
سرخ پسی مرچ
چائیز نمک
ایک کلو
سو گرام
دو عدد
دو عدد
ایک کھانے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
دو چائے کے چمچے
آدھا چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
حسب ذائقہ

پسٹا ریل

زیرہ

مسٹر پاؤڈر

نمک



محروم رہی، جس طرح عوام، بجلی سے۔ ویسے تو شادی کا موقع صرف دولہا، دلہن ہی کے لیے زیادہ یادگار ہوتا ہے، لیکن عینی کی شادی کی تقریب صرف دولہا، دلہن ہی کے لیے نہیں، بلکہ اس میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے لیے بھی یادگار ہی رہی کہ یہ تقریب عام تقریبات سے ذرا ہٹ کے ثابت ہوئی۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ کسی شادی کی تقریب میں کوئی ایک مہمان بھی نہ آئے، تب بھی شادی تو ہو ہی جاتی ہے۔ تاہم ذرا چشم تصور اکیچھے اور سوچیے! شادی کی اس تقریب کے بارے میں کہ جہاں دیگر سارے مہمان تو ہوں، مگر خود دولہا اور دلہن ہی موجود نہ ہوں۔ یرنسنز یعنی اور ملک نوید اعوان کی شادی ایک ایسی ہی

یادگار تقریب

یہ زیادہ عرصہ پرانی بات نہیں، جب ایک لڑکی جو خود کو یرنسنز کہلاتی تھی، ٹی وی پر جھومتے گاتے ہوئے نظر آئی کہ ”تو ہی ہے میرا پیارا مہیا۔۔۔“

یہ صدا کیا گونجی، ہر لڑکا خوش فہمی کا شکار ہو گیا اور خود کو اس یرنسنز کے خوابوں کا شہزادہ سمجھنے لگا اور یہ گانا تو اس قدر مقبول ہوا کہ جھٹ ایک بھارتی فلم ساز نے اس پر قبضہ کیا اور اسے اپنی فلم کا حصہ بنا ڈالا۔ (ہونہہ! گانا نہ ہوا، گویا کشمیر ہو گیا۔) اب اسی یرنسنز یعنی کے خوابوں کا شہزادہ سب کے سامنے آ گیا ہے کہ گزشتہ دنوں یرنسنز یعنی کی شادی انجام پا گئی ہے۔ تاہم یہ شادی ”بخیر و خوی“ جیسے الفاظ سے اسی طرح

خرچ کر دیتی ہوں۔

خامیاں۔۔۔

بقول عاصمہ ”تم لڑائی ختم ہونے کے بعد پھر چھیڑ دیتی ہو۔“ کبھی کبھار غصہ آ ہی جاتا ہے۔ ویسے صاف گوئی اکثر نقصان دہ بھی ہوتی ہے اس کا کئی بار تجربہ ہوا، ایم اے کے بعد عقل آگئی ہے۔ پہلے سیدھی سادی دوسرے معنوں میں بدھو تھی اب نہیں ہوں مجھے اپنی جو بات بری لگتی ہے وہ یہ کہ کبھی درست موقع پر بات نہیں کرتی۔ میں نے بڑی بہن خالدہ سے خوی یا خامی پوچھی تو خوب ہنسی پھر کہا سوچ کر بتاؤں گی اور ابھی تک فون نہیں کیا۔

5۔ ساون کے مہینے میں کیاس کی فصل تیار ہو رہی ہوتی ہے۔ اس لیے بارش اچھی نہیں لگتی۔ ہمیشہ وہی بارش اچھی لگتی ہے جو فصل کے لیے مفید ہو۔ تیز بارش سے ڈر لگتا ہے۔ رات کو ہو تو بہت بے چینی ہوتی ہے۔ میں تو اکثر دعائیں مانگنے لگتی ہوں اور استغفار کرنے لگتی ہوں۔ اسکول کے دور میں بارشیں اچھی لگتی تھیں اب بوندا باندی اچھی لگتی ہے۔ ساون کے حوالے سے کوئی واقعہ نہیں ہے۔

6۔ مجھے قرآن مجید بہت پسند ہے۔ شاعری کبھی کبھی پڑھتی ہوں کبھی بور وقت میں پڑھ لیتی ہوں اور کبھی کبھی پڑھتے ہوئے بور ہو جاتی ہوں لیکن یہ شعر پسند ہے بلکہ ساری نعت پسند ہے۔

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں

کہ میں نے اسم محمدؐ کو لکھا بہت اور چوما بہت پچھلے دنوں ایک دوست نے یہ مزاحیہ شعر بھیجا جو کہ کنواری لڑکیوں کے لیے ہے۔

”نہ چاند ہو گانہ تارے ہوں گے

کیا ہم اس سال بھی کنوارے ہوں گے

اس دنیا میں کتنوں کے نکاح ہو گئے

کیا ہمارے نصیب میں صرف نکاح کے چھوہارے ہوں گے“

☆

ازان ہونے پر دودھ پی لیتے ہیں۔ میں نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں۔ جب مہمان یا بڑی بہن بچوں سمیت آتی ہیں تو خوب رونق لگی رہتی ہے۔ سارا دن مصروفیت میں گزر جاتا ہے۔

چونکہ ہم کسان لوگ ہیں اس لیے کیاس گندم اور سرسوں کے موسم میں بہت مصروفیت ہوتی ہے۔ 3۔ جب میں آٹھویں میں تھی تو ایک ناول پڑھا تھا جس کی ہیروئن کا نام لکھا تھا۔ ساری اسٹوری یاد ہے۔ کہانی کا نام اور رائٹر کا نام ذہن سے محو ہے۔ مجھے تمام کہانیاں اچھی لگتی ہیں تمام رائٹرز پسند ہیں۔ ذہن میں اکثر کوئی نہ کوئی کہانی گردش کرتی رہتی ہے۔ مجھے کسی کہانی میں اپنا عکس نظر نہیں آیا۔ مجھے مزاحیہ، سنجیدہ ہر طرح کی اسٹوری اچھی لگتی ہے۔ میں ہر کہانی بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ پچھلے سال خالدہ نے راجہ گدھ پڑھنے کو دی تو دماغ گھوم گیا۔ مجھے تو فحش سنا ناول لگا۔ لوگ اس کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔ مجھے تو اچھا نہیں لگا۔ اس کے علاوہ سارے ناولز پسند ہیں۔

4۔ کبھی خوبیاں حاوی ہو جاتی ہیں کبھی خامیاں اسکول و کالج میں اللہ نے بہت عزت دی تھی۔ پیچرز اور فرینڈز بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ حمیرا نے کہا تھا ”تم بہت اچھی ہو۔“ فرح نے تو ڈائری بھردی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”بہت سگھڑ ہو، ہر کام میں ماہر۔“ اکثر فرینڈز کہا کرتی تھیں کہ عامرہ ذہین ہے۔ (حالانکہ میں صرف محنتی ہوں) سیکنہ نے اکثر کہا کہ ”عامرہ صاف گو ہے“ میں نے گھروالوں سے خوبیاں خامیاں پوچھیں تو امی نے کہا ”تمہیں پتا ہی ہے۔“

پھوپھو نے کہا۔ ”خوبیاں ہی خوبیاں“ مزید کہا کہ ”عامرہ رسالے پڑھتی ہے مگر کئی باتوں کا کچھ نہیں پتا۔“ بھائی نے کہا ”لو تم نے کیا کرنا ہے۔“ آصفہ نے کہا ”خامی کوئی نہیں ہے۔“

چلیں میں خود ہی بتاتی ہوں۔ صاف گو، راست گو، مذہبی اور سادہ سی ہوں۔ پوزیٹو بھی ہوں۔ حقوق العباد کا خیال رکھتی ہوں صلہ رحمی کرتی ہوں۔ اچھی بات پک کرتی ہوں معاف بھی کر دیتی ہوں۔ اللہ کی راہ میں

شادی تھی۔ دلہن یعنی تو ڈینگھی بھار کا شکار ہو کر اسپتال پہنچیں مگر دولہا جی زمانے کی ستم ظریفی کا ہدف بنے۔ یعنی انہیں پولیس لے گئی۔

جی نہیں! شادی پر اکیس توپوں کی سلامی دینے کے لیے نہیں بلکہ چار چوٹ کی مار کے لیے کہ لاہور میں منعقد ہونے والی یہ تقریب مقامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رات گئے تک جاری رہی تھی۔ (اے ہے! اپنا ”لاہور“ سعودی عرب چلا گیا ہے یا یہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے کچھ عرصہ سعودی عرب میں

مقیم رہنے کا نتیجہ ہے؟) پولیس جاتے ہوئے صرف تقریب کے دولہا کو ہی نہیں لے گئی بلکہ اس نے پرنسز یعنی کے والد ڈاکٹر خالد اور سر مشتاق اعوان کے خلاف مار پیٹ اور سرکاری کام میں مداخلت کا مقدمہ بھی درج کر لیا ہے۔ یوں یہ شادی پرنسز یعنی کے گانے سے بھی زیادہ مشہور ہو گئی ہے۔ (اب دیکھیں! کب کوئی بھارتی فلم ساز اس سین کو اپنی فلم میں شامل کرتا ہے کہ انہیں تو ہماری ہر مقبول چیز ہاتھ



صاف کرنے کی عادت جو ہے۔) یعنی کاویلمہ ان کے ڈینگھی سے نجات پانے کے بعد ہو گا۔ (ڈینگھی کے چھرا! یعنی میں کچھ خون سسرال والوں کے لیے بھی چھوڑ دیا تھا ناں۔)

اعتبار

آج کل ایک نجی چینل پر گلوکار عاطف اسلم پر بڑی ملک کے گلوکار ہمیشہ دشمنیاں کو سڑوں کا چیلنج دیتے نظر آ رہے ہیں۔ اس پروگرام میں عاطف کے کئی ساتھی ان کے ساتھ سڑ سے سڑ اور قدم سے قدم ملائے کھڑے ہیں۔ تاہم اب حقیقی زندگی میں بھی عاطف کا ساتھ دینے والی آگئی ہے کہ خیر سے اپنے عاطف اسلم منگنی شدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن اس خبر سے ابھی بہت سے لوگ ناواقف ہی ہیں کہ اپنے ہر گانے سے دھوم مچانے والے عاطف نے اپنی زندگی کا سب سے اہم راگ بے حد خاموشی سے چپ چپاتے ہی چھیڑ دیا۔ جسے بعض لوگوں نے سنا اور بعض بے خبر ہی رہے۔

عاطف اسلم کی منگیت سارہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ لاہور کے کینہر ڈکلیج سے گریجویٹ اور ایڈیلیٹ ہیں۔ یہ منگنی عاطف کی پسند سے ہوئی ہے۔ کہانی وہی روایتی ہے کہ سارہ عاطف اسلم کی مداح ہیں۔ وہ عاطف اسلم کے شو میں شرکت کرنے آئیں تو عاطف کا دل انہیں دیکھ کر گنگنا اٹھا۔ ”بخدا تم ہی ہو، ہر جگہ تم ہی ہو۔“

یوں دونوں کی منگنی ہو گئی۔ عاطف اسلم ابھی اس خبر کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔ (شاید وہ ابھی ”سر کشتیرا“ میں اپنے ووٹ کھونا نہیں چاہتے۔) لیکن لوگ بھی بہت سیانے ہو گئے ہیں۔ خبر کا سراغ کسی طور پا ہی لیتے ہیں۔ عاطف کی منگنی کی یہ اطلاع انٹرنیٹ پر گزشتہ چند ماہ سے موجود تھی۔ تاہم اب یہ خبر چند نجی چینلز سے بھی نشر ہو گئی ہے مگر حیرت انگیز طور پر کوئی نسوانی۔۔۔ عوامی رد عمل سامنے نہیں آیا ہے۔ (عاطف جی! آپ حوصلہ رکھیں۔ آپ کی مقبولیت میں

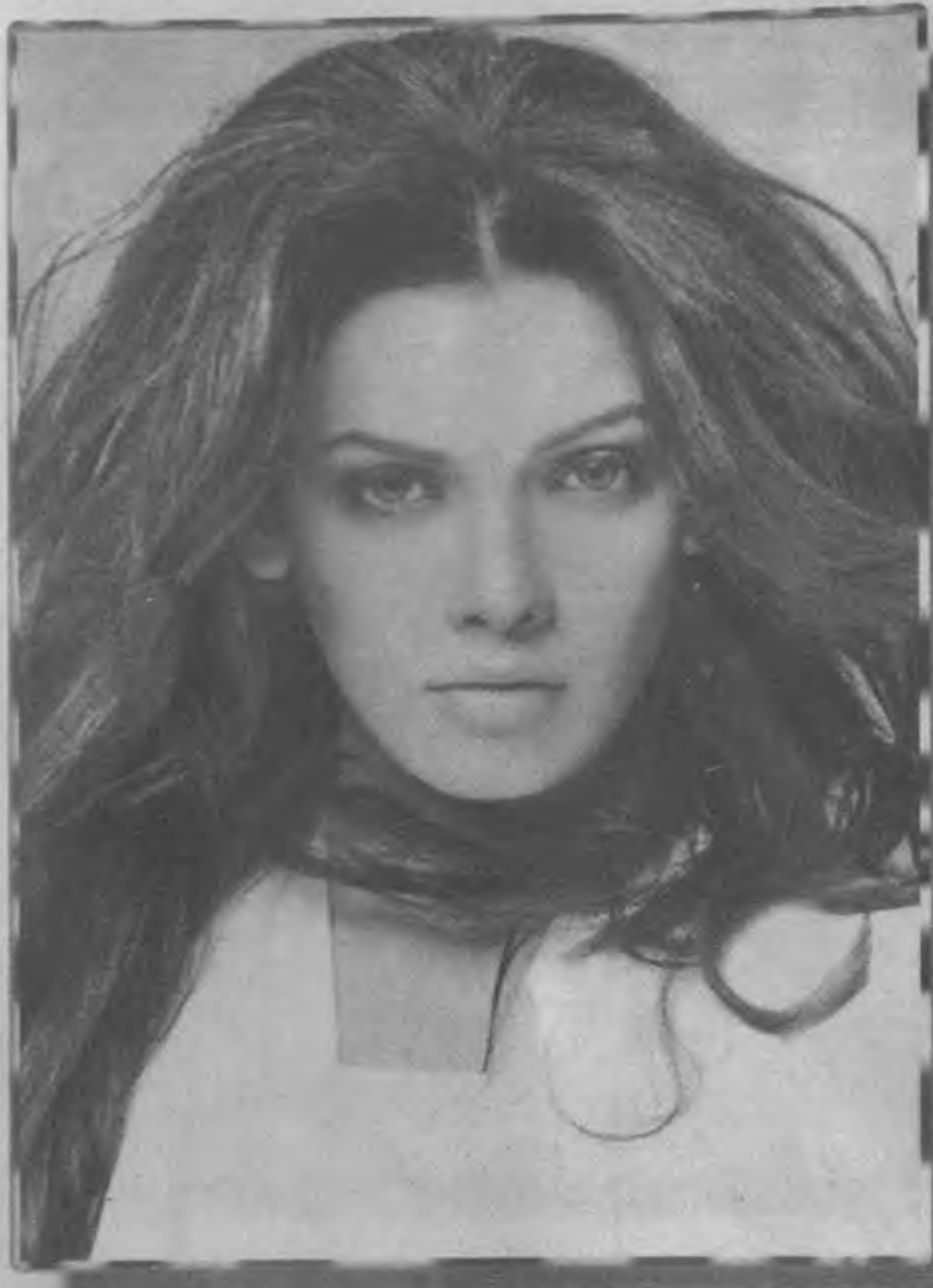
کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ اس عوامی خاموشی کی وجہ ہر امر کی ڈرامے میں شریک ہمارے میڈیا کی لڑکھائی ہوئی ساکھ ہے۔ سو کئی لڑکیاں بالیاں یہ کہتی ہوئی پائی گئی ہیں کہ ”تمی“ سے مراد جاتے اگر اعتبار ہوتا۔)

توجہ

مونالیزا خوب صورت اور باصلاحیت اداکارہ ہیں۔ کئی ڈراموں میں کام کر چکی ہیں، مگر تاحال عوامی پسندیدگی کی سند سے محروم ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی کسی کی توجہ ان کی طرف نہیں ہے۔ اس کا احساس مونالیزا کو بھی ہے، سو انہوں نے بھرپور عوامی توجہ حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں کھل کر کام کیا، کیونکہ ہماری بیشتر اداکاراؤں کا خیال ہے کہ جب تک وہ کوئی متنازعہ کام نہ کر لیں، شہرت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتیں۔ (یعنی ہماری اداکارائیں ”شہرت کی بلندیوں“ اور ”بدنامی کی پستیوں“ کے فرق سے ناواقف ہیں شاید۔) مگر شومنی قسمت، مونالیزا کو ان کی توجہ سے بھر بھی محروم ہی رہیں۔

مونالیزا نے مزید کچھ برہہ کر کرنے کا سوچا اور وہ بھارت جاکر ہمیش کے ساتھ فلم ”کجر ارے“ میں کام کر آئیں۔ بلاشبہ وہ کام ایسا تھا کہ سب کی توجہ کھینچ لیتا، مگر وائے ری قسمت! کہ مونالیزا ایک بار پھر اپنا مطلوبہ ہدف حاصل نہ کر سکیں۔ ساتھی اداکاراؤں کے ایک کے بعد ایک نت نئے ”کارنامے“ مونالیزا کو تڑپاتے رہے۔ تاہم اب شاید مونالیزا کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔

خبر آئی ہے کہ مونالیزا ”مرڈر تھری“ نامی بھارتی فلم میں کام کرنے جا رہی ہیں۔ اس فلم سے قبل پوجا بھٹ اور ہمیش بھٹ اس سلسلے کی دو فلمیں بنا چکے ہیں جن میں عربیائی و بے باکی کے تمام ساقیہ ریکارڈز توڑے گئے تھے۔ اب اس سلسلے کی تیسری فلم میں مونالیزا کر رہی ہیں۔ مونالیزا نے فلموں میں کام کرنے کے لیے اپنا نام بھی



تبدیل کر لیا ہے۔ وہ ”سارہ لوزین“ کے نام سے بھارتی فلموں میں کام کر رہی ہیں۔ (کاش! کسی طرح وہ اپنی شہرت بھی تبدیل کر لیتیں۔) مونالیزا کے خیال میں یہ نیا نام شاید انہیں راس آجائے اور وہ لوگوں کی ساری توجہ کھینچ لیں۔ دیکھتے ہیں اب کیا ہوتا ہے۔ (بھئی لوگو! اپنی سابقہ روش برقرار رکھو کہ اب بھی کوئی توجہ۔)

ذاتی فعل

شوخی و شریر نٹ کھٹ سی ٹی وی انہیں شائستہ واحدی کچھ وقت اسکرین سے آؤٹ رہنے کے بعد آج کل پھر ”ان“ ہیں۔ شائستہ واحدی کمپیئرنگ کو تو کوئی خاص نیا انداز نہ دے سکیں، تاہم اس حوالے سے انہوں نے ایک نئی روایت کا آغاز ضرور کیا ہے کہ وہ جب غیر حاضری کے بعد پروگرام کرنے آئیں تو انہوں نے ناظرین اور اپنے مداحوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی کے ایک تکلیف دہ پہلو پر گفتگو کی۔ یعنی انہوں نے ناظرین کو خود اپنی شادی کے ناکام ہونے کی اطلاع دی۔ ناظرین کے لیے یہ ایک یقیناً ”نیا

ہے اور ایک پرہیزگار نور بان نے اسے بنا ہے۔
بدلتہ "لایا ہوں۔"

بادشاہ نے اسے ملازم خاص کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ یہ بابر کت کپڑا ہر وقت میرے ساتھ رہے تاکہ جب مروں تو اسی کا کفن نصیب ہو۔

رمضان میں رات دن اور نگ زیب بادشاہ اور ملا احمد جیون کی یکجا بسر اوقات ہوتی رہی۔ دن کو پہر دن کے لیے جب دربار لگتا تو اس میں بھی بادشاہ ملا احمد کو ساتھ لے جاتے اور اپنے ساتھ تخت طاؤس پر جگہ دیتے۔ رات کو تراویح کے بعد دیر تک ملا صاحب سے علمی مذاکرہ جاری رہتا۔ جس میں ملا نظام اور پایہ تخت کے دیگر اکابر علماء شریک ہوتے۔

عید الفطر پر ملا احمد نے نماز بادشاہ کے ساتھ ادا کی اور پھر طالب رخصت ہوئے۔

وداع کرتے وقت بادشاہ نے ایک بار پھر بابوسی کا شرف حاصل کیا اور جیب سے ایک روٹی (تقریباً بارہ پیسے) نکال کر نذرانے کے طور پر پیش کی۔ ملا احمد جیون نے بڑی خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا اور اخلاق و محبت کی نشاط انگیز فضا میں اپنے بلند اقبال شاگرد کو خدا حافظ کہہ کر گھر کو روانہ ہوئے۔

ان ہی ایام میں جنوبی ہند سے اورنگ زیب کو متوحش خبریں پہنچیں اور بادشاہ فوج قاہرہ کے ساتھ ادھر کو روانہ ہو گیا۔ چودہ برس کامل ان مہمات پر صرف ہو گئے۔ جب بادشاہ دہلی واپس آیا تو وزیر اعظم نے رپورٹ کی کہ ملا احمد جیون بہت بڑے زمین دار بن چکے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ان سے لگان وصول کیا

بادشاہ کی روٹی

ملا احمد جیون اور نگ زیب عالمگیر کے استاد تھے۔ ایک دن اورنگ زیب عالمگیر عصر کی نماز پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں تشریف لائے تو کیا دیکھا کہ ملا احمد جیون حوض پر بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ مسجد نمازیوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ بادشاہ صفوں کو چیرتا ہوا استاد کی خدمت میں پہنچا اور انتہائی عقیدت سے قدموں میں جھک گیا۔ بادشاہ کو فقیر کے آگے سرنگوں دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔

نماز سے فارغ ہو کر ملا احمد بادشاہ کے ساتھ ہاتھی کی عماری پر سوار ہو کر قلعہ معلیٰ میں تشریف لے گئے۔ مغرب تک دیوان خاص میں پر لطف مذاکرہ جاری رہا۔ افطاری سے ذرا پہلے بادشاہ نے پوچھا۔
”حضور کھانا غلام کے ساتھ کھائیں گے یا لنگر شاہی کو سرفراز فرمائیں گے۔“
فرمایا۔ ”تمہارے ساتھ ہی کھانے کی تڑپ ہے۔“

شام کو دونوں شخصیات ساتھ ایک ہی دسترخوان پر جلوہ افروز تھیں۔ ملا احمد کھانا بھی کھا رہے تھے۔ اور شاہ جہان بادشاہ کے بارے میں استفسارات بھی کرتے جاتے تھے۔ بادشاہ انتہائی ادب سے اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑی ہوئی جنگوں کے حالات بیان کر رہا تھا۔ کھانا ختم ہوا تو ہاتھ دھونے کے بعد ملا احمد نے ایک موٹا سوتی کپڑا پیش کیا فرمایا۔

”اسے میری والدہ نے با وضو اور روزہ میں رہ کر کاتا

لوگوں کی شاہانہ طرز زندگی اور اس کے ساتھ ناشکری کے مناظر دیکھنے کا موقع ملا تو انہوں نے ایک محفل میں بہت دکھ سے کہا۔

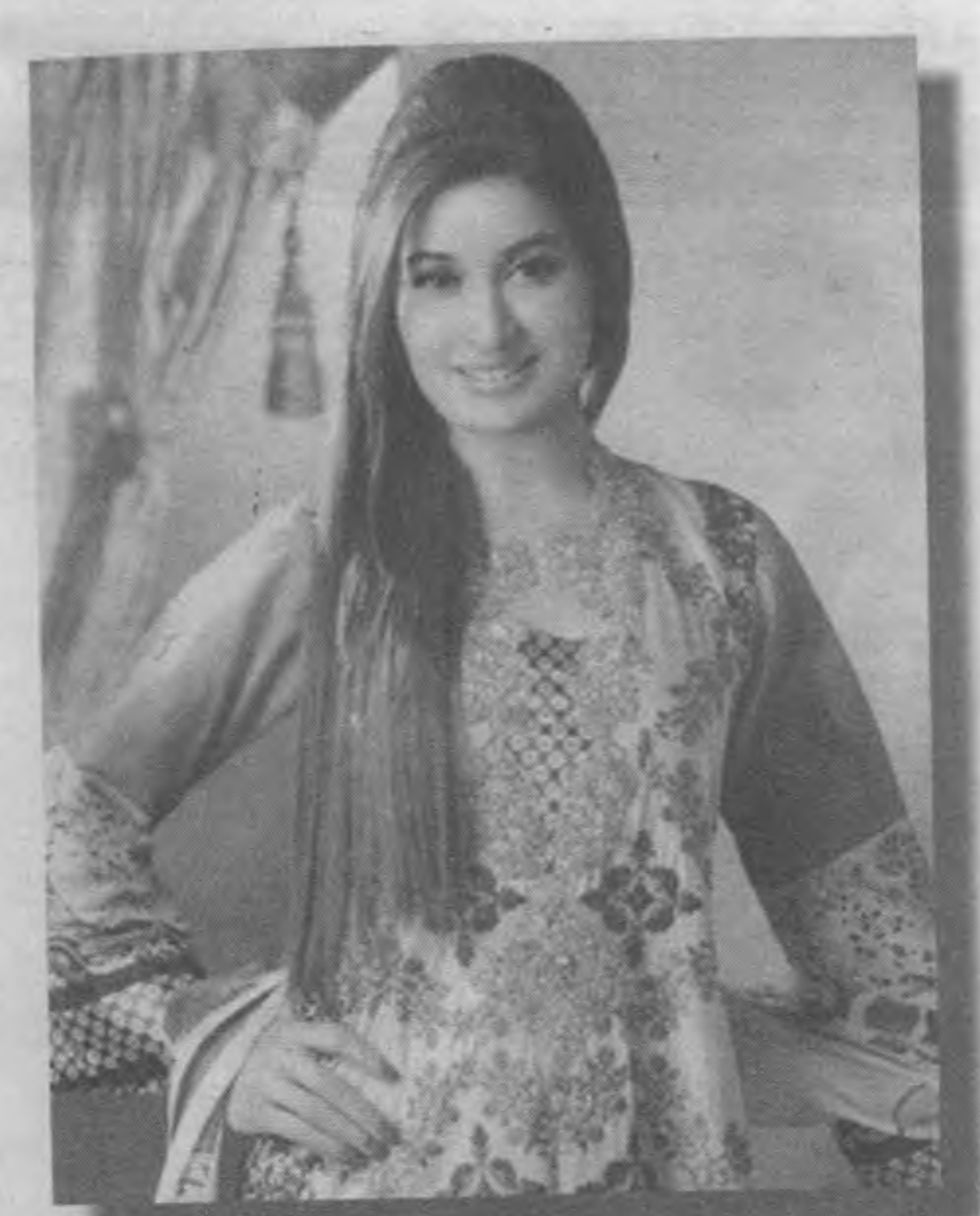
”مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو کہیں اس کفران نعمت کی سزا نہ دے۔“

(عطاء الحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)
☆ بلدیہ ٹاؤن میں لگنے والی آگ بجھتے کا شاخسانہ ہے۔ اس میں دو نکات غیر معمولی ہیں۔ اگر آگ کپڑے کے گودام سے شروع ہوئی اس کی حدت اتنی زیادہ نہیں ہوتی جاپے بھی کہ وہ ٹھوس لوہے کے گارڈز پر اثر انداز ہو۔ اگر شارٹ سرکٹ سے ہو تو بھی اتنی تیزی سے نہیں پھیلتی جبکہ فیکٹری میں جنریٹر بجلی کے کیبل اور لوازمات بالکل صحیح حالت میں ہیں۔

(ایکسپریس نیوز)
☆ افتخار چوہدری کوئی پانچ برس پہلے نوکیلی سینکڑوں والے ایک بدست بھینے کا ہدف ٹھہرا تھا۔ 9 مارچ 2007ء کو اسے آرمی ہاؤس طلب کر کے کئی باوردی جرنیلوں کے جھرمٹ میں بٹھایا گیا۔ بعد کی کہانی رعونت میں لتھڑے ہوئے ایک فرعون صفت شخص کی خود سری اور اپنے اللہ پر یقین کرنے والے بے وسیلہ شخص کی استقامت کی ایسی داستان ہے جو پاکستان کی بے مایہ سی تاریخ کا سنہری ورق ہے۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)
☆ بلدیہ ٹاؤن میں فیکٹری کی آتش زدگی نہ حادثہ تھا نہ ہی سانحہ۔ یہ سیدھا سادہ دہشت گردی کا واقعہ تھا۔ جس کو اس سے فائدہ پہنچا۔ اس کے بارے میں بھی کوئی خاص قیاس آرائی اور تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف ایک آزاد تھانے دار کو ہی یہ گتھی سلجھانے پر مامور کر دیا جائے تو دو دن میں سب سامنے آجائے گا۔

(طلعت حسین۔ راہ راست)



تجربہ تھا۔ کچھ لوگوں نے دل جلے تبصرے بھی کیے کہ اپنے ہر انٹرویو میں خود کو ”چائلڈ میرج کیس“ قرار دینے والی شائستہ جب بڑی ہو میں تو بزرگوں کی طے کردہ شادی توڑ دی۔ خیر! یہ شائستہ کی ذاتی زندگی ہے جس میں مداخلت کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ (سوائے ان کے قریبی لوگوں کے)

تاہم طلاق کے بعد ایک خاص مدت تک گھر میں نہ ”گزارنے کا فیصلہ شائستہ کا ذاتی فعل ضرور ہے مگر ان کا یہ عمل معاشرے پر کسی طور اثر انداز بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے مداخلوں کا ایک حلقہ ہے اور اعلا تعلیم یافتہ ہونے کے سبب بہت سے لوگ شائستہ سے سلجھے ہوئے اقدامات کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ (شاید اسی لیے لوگ شوہر میں آنے سے ڈرتے ہیں کہ عقل و تعلیم شوہر کے معاملات پر اتنا اثر انداز نہیں ہوتی جتنا شوہر کی چکاچوند انہیں متاثر کر دیتی ہے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ہر وقت پاکستان میں ناشکرے اس میں کپڑے نکالتے رہتے ہیں۔ ایک بار انڈیا سے ایک بہت بڑی علمی شخصیت پاکستان تشریف لائے انہیں یہاں

اس خبر نے بادشاہ کو حیرت میں ڈال دیا کہ ایک غریب الحال بوریا نشین عالم امیر کبیر کیسے بن سکتا ہے۔ اسے استاد سے ملنے کا اشتیاق تو تھا ہی اس خبر نے اشتیاق کو مزید بڑھا دیا۔ اسی وقت ایک نیا زنامہ اپنے قلم سے ملا احمد کو تحریر کیا کہ حضرت کو ملے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ نیاز مند دکن کی مہمات میں اس قدر الجھا کہ پایہ تخت کو بھی واپس نہ آسکا۔ امیدوار ہوں کہ آپ تشریف لا کر مجھے سرفراز فرمائیں۔

بادشاہ کے بلاوے پر ملا احمد دہلی تشریف لے آئے بادشاہ نے انتہائی محبت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور رمضان کے لیل و نہار اخلاص و ارادت کے جذبات میں بسر ہونے لگے۔ ملا احمد کا لباس اسی طرح سادہ تھا۔

ان کے لب و لہجہ اور طور و اطوار سے وہی سادگی نمایاں تھی۔ باوجود اشتیاق کے بادشاہ کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ملا احمد صاحب سے دریافت کر سکے کہ ان کی بابت تمہول کی جو داستان مشہور ہو گئی ہے۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

ایک دن خود ملا صاحب نے ہی فرمایا۔

”آپ سے جو دونی لے کر گیا تھا۔ وہ کوئی بہت ہی بابرکت تھی۔ میں نے اس سے بنوے خرید کر کپاس کاشت کی۔ خدا عز و جل نے اس میں اتنی برکت ڈالی کہ چند سالوں کے اندر ہی اندر سیکڑوں سے لاکھوں ہو گئے۔“

بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر ارشاد ہو تو دونی کی داستان عرض کی جائے۔“

ملا صاحب کا نے اشتیاق سے ”فرمایا ضرور سنوں گا۔“

شہنشاہ نے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ سیٹھ اتم چند کو اطلاع دی جائے کہ وہ 1049ھ کا بھی کھاتہ لا کر پیش کرے۔

خواجہ سرا کو اتم چند کا پتا معلوم نہ تھا۔ اس لیے ذرا رکا اور جہاں پناہ پر نظر کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اتم

چند کے بارے میں اور وضاحت چاہتا ہے۔

فرمایا۔ ”چاندنی چوک میں مسجد فتح پوری کے بائیں جانب جو کوچہ چلا گیا ہے۔ اس میں چوتھے نمبر کا مکان اسی کا ہے۔“

اورنگ زیب کے سامنے آتے ہوئے بڑے بڑے امراء کا زہرہ آب آب ہوتا تھا۔ اتم چند ایک اوسط درجے کا بنیا تھا۔ اسے جب حاضر ہونے کی اطلاع پہنچی تو وہ سخت فکر مند ہوا۔

1049ھ کے بھی کھاتہ کو اٹھا کر بار بار پڑتال کی۔ اس کے اوراق کو جھاڑا اور صاف ستھرا کر کے بغل میں دبا کر قلعہ کو روانہ ہوا۔ خواجہ سرا سے اردو بازار اور دیوان عام کی سیر کراتا ہوا دیوان خاص میں لے گیا۔ بادشاہ وظیفہ میں مصروف تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب حضور فارغ ہوئے تو اسے پیش کیا۔

بنیا رعب شاہی سے کانپ اٹھا۔ ڈنڈوت کے لیے جھکنا چاہتا تھا۔ مگر خواجہ سرا نے تھام لیا۔

بادشاہ نے مسکرا کر بنیے پر نظر ڈالی اور فرمایا۔ ”گھبراؤ نہیں آگے بڑھو۔ 1049ھ کا کھاتہ کھول کر خرچ کی تفصیل عرض کرو۔“

بنیے نے ہر ہر ماکر روز نامہ کھولا اور تاریخ اور خرچ کی تفصیل پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر آکر رک گیا۔

یہاں ایک دونی درج تھی۔ مگر اس کے سامنے لینے والے کا نام نہیں تھا۔ شہنشاہ نے ملائمت سے پوچھا۔

”ہاں بولو یہ دونی کہاں گئی۔“

اتم چند نے روز نامہ بند کر کے رکھ دیا۔ ایک آہ جگر سوز کھینچی اور یوں عرض گزار ہوا۔

”جہاں پناہ! یہ ایک درد بھری داستان ہے۔ اگر حضور اجازت دیں تو عرض کی جائے۔“

”ہاں! مابدولت اسے شوق سے سنیں گے۔“

شہنشاہ نے معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے فرمایا۔ ”پوہ کی ایک تاریک رات کا واقعہ ہے کہ پہر رات گزرے جمنائی جانب سے شہر گھس چڑھ آئی اور دیکھتے

ہی دیکھتے موسلا دھار برسے لگی۔ میرا مکان اگرچہ پختہ تھا۔ مگر نیا بننا تھا۔ اس نے بارش دیکھی نہ تھی۔ بمشکل دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ اس نے ٹپکنا شروع کر دیا۔ میرا قیمتی سامان بھی کھاتے پالنے کے سبب اسی میں تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی۔ مگر مکان کا ٹپکنا بند نہ ہوا۔ میں نے گھبرا کر باہر جھانکا تو مجھے ایک آدمی سرکاری لالین کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ میں سخت متعجب ہوا کہ آدمی رات گزرے کون شخص ہو سکتا ہے۔ جو کسی مکان میں پناہ لینے کے بجائے ایسی کھلی جگہ پر کھڑا ہے۔ جہاں بارش کی بوچھاڑ بری طرح سے پڑ رہی ہے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

”بھلے میاں! مزدوری کرو گے؟“

جواب ملا ”کیوں نہیں!“

وہ نیک مرد تین چار گھنٹے انتہائی بہادری اور جفاکشی کے ساتھ کام کرتا رہا تب کہیں جا کر چھت درست ہوئی۔ پھر اس نے اندر کا سامان درست کیا۔ ہم سب حیرت سے کھڑے تکتے رہے اور وہ مشین کی طرح کام میں مصروف تھا۔ اتنے میں فتح پوری مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ اس آدمی نے کام چھوڑ کر اذان سنی اور ہر ہر کلمے کے ساتھ دعا مانگی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”سیٹھ صاحب! آپ کا کام ٹھیک ٹھاک ہو چکا ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ تاکہ میں کپڑے بدل کر کسی مسجد میں نماز ادا کروں۔“

میں نے کہا ”واقعی میرا کام آپ نے ختم کر دیا ہے، لیکن آپ کو دینے کے لیے سوائے دونی کے میری جیب میں اور رقم نہیں ہے۔ آپ صبح کو دکان پر آجائیں، میں منہ مانگا انعام دوں گا۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”مجھے ہی دونی کافی ہے، میں پھر حاضر نہیں ہو سکتا، کیونکہ جسے کسی اور جگہ جا کر کام کرنا ہے۔“

مجبوراً میں نے جیب سے دونی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور وہ لے کر صبح کے دھندلے میں غائب ہو گیا۔ ہم دیر تک کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھتے

رہے، وہ فتح پوری مسجد کی طرف ہی گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے بہتیرا ڈھونڈا۔ مزدوروں میں جا کر تلاش کیا۔ مگر وہ نہیں ملا۔ پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ پوہ کی وہ رات مکان کا ٹپکنا، اجنبی کا ساری رات کام کرنا اور پھر دونی لے کر گم ہو جانا نہیں بھولتا۔ رہ رہ کر میرا ضمیر میں مجھے ملامت کرتا ہے کہ اگر روپے نہ تھے، اشرفیاں تو موجود تھیں۔ ایک اشرفی ہی دے دیتا۔ اتم چند نے یہ داستان ختم کرنے کے بعد ہاتھ جوڑ کر

شہنشاہ کو پرنام کیا۔ بادشاہ نے دست مبارک سے خلعت فاخرہ مرحمت کر کے اتم چند کو رخصت فرمایا۔ جب وہ روانہ ہو گیا تو بادشاہ نے مسکرا کر ملا احمد پر نظر ڈالی، ملا صاحب فرط محبت سے جھوم اٹھے بولے۔

”واہ! اورنگ زیب تو نے کمال کر دیا۔ میرا پہلے سے یہی خیال تھا کہ شاگرد بلند اقبال نے یہ خود کما کر ہی نذر گزاری ہے۔ ورنہ اس سے سیکڑوں اور لاکھوں کیونکر بنتے۔“

بادشاہ نے انتہائی عقیدت سے عرض کی کہ یہ حضرت کے فیض تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ اورنگ زیب ذاتی خرچ کے لیے خود کما لیتا ہے اور خزانہ عامرہ سے کچھ نہیں لیتا۔ اگر حضرت کی دعا شامل حال نہ ہوتی تو مجھے یہ توفیق کیونکر ہوتی۔“

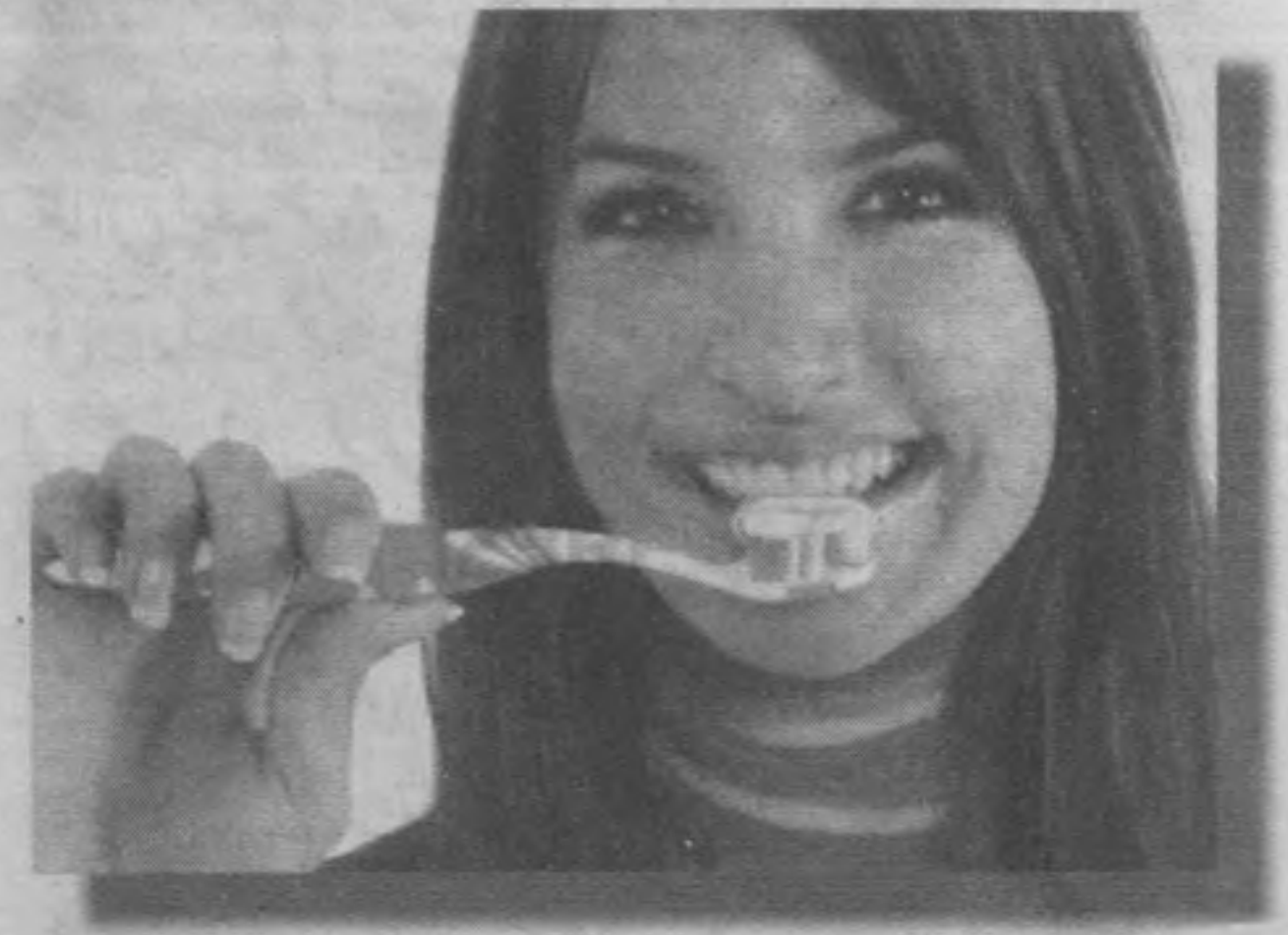
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے فارغہ افتخار کے 4 خوبصورت ناول

آئینوں کا شہر	قیمت - 500/- روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت - 500/- روپے
یہ گلیاں یہ چوہارے	قیمت - 300/- روپے
پچلاں دے رنگ ہزار	قیمت - 250/- روپے

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



ادارہ خوش صورتی

شخصیت کی دلکشی و رعنائی چہرے کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ دلکش اور حسین مسکراہٹ میں پنہاں ہے۔ حسین مسکراہٹ دانتوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اس لیے دانتوں کی صفائی اور خوب صورتی کا خاص خیال رکھیں۔ دانت انسان کے چہرے پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں کرتے اور مسکراتے وقت نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں اور اگر یہ گندے ہوں تو اس سے دیکھنے والوں پر شخصیت کا تاثر خراب ہوتا ہے نیز دانتوں کی صفائی نہ کرنے سے معدے اور مسوڑھوں کی بہت سی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس لیے دانتوں کو چمک دار اور خوب صورت بنانے کے لیے متوازن غذا کا استعمال کریں جس میں دودھ، انڈے، سبزیاں، پھل، گوشت اور اناج خاص طور پر ضروری ہیں۔

☆ دانتوں کی صفائی اور خوب صورتی کے لیے ٹوتھ برش یا مسواک باقاعدگی سے استعمال کریں۔ یہ عمل دانتوں کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بیماریوں سے محفوظ رکھے گا۔

☆ کڑوے تیل میں نمک ملا کر دانت صاف کریں۔ اگر تیل کی بو سے ہچکچاہٹ محسوس کریں تو اس کے بعد

منجن یا ٹوتھ پیسٹ استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے دانتوں میں چمک اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔
☆ دس گرام پھٹکری، بیس گرام شہد اور پندرہ گرام سرکہ لیں۔ ان تین چیزوں کو اچھی طرح ملا کر ہلکی آنچ پر پکا میں۔ جب اچھی طرح پک جائیں تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں ڈال لیں اور حسب ضرورت استعمال کریں۔ اس سے دانت صاف، شفاف اور مضبوط ہو جائیں گے اور اگر آپ کے دانت ملتے ہیں تو وہ بھی ہلکا بند ہو جائیں گے۔
☆ صبح یا شام کے وقت مغزیستہ اوپر والے لال چھلکے سمیت ایک سے تین دانے آہستہ آہستہ چبا کر کھانے سے چند روز میں مسوڑھے مضبوط اور دانت صاف ہو جائیں گے۔

☆ دانتوں کو مضبوط کرنے کے لیے آدھی پیالی سرکہ میں ایک کھانے کا چمچہ شہد ملا میں اور اس سے روزانہ کلیاں کریں۔

☆ اگر آپ کے دانتوں سے خون آتا ہو تو پھٹکری ایک تولہ، نمک ایک تولہ، کالی مرچ ایک تولہ لے کر تینوں کو پیس لیں اور پھر دانتوں پر ملیں۔ بیس منٹ بعد گرم پانی سے کلی کر لیں۔ چند ہی دنوں میں دانتوں سے خون آنا بند ہو جائے گا۔

☆ پوٹاشیم پرمینگنیٹ جسے لال دوائی بھی کہتے ہیں۔ تھوڑی مقدار میں لے کر ایک گلاس پانی میں حل کر لیں اور پھر اس سے غرارے کریں۔ اس سے بھی دانتوں سے خون آنا بند ہو جائے گا۔

☆ اگر مسوڑھوں میں ورم آجائے تو مشک کا فور ایک تولہ، نوشادر ایک تولہ لے کر دونوں کو خوب باریک پیس لیں۔ یہ منجن مسوڑوں پر ملنے سے چند دنوں میں آرام آجائے گا۔

☆ اگر دانتوں میں درد ہو یا منہ سے بدبو آتی ہو تو گرم پانی میں نمک ملا کر کلی کرنے سے دانتوں کی تکلیف اور منہ سے بدبو بھی دور ہو جاتی ہے۔

☆ لونگ کا تیل بار بار لگانے سے بھی دانتوں کے کیڑے مر جاتے ہیں۔

محمد آصف زمیل

ڈائجسٹ پی۔ کے ڈاٹ کام

DIGESTPK.COM

ایکسپریس
ایکسپریس
ایکسپریس

محمد آصف زمیل

ڈائجسٹ پی۔ کے ڈاٹ کام

DIGESTPK.COM



ایکسپریس
ایکسپریس
ایکسپریس

Vitamin
Fruit Extracts
Vitamin
Fruit Extracts



MS Creams-0333-42430